مفکر اسلام

مولانا مفتی محمود

کی

علمی، دینی اور سیاسی خدمات

مولانا فضل الرحمٰن

ڈاکٹر مولانا عبدالحکیم اکبری



مفتیٔ اعظم مولانا مفتی محمودؒ

کی

علمی، دینی اور سیاسی خدمات

مقدمہ: قائد ملتِ اسلامیہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن (ایم۔این۔اے)
مرکزی امیر جمعیۃ علماء اسلام پاکستان

تحقیق و تالیف

ڈاکٹر مولانا عبدالحکیم اکبری

خطیب جامع مسجد گومل یونیورسٹی

شعبہ عربی، علوم اسلامیہ و تحقیق گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان

مکتبۃ الحمید

بالمقابل گرڈ سٹیشن، شیخ یوسف روڈ، ڈیرہ اسماعیل خان

نام کتاب .... مفتیٔ اعظم مولانا مفتی محمودؒ کی علمی، دینی اور سیاسی خدمات

مؤلف .... ڈاکٹر مولانا عبد الحکیم اکبری

سن اشاعت .... 2010ء / 1431ھ

ناشر .... مکتبۃ الحمید، ڈیرہ اسماعیل خان

کمپوزنگ .... قاری حافظ محمد خالد۔ ڈیرہ اسماعیل خان

قیمت ....

ملنے کا پتہ

مکتبۃ الحمید

بالمقابل گرڈ سٹیشن، شیخ یوسف روڈ، ڈیرہ اسماعیل

فون نمبر: 0966-717806

موبائل نمبرز: 03459822722
03229820151
03449352930

اُس وقت کے امام کو میرا سلام ہو

الحاج عبدالکریم صابر ڈیرہ۔ 1973ء

نباضِ صبح و شام کو میرا سلام ہو ... اُس مردِ نیک نام کو میرا سلام ہو
شیخ الحدیث مفتیٔ محمود شیخ وقت ... خوش خلق و خوش کلام کو میرا سلام ہو
جو ہر قدم پہ خضرِ حیاتِ عمل رہا ... اُس فائز المرام کو میرا سلام ہو
تاریخ جس کو یاد رکھے گی تمام عمر ... اُس میر خاص و عام کو میرا سلام ہو
گھبرایا جو نہ پیچ و خم راہ سے کبھی ... اُس مردِ تیز گام کو میرا سلام ہو
جو محترم ہے سارے زمانے کیواسطے ... مقصودِ احترام کو میرا سلام ہو
وہ جس نے ہم کو دی ہے نوید سکون دل ... اُس صاحب پیام کو میرا سلام ہو
جو چاہتا ہے ہر طرح اسلام کا نظام ... اُس صاحب نظام کو میرا سلام ہو
آئینِ دین کے واسطے جو وقف ہوگیا ... اُس صاحبِ مقام کو میرا سلام ہو
بطلِ جلیل مفتی اعظم امام وقت ... اُس قائدِ عوام کو میرا سلام ہو
ذی جاہ ذی وقار ہیں ذیشان و ذی شعور ... ذی عزّ و ذی الاکرام کو میرا سلام ہو

صابرؔ بصد خلوص و عقیدت بطرزِ نو
اُس وقت کے امام کو میرا سلام ہو

بیاد حضرت مولانا مفتی محمودؒ

غفار بابرؔ۔ڈیرہ۔2002ء

وہ شب زدوں میں سحر کا دماغ رکھتا تھا
ہوا کے دوش پہ اپنا چراغ رکھتا تھا
جو کر رہا تھا رفو دوسروں کے زخموں کو
وہ شخص آپ دل داغ داغ رکھتا تھا
وہ دشت غم کا مسافر تھا ایک دیوانہ
وہ اپنے دل کو مگر باغ باغ رکھتا تھا

عجیب جاگتی آنکھوں میں خواب رکھتا تھا
وہ نوک خار پہ برگ گلاب رکھتا تھا
وہ جس کے عزم پہ قرباں جوانیوں کا غرور
وہ مرد پیر بھی کیسا شباب رکھتا تھا
خدا کی ذات پر اس کا یقین کامل تھا
وہ دل میں عشق رسالت مآبؐ رکھتا تھا
کرن کرن کو اجالوں کی بھیک دیتا تھا
نظر نظر میں وہ صد آفتاب رکھتا تھا

وہ اپنی زیست کے لمحوں کی لاج رکھتا تھا
وہ "کل" کو اپنے تصرف میں "آج" رکھتا تھا
وہ اک خطیب کہ شعلہ نوا بھی تھا لیکن
غضب کی دھوپ میں شبنم مزاج رکھتا تھا
وہ خار زار محبت پہ چل رہا تھا مگر
گلوں پہ قرض وہ اپنا خراج رکھتا تھا
وہ ایک مرد قلندر بھی کیا سکندر تھا

فہرست مضامین

اظہارِ تشکر

حامدا و مصلّیا و مسلّما

اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے فضل واحسان، اساتذہ کرام کی شفقت و تعاون اور دوست احباب کی دُعا و حوصلہ افزائی سے میں اس قابل ہوا کہ اپنا تحقیقی مقالہ بعنوان "مولانا مفتی محمود کی دینی، علمی اور سیاسی خدمات کا تحقیقی مطالعہ" آپ کے مطالعہ کے لئے پیش کر سکوں۔ اگر ایک طرف میرے لئے خوشی اور مسرت کی انتہا ہے تو دوسری طرف ربّ کریم کے بے بہا انعامات و احسانات کے اظہار تشکر کے لئے سر تاپا اپنے آپ کو عاجز و درماندہ محسوس کرتا ہوں۔ اس کے سپاس تشکر کے لئے بھی، اسی کے فضل واحسان اور توفیق کے لئے دست بدعا ہوں۔

میرے اساتذہ کرام نے میرے دل کے اندر دین اسلام اور اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کا جو جذبہ پیدا کیا۔ اور جس طرح مزید مطالعہ اور تحقیق کے لئے میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی فرمائی، میں خوشی کے اس موقعہ پر اُن کا از حد شکر گزار ہوں۔ خصوصاً میرے شکریہ کے مستحق میرے نگران مقالہ جناب ڈاکٹر محمد صدیق صاحب اسسٹنٹ پروفیسر و چیئرمین شعبہ عربی، علوم اسلامیہ و تحقیق وایڈیشنل کنٹرولر گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان و جناب ڈاکٹر پروفیسر محمد اسلم خان صاحب ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ عربی، علوم اسلامیہ و تحقیق گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان ہیں جنہوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی۔ مجھے حوصلہ دیا۔ اور فن تحقیق کے لحاظ سے مجھے مفید مفید مشوروں سے نوازا۔ میں ان کی بھرپور توجہات اور عنایتوں کے بدلے ان کی خدمت میں جتنا بھی سپاس امتنان پیش کروں کم ہے۔

میں ان علم دوست احباب وعلم پرور حضرات کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے میرے مقالہ کے موضوع کی مناسبت سے مجھے کتب وحوالہ جات کی فراہمی میں کبھی کسی مشکل کا شکار نہ ہونے دیا۔ خصوصاً حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب مہتمم جامعہ قادریہ وجامعہ دارالہدیٰ بھکر، مرکزی سرپرست جمعیۃ علماء اسلام پاکستان، جناب حضرت مولانا مفتی محمد انور شاہ صاحب مہتمم جامعۃ الباقیات الصالحات لکی مروت وسابق ناظم امتحانات وفاق المدارس العربیہ ملتان، پاکستان وسابق شیخ الحدیث ومفتی جامعہ قاسم العلوم ملتان۔ اور مولانا مفتی محمد انور شاہ کا اس لحاظ سے بھی کہ مقالہ ہٰذا کی اشاعت سے قبل انہوں نے اس کو زیر مطالعہ رکھا اور بعض مقامات کی اصلاح کی طرف متوجہ کیا۔ جناب خواجہ محمد زاہد صاحب (سابق مرکزی ناظم مالیات جمعیۃ علماء اسلام پاکستان) ڈیرہ اسماعیل خان کا (خواجہ محمد زاہد صاحب 22-03-2010 کو مولانا لطف الرحمٰن کے ضمنی الیکشن کے ذمہ داری کی حیثیت سے رات دس بجے اپنے دیگر جماعتی کارکنوں کے ساتھ الیکشن آفس میں موجود تھے کہ کسی سیاہ بخت نے ہینڈ گرنیڈ پھینکا جس سے خواجہ محمد زاہد صاحب کی شہادت واقع ہوئی۔ اُن کے ساتھ میرے قابل احترام دوست شیخ ایاز بھی شہید ہو گئے۔ جبکہ باقی ساتھی زخمی ہوئے) بہت ہی ممنون ہوں۔ اور ان کے لئے اللہ بزرگ وبالا کی طرف سے ان کے مدد وتعاون پر اجر کے لئے دست بدعا ہوں۔

میں اپنی اہلیہ محترمہ کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری کتابوں اور میرے اوراق کی حفاظت میں ازحد دلچسپی لی۔ اور مجھے اس سلسلے میں ذہنی پریشانی سے کافی حد تک محفوظ رکھا۔

میرے تحقیقی مقالہ کے کمپوزر جناب حافظ محمد کامران صاحب اور جناب مولانا حافظ قاری محمد خالد بھی شکریہ کے مستحق ہیں۔ جنہوں نے بروقت میرے کام کی تکمیل میں میرے ساتھ تعاون کیا۔

میں اپنے تمام اساتذہ کرام، دوست واحباب اور بہی خواہوں کا بھی احسان مند ہوں خصوصاً درج بالا حضرات کا جن کے تعاون سے میں اس تحقیقی مقالہ کو ظاہری اور باطنی خوبصورتی کے ساتھ قاری حضرات کے سامنے لانے میں کامیاب ہوا۔ میں ان تمام اصحاب قلم کا شکر گزار ہوں جن کی بیش بہا تحریروں سے مجھے اس تحقیقی کام میں استفادہ کرنے کا موقع ملا۔

بہت ناسپاسی ہوگی اگر میں شکریہ ادا نہ کروں حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب کا۔ جنہوں نے میرے اس مقالہ کو اوّل تا آخر پڑھا۔ کئی دن تک زیر مطالعہ رکھا۔ اور بعض واقعات مقامات کے بارے میں مجھے اپنی حتمی آراء سے نوازا۔ اور پھر مفتی صاحب سے متعلق گومل یونیورسٹی میں منعقدہ سیمینار میں اپنی تقریر کو اس مقالہ کی اشاعت کی صورت میں اس کے "مقدمہ" کے طور پر شائع کرنے اجازت دے دی۔ جو کہ تحریر کی صورت میں لانے اور آپ کی نظر ثانی کے بعد اس کو اس کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔

میرے شکریہ کے مستحق مولانا عبدالحمید صاحب مہتمم جامعہ خدیجۃ الکبریٰ للبنات، مدرّس جامعۃ المعارف الشرعیہ ومدیر مکتبۃ الحمید ڈیرہ اسماعیل خان بھی ہیں۔ جنہوں نے اپنے ادارے کی طرف سے اس کتاب کو شائع کرنے میں میرے ساتھ تعاون کیا۔

عزیزم ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب ایسوسی ایٹ پروفیسر گومل میڈیکل کالج و آرتھوپیڈک سرجن ٹیچنگ ہسپتال ڈیرہ اسماعیل خان سے بھی اظہار تشکر کرتا ہوں جن کے مالی تعاون سے میں اس قابل ہوا کہ اس کتاب کو زیور طبع سے آراستہ کر سکوں۔ اور قارئین ومحققین کے استفادہ کے قابل بنا سکوں۔

وَ مَا تَوفِیْقِیْ اِلاَّ بِاللّٰہِ

ڈاکٹر عبدالحکیم اکبری

پیش لفظ

ڈاکٹر عبدالحکیم اکبری

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ ۝١ ٱلۡحَمۡدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ۝٢ ٱلرَّحۡمَٰنِ
ٱلرَّحِيمِ ۝٣ مَٰلِكِ يَوۡمِ ٱلدِّينِ ۝٤ إِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَإِيَّاكَ نَسۡتَعِينُ ۝٥
ٱهۡدِنَا ٱلصِّرَٰطَ ٱلۡمُسۡتَقِيمَ ۝٦ صِرَٰطَ ٱلَّذِينَ أَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ غَيۡرِ
ٱلۡمَغۡضُوبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا ٱلضَّآلِّينَ ۝٧ اٰمِيۡن

والصّلوة و السلام علی افضل الانبیاء و سید المرسلین و علی اله و اصحابه و من تبعهم باحسان الی یوم الدین۔

زیر نظر تحقیقی مقالہ مولانا مفتی محمود کی خدمات کے حوالہ سے ہے جیسا کہ اس کے عنوان سے واضح ہے۔ ان کی حیات وخدمات اور شخصیت و کردار، ان کے افکار و نظریات، ان کے خطابات وتقاریر، مضامین وانٹرویوز، اب تک بیسیوں کتب ومقالات کا موضوع رہے ہیں۔

اور آئندہ بھی ان کی شخصی واجتماعی زندگی اور ملی و قومی خدمات پر اہل فکر وشعور اور صاحبان قلم و قرطاس خامہ فرسائی کرتے رہیں گے۔ ان کے لئے کافی وسیع میدان ہے۔ اور ابھی مفتی صاحب کی زندگی وخدمات کے بہت سے وہ پہلو جو پردۂ اخفاء میں ہیں ان کو تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے حوالۂ قلم و قرطاس کرنا ایک اجتماعی قرض ہے۔ جن کے لئے ایسے صاحبان علم وضرور سامنے آئیں گے۔ جو یہ قرض چکا سکیں گے۔

زیر مطالعہ تحقیقی مقالہ ایک طالب علمانہ کاوش ہے۔ جس میں اس اعتراف کے ساتھ کہ میں اس کا کماحقہ حق ادا نہ کر سکا۔ صرف اب تک اس سلسلے میں ہونے والے تحقیقی کام کے منتشر مضامین کو ایک مخصوص عنوان کے تحت یکجا کرنے کی سعی کی ہے۔ جو کہ یقیناً سراہا جائے گا۔ اور میرے جیسے بے بضاعت و بے بساط تحقیق کے راستہ کے آبلہ پا راہروں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ تاکہ آئندہ تحقیق کرنے والوں کے لئے کارگر واقع ہو سکے۔

حضرت مفتی صاحب کی حیات وخدمات پر جناب محمد نعیم آسی صاحب نے مفتی صاحب کی حیات میں جو کتاب مولانا مفتی محمود (حیات وخدمات) کے عنوان سے لکھی ہے۔ ان کے وہ جملے مجھے بہت پسند آئے اور میرے دل کی آواز محسوس ہوئے جو انہوں نے ابتداء میں لکھے ہیں۔ میں یہاں بات کو آگے بڑھانے سے پہلے انہیں کا سہارا لیتا ہوں۔

"اس کتاب کا مرکزی کردار ایک مخلص اور سیدھا سادا انسان ہے۔ جس کی زندگی ایک کھلی کتاب ہے۔ اور جسے ہر کوئی پڑھ سکتا ہے۔ سیاسی اعتبار سے اس میں کوئی اونچ نیچ نہیں۔ نہ وہ کسی کو دھوکا دیتا ہے اور نہ کسی سے دھوکا کھاتا ہے۔ نہ خود سپردگی کا قائل ہے، نہ خواہ مخواہ لڑائی بھڑائی کا۔ یہ کتاب ایک باحمیت عالم دین، ایک زیرک سیاستدان اور ایک عالی دماغ مدبرّ و منتظم کی کہانی ہے۔ آپ ان کے کسی خیال یا اقدام سے اختلاف کر سکتے ہیں۔ مگر یہ امر واقعہ ہے۔ اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ مفتی صاحب کی تمام تر سعی وجُہد اور تگ وتاز کا مرکزی نقطہ روز اوّل سے اسلام.... اور صرف اسلام ہے۔ وہ اسلام کے نشأۃِ ثانیہ اور مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی بحالی کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مجھے بے حد محبوب ہے"۔

یہی اس عظیم شخصیت کی خدمات وکردار کی کرشمہ سازی ہے کہ جیسے وہ محمد نعیم آسی کے محبوب ہیں میرے بھی محبوب ہیں۔ اور مجھ جیسے لاکھوں انسانوں کے دلوں میں ان کی محبت گھر کر چکی ہے۔ اور یہی وجہ ہے جس نے مجھے اس حوالہ سے تحقیق کے لئے میدان فراہم کیا۔

اور مجھ جیسے بے بضاعت و بے بساط ادنیٰ درجہ کے طالب علم سے یہ کام لیا۔ میں یقیناً مفتی صاحب کی ذات کی یہ کرامت سمجھتا ہوں کہ جس کام کو ابتداء میں سوچتے ہوئے، آغاز کرتے ہوئے خوف محسوس کر رہا تھا اور اپنے آپ کو ہرگز اس تحقیقی کام کا اہل نہیں پا رہا تھا۔ یہ کام مختصر سے عرصہ میں تکمیل تک پہنچا۔ اس میں میری کوئی قابلیت و اہلیت نہیں تھی یہ سب کچھ اس عظیم شخصیت کی بدولت اور ان کی کرامت سے ممکن ہوا۔

زیر نظر مقالہ کا موضوع ایک عظیم شخصیت کی خدمات ہیں۔ جو ۱۹۴۳ء میں تحصیل علم سے فراغت سے لے کر ۱۹۸۰ء میں ان کی وفات تک ایک طویل مدت میں انجام دئے گئے ہیں جس میں وہ بڑے بڑے انقلابات آئے۔ متعدد تحریکیں چلیں۔ مختلف حیثیتوں سے آپ کی شخصیت کی صلاحیتیں نمودار ہوئیں۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ بعض حضرات کو ان کی کسی بات، عمل یا تحریک سے اختلاف رہا ہو۔ ان کو ایسے کرنے کا مکمل حق ہے۔ مگر یہاں یہ بات وہ اپنے مطالعہ میں پیش نظر رکھے کہ مقالہ نگار نے کہاں تک فن تحقیق کی باریکیوں اور لوازمات کا التزام کیا ہے۔ اور کہاں اس کا قلم راہ راست سے پھسلا ہے۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ کسی بات کی چھان بین کے لئے ضروری شرائط کو مد نظر رکھا جائے۔ لیکن جہاں انسانی خطا سے شعوری طور پر بچنا ممکن نہیں لاشعوری طور پر تو غلطیوں کے صدور سے بالکل کوئی چارہ ہی نہیں۔

راقم الحروف نے اس کے باوجود کوشش یہ کی ہے کہ جو کچھ لکھے اپنی بساط بھر چھان بین، تحقیق اور مع حوالہ لکھے۔ اور جس حوالہ سے جو بات معلوم ہوئی ہے اس کا ماخذ ضرور لکھے۔

راقم الحروف کا مفتی صاحب سے تعلق ابتدائی یادداشت سے ہے۔ اس لئے متعین طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اُن سے پہلی ملاقات کب ہوئی تھی۔ کیونکہ ہمارا تعلق ایک ہی بستی عبدل خیل سے ہے۔ صرف اتنا یاد آتا ہے کہ وہ راقم الحروف کے والد بزرگوار کی محفل میں بعض دفعہ شریک ہوتے۔ کتابوں کا مطالعہ ہوتا۔ اور بحث مباحثہ ہوتے۔ جس میں دیگر علماء بھی

شریک ہوتے تھے۔ راقم الحروف کے حافظے میں یہ واقعہ اب بھی موجود ہے کہ راقم الحروف جن دنوں ان کے چھوٹے بھائی خلیفہ محمد مرحوم سے "قاعدہ" پڑھ رہا تھا۔ کہ ایک دن ان کی بیٹھک میں قاعدوں اور پاروں کے مخصوص جگہ سے اپنے قاعدہ اٹھانے کے لئے اندر داخل ہوا تو وہاں مفتی صاحب گاؤں کے دیگر رہنے والوں کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ حسب روایت ان سے مصافحہ کیا۔ تو انہوں نے پڑھائی کے بارے میں پوچھا اور پھر امتحان لیا یہ تو معلوم نہیں کہ انہوں نے کیا پوچھا اور یہ کہ راقم الحروف کا جواب صحیح بھی تھا یا غلط۔ لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ انہوں نے نقد انعام دے کر حوصلہ افزائی کی تھی۔ پھر تو مسلسل ایک نہ ٹوٹنے والا تعلق قائم رہا۔ جو حالات کے اُتار چڑھاؤ سے بالاتر رہا۔ راقم الحروف نے دینی تعلیم کی ابتداء انہی کے زیر سایہ مدرسہ قاسم العلوم ملتان سے کی۔ جہاں راقم الحروف کے بڑے بھائی مولانا مفتی عبداللطیف صاحب مدرّس و معین مفتی تھے۔ تقریباً دو سال وہاں زیر تعلیم رہا۔ دوسرا تعلیمی سال تھا کہ مدرسہ کے تعلیمی کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ اعلیٰ درجہ کے مدرّسین ابتدائی کتب میں سے کوئی ایک کتاب ضرور زیر درس رکھیں گے۔ اس طرح علم نحو کی ابتدائی کتاب "نحو میر" کے ابتدائی اسباق حضرت مفتی صاحبؒ سے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اسباق کے علاوہ فارغ اوقات میں ان کی محفل میں بیٹھنا۔ ان کے مہمان خانے میں مہمانوں کی خدمت کرنا گویا کہ ان کے قریب قریب رہنے کا خوب موقع ملا۔ تعطیلات میں گاؤں میں سارا سارا دِن اُن کی محفل میں بیٹھنے کا موقع ملتا اور پھر جب ان کے بڑے صاحبزادے مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں داخلہ لیا جہاں راقم پہلے سے وہاں زیر تعلیم تھا۔ پھر ایک ہی کمرہ میں چار سال تک رفاقت نے مفتی صاحب کے اور زیادہ قریب کیا۔ اسی دوران کئی اسفار میں معیت بھی حاصل رہی۔ ہر ہفتہ، ہفتہ وار تعطیل کے موقع پر پشاور میں جب وہ وزیر اعلیٰ رہے اور اسلام آباد کے پارلیمنٹ ہاسٹل میں جہاں وہ رہائش پذیر رہے، مولانا فضل الرحمٰن کے ہمراہ ان کے ہاں جانے کا بار بار موقع ملتا۔ ۱۹۷۶ء راقم

الحروف کے دورۂ حدیث کا سال تھا۔ اور اسی سال جمعیۃ طلباء اسلام میں اختلافات عروج پر پہنچ گئے تھے۔ آخر کار جمعیۃ علماء اسلام کے بزرگوں نے اس مسئلہ کے حل کے لئے غور وخوص شروع کیا۔ جس کے لئے انہوں نے موجودہ تنظیم کو توڑ کر ایک کنوینگ باڈی تشکیل دی۔ جس کے کنوینئر جناب محمد اُسلوب قریشی اور سیکرٹری میاں عارف صاحب مقرر کئے گئے۔ جبکہ راقم الحروف کو صوبہ سرحد سے واحد نمائندہ مقرر کیا گیا۔ چونکہ اُسلوب قریشی نے بعد میں اس فیصلے کے ماننے سے انکار کیا اس لئے اس سات رُکنی کنوینگ باڈی کا راقم الحروف کو کنوینئر مقرر کیا گیا۔ اس کے لئے سات رُکنی کمیٹی کی میٹنگ جمعیۃ علماء اسلام کے مرکزی دفتر رنگ محل لاہور میں طلب کی گئی۔ جب کمیٹی کے ارکان نے غیر متوقع طور پر مرکزی کنوینئر کے لئے میرا نام پیش کیا گیا تو میں نے معذرت کر دی۔ شدید اصرار کے باوجود میں نے آمادگی ظاہر نہ کی۔ تو ساتھیوں نے فون کے ذریعہ مفتی صاحب سے ملتان رابطہ قائم کیا اور ساری صورت حال ان کو بتا دی۔ انہوں نے راقم الحروف کو فون پر یہ ذمہ داری لینے کی ہدایت فرمادی۔ جواب میں راقم الحروف نے دو شرطیں رکھ دیں۔ ایک یہ کہ آپ تنظیم کی سرپرستی فرمائیں گے اور دوسری یہ کہ آپ اپنے فرزند مولانا فضل الرحمٰن کو یہ اجازت دیں گے کہ اگر ہم نے مناسب سمجھا کہ صوبہ سرحد میں ان کو کوئی تنظیمی ذمہ داری دیں تو آپ کی طرف سے اجازت ہوگی۔ مفتی صاحب نے ان شرائط پر آمادگی ظاہر کر دی۔
اور اس طرح راقم الحروف نے اپنے ساتھیوں کے تعاون سے مقررہ مدت چھ ماہ سے مزید تین ماہ کے عرصہ میں ملکی سطح پر ابتدائی تنظیم سے مرکزی تنظیم تک تمام تنظیم قائم کر دیں۔ اور جماعت میں ایک نئی روح پھونک دی۔ یہاں یہ واقعہ بھی اہم ہے کہ جب 1976ء میں بھٹو حکومت نے مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کی مسجد "مسجد نور" کو اوقاف کی تحویل میں لیا۔ تو اس کے خلاف زبردست تحریک چلی۔ ان دنوں ایک طرف پنجاب میں سیلاب آیا ہوا تھا۔ دوسری طرف گوجرانوالہ میں جیل بھرو تحریک شروع تھی۔ اس دوران دو دفعہ مفتی صاحب نے راقم الحروف کو

میاں محمد عارف کے ہمراہ شاہی مسجد لاہور کے خطیب مولانا عبدالقادر آزاد کے پاس بھیجا (جو کہ مفتی صاحب کے شاگرد تھے) تاکہ اس کے اثر ورسوخ کو کام میں لے کر اس مسئلہ کو حل کیا جائے۔ جس کا آخر کار نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت نے مسجد واگزار کر دی۔

1977ء کی تحریک میں راقم الحروف اور مولانا عبدالمالک شاہ صاحب حال مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ و سابق صوبائی ناظم جمعیۃ علماء اسلام صوبہ پنجاب نے ڈیرہ اسماعیل خان میں اکابرین قومی اتحاد کی گرفتاری کی وجہ سے تحریک کی ذمہ داری سنبھالی تھی۔ اس لئے جب ضیاء الحق نے الیکشن کا اعلان کیا۔ تو مفتی صاحب نے مولانا سیّد عبدالمالک شاہ اور راقم الحروف کو ایک مکتوب (جو کہ راقم الحروف کے پاس محفوظ ہے) میں ہدایت کی کہ وہ ڈیرہ اسماعیل خان پہنچ کر الیکشن سے متعلق تمام ذمہ داریاں انجام دیں۔

انہی قریبی تعلقات اور اعتماد اکابر علیٰ اصاغر نے کچھ اپنی طبیعت میں بے ساختگی نے کچھ ان کی شفقت و نظر کرم نے اتنا جری کر دیا کہ مجھے کئی کئی دفعہ ان کی ابتدائی زندگی کے بارے میں سوالات کرنے کا موقع ملتا۔ جس کا وہ تفصیلی جواب دیتے جبکہ عام لوگوں کے سامنے وہ ان حالات کو کبھی موضوع بحث نہ بناتے اور نہ اہمیت دیتے تھے۔ اس لحاظ سے میں نے آپ کے حالات زندگی سے متعلق جو کچھ لکھا ہے زیادہ تر ان کے اپنے بیان کردہ حالات پر مبنی ہیں۔ انکی علمی، دینی اور سیاسی خدمات کے حوالہ سے جو کچھ تحقیق کی ہے۔ وہ کتب ورسائل واخبارات وجرائد سے لیا گیا ہے جو اب تک مفتی صاحب کی سیاسی جدوجہد اور خدمات کے حوالہ سے شائع ہو چکی ہیں۔ جن تک راقم الحروف کی رسائی ہو چکی ہے۔ صرف دو کتابیں (مطبوعہ) ایسی ہیں۔ جن کو باوجود تلاش کے میں حاصل نہ کر سکا۔ ایک جناب نور عالم قریشی ایڈوکیٹ کی "میر کارواں" اور دوسری جناب مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی صاحب کی جو انہوں نے مفتی صاحب کے بارے میں لکھی ہے۔ اور ایک غیر مطبوعہ مسوّدہ جو تلاش کے باوجود بھی میسر نہ آسکا۔ مفتی صاحب کے پاس ایک دفعہ ملتان سے

دونوجوان جناب مجتبےٰ بھٹہ صاحب اور جناب حافظ نوراحمد صاحب عبدل خیل آئے تھے۔اور وہ کئی دن وہاں رہے۔جہاں روزانہ مفتی صاحب کچھ وقت ان کو دیتے اور اسلام کے نظام معاشیات اور موجودہ معاشی نظریات کے بارے میں ان سے سوالات کرتے اور مفتی صاحب جوابات دیتے تھے۔اور یوں انہوں نے ایک مسوّدہ تیار کیا۔جس کی انہوں نے کتابت بھی کرا رکھی تھی۔ لیکن وہ مسوّدہ ان سے ضائع ہوگیا تھا۔راقم الحروف کے ذہن میں چونکہ سوالات وجوابات کا یہ پورا منظر سامنے تھا۔اوراب جب تحقیقی مقالہ کے لئے اس کی ضرورت ہوئی تو جناب حافظ نوراحمد سے ملتان جاکر ملاقات کرکے جب یہ معلوم ہوا تو بہت دکھ ہوا کہ وہ مسوّدہ کہیں ضائع ہوگیا ہے۔ اور باوجود تلاش کے اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا ہے۔

زیر نظر مقالہ میں مفتی صاحب کی خدمات کے ساتھ ساتھ آپ کی زندگی کے وہ پہلو بھی سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے جو عام لوگوں کی نظر سے گوشۂ اخفا میں تھے۔اور اس سے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ جیسے زندگی میں عام بچوں کو بچپن، لڑکوں کو لڑکپن اور نوجوانوں کو جوانی کے مراحل سے گزر کر زندگی کے آخری مراحل تک جن حالات سے اور جن راستوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ آپ بھی انہیں حالات سے گزرے ہیں۔لیکن اس کے باوجود اتنی عظیم عظیم خدمات کی انجام دہی کے اصل اسباب و وُجوہات کیا ہیں؟یہی تو ہیں کہ یہ سب کچھ اپنے اسلاف، اکابر اور بزرگان دین کے دامن وخیالات سے وابستگی کی وجہ سے ممکن ہوا۔اور اس وجہ سے کہ وہ سب کچھ دنیاوی لالچ سے بالاتر صرف اللہ کی رضامندی اور اسلام کی سربلندی کے لئے کرتے رہے۔اس سبب سے کہ نہ حُبِّ مال ان کا مطمع نظر رہا اور نہ ہی حُبِ جاہ کا شکار ہوئے۔کیونکہ اس کے تمام اُمور باہمی مشاورت سے طے ہوتے تھے اور ایک جماعتی نظم کے تحت انجام دہی کی کوشش کرتے تھے۔اور یہ سب کچھ اس مقصد کے پیش نظر کیا گیا کہ آپ کے فکر و عمل کو اس طرح نمایاں کیا

جائے۔کہ جس سے آپ کے نقش قدم پر چلنے والوں میں عزم، ہمت اور اشتیاق پیدا ہو اور اُن کی زندگی نیک مقاصد کے حصول میں بسر ہو۔

H.E.C پاکستان کے طریقہ کار کے مطابق مقالہ نگار کے اس مقالہ کو جناب ڈاکٹر حافظ عبدالغفار صاحب ڈائریکٹر جارجیا اسلامک سنٹر امریکہ، جناب پروفیسر انوار اللہ صاحب مشیر حکومت برونائی دارالسلام برائے مذہبی اُمور برونائی دارالسلام اور جناب پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز صاحب ڈائریکٹر انسٹیٹیوٹ آف عربک، اسلامک سٹڈیز اینڈ سیرت شیخ زید اسلامک سنٹر پشاور یونیورسٹی پشاور کے پاس (ایویلیوشن) کے لئے بھیجا گیا تھا۔تینوں سکالرز نے اس مقالہ کو Ph.D کی ڈگری کے اجراء کے لئے تحقیق کے مطلوبہ معیار کو پورا کرنے کی بنیاد پر اس کی سفارش کی تھی۔

Ph.D کے مقالہ کو کتابی صورت دینے کے لئے اس میں "باب پنجم" کا اضافہ کیا گیا ہے۔نیز "ذاتی اوصاف و کمالات" میں آپ کے بعض لطائف کو شامل کتاب کیا گیا ہے۔پاکستان کے "معاشی مسائل" کے آخر میں "مسئلہ احیاء اموات"، "مسئلہ مزارعت"، "انگریز کی عطاکردہ جاگیروں کو چھین کر بے زمینوں میں تقسیم کردینے کا مسئلہ" بھی اضافہ کئے ہیں۔

تحقیق کا کام ایسا ہے کہ نہ تو کوئی اس کو مکمل کر سکا ہے۔اور نہ ہی اپنے اپنے موضوع زیر بحث کو کوئی تکمیل تک پہنچا سکا ہے۔یہاں "کوتاہ دستی" کا اعتراف ہی کرنا پڑتا ہے۔اس لئے قارئین کرام سے یہ التجاء ہے کہ مطالعہ کے وقت اگر ان کو کسی کوتاہی، غفلت اور سہو قلم کے بارے میں آگاہی ہوجائے تو مقالہ نگار کو ضرور مطلع کردیں۔تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح کی کوشش کی جاسکے۔نیز اگر کسی کو حضرت مفتی صاحب کی حیات، خدمات کے سلسلے میں کوئی اہم واقعہ یاد ہو۔تو ضرور مطلع کریں تاکہ دوسری اشاعت میں اس کو شامل کیا جاسکے۔

الٰہی عاقبت محمود گرداں

مقدمہ

مفکّر اسلام، مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ کی دینی، علمی، سیاسی خدمات پر مولانا عبدالحکیم اکبری کو شعبہ عربی، علوم اسلامیہ و تحقیق گومل یونیورسٹی کے زیر اہتمام پی ایچ ڈی کی ڈگری کے اجراء کے لئے زبانی امتحان / پبلک ڈیفنس کے لئے سینٹ ہال گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان میں 2009-10-28 کو اجلاس منعقد ہوا۔ اجلاس کی صدارت وائس چانسلر جناب ڈاکٹر فرید خان نے کی جبکہ مہمان خصوصی قائد ملت اسلامیہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن تھے۔ جناب ڈاکٹر قبلہ ایاز صاحب چیئرمین / ڈائریکٹر انسٹیٹیوٹ آف عربی وعلوم اسلامیہ و سیرت شیخ زید اسلامک سنٹر پشاور یونیورسٹی، پشاور انٹرنل (داخلی) ممتحن تھے۔ کامیاب ڈیفنس کے بعد "مفکّر اسلام مولانا مفتی محمودؒ..... علم وامن کا نقیب" کے عنوان سے ایک سیمینار منعقد ہوا۔ سٹیج سیکرٹری کے فرائض مولانا عبدالحکیم اکبری نے ادا کئے۔ خطبہ استقبالیہ جناب ڈاکٹر محمد صدیق چیئرمین شعبہ عربی، علوم اسلامیہ و تحقیق گومل یونیورسٹی نے پڑھا۔ سیمینار سے مولانا فضل الرحمٰن صاحب کا خطاب نذر قارئین ہے۔ مولانا صاحب کی ہدایت کے مطابق آپ کی اس تقریر کو تحریر کی شکل میں لاکر ان کی نظر ثانی کے بعد زیر نظر کتاب کا مقدمہ بنایا گیا ہے۔ اس تناظر میں مولانا کی اس تقریر کو پڑھنے سے عنوان سے مناسبت واضح ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَ الصَّلٰوةُ وَ السَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَآءِ وَ الْمُرْسَلِیْنَ وَ عَلٰی اٰلِهٖ وَ صَحْبِهٖ وَ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمٍ عَظِیْمٍ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بسم اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ ٱلرُّسُلُ ۚ أَفَإِي۟ن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ ٱنقَلَبْتُمْ عَلَىٰٓ أَعْقَٰبِكُمْ ۚ وَمَن يَنقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَن يَضُرَّ ٱللَّهَ شَيْـًٔا ۗ وَسَيَجْزِى ٱللَّهُ ٱلشَّٰكِرِينَ ﴿١٤٤﴾﴾

عزّت مآب جناب پروفیسر ڈاکٹر فرید خان رئیس جامعہ، میرے نہایت قابل احترم پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز صاحب، برادر مکرم مولانا عبدالحکیم اکبری صاحب، تمام اساتذہ، گومل یونیورسٹی کی تمام علمی شخصیات اور اس سیمینار میں شامل میرے تمام بزرگ، میرے دوست، میرے بھائی!

اکابر علماء کا سلسلۃ الذہب جس کے ساتھ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہمیں نسبت عطا کی ہے یقیناً ہم اس کا شکر بجالانے سے قاصر ہیں۔ کم من نعمة انعمت بها علينا قل لك بها شكرنا کے الفاظ کے ساتھ اپنے رب کے سامنے اس تقصیر کا اعتراف کرتے ہیں لیکن جہاں آج دنیا میں ہمیں اس نسبت پر فخر ہے وہاں اخروی اعتبار سے وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِیْقًا کی تعبیر بننے کی امید بھی اپنے رب سے وابستہ کیے ہوئے ہیں۔

ایسے اکابر کو زندہ جاوید بنانے کا سب سے مؤثر ذریعہ ان کی زندگی کو ضبط تحریر میں لانا ہے تاکہ آنے والی نسلیں اپنے اکابرین کی زندگی کو سمجھ کر اسے مشعل راہ بنا سکیں۔

میرے قبلہ گاہ مفکّر اسلام حضرت مفتی اعظم نوّر اللہ مرقدہ کی زندگی اور آپ کی خدمات پر مولانا عبدالحکیم اکبری صاحب نے جو مقالہ (Ph.D) کا لکھا ہے اور جسے آج کی خصوصی تقریب میں شرف قبولیت اور منظوری سے نوازا گیا ہے۔ میں سب سے پہلے اس پر مقالہ نگار (عبدالحکیم اکبری) کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

برادرم مکرم کا قبلہ گاہ حضرت مفتی صاحبؒ نوراللہ مرقدہ کی "دینی، علمی اور سیاسی خدمات پر تحقیقی مقالہ" زیر مطالعہ رہا جو حق حضرت والد صاحب کا ہم سب پر تھا وہ اکبری صاحب نے تنہا ادا کر دیا۔ اپنے اکابر کو زندہ جاوید بنانے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ان کی زندگی کو ضبط تحریر میں لاکر شائع کر دیا جائے تاکہ آنے والی نسلیں اپنے اکابرین کی زندگی کو سمجھ کر اسے مشعل

راہ بنا سکیں۔ میں دل کی گہرائیوں سے برادرم مکرم جناب عبدالحکیم اکبری صاحب کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔

تمام نظام کا خالق اللہ ربّ العلمین ہے اور اس کے تکوینی نظام میں اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے کچھ تخلیقات اس کے خصوصی ذمہ داریوں کے ساتھ کرتا ہے عالم افلاک میں تمام ستارے اور سیارے اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں لیکن ان میں سورج کی اپنی خصوصیت ہے چاند کی اپنی خصوصیت ہے اور پھر ہم مختلف ستاروں سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں اسی طرح سفلیات میں بھی اور پھر انسانی جامعہ میں بھی، اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کو بعض ایسی خصوصیتوں کے ساتھ نوازتا ہے۔ جو اپنے ماحول میں اسے ممتاز بنا دیتا ہے۔ میں نے اس حوالہ سے یہاں بڑی علمی باتیں سنی ہیں۔ اس تقریب میں شرکت کو صرف اپنے لئے اعزاز ہی نہیں سمجھتا بلکہ مجھے اہل علم کی علمی خیالات سے استفادہ کرنے کا بھی موقع مل رہا ہے۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے میں بہت کچھ سیکھ رہا ہوں۔ جس پر ہمیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ آج کے اس ماحول میں بھی کام کے لوگ موجود ہیں جو روشنی پھیلا سکتے ہیں جو رہنمائی کر سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت ورہنمائی کے لئے دو ضرورتوں کو بہت ہی اہم قرار دیا ہے۔ ایک طرف اللہ تعالیٰ نے آسمانی صحائف اور کتابیں بھیجیں جس کا معنی یہ ہے انسان کو پیدا کر کے اسے اندھیروں کی طرف نہیں دھکیلا بلکہ اس کی رہنمائی کی اس کو روشنی عطا کی۔ اور مقصد زندگی عطا کیا۔ دنیا میں آپ آئے کیوں؟ دنیا میں آپ رہے کیوں؟ لیکن اس ایک ضرورت پر اکتفا نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی سوسائٹی میں اور انسانی اس جامعہ میں ایسی شخصیات بھی انسانیت کو عطا کیں۔ جو کہ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتابوں کے اندر موجود تمام مضامین کے وہ مرادات و مفاہیم انسانیت تک پہنچائیں جو اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ اگر یہ شخصیات نہ ہوں تو ہر انسان اس کتاب اور صحیفے کو خود پڑھے، اس کا مطالعہ کرے اور پھر جو کسی انسان کے دماغ میں اس کا مفہوم و مراد

آیا اسی کو وہ مقصد زندگی ٹھہرائے تو پھر وہ اس شخص کی ذاتی مفہوم و مراد ہو سکتی ہے ضروری نہیں کہ وہ مراد اللہ کی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے کتابیں بھی بھیجیں اور صحائف بھی بھیجے اور انبیاء کرام کی صورت میں وہ شخصیات بھی بھیجیں وہ نفوس قدسیہ وہ اہل صفا جو کہ اللہ تعالیٰ کی مرادات کو اور اس کی مفاہیم کو انسانیت تک پہنچائے۔ اور ہمارے پاس وہ سلسلہ موجود ہے۔ مجھے ایک ہندو نے کہا ایک سفر میں ہم جا رہے تھے کہ مولوی صاحب اسلام کیوں سچا ہے؟ اور ہندومت کیوں جھوٹا ہے؟ ایسا کیوں نہیں کہ ہندومت سچا ہے اور اسلام جھوٹا ہے (اس پر دو جملوں میں بات کروں گا) تو میں نے کہا آپ کو بھی اور مجھے بھی ایک چیز پر اتفاق ہے مجھے بھی سچ چاہیئے اور آپ کو بھی سچ چاہیئے۔ سچ کے طلب گار آپ بھی ہیں اور سچ کا طلب گار میں بھی ہوں آپ کے دل کا اندر بھی جھوٹ کو قبول نہیں کرتا اور میرے دل کا اندر بھی جھوٹ کو قبول نہیں کرتا۔ اس نے کہا کہ ہاں اس پر اتفاق ہے اب سچ تک رسائی کیسے کریں؟ سچ وہ ہے جو اللہ کی ذات ہے اس کے وجود میں کوئی شک نہیں نہ تو آپ اس کا انکار کرتے ہیں اور نہ میں اس کا انکار کرتا ہوں۔ کہا کہ بالکل ٹھیک ہے۔ تو میں نے کہا کہ جو اللہ کہے گا وہی سچ ہو گا۔ اس نے کہا کہ وہی سچ ہو گا۔ تو اللہ تعالیٰ تک سچ کی رسائی کا میرے پاس راستہ ہے۔ اور میں جو کچھ کہہ رہا ہوں پوری سند کے ساتھ ثابت کروں گا۔ کہ یہ اللہ کی طرف سے آیا ہے آپ کے پاس کون سا نظام ہے جس کی بنیاد پر آپ یہ دعویٰ کر سکیں کہ جو میں کہہ رہا ہوں اللہ کی طرف سے ہے۔ چپ سادھ کر گیا اور کہا کہ مولانا صاحب بات تو Debatable ہے۔

اور یاد رکھیں دین اسلام کی ایک خصوصیت ہے اور یہ خصوصیت کسی اور مذہب کو حاصل نہیں سوائے اسلام کے کہ ہم جس عقیدے اور دین و فکر کی بات کرتے ہیں اس کی ہمارے پاس سند موجود ہے۔

پورا سلسلۃ الذہب ہے۔ کتاب اللہ ہے تو رسول اللہ بھی ہے۔ منزل من اللہ ہے تو مبعوث من اللہ بھی ہے۔ جب یہ سلسلہ مکمل ہوا تو پھر آگے اب سلسلہ چلے گا۔

اللہ تعالیٰ نے آخری کتاب بھیجی کامل مکمل اور آخری شخصیت کامل مکمل اور حضور ﷺ سے بہتر کون قرآن کریم کے مفہوم و مراد کو انسانیت تک منتقل کر سکتا ہے؟ جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتھارٹی بنا کر پیش کیا گیا۔

وَمَا يَنطِقُ عَنِ ٱلْهَوَىٰٓ ﴿٣﴾ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ﴿٤﴾

اپنی خواہش سے وہ بولتے نہیں۔ ان کا ہر بول اللہ کی وحی ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کی کسی بھی لفظ، کسی بھی جملے، کسی بھی آیت کی وہ تشریح و توضیح کریں وہی اللہ کی مراد ہوگی وہی اللہ کا مقصود ہوگا۔

پھر حفاظت کی اللہ نے اس کی۔

لَا تُحَرِّكْ بِهِۦ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِۦٓ ﴿١٦﴾

ہم شاگرد، اُستاد سے پڑھتے ہیں تو زبان سے یاد کرتے ہیں۔ بار بار تکرار کرتے ہیں اس کے۔ پھر بھول چوک ہو جاتی ہے۔ پھر اُستاد ہمیں اس کی اصلاح کرتا ہے پھر ضروری نہیں کہ سارے کا سارا اُسی طرح یاد کر کے جائیں کہ جس طرح اُستاد پڑھا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اپنی زبان کو حرکت مت دینا۔ زبان بتقاضائے بشریت کسی لغزش کا شکار ہو سکے گی۔

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُۥ وَقُرْءَانَهُۥ ﴿١٧﴾

آپ کے سینے میں اس کو جمع کرنا اور پھر اس کی تلاوت زبان پر کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔

ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُۥ ﴿١٩﴾

جب آپ ان کی توضیح و تشریح کریں۔ اس کی حفاظت کے ہم ذمہ دار ہیں۔ ایک تحفظ عطا کیا۔ حضور ﷺ کو وہ جماعت ملی جس نے آپؐ کے ایک ایک لفظ کو اُمت تک منتقل کیا۔

و سیکون بعدی خلفاء فیکثرون۔

میرے نائبین آتے رہیں گے موقعہ بموقعہ۔ بڑی تعداد میں آتے رہیں گے۔ اس اُمت میں ہر زمانے میں ایسی شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں کہ جنہوں نے ان حالات کے اندر دین اسلام کو سہارا دیا ہے، اُمت کو سہارا دیا ہے۔ اس فکر و نظر کو سہارا دیا ہے۔ اس سچ کو سہارا دیا ہے۔ اس حق کو سہارا دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے خود اس کا انتظام کیا ہے۔ بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں کہ جو قدرت کی تکوین کا مظہر ہوا کرتی ہیں۔ اس حوالہ سے جب میں حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کی شخصیت پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے تھوڑا سا اس کے پس منظر میں جانا ہوتا ہے۔

ہمارا جو قبیلہ ہے صحرائی قسم کا ہے۔ کوئی تعلیم نہیں اور کوئی تربیت کا نظام نہیں۔ افغانستان میں سردی کا موسم آتا ہے، ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ تو دامانی علاقے میں اُتر آتے ہیں۔ گرمی کا موسم آتا ہے تو پھر واپس چلے جاتے ہیں۔ اور یہ ان کی زندگی ہے۔ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَ الصَّيْفِ آنا جانا۔ موسم کے مطابق زندگی گذارنے کا۔ ان کا کوئی گھر نہیں ہے کوئی جائیداد اور جاگیر نہیں ہے مال مویشی ان کی جاگیر ہے۔ اسی کے ساتھ آ رہے ہیں اور جا رہے ہیں۔ چھوٹا موٹا کاروبار کرتے ہیں۔ تجارت کرتے ہیں۔ ہماری جو خانقاہ اور اس کے جو جدّ امجد ہیں حضرت سیّد احمد گل رحمۃ اللہ علیہ جن کا خاندان آ رہا ہے اور جا رہا ہے۔ ہمارے اسی دامانی علاقے (ڈیرہ اسماعیل خان کے ضلع کا صحرائی علاقہ) سے گزرتا ہے، پنیالہ سے گزرتا ہے۔ پھر میانوالی کے ضلع عیسیٰ خیل کے پاس ظَرنا کے ایک گاؤں میں بسیرا کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد دوبارہ ایک دو مہینے سفر میں گزرتے ہیں۔ دو چار مہینے نہیں گزرتے ہیں کہ پھر واپس آتے ہیں۔ ایسی مؤثر شخصیت کہ جہاں سے گزرے عقیدت مندوں کا ایک جم گھٹا ہو گیا۔ مؤثر شخصیت تھی۔ اور پنیالہ کے رئیس تھے، رئیس

شہاب الدین خان، موجودہ خوانین کے جدِ امجد، ان کے مرید ہو گئے۔ اب ماحول بن رہا ہے کہ ایسی شخصیات کی شخصیت کی جو تعمیر ہوتی ہے۔ اور ان کا جو فکری پروان ہوتا ہے، کون سا ماحول ہے جو اس کا مددگار ثابت ہوا۔ اور جب وقت گزر جاتا ہے اور تاریخ کا حصہ بن جاتا ہے۔ تو سوچتا ہے آدمی۔ کہ قدرت کی تکوین کے تحت کچھ ہو رہا تھا۔ اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ ایک ماحول بنا رہا تھا۔ رئیس شہاب الدین بہت بڑے زمیندار تھے۔ مرید ہونے کے بعد ان سے درخواست کرتے ہیں کہ لوگ آپ سے فائدہ اٹھاتے ہیں، فیض یاب ہوتے ہیں، آپ یہیں پر مقیم ہو جایئے۔ اور اُن کی درخواست پر وہاں مقیم ہو جاتے ہیں۔ اُن کو جاگیر عطا کرتے ہیں۔ پنیالہ کی وہ زمین جہاں خانقاہ (یٰسین زئی) آباد ہے وہ خوانین کی دی ہوئی ہے۔ حضرت یہاں آباد ہو جاتے ہیں۔ عطیہ کی ہوئی زمین ابھی شائد اس نسل کے نوجوانوں نے اس کے انتقالات کئے ہوں گے۔

میرے دادا (خلیفہ محمد صدیق) جو ابھی سنِ بلوغ کو بھی نہیں پہنچے وہ اپنے قبیلے کے ساتھ جانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ کہ میں تو حضرت کے قدموں میں رہوں گا۔ اور میں نے قبیلے کے ساتھ نہیں جانا۔ لاتعلق ہو جاتے ہیں پورے قبیلے کے ساتھ۔ اور تنہا اس عمر میں کہ ابھی جوانی کے حدود میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہیں ٹھہر جاتے ہیں۔ اور زندگی ان کے حوالے کر جاتے ہیں۔ اور پھر تمام نان نفقہ، ان کی تربیت ان کی تعلیم یہاں تک کہ ان کی شادیاں کراتے ہیں۔ (دو شادیاں ان کی ہوئی تھیں جس طرح کہ مقالہ نگار نے ان کا ذکر کیا ہے) ان سمیت وہیں پر رہے۔ انہی کی تعلیم میں رہے۔ صاحبزادہ محمود صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ شاید آپ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ تمہارا باپ (مولانا مفتی محمودؒ) بہت بڑا عالم ہے اور تمہیں کچھ پتہ نہیں کہ تمہارے دادا (خلیفہ محمد صدیق صاحبؒ) کیا تھے؟ میں نے کہا نہیں انہوں نے کہا کہ تمہارے دادا اس سے بڑھ کر عالم تھے۔ لیکن صرف اتنی بات تھی کہ وہ شہرت نہیں پا سکے۔ وہ یہیں پر رہ پائے اور مفتی

صاحب درس و تدریس کے لئے باہر چلے گئے۔ اللہ نے ان کو مواقع دیئے، آگے بڑھے وہ۔ اور دُنیا نے اُن کو پہچانا۔

اس ماحول میں حضرت مفتی صاحب کی ولادت ہوئی اور جو مفتی صاحب کے ہم عمر تھے کہتے تھے کہ مفتی صاحب پڑھتے تو نہیں تھے کھیل کود میں زیادہ مصروف ہوتے تھے۔ لیکن جب بڑے ان کو ڈانٹتے تھے کہ پڑھتے کیوں نہ ہو؟ تو کہتے کہ مجھے سن لو نا۔ مجھے یاد ہے ایسا بلا کا حافظہ اللہ نے ان کو عطا کیا تھا کہ اُستاد کی بات سنی اور پھر اس کے بعد بھولی نہیں۔ ایک دفعہ میں نے ان سے (کبھی کبھی ماحول بن جاتا تھا تو ہم بھی جرأت کر لیتے تھے کوئی بات پوچھنے کی) تو فرماتے تھے کہ ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے دو کام بڑے اہتمام کے ساتھ کئے ہیں ایک یہ کہ میں نے سبق کی غیر حاضری نہیں کی۔ دوسرا یہ کہ میں نے پورے سبق کو پورے غور سے سنا اور وہیں بیٹھ کر سمجھا ہے بعد میں نہیں پوچھتا رہا ہوں کسی سے کہ فلاں جگہ کیسے ہے؟ مجھے سمجھ نہیں آئی۔

ایک دفعہ فرمانے لگے کہ میں اگلے دن کے سبق کے لئے زیادہ مطالعہ نہیں کرتا تھا۔ تو میں نے کہا کہ کیوں آپ مطالعہ نہیں کرتے تھے لوگ بھی کہتے ہیں کہ آپ زیادہ پڑھتے نہیں تھے۔ فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ تھی کہ جس دن میں مطالعہ کر کے کلاس میں جاتا تھا تو جو استاد کی بحث ہوتی تھی وہ میرے مطالعہ سے کم ہوتی تھی اور میں یوں سوچتا تھا کہ میں زیادہ جانتا ہوں استاد کی نسبت۔ تو میں نے سوچا کہ اگر کلاس میں میرا تصور یہ ہو کہ میں استاد سے بہتر جانتا ہوں تو یہ میری تباہی کا باعث بن جائے گا۔ اس لئے میں مطالعہ نہیں کرتا تھا۔ کہ کلاس میں استاد کا علم مجھ سے فائق مجھے نظر آئے اور میں سمجھوں کہ میں نے جو سمجھا ہے استاد سے سمجھا ہے یہ کیفیت ہوتی تھی۔

مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ مفتی صاحب اپنی باتیں نہیں کرتے تھے لیکن چونکہ ہم اس ماحول میں پلے بڑھے ہیں بعض دفعہ ماحول بن جاتا تھا۔ جہاں وہ بہت عجیب عجیب باتیں کرتے تھے۔ فرمانے لگے کہ (عربی) ادب کی کتاب (دیوان) متنبی بہت مشکل کتاب ہے کہ وہ میں نے

روٹی کے لئے لی تھی کہ مدرسہ میں کھانا ملتا تھا چار کتابوں سے اور میرا مقصود تھا تین کتابیں پڑھنا۔ تو ایک کتاب میں نے متنبی کی اس لئے لی کہ کم از کم روٹی تو ملتی رہے۔ پڑھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس کو۔ اب امتحان کا دن آگیا۔ جب امتحان قریب آگیا تو میں نے سوچا کہ تین میں تو میرے نمبر بہت اچھے ہوں گے اس میں (دیوان متنبی) تو میں فیل ہو جاؤں گا۔ ایک ہفتہ باقی تھا اس میں۔ میں نے کچھ شروحات ادھر ادھر سے اکٹھی کیں اور میں بیٹھا اول سے لے کر جہاں تک میں نے پڑھا تھا ہفتہ کے اندر میں نے حل کر دیا سارا۔ اور پھر جب اس کا امتحان میں نے دیا تو فرماتے ہیں کہ کل نمبر تو پچاس ہوتے تھے اور مجھے ممتحن نے باون نمبر دیئے کہ حد سے زیادہ بہتر آپ نے حل کر دیا ہے۔ پھر فرمایا کہ منطق کی کتاب ہے حمد اللہ۔ ملا حمد اللہ کی منطق کی کتاب ہے۔ امتحان گاہ میں جب بیٹھا تو تین سوالات ہوتے تھے۔ سوالات میں نے پڑھے اور میں کھڑا ہو گیا۔ ممتحن سے میں نے گذارش کی کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں آپ سے۔ آئے اور اس نے کہا کیا بات ہے؟ میں نے کہا کہ یہ تینوں سوال جو آپ کے آئے ہیں اس کا متن بھی اس کی شرح بھی، اس کا حاشیہ بھی مجھے لفظ بہ لفظ یاد ہے۔ تو آپ کو گواہ بنانا چاہتا ہوں کہ میں نقل نہیں مار رہا ہوں۔ یہ مجھے یاد ہیں۔ تو فرمایا کہ نہیں اپنی عبارت میں ردّ وبدل کے ساتھ حل کرو۔ فرمایا کہ میں نے عربی میں لکھا اور اپنی عبارت میں لکھا، کل نمبر 50 ہوتے تھے، مجھے اس کے 55 نمبر دیئے گئے۔ اس پر اعتراض ہوا کہ اضافی نمبر اتنے زیادہ کیوں دیئے گئے۔ اساتذہ کی مجلس علمی بلائی گئی۔ وہ میرا پرچہ نکالا گیا۔ میرے اُستاد ممتحن جو تھے اس نے کہا کہ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس کو ڈبل نمبر دوں 100۔ لیکن آپ لوگ قبول نہ کرتے۔ جو تین سوالات ہیں ملا حمد اللہ نے نے ان تین سوالوں کو اپنی کتاب میں اس طرح حل نہیں کیا ہے۔ جس طرح کہ اس طالب علم نے کیا ہے۔ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اس کی عبارت اس سے بہتر ہے، یہ منطق میں اس کی حالت تھی۔

فقہ کی بات کی گئی تھی۔ مفتی انور شاہ صاحب بتا رہے تھے۔ کہ فتویٰ آیا بڑا اہم فتویٰ تھا۔ کراچی سے لے کر لاہور پشاور تک جید علماء کرام کے اس پر دستخط تھے۔ پڑھا اور اس کو رکھ دیا۔ دستخط نہیں کئے۔ میں نے کہا جی اس پر دستخط کر لیں۔ دستخط کی روایت یہ ہوتی ہے کہ "الجواب صحیح" لکھ کر دستخط کئے جاتے ہیں۔ میں نے کہا اس پر اتنے بڑے لوگوں کے دستخط ہیں۔ حوالہ جات اس میں دیئے گئے ہیں تو مفتی صاحب نے خاموشی سے رکھ دیا دستخط نہیں کئے۔ میں نے پھر گذارش کی کہ اس پر دستخط کر لیں۔ خاموش ہو گئے۔ تیسری دفعہ پھر میں نے عرض کیا۔ کہ حضرت کیا کرنا ہے اس کا۔ فرمایا یہ صحیح نہیں ہے۔ بڑی بات تھی اتنے بڑے علماء، تمام جامعات کے اکابرین کے دستخط ہیں۔ ملک کی نامور شخصیات تھیں اس میں۔ اتنے بڑے علماء نے اس کی تائید کی ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ نہیں مسئلہ اس طرح نہیں۔

پھر کیسے کہتے ہیں آپ کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ اس کا جو جواب دیا وہ بڑا عجیب ہے۔ فرمایا کہ میری طبیعت سلیم ہے۔ اور یہ شریعت ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ شریعت ہو اور طبیعت سلیم قبول نہ کرے اس کو۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ مجھے اپنی طبیعت پر پوری آگاہی ہے۔ میری طبیعت سلیم ہے اور طبیعت سلیم شریعت کو قبول کرتی ہے۔ اس کا اباء نہیں کرتی۔ اس لئے مجھے تردّد ہے اور میری یہ رائے ہے اور اس پر آپ حوالہ جات ڈھونڈیں۔ کہا کہ امتحان میں مبتلا کر دیا ہمیں۔ اب ہم دار المطالعہ میں گئے۔ کتابیں لے رہے ہیں کہاں سے نکال رہے ہیں، کہاں سے نکال رہے ہیں۔ آدھی رات کو جا کر ہم نے مفتی صاحب کی تائید میں حوالے تلاش کر لئے۔ اور صبح ہم نے پیش کر دیئے۔ اور انہوں نے کہا کہ میں نہیں کہہ رہا تھا کہ اس طرح نہیں۔ پھر کیوں لکھا انہوں نے۔ کہا کہ اکابر ہیں ایک دوسرے پر اعتماد کی حد تک۔ ایک نے تحقیق کی دوسرے نے کہا کہ ٹھیک ہے آپ کی بات۔ یعنی جو آپ نے لکھا تو اس میں کیا کلام کر سکتا ہوں۔ لیکن مجھے تردّد ہوا اس میں۔

(مقالہ نگار (عبدالحکیم اکبری) نے مولانا مفتی محمد انور شاہ صاحب سے پوچھا کہ وہ فتویٰ کس صورت میں طلب کیا گیا تھا تو مفتی صاحب نے بتایا کہ یہ رہن کے مسئلہ میں "تقادم بالزمان" سے متعلق تھا۔ دیگر مفتیوں نے مطلق جواب دیا تھا۔ جبکہ مفتی صاحب کا جواب قاضی کی قضا کے ساتھ مشروط تھا)

حدیث کی بات آئی میں نے ایک دفعہ ان سے عرض کیا کہ جی! آپ کی جو ترمذی شریف کی تقریر ہے دورۂ حدیث میں ہمارے زیر مطالعہ رہی ہے۔ ایک اور شیخ الحدیث کی ترمذی کی تقریر ہے وہ اُردو میں ہے وہ بھی ہمارے زیر مطالعہ ہے۔ آپ دونوں کی جو ترتیب ہے مباحث کی، وہ یکساں ہے تو اتنے دُور دُور مختلف جامعات کے دو شیخ الحدیث۔ ان کے مباحث کی ترتیب ایک جیسے کیسی ہوگئی۔ فرمایا انہوں نے مجھ سے کاپیاں مانگی تھیں اور میری تقریرات وہ لے گئے تھے اور میری تقریرات سے انہوں نے ترمذی کا درس شروع کیا۔ اس لئے اس کی اور میری تقریر آپ کو برابر لگ رہی ہے۔ اور پھر فرمایا کہ مباحث حدیث کی جو میری قائم کی گئیں ترتیبات ہیں میں چیلنج کرتا ہوں۔ کسی اُستاد حدیث نے اس ترتیب کے ساتھ جو ترتیب بحث میں نے تیار کی ہے شاید اس کا ابھی تک مجھے کوئی بدیل نہیں ملا ہے۔

یہاں میں آپ کو ایک عجیب بات بتاؤں۔ افواہ اُڑ گئی ہندوستان میں وہابی فرقے کی۔ اور فتویٰ بازیاں شروع ہوگئیں اس کے اوپر۔ ہماری خانقاہ تک بھی یہ باتیں آئیں اور یہ غوغا پہنچا۔ ہمارے حضرات نے مشورہ طے کیا کہ جید علماء کرام کو بھیجیں دیوبند میں۔ اور وہاں جاکر وہ وہاں پر دیکھیں ساری صورت حال کو اور پھر وہ آئیں ہمیں رپورٹ کریں اور بیان کریں کہ کیا صورت حال ہے؟ اس طرح اندھیرپن میں کس طرح ہم فتویٰ جاری کریں۔ ان جید علماء میں مولانا غلام رسول صاحب (حضرت مفتی صاحبؒ کے اُستاد) بھی تھے۔ کہ جید علماء کرام دو تین حضرات گئے، دو تین مہینے وہاں گزار آئے۔ اُن علماء کرام کے دروس میں انہوں نے شرکت کی۔ واپس آئے تو فرمایا کہ

ان سے بڑھ کر علماء پورے ہندوستان میں نہیں۔ ان سے بڑھ کر متبعین سنت پورے ہندوستان میں نہیں۔ جب یہ رپورٹ آئی، علماء کرام کی رپورٹ، جنہوں نے وہاں پر دو تین مہینے گزارے تو پھر فیصلہ ہوا کہ پھر تعلیم کے لئے اپنے بچوں کو وہاں بھیجا جائے۔ حضرت مفتی صاحب اور ہمارے صاحبزادگان حضرات جتنے بھی تھے۔ ان کو دیوبند، مراد آباد اور پھر ہمارے حضرات منطق وفلسفہ کے بڑے شوقین تھے۔ اور مدرسہ شاہی مراد آباد میں ذرا منطق کی کتابیں اور فنون بہت اچھی طرح پڑھائے جاتے تھے۔ مولانا عجب نور صاحب اور مولانا عبدالغفور جیسے اساتذۂ کرام یہیں موجود تھے۔ تو یہ حضرات مراد آباد چلے گئے۔ اب یہاں پر ایک عجیب صورت ہے وہ خانقاہ جو پنیالہ کے خوانین کی اعانت ورغبت سے وجود میں آیا، جنہوں نے رشتہ بھی دیا۔ اس سے رشتہ بھی ہوگیا۔ پیر مرید بھی تھے۔ اور پیر کے گھرانے میں سوچ کی تبدیلی کو دیکھیں کہ اُن کا رُخ کدھر ہوتا ہے اور انہی دنوں میں رئیس شہاب الدین خان کے صاحبزادے تھے مہربان خان پنیالہ کے رئیس تھے ان کو انگریز کی طرف سے خان بہادر کا خطاب ملا۔ اب دھارے تبدیل ہوگئے۔ پنیالہ کے خوانین کو انگریز نے خان بہادر کا خطاب عطا کیا۔ اور یہ خاندان اور اس کی نئی نسل جو ہے یہ تعلیم وتربیت کے لئے دوسری رُخ پہ چلے گئے۔ اور پھر اُس ماحول کے اندر جب مفتی صاحب واپس آئے تو انہوں نے انگریز کے خلاف تحریک میں حصہ لیا۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی لیا۔ اور وہاں ہندوستان میں بھی لیا۔ جب میں مراد آباد گیا تو ائیرپورٹ پر بڑا استقبال ہوا، اس میں ایک ہندو تھا۔ اب وہ ہندو مجھے کہتا ہے کہ میرے بیٹے! میرے بیٹے! میں حیران ہوا کہ ہندو مجھے بیٹا کہہ رہا ہے خیر ہے۔ اس نے کہا میں آپ کے ابا کے ساتھ جیل میں تھا۔ ہم اکٹھے جیل میں تھے تحریک آزادی میں۔ ظاہر ہے مفتی صاحب اور وہ برابر ہوگئے ہوں گے۔ مراد آباد کے لوگ تھے۔ اور اس ہندو نے کہا کہ میں نے جیل میں حسین احمد مدنی سے قرآن پڑھا ہے۔ تو اس سوچ کا آدمی تھا وہ۔ اور اسی عقیدت سے مجھ

سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ اس کی ایک تاریخ تھی۔ یہ نظریاتی اور فکری رویّے تبدیل ہوگئے۔ ایک خاندان ایک سمت چلا گیا دوسرا خاندان دوسری سمت چلا گیا۔

اب خانقاہی نظام ہے سادات یٰسین زئی ہیں ان کا ماحول ہے اس ماحول کے اندر ایک نوجوان محمد صدیق اپنے قبیلے کو چھوڑ کر آجاتا ہے۔ اپنی زندگی کو ان بزرگوں کے حوالہ کرتا ہے۔ وہ یہیں پر تعلیم بھی حاصل کرتا ہے اور یہیں پر شادی بھی کرتا ہے۔ یہیں پر اس کی اولاد بھی ہوتی اور اس کے اندر ایک محمود نامی مفتی محمود بن کر ایک فکری جدوجہد میں آگے بڑھتا ہے۔ کہ انگریز کے خلاف جدوجہد اور پاکستان بننے کے بعد جمعیۃ علماء اسلام کی تشکیل نو اور اس رُخ پر اپنی ایک جدوجہد کو تسلسل و دَوام دیتا ہے۔ تو یہ جو ماحول بنا ہے۔ اس کو آپ کہہ سکتے ہیں کہ قدرت اور اس کی تکوین نے ایک شخص کو اس مٹی سے اُٹھایا اور اس کے لئے پیشگی ایک ماحول تیار کیا گیا۔ اور پھر وہ ستارہ پوری دنیا میں چمکا۔ اس نے ایک رول ادا کیا۔ اور آج آپ جو ایک فکری اور نظریاتی پلیٹ فارم جمیعۃ علماء کا دیکھ رہے ہیں یا دینی مدارس کے نظم کے حوالہ آپ دیکھ رہے ہیں اس میں ایک شخص کو ایک کلیدی مقام حاصل ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا مخالفین بھی فراخدلی سے اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ کہ جو فکری انقلاب آیا ہے یہ وہ ایک فکری فلسفہ تھا اور آج بھی استعمار مخالفت ہمارے لئے زینت ہے۔ اور وہ فکری جہت تبدیل نہیں ہوئی۔ لیکن جیسا کہ مقالہ نگار (عبدالحکیم اکبری) نے بھی اپنے مقالہ میں اس جہت کا تعین کیا ہے اور اس سیمینار کا عنوان بھی آپ لوگوں نے بنایا ہے۔ علم اور امن، لیکن علم اور امن سے پہلے دو چیزوں کا ایک اور التزام۔ کہ اگر ایک ہے اور دوسرا نہیں تو نامکمل ہے۔ وہ ہے علم اور تربیت۔ رسول اللہ ﷺ کبھی فرماتے ہیں ﴿إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا﴾ اور کبھی فرماتے ہیں ﴿بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ﴾ اخلاق کیا ہے؟ اس کی ہم کیا تعریف کریں۔ اخلاق کس کو کہتے ہیں؟ علم تو یہی ہے جو ہمیں کتابوں میں ملتا ہے جو قرآن کریم کی صورت میں ہمارے پاس ہے یا جو احادیث رسول اللہ کی صورت میں

ہمارے پاس ہے۔ علماء کی کتابوں میں ہمیں ملتا ہے اس کو تو ہم علم کہتے ہیں لیکن اخلاق کیا چیز ہے؟ علماء کرام نے اخلاق کی اور خلق کی جو تعریف کی ہے کہ انسان کے اندر کی وہ قوت جو کہ آپ کو برانگیختہ کرے۔ علم پر عمل کے لئے اگر آپ میں وہ قوت ہے یعنی علم کے ساتھ تربیت بھی ہے، اخلاق بھی ہیں آپ کو پتہ ہے نماز فرض ہے۔ اَذان ہوگئی آپ میں وہ قوت متحرک نہیں ہو رہی کہ آپ اُٹھیں اور غسل خانہ میں جائیں وضو کریں اور مسجد میں چلیں اور نماز پڑھیں۔ رمضان کا مہینہ آیا آپ کو علم ہے کہ روزہ فرض ہے۔ آپ کا ایمان ہے اس بات پر کہ روزہ فرض ہے لیکن سحری ہے افطار ہے صبح سے شام سے گزرتی ہے اور اندر وہ قوت بیدار نہیں ہوتی جو آپ کو مجبور کرے کہ سحری سے لے کر مغرب تک کوئی کھانا پینا نہیں۔ تو اس کا معنی علم ہے۔ اخلاق (تربیت) نہیں۔

اب وہ چیز ہم نے اپنی تعلیمی اداروں میں دیکھنی ہے ہم بڑے بڑے جامعات بنا رہے ہیں۔ بڑے بڑے ادارے قائم کر رہے ہیں علمی لحاظ سے۔ اور ہمیں یہاں اس بات کو دیکھنا چاہیئے، ہم جو دینی مدرسوں میں پڑھتے ہیں ہمارے دینی مدارس میں جب لفظ "علم" سامنے آئے گا تو "علم" کتاب اللہ اور حدیث رسول اللہ ہوگا اور اس کے علاوہ جتنے علوم ہیں ان کو فن سے تعبیر کرتے ہیں۔ علم و فن سائنس اینڈ ٹیکنالوجی۔ تو جو علم ہے وہ مخدوم ہے۔ جو فن ہے وہ خادم ہے اب دُنیا کہاں چلی گئی یعنی جو علم ہے اس کا کوئی کردار نہیں جو فن ہے اور خادم ہے اس نے سب کچھ پر قبضہ کر لیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب علماء ہوں گے اور علماء کے لئے ایک تربیت گاہ نہیں ہوگی کہ جہاں وہ اس علم کا عملی مظاہر کرسکیں تو پھر یہی آپ کہیں گے کہ یہ مولویوں کا طبقہ دقیانوسی طبقہ۔ پتہ نہیں کتنے سالوں کا پرانا طبقہ۔ بابا آپ نے ان کے لئے کام کرنے اور تربیت کے تمام دروازے بند کردیئے ہیں۔ آپ کی مملکتی نظام میں ان کے رول کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے تو پھر ان کا کردار صرف سوسائٹی کی تربیت اور محدود پیمانے پر کوئی کردار ادا کرنے کا رہ جاتا ہے آپ نے ان کو غار

کہف کی طرف دھکیل دیا ہے۔ مدرسوں کے احاطوں میں بند ہو گئے۔ ان کی صلاحیتیں وہاں بند ہو گئیں۔ اس علم کو اگر ہم مملکتی نظام میں تحفظ فراہم کریں اور اس علم کے حاملین کو ہم وہ تربیت دیں کہ جس سے وہ مملکت کی خدمت کر سکیں۔ اگر اس مدرسہ (کالجز، یونیورسٹیز) کا پڑھا اگر ملک کے مختلف شعبوں میں جانے کی صلاحیت رکھتا ہے تو اس مدرسہ (دینی مدرسہ) کا طالب علم وہاں جانے کی صلاحیت کیوں نہیں رکھتا ہم نے وہ مواقع ختم کر دیئے ہیں۔ اور جدید اور قدیم علوم، عصری اور قدیم علوم کا امتیاز دنیا کے سامنے رکھ رہے ہیں۔ یہ بات سامنے رکھنی چاہیئے کہ دنیا میں جتنے علوم ہیں چاہے آپ یورپ میں چلے جائیں جہاں بھی چلے جائیں جدیدیت کا کوئی انکار نہیں۔

جدید تحقیق، جدید انکشاف، جدید ٹیکنالوجی یہ تو وقت کے کارنامے ہیں اور آج کا انسان، آج کا سائنس فخر کرتا ہے۔ لیکن کبھی وہ قدیم علوم کو نہ فرسودہ کہتا ہے اور نہ اس کو ناقابل اعتناء سمجھتا ہے اس کی طرف رجوع کرتا ہے وہاں سے اصول لیتا ہے۔ اور اس اصول کو لے کر پھر نئی تحقیق کی طرف آگے بڑھتا ہے جن کے پاس کوئی سند نہیں وہ لوگ قدیم علوم سے بے نیاز نہیں رہ سکتے اور جدید اور جدیدیت کے لئے بھی ان کو وہاں سے رہنمائی لینی پڑتی ہے لیکن ہم مسلمان ہیں قرآن و حدیث کے حوالہ سے یہی بات کرتے ہیں کہ ہم چودہ سو سال پیچھے چلیں جائیں۔ چودہ سو سال پیچھے نہیں جانا ہے چودہ سو سال پہلے کی کتاب آپ کو آگے بڑھنے کے لئے کہہ رہی ہے۔

دیکھو! ایک اصول سمجھیں ذرا۔ اسلام میں ارتداد قابل قبول نہیں۔ ناقابل معافی ہے ارتداد کی سزا قتل ہے۔ اب ارتداد کس چیز کا نام ہے؟ ارتداد، ردّ الی الخلف کا نام ہے۔ کافر ہونے کا نام نہیں۔ خالی ردّ الی الخلف۔ پیچھے کی طرف جانا۔ جس کو آج کے زمانے میں ہم رجعت پسندی کہتے ہیں۔ پیچھے کی طرف جانا آپ اسلام تک پہنچے اور پھر پیچھے کی طرف گئے۔ اس فلسفہ کو آپ سمجھیں کہ اسلام اس کی انتہائی سزا دے رہا ہے۔ ناقابل قبول ہے کہ اس ریاست کو آپ تسلیم کریں اور پھر اس کی بغاوت کر دیں۔ تو ترقی کی اتنی بڑی قدر و منزلت ہے اسلام میں۔

کہ اس ترقی یافتہ اور آخری دین کو قبول کرنے کے بعد پھر پیچھے کی طرف مُڑنے کی اجازت نہیں دے رہا۔ اس فلسفہ کو سمجھا جائے۔ اس اصول کو سمجھا جائے۔ پھر ہر حوالہ سے اس سے رہنمائی لی جائے۔ اصولوں سے رہنمائی لی جاتی ہے جزئیات کی جانب۔ اس حوالہ سے ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اسلام کیا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ پوری انسانیت کا کمال اعتدال میں ہے۔ انسانیت کا کمال یعنی اس کی مکمل شکل وہ اعتدال میں ہے۔ اعتدال نیچے کی طرف ہو تو بھی مکمل نہیں انسان۔ اعتدال سے تجاوز ہو جائے تو بھی مکمل نہیں انسان۔ اور جناب رسول اللہ ﷺ اس جامعہ انسانی میں اعتدال کی کسوٹی پر اُترنے والے شاید اس کے مقابلہ کا کوئی انسان ہو۔ بشریت کے مقام اعتدال پر سب سے بلند مقام یہی ہے جو اعتدال کا ہے۔ محبت میں، غضب میں، دوستی میں، دشمنی میں، پیسے کمانے میں، پیسہ خرچ کرنے میں۔ ہر لحاظ سے عبادات میں اعتدال۔

ایک صحابی تھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سنا ہے آپ روزانہ روزہ رکھتے ہیں؟ کہتا ہے کہ ہاں۔ کہا کہ نہ کرو۔ مہینے میں تین روزے رکھو۔ اس نے کہا کہ میں رکھ سکتا ہوں۔ چلو اس طرح کرو کہ ایک دن رکھو اور ایک دن مت رکھو۔ صوم داؤدی رکھو۔ بالآخر مان تو گئے لیکن انہوں نے کہا کہ میں کر سکتا ہوں۔ جب بڑھاپے میں پہنچے تو کہنے لگے کاش کہ میں حضور ﷺ کی بات مان لیتا۔ اتنی نقاہت اور بڑھاپے کا غلبہ نہ ہوتا آج۔ اگر میں اس وقت ان کی بات مان لیتا۔

عبادات کے میدان میں آئے۔ نماز کے بارے میں اللہ فرماتے ہیں۔ ﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ﴿١١٠﴾﴾ زیادہ اونچا بھی نہیں زیادہ آہستہ بھی نہیں درمیان میں۔

معیشت کے حوالہ سے ﴿مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ﴾ جس نے آمد و خرچ میں اعتدال و توازن برقرار رکھا اس کا کبھی دیوالیہ نہیں ہوا۔ اعتدال سے باہر نکلتی ہے بات تو۔ آپ گھر بیٹھے

رہیں اور کہیں کہ متوکل آدمی ہوں۔ اللہ تعالیٰ خود روزی دے گا۔ وہ خوار ہو جاتا ہے۔ آپ محنت کرتے ہیں اور ناجائز ذرائع سے کماتے ہیں وہ بھی خوار اور برباد ہو جاتا ہے۔ جائز حدود کے اندر، کسب کے ساتھ محنت کرنا اور اعتدال کے ساتھ پوری زندگی گزارنا یہ کمال انسانیت ہے۔ اس سے انسانیت مکمل ہو جاتی ہے۔ اور جب اس سے ہٹتا ہے تو یہ انسان کی نامکمل ہونے کی دلیل ہے۔ اس لئے جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَٰكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا۟ شُهَدَآءَ عَلَى ٱلنَّاسِ﴾ کہ ہم نے تمہیں ایک میانہ رَو اُمت پیدا کیا ہے۔ اور اُمت ظاہر ہے کہ زندگی کے روش، طور طریقوں اور تہذیب وتمدّن کے حوالہ سے معتدل کہلائے گی۔ لیکن یہ اعتدال کس نے پیدا کیا اس کے اندر۔ اس علم نے جو اس کو حوالہ کیا گیا۔ کیونکہ تربیت ہمیشہ علم کی روشنی میں ہوتی ہے۔ چنانچہ اس دین کو قبول کر کے جو اس کا علم حاصل کرے تو اس کے مطابق زندگی گزارنے میں اعتدال آئے گا۔

حضرت مفتی صاحب نے اسلام کی اس طبیعت، اس مزاج اور اس جبلّت کو سمجھا بالکل اسی طرح جس طرح ان کے اکابر نے سمجھا بالکل اسی طرح جس طرح اس کے اعتدال کو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے سمجھا۔ اس کی پیروی کرتے ہوئے چلے۔ اس چیز کو اگر ہم سمجھیں تو پھر ہم اسلام کی اُس مزاج اور اُس جبلّت کو اپنا سکتے ہیں جس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری دین لے کر آئے۔ یہ وہ چیز تھی کہ جس کی طرف ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں جانا چاہیئے۔

آپ نے وزیرستان کی بات کی قبائلی لوگوں کی بات۔ ۱۹۷۷ء کی تحریک میں حضرت مفتی صاحب بھی سُہالہ میں تھے نظر بند تھے۔ میرے پاس ایک وفد آیا وزیرستان سے کہ مفتی صاحب ہم قبائل کو تحریک میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دے رہے تو آپ جائیں اُن کو ہمارے بارے میں پیغام پہنچائیں کہ ہم تیار ہیں تحریک میں شامل ہونے کے لئے آپ ہمیں اجازت دیں۔

جب میں نے مفتی صاحب سے اس کا ذکر کیا تو فرمایا کہ یہ قبائلی علاقہ ہے ان کے ہاتھ میں بندوق ہے اگر میں ان کو تحریک میں آنے کے لئے کہوں گا تو پھر وہ بندوق استعمال کریں گے۔ اور بندوق تحریک میں شدت پیدا کرتی ہے اُن کو مت آنے دیں۔ یہ اُن کا فلسفہ تھا۔ مفتی صاحب ۱۹۶۸ء، ۱۹۶۹ء یا ۱۹۷۰ء کے عرصہ میں وزیرستان گئے۔ یہ وزیرستان پہلے بھی مسلح علاقہ تھا یہاں جہادی لوگ تھے، فقیر اپی کا گھرانہ بھی جہادی لوگ، خیسور کے حضرات بھی جہادی اور مسلح لوگ تھے۔

مفتی صاحب کے بار بار رابطے سے وہاں جانے کے بعد یہ لوگ جمعیۃ علماء کی طرف آئے اور پھر مسلح جدوجہد سے مفتی صاحب نے ان کو سیاسی عمل کی طرف اُن کا رُخ موڑ دیا۔ کیا وجہ ہے دس سال ہو گئے میرے اُوپر پابندی ہے کہ کہ آپ قبائلی علاقہ میں نہ جائیں تاکہ قبائل دُنیا کے سیاسی عمل سے وابستگی کی بجائے اُن کے جو مذہبی رجحانات ہیں اُن میں تشدّد پروان چڑھے اور پھر اُس سے دنیا مقاصد حاصل کرے۔ اس چیز کو بھی سمجھنا چاہیئے۔ جب سیاسی جدوجہد وہاں نہیں ہوئی۔ زرداری صاحب نے اعلان بھی کر دیا کہ ہم، جو پولیٹکل پارٹیز ایکٹ ہے اس کو Extant کریں گے۔ قبائلی علاقہ جات تک، نہیں کر سکے۔ نہیں کر پارہے ابھی تک۔ کچھ قوتیں ہیں جو رُکاوٹ ہیں۔ کوئی سیاسی پارٹی مخالف نہیں۔ اگر میں قبائلی علاقہ جات میں سیاست کر سکتا ہوں تو دوسری پارٹیوں پر میں کیوں قدغن لگاؤں اور قوم کی اپنی مذہبی رجحانات ہیں، اپنی مذہبی رجحانات کی پیروی کرنا چاہتے ہیں تو کون روک سکتا ہے؟

ایک دفعہ ہمارے سیاسی بزرگوں، رہنماؤں کا ایک اجلاس تھا، ہر قسم کے فکر کے لوگ اس میں بیٹھے ہیں ہمارے ایک قوم پرست، سیکولر مزاج کے ہمارے دوست، ہمارے محترم کہنے لگے کہ سٹیٹ میں مذہب کا رول نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ جو مذہب ہے اس نے سارا معاملہ خراب کیا ہوا ہے۔ شیعہ سُنّی، دیوبندی بریلوی، کافر کافر، ایک دوسرے پر فتویٰ۔ یہ سارے رُجحانات مذہب کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ تو میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ دُنیا میں اختلاف ہوتے

ہیں۔ اختلاف تو ناگزیر چیز ہے انسانی معاشرہ میں ہو گی ہر قیمت پر ہو گی کسی بھی لحاظ سے ہو اختلاف تو ہو گا دُنیا میں۔ لیکن اختلاف میں نفرت اور تعصّب نہیں ہونا چاہیئے تا کہ دعوت کا ماحول زندہ رہے۔ جب نفرت اور تعصّب اختلاف میں حائل ہو جائے تو پھر آپ کے دعوت کے راستے رُک جاتے ہیں۔ اسلام دعوت کے راستے کبھی نہیں روکتا اس لئے تعصبات نہیں ہونے چاہئیں۔ برداشت ہو، ایک دوسرے کے ساتھ مکالمہ ہو۔ دلائل کا تبادلہ ہو۔ اب اس حوالہ سے مذہبی اختلاف تو مٹ بھی سکتا ہے ایک آدمی کافر ہے مسلمان ہو گیا اختلاف مٹ گیا۔ شیعہ ہے سُنّی ہو گیا اختلاف مٹ گیا۔ سُنّی ہے شیعہ ہو گیا اختلاف مٹ گیا تو ختم بھی ہو سکتا ہے۔ نسلی اختلاف ختم بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی آدمی پشتون ہے تو وہ پشتون ہے اور ہر وقت پشتون ہے اگر وہ چاہے میں پنجابی ہو جاؤں تو خود بخود پنجابی نہیں ہوتا اور جو آدمی پنجابی ہے تو پنجابی ہی ہے پشتون نہیں ہو سکتا۔ عربی ہے تو وہ بس عربی ہے اب وہ پشتون نہیں ہو سکتا پشتون ہے تو وہ عربی نہیں ہو سکتا۔ نسلی اختلافات تو ختم بھی نہیں ہو سکتے لیکن پاکستان میں مذہب کے حوالہ سے قیادت بھی موجود ہے اور قومیتوں کے حوالہ سے بھی قیادت موجود ہے۔ مجھے مذہبی حوالہ سے ایک شخصیت بتا دیں سیاسی قیادت کی جس نے فرقہ وارانہ تعصّبات میں کردار ادا کیا ہو۔ تمام پارٹیاں آپ کے سامنے ہیں۔ یہ جمعیۃ علماء ہے جمعیۃ علماء پاکستان، جمعیۃ اہل حدیث ہے سب موجود ہیں۔ اور دستور ساز اسمبلی کی قراردادِ مقاصد سے لے کر ۱۹۷۳ء کا آئین اور ایم۔ ایم۔ اے تک تمام مراحل مذہب کے حوالہ سے سیاسی قیادت کرنے والی مذہبی قائدین کا فرقہ وارانہ تعصبات اور نفرتوں میں کوئی رول نہیں۔ ہاں سوسائٹی میں یہ عناصر موجود ہیں کبھی اسٹیبلشمنٹ فائدہ اٹھاتی ہے۔ کبھی کسی حکومت کی ضرورت ہوتی ہے کہ آپس میں لڑ جائیں تو وہ قوتیں ایسے حالات پیدا کرتی ہیں۔ لیکن اس کی اپنی جو باقاعدہ قیادت ہے جس کا مسلسل ایک کردار ہے۔ اس نے کبھی بھی فرقہ وارانہ تعصبات کو ہوا نہیں دی اور آپ حضرات کی قیادت، قومیتوں کے نعروں کی علمبردار سیاسی قیادت ہیں ملک کے

اندر قومیتوں کے اندر نفرت آپ پیدا نہیں کرتے آپ کی سیاست اسی سے نہیں چمکتی۔ آپ کا سیاسی مہم بھی نہیں اس کے علاوہ کچھ ہے آپ کے پاس۔ پشتون کے حق پر قربانی دیں گے اور پنجابیوں کو کہیں گے کہ وہ ظالم ہیں پشتون مظلوم ہیں، مظلوم قومیتیں، محروم قومیتیں۔ یہ اصطلاحات میری ہیں یا آپ کی ہیں۔ کہنے لگے کہ مولانا صاحب بہت زیادتی کی آپ نے، ہم اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ تو یہ چیزیں مدنظر رہنی چاہئیں کہ پاکستان کی مذہبی سیاسی قیادت نے فرقہ واریت کو ہوا دینے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ سیاسی اختلاف ہوتے ہیں۔ سیاسی پارٹیاں، حالات ہوتے ہیں اکٹھے ہوتی ہیں کبھی نہیں ہوتیں۔ وہ ضرورتوں کے مطابق ہوتی ہیں۔ ہر پارٹی کی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں۔ ان ترجیحات پر وہ کام کر رہے ہوتے ہیں۔ اختلاف رائے ہوتا ہے، تنقید و جرح بھی ہوتی رہتی ہے لیکن اس میں فرقہ وارانہ تعصّب کا کوئی کردار نہیں ہوتا اور میں اگر ایک حنفی ہوں تو میں حنفیت کو فرقہ تو نہیں کہتا۔ ﴿اِخْتِلَافُ اُمَّتِي رَحْمَةٌ﴾ کے زُمرہ میں لاتا ہوں اُسے۔ کہ سب کا احترام کرو اور تابعداری ابو حنیفہؒ کی کرو۔ حضرت مفتی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں حنفی ہوں لیکن محض عقیدت کی بنیاد پر حنفی نہیں ہوں۔ میں قوت دلیل کی بنیاد پر حنفی ہوں اور جب حدیث کی درس میں جاتے تھے تو وہاں تقابل مذاہب تو ہوتا ہے اور پھر وہاں جب اُن کی قوت نکھرتی تھی اس حوالہ سے۔ مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے طلبہ بیٹھتے تو اپنے مسلک کے حوالہ سے تیاری کر کے آتے تھے۔ اور پھر وہ مفتی صاحب پر سوالات کرتے تھے اور طلبہ کہتے تھے کہ اب درس میں مزہ آ رہا ہے کہ مفتی صاحب پر کوئی تنقید کرنے والا موجود ہو مفتی صاحب اتنے تحمل کے ساتھ دلائل پر دلائل دیتے ہیں تو اس کے دلائل سنتے ہیں اپنے دلائل دے رہے ہوتے ہیں اور ہمیں اس سے علمی فائدہ ہوتا ہے۔ اس اختلاف کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ علمی فائدہ ہوتا ہے۔ ہمارے جتنے ائمہ گزرے ہیں ان کے اختلافات آج ہمارے دارالمطالعوں اور ہماری علمی کتابوں کے ذخیرہ کا حصّہ ہیں اور اُمت اس فائدہ اٹھاتی ہے۔ یہ علمی چیزیں یہ وہ چیز ہے

جس کو ان شخصیات نے قوم کی طرف منتقل کیا ہے۔ اور دُنیا ہمیں اعتدال میں رہنے نہیں دیتی، طعنہ دیتی ہے کہ بھائی اس کو ہماری کمزوری سمجھتے ہیں۔ لیکن ہم کوشش کر رہے ہیں کہ سیاست ہو، مذہب ہو، مسلکی ماحول ہو۔ مدارس کا ماحول ہو اس میں اعتدال کا ہونا ضروری ہے۔

اسلام پر جو سب سے بڑے اعتراضات ہیں کیا ہیں؟ اسلامی سزائیں، حدود۔ اب مفتی صاحب کو ہم نے سنا کہ جب ایک مقرر تقریر کرتا تھا اور کہتا تھا کہ اسلام آئے گا تو پھر دیکھیں گے آپ، چور کے ہاتھ کٹیں گے۔ زانی کو سنگسار کیا جائے گا۔ اور اس قسم کی باتیں۔ مفتی صاحبؒ نے اس کو روکا کہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ یہ اسلام کی تصویر ہے جو آپ پیش کر رہے ہو۔ سزا جو ہیں یہ مذہب نہیں ہوتا۔ جس طرح آپ سکول میں پڑھتے ہیں مدرسہ میں پڑھتے ہیں یا آپ یونیورسٹیوں میں پڑھا رہے ہیں۔ آپ نصاب بھی پڑھاتے ہیں لیکن طالب علم کی تعلیمی زندگی میں نظم وضبط پیدا کرنے کے لئے آپ نے کچھ سزاؤں کا تعین بھی کیا ہے۔ کلاس میں نہیں آئے گا حاضری نہیں کرے گا۔ سبق یاد نہیں کرے گا۔ گھر کا کام نہیں کرے گا۔ سٹڈی نہیں کرے گا رات کو۔ تو آپ کبھی اس کو Fine (جرمانہ) کرتے ہیں۔ کبھی پھر اس کے داخلہ کو معطل کر دیتے ہیں۔ کلاس سے نکال دیتے ہیں۔ کسی زمانے میں تو ڈنڈے بھی لگایا کرتے تھے۔ ہمارے ہاتھوں نے بہت ڈنڈے کھائے ہیں۔ تو کیا ہم نے آج تک مدارس کے اندر طالب علم کی زندگی میں نظم پیدا کرنے کے لئے سزاؤں کو نصاب تعلیم کا حصہ کہا ہے؟ کیا ہم نے کبھی اس کو نصاب تعلیم کہا ہے؟ جب ہمارے اداروں میں تعلیمی نصاب اور چیز کا نام ہے اور سزائیں اس سے بالکل مختلف چیز کا نام ہے تو پھر نظام اسلام میں ہم سزا کو نظام کا حصہ کیوں قرار دیں۔

ہاں نظام میں نظم پیدا کرنا اس کی تطبیق کی شکل پیدا کرنا اس کے لئے دو چار سزائیں اللہ تعالیٰ نے براہ راست بھیجی ہیں باقی آپ پر چھوڑی ہیں۔ کہ اس کے لئے اپنا کوئی نظام بنائیں اور جب اسلام سزا کی بات کرتا ہے تو کیا دُنیا نہیں کرتی۔ کیا یورپ اور امریکہ میں سزائیں نہیں ہیں؟

لیکن سزاؤں کے جو اثرات ہیں۔ یورپ میں جائیں جرائم کی شرح دیکھ لیں جہاں اسلامی دُنیا میں سزائیں ہیں وہاں دیکھ لیں۔ ایک ڈاکٹر آئے تھے، ڈاکٹر دوالیبی غالباً انہوں نے مفتی صاحب سے کہا کہ مفتی صاحب سنگسار کرنا اس زمانے کے کام ہیں؟ وحشی قسم کی سزا ہے کوئی جدید دور کی سزا ہو۔ مفتی صاحب نے کہا کہ جدید دور کی سزائیں کیا ہو سکیں گی؟ یا پھر کیا امکانات ہیں اس کے۔ مطلب یہ ہے کہ قتل کرنا سزا ہے لیکن قتل سنگساری سے نہ کیا جائے تو پھر اور کیا صورتیں ہوں گی۔ تلوار سے، بندوق کی گولی سے مارنا، بجلی کا کرنٹ دے کر مار دو، تلوار سے اس کی گردن مار کر ماردو۔ بندوق کی گولی سے اس کو ماردو۔ اس نے کہا کہ ہاں یہ بات ٹھیک ہے۔ تو مفتی صاحب نے کہ آپ کو پتہ ہے کہ اسلام اپنی سزاؤں میں، سزاؤں کو نافذ کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ سزاؤں کو نافذ نہ کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اور پھر مفتی صاحب نے رجم کی سزا کے حوالہ وہ واقعہ بیان کیا۔ کہ حضور ﷺ کے زمانے میں ایک شخص خود آیا۔ کہ یا رسول اللہ! میں نے زنا کیا ہے۔ طَهِّرْنِي مجھے پاک کرو۔ اب زنا کی سزا کا اس کو علم تھا۔ لیکن "پاک کرو" کا مطلب یہ کہ مجھے دُنیا میں اس کی سزا چکا دو۔ آخرت میں مَیں یہ نہیں بھگت سکتا۔ اس کا ایسا ایمان تھا کہ جیسے آخرت اور دوزخ اس کے سامنے ہیں۔ حضور ﷺ نے یہ تو نہیں فرمایا کہ آجاؤ ہاتھ لگ گئے۔ مزہ آجائے گا۔ آج ہم اسلام کی ایک سزا نافذ کریں گے۔ بلکہ یہ فرمایا کہ ایسے ہی عورت کو ہاتھ لگا دیا اور کہہ دیا کہ میں نے زنا کیا۔ صرف جسم اس کے ساتھ لگ گیا ہو گا۔ شاید بوسہ لے لیا ہو گا۔ لیکن اس نے کہا۔ کہ نہیں میں نے اس اجنبی عورت کے ساتھ وہ کام حرام طریقے سے کیا ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ حلال طریقے سے کرتا ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا أبك جنون؟ کیا تم پاگل ہو؟ عرض کیا نہیں میں ہوش میں بات کر رہا ہوں۔ پھر آپؐ نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ اس کا مُنہ سونگھ لو کہیں شراب تو نہیں پیا ہوا ہے۔ اس کا مُنہ سونگھا گیا۔ عرض کیا شراب کی بُو نہیں ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا بس پھر تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے نافذ ہو گا۔ چنانچہ اسے سنگسار کیا گیا۔ لیکن دوران

سنگساری درد برداشت نہ کرسکا اور بھاگ گیا۔ اور لوگوں کے حلقہ سے نکل گیا۔ تو حلقہ سے باہر ایک شخص نے اونٹ کا پڑا ہوا جبڑا اُٹھایا اور اُسے دے مارا۔ جس سے وہ ڈھیر ہو گیا۔ جب حضور ﷺ کو علم ہوا تو آپؐ ناراض ہو گئے اور فرمایا کہ جب وہ حلقہ توڑ کر بھاگ گیا۔ تو پھر اس کا اور اللہ کا معاملہ تھا، تم نے پیچھا کیوں کیا۔ اور آپؐ نے اس کی تعریف کی کہ ﴿انه تَابَ تَوْبَةً لَوْ قُسِّمَ عَلٰى اَهلِ الْمَدِيْنَةِ لَوَسِعَتْهَا﴾ علماء ناراضگی کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ بھاگنا درحقیقت علامت تھا۔ اپنی گواہی سے رجوع کرنے کا۔ اور رُجوع سے معاملہ مشکوک ہو جاتا ہے تو حد ساقط ہو جاتی ہے۔

دوالیبی صاحب سے مفتی صاحب نے رجم کی یہ حکمت بیان کی کہ اس صورت میں بچنے کا امکان ہے اور "جدید طریقوں" سے ان کے بچنے کا امکان نہیں۔

اور اس قسم کے، جو آپ نے عائلی قوانین کی بات کی ہے۔ (عبدالحکیم اکبری نے اس سے قبل اپنی تقریر میں حضرت مفتی صاحب کی عائلی قوانین کے خلاف ان کی مساعی کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مفتی صاحب کا ۱۹۶۲ء کی قومی اسمبلی میں حضرت مفتی صاحب کا عائلی قوانین کی مخالفت میں فقہی دلائل کا ذکر کر کے مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے استفسار کیا تھا۔ کہ کیا بات ہے کہ پاکستان کے ہر آئین میں عائلی قوانین کو تحفظ حاصل ہوتا ہے) اس میں شک نہیں کہ مفتی صاحب کی تقریر کا آج تک کوئی جواب نہ ہو سکا، جن دلائل کے ساتھ جس میں نقلی دلائل بھی ہیں اور عقلی دلائل بھی۔ قرآن سے بھی ہیں حدیث سے بھی ہیں اور پانچوں فقہوں سے اور پھر اس پر عقلی دلائل دیئے۔

لیکن ایک بات ذہن میں رکھیں کہ آپ کے ملک میں جو قانون سازی یا جن اداروں کی تشکیل یا جو تحریکات بین الاقوامی ایجنڈے کا حصہ ہوں۔ اس کا تسلسل کبھی نہیں ٹوٹے گا۔ تحریک نسواں، تحریک حقوق نسواں۔ یہ چونکہ مغرب کا ایجنڈا ہے۔ لہٰذا اس کو بڑھاتے چلے جائیں گے۔ اور آپ ہزار اپنے دلائل مارتے رہیں گے کہ یہ نہیں ہے شریعت کا فیصلہ، یہ اسلامی ملک ہے۔

لیکن آپ اس تحریک سے پیچھے نہیں آسکتے۔ ہسپتال میں آپ ایک شعبہ بند کر دیں اور ایک کھول دیں۔ لیکن ہسپتال سے باہر جو خاندانی منصوبہ بندی کا جو نظام ہے ذرا اُس پر کنٹرول کر کے تو دکھاؤ۔ یہ بین الاقوامی ایجنڈا ہے۔ لہٰذا بعض چیزیں ہمارے ملک کے اندر بین الاقوامی ایجنڈے کے تحت چلتی ہیں اور ہر ملک اور اس دور کی اسٹیبلشمنٹ اس کے تسلسل کو زندہ رکھتی ہے۔ دینی مدارس کا خاتمہ اب بین الاقوامی ایجنڈا بن گیا ہے کہ علوم دینیّہ کے اس تصور سے نکلو۔ اور یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ کثیر المقاصد ہے۔ یہ صرف دہشت گردی کا خاتمہ نہیں ہے۔ دہشت گردی ایک لفظ ہے جس کو ہر ایک پر حاوی کر رہے ہیں۔ لہٰذا دہشت گردی، دہشت گرد بھی مجرم اور ایسے ادارے جہاں سے دہشت گرد نکل سکتے ہیں ان کے منابع بھی ان پر بند کر دو اور دینی مدارس کو ان کے منابع سمجھتے ہیں۔ اور پھر آپ کے ایٹمی پروگرام تک رسائی بھی۔ یہ دہشتگرد، مذہبی انتہاپسند پہنچ جائیں گے خدانخواستہ۔ آپ ہزار کہیں کہ ہمارا ایٹمی پروگرام محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ کوئی مذہبی قوت وہاں پہنچنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ لیکن امریکہ اس جنگ کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ تاکہ اس وقت تک برقرار رکھے کہ جب آپ کہہ دیں کہ ہاں اب میرے بس میں نہیں ہے۔ یہ آپ اپنی کنٹرول میں لے لیں۔ تو یہ کثیر المقاصد جنگ ہے۔ خطہ کے مفادات پر قبضہ، مذہبی طرز معاشرت، مذہبی علم، اس علم کے ادارے، آپ کی دفاعی قوت اس پر اپنا کنٹرول۔ آپ کی اقتصادی معاشی قوت پر کنٹرول۔ یہ بین الاقوامی ایجنڈا ہے۔ آپ کا اقتصاد آئی ایم ایف سے وابستہ ہے آپ کا اقتصاد ورلڈ بینک سے وابستہ ہے آپ کا اقتصاد ایشین بینک سے وابستہ ہے اور یہ عالمی ادارے ہیں۔ اور ترقی پذیر اور پسماندہ ملکوں کو ان عالمی اداروں سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ جبری طور پر۔ ان کی خواہش ہو یا نہ ہو۔ بین الاقوامی معاہدات ہیں این پی ٹی، سی ٹی بی ٹی ہے اور پتہ نہیں کیا کیا معاہدات ہیں بین الاقوامی۔ اس میں جکڑ رکھا ہے آپ کو۔ امریکہ خود دستخط نہیں کرے گا آپ سے کہے گا کہ دستخط کرو۔ اس بین الاقوامی استعمار کے خلاف ہمارے اکابر نے تحریک چلائی

اور اس بین الاقوامی استعمار کو بالآخر ملک سے نکالا۔ لیکن صرف یہ کہنا کہ ہماری تحریکات کے نتیجے میں نکل گیا کچھ بین الاقوامی ماحول بھی بنانا پڑتا ہے۔ تاریخی لحاظ سے اچھا یا برا اپنی جگہ۔ لیکن ہماری تحریکات اپنی جگہ پر ایک اس کا تسلسل ہے البتہ ہٹلر کے ضرب نے جب انگریز کی کمر توڑ دی تھی۔ اور اس کے بعد وہ اس قابل نہیں رہا تھا کہ اپنے انگلینڈ کو بچا سکے۔ ہٹلر لندن کے دروازے پر پہنچ گیا تھا۔ وہ ماحول بھی بنا اس کے لئے۔

امریکہ نے جو اَب پالیسی اختیار کی ہوئی ہے میں اس پر پریشان نہیں ہوں۔ کیوں؟ اس نے اپنی قوم اور حکومت کو اور اپنی افواج کو ایسی جگہ اُتارا ہے کہ اب عراق میں ہاتھ اُٹھا چکا ہے کہ میں جنگ ہار چکا ہوں۔ افغانستان میں کہہ چکا ہے کہ میں شکست کھا چکا ہوں۔ اور یہی صورت حال اس کو اقتصادی طور پر تباہ کر رہی ہے۔ پتہ نہیں کہ کتنے بینک ہیں امریکہ کے جو بند ہو گئے ہیں۔ اقتصادی انحطاط کا شکار ہو رہے ہیں۔ ان شآء اللہ وہ ماحول آرہا ہے کہ جس ماحول میں اس کی کمر خود ٹوٹے گی۔ اور اس کی غلط پالیسیوں کے نتیجے میں ٹوٹے گی۔

لیکن ہمیں اپنی اس جدوجہد، اپنے اسلاف کے اس سلسلے کو زندہ رکھنا ہے اور ایسی شخصیات کو نابغہ رُوزگار شخصیات کو زندۂ جاوید بنانے کا احسن طریقہ یہی ہے کہ جیسا مولانا اکبری صاحب نے کتاب کی صورت میں اس کو منضبط کر دیا ہے اور اپنی نسلوں کے لئے اس کو محفوظ کر دیا ہے۔ اور اگلی نسل اس پر کام کرے گی۔ اور ان شآء اللہ اس پر مزید اضافے ہوں گے۔ اور جو کچھ لکھا گیا ہے میں سمجھتا ہوں بہت ہی اعلیٰ ترین محنت ہے لیکن کچھ حصے ایسے ہیں۔ میں نے اکبری صاحب سے کہا ہے کہ اس پر میرا اور آپ کا مذاکرہ ہو تا کہ اگر کوئی کمزوری کہیں پر ہے تو اس کا بھی ازالہ ہو سکے۔ اصلاح کی کوشش جو ہے یہ بھی ایک اچھی خصلت ہے اور یہ اچھائی اگر اس میں پائی جاتی ہے تو یہ اور زیادہ حقدار بنا دیتا ہے ان کو۔ اجازت چاہوں گا آپ حضرات سے شکریہ کے ساتھ۔

وَ اٰخِرُ دَعوَانَآ اَنِ الحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العٰلَمِینَ

باب اوّل

حالاتِ زندگی

خاندان وسلسلہ نسب

آپ کے خاندان کا تعلق افغانوں کے مشہور قبیلہ ناصر سے ہے۔ یہ قبیلہ خانہ بدوش تھا جو سردیوں کے آغاز میں سرحد وپنجاب کا رخ کرتا اور تقریباً چھ مہینے محنت مزدوری کرتا۔ اور گرمیوں کے آغاز پر افغانستان اور دیگر دوسرے مقامات پر چلا جاتا اور چار مہینے وہاں خیمہ زن رہتا۔ اور دو مہینے آمد ورفت میں لگ جاتے۔(۱) آج کل اس قبیلے کے اکثر خاندان بلوچستان کے ضلع لورالائی، ژوب وغیرہ میں مستقل آباد ہو چکے ہیں۔ اور بعض نے افغانستان کو اپنا مستقر بنا لیا ہے۔ بہت کم خاندان ایسے ہیں جو اب بھی خانہ بدوش کی حیثیت سے زندگی گزار رہے ہیں۔

اپنے خاندان کے بارے میں مفتی صاحب نے ماہنامہ "تبصرہ" لاہور کے ایڈیٹر مشہور احراری رہنما، نامور شاعر، آٹھ جلدوں پر مشتمل "تاریخ احرار" کتاب کے مصنف جو بعد میں جمعیۃ علماء اسلام کے مرکزی رہنماؤں میں شمار کئے جاتے تھے کے استفسار پر بتایا کہ "میں افغان قوم کے قبیلہ ناصر کی مشہور شاخ یحییٰ خیل میں عَلَم خاندان سے متعلق ہوں"۔(۲)

آپ چھٹی پشت میں عَلَم سے ملتے ہیں۔ شجرۂ نسب یوں ہے۔

محمود بن محمد صدیق بن محمد دراز بن گلستان بن عمر بن محمد بن موسیٰ بن عَلَم۔

خانقاہ یٰسین زئی

افغانستان میں آباد سادات کا ایک خانہ بدوش قبیلہ "یٰسین زئی" کے نام سے شہرت رکھتا ہے۔ اسی خاندان کے دو افراد حضرت سیّد غلام حیدر صاحب اور سیّد مہتر موسیٰ صاحب (وفات ۱۴ ربیع الاول ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۶۹ء) سلسلہ نقشبندیہ کے مشہور بزرگ حضرت شیخ المشائخ دوست محمد قندھاری کے خلفاء میں سے تھے۔ یہ دونوں آپس میں ماموں بھانجے تھے۔ سیّد غلام حیدر

صاحب کا جلد انتقال ہو گیا تھا۔ جبکہ سیّد مہتر موسیٰ صاحب نے ذکر واذکار اور لطائف کے اسباق کا سلسلہ چلایا ان کے مریدین ومتوسلین کی کافی تعداد افغانستان وہندوستان میں موجود تھی۔ سردیوں میں وہ عیسیٰ خیل ضلع میانوالی اور پنیالہ ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے قریب خیمہ زن ہوتے اور گرمیوں میں افغانستان تشریف لے جاتے۔ ان کے انتقال کے بعد تصوف کا یہ سلسلہ ان کے صاحبزادے حضرت سیّد احمد گل صاحب (ولادت ۶ محرم ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۵۳ء) نے آگے بڑھایا۔ وہ مرجع خلائق تھے۔ دُور دُور سے لوگ اصلاح کی نیت سے ان کی طرف رجوع کرتے۔ ان کی خانقاہ ہر وقت ذکر ومراقبات کے حلقوں سے آباد رہتی تھی۔ ان کے مریدین میں سے خلیفہ محمد صدیق بھی تھے۔ جو کہ علوم ظاہریہ وباطنیہ کے حصول کے لئے اپنے خاندان اور عزیز واقارب سے ترک تعلق کر کے حضرت سیّد احمد گل صاحب کے قافلے کا ایک مستقل فرد بن گئے تھے۔(۳)

ایک مرتبہ سادات کے اس خاندان نے گرمیوں کے آغاز پر پنیالہ سے کوچ کرنے کی تیاری کا فیصلہ کیا تو حضرت سیّد احمد گل صاحب سخت علیل ہو گئے۔ مرض اور نقاہت میں دن بدن اضافہ ہوتا دیکھ کر پنیالہ کے ایک مشہور زمیندار شہاب الدین خان نے حضرت کو یہاں مستقل رہائش اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ اور اس کے لئے انہوں نے پنیالہ سے شمال میں تقریباً ۴ فرلانگ کے فاصلہ پر خانقاہ، مسجد اور مکانات کی تعمیر کے لئے زمین بھی وقف کر دی۔(۴) حضرت نے یہ مشورہ مان لیا۔ اور یہیں مستقل رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد اسی بیماری میں حضرت سیّد احمد گل صاحب انتقال فرما گئے۔ اور وہیں دفن ہوئے۔

حضرت کے کل آٹھ صاحبزادے تھے۔ (ان میں) چار بیٹوں حضرت عبدالحلیم صاحب، دین محمد، نور محمد اور شاہ عبدالعزیز نے والد صاحب کے ساتھ یہیں مستقل رہائش اختیار کی اور چار بیٹے افغانستان چلے گئے حسب معمول آتے جاتے رہے۔ بالآخر

انہوں نے قندھار میں (قندھار سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر "جوئے لاہور") کو اپنا مستقر بنایا اور مستقل طور پر وہاں رہنے لگے۔(۵)

حضرت سیّد عبدالحلیم شاہ صاحبؒ اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ سے منسوب نقشبندیہ سلسلے کے دونوں شاخوں بنوریہ اور معصومیہ میں اپنے شیوخ سے مجاز تھے۔ مقالہ نگار نے لکھا ہے۔

> حضرت عبدالحلیم صاحب سب سے بڑے تھے۔ عالم باعمل اور باصفا بزرگ تھے۔ نقشبندیہ سلسلہ کے بنوریہ شاخ کے اسباق کی تکمیل اپنے والد بزرگوار سے کرچکے تھے۔ ان کی وفات کے بعد رامپور تشریف لے گئے۔ حافظ عنایت اللہ رامپوریؒ سے بیعت ہوئے۔ سلسلہ معصومیہ کی تکمیل ان سے کی۔ اور انہوں نے عبدالحلیم صاحب کو مجاز فرمایا۔(۶)

اللہ تعالیٰ نے حضرت سیّد عبدالحلیم شاہ صاحبؒ سے اصلاح خلق کا بہت کام لیا ہے لوگوں کے اصلاح عقائد اور تزکیۂ نفوس کی وجہ سے آپ کے متوسلین کا حلقہ اور خدمات کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔ آپ کے خلفاء میں حضرت خلیفہ سیّد علی شاہ صاحبؒ، کٹہ خیل۔ حضرت فقیر احمد گل، پہاڑ پور۔ حضرت سیّد عبدالعزیز شاہ صاحبؒ (آپ کے چھوٹے بھائی) مفتی محمود کے والد بزرگوار خلیفہ محمد صدیق اور حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ (واں بھچراں ضلع میانوالی) ملا صاحب جان سلیمان خیل کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔ حضرت سیّد عبدالحلیم صاحبؒ کا جمادی الاخری ۱۳۵۴ھ (مطابق ستمبر ۱۹۳۵ء) میں انتقال ہو گیا۔

حضرت سیّد عبدالحلیم صاحب کے چار بیٹے حضرت سیّد احمد صاحب، سیّد محمد صاحب، سیّد حامد صاحب اور سیّد محمود صاحب ہوئے۔ اپنے والد بزرگوار کی وفات کے وقت چونکہ چاروں بھائی کم سن تھے اس لئے ان سے اپنے والد سے فیض حاصل کرنے کا موقع نہ مل سکا بعد میں یہ چاروں اپنے چچا حضرت سیّد عبدالعزیز شاہ سے بیعت ہوئے اور مجاز ہوئے۔ مؤخر الذکر تینوں دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل تھے۔ سلسلہ فیض سیّد احمد صاحبؒ سے زیادہ پھیلا۔ مولانا فضل

الرحمٰن انہی سے بیعت ہوئے تھے۔ سلسلہ بنوریہ کے اسباق کی تکمیل بھی ان سے کر چکے ہیں۔ چاروں بھائیوں کی اولاد علماء ہیں۔ اور اپنی بساط بھر دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ سیّد احمد صاحب کے اکلوتے صاحبزادے مولانا محمد محسن شاہ پاکستان بھر میں مشہور مدرسہ جامعہ حلیمیہ دڑہ پیزو کے مہتمم ہیں۔ جہاں ہزاروں طلبہ زیر تعلیم رہتے ہیں۔

حضرت سیّد عبدالعزیز شاہ صاحب نابینا ہونے کے باوجود حافظ القرآن اور بہت بڑے عالم دین تھے اور باقاعدہ طلباء کو پڑھاتے تھے۔ مفتی صاحب بھی ان کے شاگردوں میں سے تھے۔ غالباً ۱۹۲۵ء میں خانقاہ یٰسین زئی سے آپ ابا خیل تحصیل لکی مروت ضلع بنوں منتقل ہو گئے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں حضرت مفتی صاحبؒ کے گھر عبدل خیل میں مہمان کی حیثیت سے ٹھہرے ہوئے تھے کہ پیغام اجل آ پہنچا۔ خانقاہ کے قبرستان میں مدفون ہوئے رحمہ اللہ۔(۷) آپ کی وفات کے وقت مفتی صاحب ملتان میں تھے۔ سیّد عبدالعزیز شاہ صاحبؒ کے تمام صاحبزادے بڑے بڑے علماء ہوئے۔ صاحبزادہ یار محمد صاحب مراد آباد میں اپنے بھائیوں اور مفتی صاحب کے ساتھ زیر تعلیم تھے۔ نوجوانی میں انتقال فرما گئے ہیں۔ صاحبزادہ جان محمد صاحب مراد آباد میں زیر تعلیم رہے۔ دارالعلوم دیوبند سے دورۂ حدیث کیا۔ متعدد مدارس میں مدرّس اور شیخ الحدیث رہے۔ جنوری ۱۹۸۰ء میں انتقال فرما گئے ہیں۔ مقالہ نگار کے استاد و مرشد تھے۔ صاحبزادہ عبدالرحیم صاحب بہت بڑے عالم تھے۔ نہایت متورّع تھے۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ صاحبزادہ عبدالرحمٰن صاحب متعدد مدارس میں شیخ الحدیث رہے ہیں۔ 27/ رمضان المبارک بروز جمعہ ان کا انتقال ہوا۔ صاحبزادہ عبداللطیف صاحب عالم دین تھے۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ اور سب سے چھوٹے صاحبزادے حضرت مولانا عبدالکریم شاہ صاحب آج کل دارالعلوم فیصل آباد میں شیخ الحدیث ہیں۔

ان حضرات کی اولاد بھی علماء ہیں اور درس واصلاح کا سلسلہ جاری کئے ہوئے ہیں۔

والد ماجد خلیفہ محمد صدیق صاحبؒ

اپنے والد بزرگوار کے بارے میں مفتی صاحب نے فرمایا ہے۔

میرے والد مرحوم کا اسم گرامی مولانا خلیفہ محمد صدیق ہے۔ آپ عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ طریقت کے سلاسل اربعہ میں خلیفہ مجاز تھے۔ ذکر و تلقین بطریقہ نقشبندیہ مجدّدیہ فرمایا کرتے تھے۔ والد صاحب موصوف افغانستان سے یہاں ضلع ڈیرہ اسماعیل خان میں پنیالہ کے مقام پر آکر مستقل سکونت اختیار کر گئے تھے۔(۸)

مفتی صاحب کے حالات میں مقالہ نگار نے لکھا ہے۔

خلیفہ محمد صدیق نے شرح جامی، رسائل منطق، علم فقہ اور علم قراءت اپنے پیر و مرشد حضرت احمد گلؒ سے پڑھے تھے۔ مجاہدہ وریاضت اور ذکر واذکار کی طرف بہت راغب رہتے تھے۔ حضرت کی طرف سے اجازت بھی ملی تھی۔ حضرت کی وفات کے بعد حضرت عبدالحلیم صاحب سے بھی بیعت ہوئے تھے۔(۹) حضرت عبدالحلیم صاحب نے بھی مجاز فرمایا تھا۔

آپ کی ساری زندگی خانقاہ میں گزری کچھ عرصہ کے لئے پنیالہ میں مقیم ہوگئے تھے پھر بھی ہر وقت خانقاہ کے تمام معمولات میں برابر شریک ہوتے اور وہاں آنے والے مہمانوں کی خاطر تواضع اور خدمت میں پیش پیش رہتے تھے۔ خلیفہ محمد صدیق صاحب ۱۳ر صفر ۱۳۷۱ھ (مطابق ۱۴ر نومبر ۱۹۵۱ء) کو انتقال فرماگئے۔ اور خانقاہ میں خانقاہ کے حضرات کے لئے مخصوص قبرستان کے حصہ میں دفن ہوئے۔ کہ جس نے ساری زندگی خانقاہ کے لئے وقف کردی تھی اور خانقاہ کے حضرات اور متوسلین و مریدین کی خدمت کو مقصد زندگی بنایا تھا وہ اسی قابل ہیں کہ وہ موت کے بعد بھی ان حضرات سے جدا نہ رہے۔

حضرت مفتی صاحب ان کی وفات کے وقت ملتان میں تھے۔ جس کی وجہ سے اپنے والد بزرگوار کی تجہیز و تکفین میں شریک نہ ہوسکے تھے۔

مفتی محمود کی وِلادت

خلیفہ محمد صدیق کی پہلی شادی پنیالہ کے قریب (معظم نامی گاؤں میں) ہوئی تھی ان سے ایک لڑکا (احمد) اور ایک لڑکی ہوئی۔ پہلی بیوی کی وفات کے بعد دوسری شادی پنیالہ کے ایک علمی خاندان میں ہوئی۔ حضرت مفتی صاحب، خلیفہ محمد صاحب، حامد اور ایک لڑکی ان کے بطن سے تھے (آخر الذکر بھائی بہن بچپن ہی میں فوت ہوگئے تھے)۔(۱۰)

اپنی تاریخ ولادت کے بارے میں مفتی صاحب نے خود بتایا ہے کہ "میری پیدائش ۶ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۹ء میں ہوئی"۔(۱۱)

اور یہی آپ کی تاریخ ولادت آپ کے والد ماجد کے حوالہ سے مقالہ نگار نے بھی لکھی ہے کہ "مولانا مفتی محمود کی تاریخ پیدائش ۶ر ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ مفتی صاحب کے والد بزرگوار نے بذات خود بطور یاد داشت تحریر فرمائی ہے"۔(۱۲)

اس کے مطابق سن عیسوی کے لحاظ سے آپ کی تاریخ پیدائش ۹ر جنوری ۱۹۱۹ء ہے۔

اس پر مقالہ نگار نے ان کی تاریخ ولادت کی سن ہجری اور سن عیسوی کے اعتبار سے مطابقت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> سن عیسوی کے لحاظ سے راقم الحروف کے استفسار پر ایک دفعہ حضرت مفتی صاحب نے اپنی تاریخ پیدائش جنوری ۱۹۱۹ء بتائی تھی اور ان کے مڈل سکول سرٹیفیکیٹ (جو کہ راقم الحروف کے پاس محفوظ ہے) پر ۳۱ر مارچ ۱۹۳۳ء کو ان کی عمر ۱۴ سال ایک ماہ ۱۴ دن درج ہے یعنی سرٹیفیکیٹ کے مطابق ان کی پیدائش ۱۵ر فروری ۱۹۱۹ء ہے۔ (اس سے معلوم ہوا کہ) ہجری کے لحاظ سے ان کی تاریخ پیدائش بالکل صحیح ہے جبکہ عیسوی تاریخ ایک تخمینہ ہے۔(۱۳)

پہلی بیوی کے انتقال کے بعد خلیفہ محمد صدیق صاحب کی دوسری شادی پنیالہ کے ایک علمی خاندان میں ہوئی تھی جو حضرت آدم بنوریؒ کے خلیفہ حاجی بہادر آف کوہاٹ کی نسل میں سے ہے اور پنیالہ میں اس خاندان کا یہی ایک گھر آباد ہے۔(۲۰)

مفتی محمود صاحب، خلیفہ محمد، حامد اور ایک لڑکی اس دوسری اہلیہ سے ہوئے۔ مؤخر الذکر دونوں بہن بھائی بچپن میں انتقال کر گئے تھے۔ خلیفہ محمد کی تاریخ پیدائش ۷رذی الحجہ ۱۳۴۲ھ (مطابق ۱۰رجولائی ۱۹۲۴ء) ہے۔ قرآن حکیم ناظرہ اپنے والد صاحب سے پڑھا فارسی وغیرہ کی کتابیں بھی انہیں سے پڑھیں۔ پانچ سال کی عمر میں گورنمنٹ مڈل سکول پنیالہ میں داخل کرائے گئے۔ انہوں نے وہاں ۱۹۳۸ء میں مڈل کا امتحان پاس کیا اکثر کتابیں عیسیٰ خیل ابا خیل اور پھر عبدل خیل میں مفتی صاحب سے پڑھی تھی۔ لیکن باقاعدہ دورۂ حدیث کی کتب نہیں پڑھ سکے تھے کیونکہ مفتی صاحب کی تدریسی مصروفیات کی وجہ سے گھر کی تمام تر ذمہ داریاں انہیں کے سپرد تھیں۔ محلہ کی مسجد کی امامت بھی وہ انجام دیتے تھے۔ آپ کی پہلی شادی اپنے بڑے بھائی کی بیوہ سے کر دی گئی تھی۔ لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی دوسری شادی اپنے ماموں ملا خان محمد کی بیٹی سے ہوئی تھی جس سے ان کے ۴ بیٹے اور ۴ بیٹیاں ہوئیں۔ بیٹوں میں مولانا عنایت اللہ فاضل دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (حالاً ڈسٹرکٹ خطیب اوقاف ڈیرہ اسماعیل خان) مولانا کفایت اللہ مرحوم، مولانا ہدایت اللہ اور مولانا حافظ سعادت اللہ ہیں۔

خلیفہ محمد صاحب ۱۵رذی الحجہ ۱۳۹۵ھ (مطابق ستمبر ۱۹۷۵ء) کو انتقال کر گئے تھے۔ عبدل خیل میں دفن ہیں۔ ان کے انتقال کے وقت مفتی صاحب سفر حج میں تھے۔ ان کی تیمارداری کے فرائض مولانا فضل الرحمن نے ادا کئے تھے۔ انہیں دنوں جمعیۃ طلباء اسلام صوبہ سرحد کی مجلس شوریٰ کا اجلاس ڈیرہ اسماعیل شہر میں ہو رہا تھا۔ جس میں مولانا فضل الرحمن باوجود صوبائی مجلس شوریٰ کے ممبر ہونے کے اپنے چچا کی علالت کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکے تھے۔ جب

خلیفہ صاحب کی وفات کی اطلاع آئی تو راقم الحروف صوبائی شوریٰ کے ارکان کے ہمراہ جنازہ میں شریک ہوا تھا۔ مقالہ نگار نے لکھا ہے۔

> خلیفہ محمد صاحب مفتی صاحب کے چھوٹے بھائی تھے۔ گھر کے تمام امور کی نگرانی وہ فرمایا کرتے تھے۔ بہترین عالم دین اور نہایت متقی تھے۔ ذی الحجہ ۱۳۹۵ھ جب ان کا انتقال ہوا تو مفتی صاحب سفر حج میں تھے۔ ان کی وفات سے مفتی صاحب کو بہت دھچکا لگا اور ملکی، جماعتی اور علاقائی مسائل کے علاوہ گھر کی نگرانی بھی مفتی صاحب کے سر آگئی۔(21)

اس بات کا ذکر مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے بھی "خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے" کے عنوان کے تحت ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) میں کیا ہے۔

> میرے چچا خلیفہ محمد صاحبؒ جب تک زندہ رہے تمام خاندان کی ذمہ داری ان کے سپرد رہی اور وہ اپنی ذمہ داریوں کو اس انداز سے نباہتے رہے کہ مفتی صاحب سے وقتاً فوقتاً مشوروں کے سوا مزید کسی قسم کی زحمت نہ دیتے۔ لیکن حضرت خلیفہ صاحب کی وفات کے بعد والد محترم نے خاندانی امور میں باقاعدہ دلچسپی لینی شروع کر دی۔ اور اپنے چھوٹے بھائی حضرت خلیفہ صاحب کے اہل خانہ کی نگرانی بھی خود فرماتے رہے وہ خاندان کے ایک کامیاب سربراہ ثابت ہوئے۔ اپنی بے پناہ سیاسی مصروفیات کے باوجود انہوں نے خاندان کے ہر فرد کا خیال رکھا اور ہر ایک سے اس کے مقام اور مرتبے کے مطابق برتاؤ کیا۔(۲۲)

ماحول

کسی انسان کی شخصیت اور اس کی تعمیر و تشکیل میں اس کے ابتدائی ماحول کا بہت زیادہ کردار ہوتا ہے۔ اس کے خیالات اور احساسات اس کے ابتدائی ماحول سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ابتداء میں وہ بالکل خالی الذہن ہوتا ہے اس کے ذہن کی تختی بالکل سادہ اور صاف ہوتی ہے۔ اور اس عمر میں انسانی ذہن میں جو بات بیٹھتی ہے وہ "نقش کالحجر" ہوتی

ہے۔ باقی عمر میں یہی خیالات واحساسات اس کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں کار فرما ہوتے ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی اس کو علم الحیات اور علم النفس کی ایک مسلّمہ حقیقت بتاتے ہیں۔ وہ رقمطراز ہیں۔

> انسان کے مزاج و مذاق کی تشکیل، اس کے فطری جوہر چمکانے اور اکثر اوقات اس کے زندگی کا رُخ متعین کرنے میں، اس کے خاندان اور اس کے قریبی اجداد کا اثر علم الحیات اور علم النفس کی ایک مسلّمہ حقیقت ہے جس کی تصدیق گزشتہ تاریخ نیز پے دَر پے مشاہدات و تجربات سے ہوتی رہتی ہے۔ اور اس کا انکار ایک امر بدیہی کا انکار ہے۔(۲۳)

اس کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ کسی انسانی ذہن پر یہ اثر دو راستوں سے ہوتا ہے۔

> ایک نسلی طور پر کہ یہ خصائص (کمالات اور کمزوریاں) باپ سے بیٹے کی طرف اور مورث سے والد کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ دوسرے ذہنی و فکری طور پر کہ خاندانی روایات اور آباء واجداد کے قابل فخر کارناموں کا تذکرہ، ان کے اصول زندگی، عقائد و مسلّمات اور ان معیار و اقدار کا چرچا جن کو وہ ہمیشہ سینہ سے لگائے رہے۔ اور جو ان کو جان سے زیادہ عزیز تھے۔ ان محبوب اور معیاری شخصیتوں کے نام جس کی عقیدت و عظمت ان کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں بیٹھ گئی تھی۔ اور ان مقاصد کا ذکر جن کے لئے انہوں نے بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ بچپن سے انسان کے کان میں پڑتا رہتا ہے۔ اور اس کے دل و دماغ کی سادہ تختی پر "نقش کالحجر" ہو جاتا ہے اور وہ یہ چیزیں شعوری اور غیر شعوری طریقہ پر اس کی شخصیت و سیرت کی تعمیر اور اس کی صورت گری کرتی ہے۔(۲۴)

محمود کو بھی جو ابتدائی ماحول ملا۔ اس کی ساری زندگی میں اس کی شخصیت و کردار پر اس کے اثرات محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ بلکہ اسی ابتدائی ماحول کے اثرات تھے جس کی وجہ سے وہ دین کی خدمت کے جذبے سے سرشار رہے اور کلمہ حق کی سربلندی کے لئے ہمیشہ سربکف رہے۔ دین

کی ضرورت ہو اور وہ غفلت، مصلحت یا کسی مداہنت سے کام لے ان سے بہت بعید تھا۔ حق گوئی کے معاملہ میں جرأت و بے باکی سے کام لیتے اور نتیجہ اللہ ربّ العزت کے حوالہ کرتے۔ مقالہ نگار نے لکھا ہے۔

> محمود نے جب آنکھ کھولی اور اس میں کچھ شعور پیدا ہوا تو ہر طرف اصلاح ظاہر و باطن کی باتیں تھیں۔ علمی مباحث کا تذکرہ تھا۔ قال اللہ و قال الرسول ﷺ کی صدائیں تھیں۔ طلباء کا جمگھٹا تھا جس کا لازمی اثر اس معصوم بچے کے ذہن پر ہونا تھا۔ اور آخر تک اس ماحول کا اثر ان کے رہن سہن اور گفتار و کردار میں صاف دکھائی دے رہا تھا۔(۲۵)

مفتی صاحب نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ علم شریعت و طریقت دونوں کا امتزاج لئے ہوئے تھا۔ اگر ایک طرف ذکر و اذکار اور مراقبہ و ختم خواجگاں کے حلقے تھے۔ وظائف و لطائف کے اشغال تھے۔ اور تصوف کے اسباق مکمل کرائے جاتے تھے تو دوسری طرف درس و تدریس اور خصوصاً علم فقہ و اصول فقہ کا ایک عام ماحول تھا۔ فقہی مسائل اکثر زیر بحث رہتے تھے۔ بعض شروح و فتاویٰ سبقاً سبقاً پڑھے پڑھائے جاتے تھے۔ وہاں ہر وقت علم فقہ کے ماہر علماء کا مجمع لگا رہتا تھا۔ جن میں مقالہ نگار کے تایا استاد مولوی عبد اللہ، ان کے بڑے بیٹے اخوندزادہ عبد الحلیم اور والد ماجد استاد مولوی کمال الدین اور مولوی عطاء محمد تترخیلوی بھی ہوتے تھے۔ مفتی صاحب اس ماحول میں پروان چڑھے۔ یہی وجہ تھی کہ شروع سے ان کا رُجحان علم تصوف اور علم فقہ کی طرف زیادہ رہا۔

ایک دینی ماحول کے ساتھ ساتھ والد صاحب کی تربیت اور ہر وقت کی نگرانی "سونے پر سُہاگہ" تھی۔ ان کے والد ہمیشہ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کی کڑی نگرانی فرماتے رہتے اور اس میں ذراسی غفلت کے بھی روادار نہ ہوتے۔ مقالہ نگار نے "سوانحی نقوش" میں لکھا ہے "مفتی

صاحب کے والد مرحوم ان کی ہر قدم پر نگرانی فرمایا کرتے اور اخلاق وعادات اور تعلیم کے بارے میں ذرا سستی اور غفلت برداشت نہیں کرتے تھے"۔(۲۶)

اس مضمون میں آگے چل کر مقالہ نگار لکھتا ہے۔

خلیفہ محمد صدیق صاحب کی یہ تمنا تھی کہ اللہ تعالیٰ اُن کے لڑکوں کو عالم باعمل بنائے اوران کو دین کے خدمت کے لئے قبول فرمائے۔ان کا یہ معمول تھا کہ ہر (فرض) نماز(کی جماعت) کے بعد مسجد میں (بلند آواز سے) حضرت مولانا سیّد عبدالحلیم صاحب سے بطور خاص اپنے لڑکوں کے لئے دُعا کروایا کرتے تھے۔(۲۷)

خانقاہی ماحول، والد کی کڑی نگرانی اوراولیاء اللہ کی دُعاؤں ہی کے یہ اثرات تھے۔ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نہ صرف علماء میں ایک غالب شان عطاء فرمائی تھی۔ بلکہ اپنے ہم عصر سیاستدانوں میں بھی ان کو ایک نہایت ممتاز مقام حاصل تھا۔

ابتدائی تعلیم

مفتی محمود نے قرآن حکیم ناظرہ اپنے والد صاحب سے پڑھا۔ فارسی اور فقہ کی ابتدائی کتابیں اپنے والد صاحب اور مولوی شیر محمد صاحب سے پڑھیں۔ چھ سال کی عمر میں مڈل سکول پنیالہ میں داخل کرائے گئے۔ سکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی کتب کی تعلیم جاری رکھی۔ اپنی خداداد صلاحیت و قابلیت کی بناء پر ہر کلاس میں اوّل آتے رہے۔ خود بتاتے ہیں "میں ہر جماعت میں اوّل درجہ میں کامیابی حاصل کرتا رہا"۔(۲۸)

۱۹۳۳ء میں آپ نے مڈل کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا۔ اور ۲۷ رجون ۱۹۳۳ء کو آپ کو صوبہ سرحد کے محکمۂ تعلیم کے Registrar of Departmental Examination کی طرف سے مڈل پاس سرٹیفیکیٹ جاری ہوا۔

سکول کی تعلیم سے فراغت کے بعد آپ کے والد صاحب نے آپ کو حضرت سیّد عبدالعزیز شاہ صاحب کے پاس اباخیل بھیجا۔ شاہ صاحب نے آپ کو صرف ونحو، فقہ واصول فقہ اور علم منطق کے ابتدائی رسائل پڑھائے۔ شاہ صاحب کے دونوں بڑے صاحبزدے یار محمد صاحب اور جان محمد صاحب آپ کے شریک درس تھے۔ آپ تین سال تک شاہ صاحب کے پاس اباخیل میں زیر تعلیم رہے۔ اس کے بعد خانقاہ یسین زئی میں بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہاں آپ کو آپ کے والد صاحب، مولوی شیر محمد صاحب اور مولانا غلام رسول (فاضل دیوبند) نے پڑھایا۔ شرح جامی، سلّم العلوم، ہدایہ اوّلین اور حسامی تک کتابیں آپ نے یہاں پڑھ لیں۔ خانقاہ میں صاحبزادہ محمد صاحب اور صاحبزادہ حمید صاحب آپ کے ہم جماعت تھے۔

اعلیٰ تعلیم

خانقاہ کے حضرات، حضرت مولانا غلام رسول صاحب کے ذریعہ سے دارالعلوم دیوبند، وہاں کے علماء اور نصاب ونظام تعلیم سے آگاہ ہو چکے تھے۔ اورایک غائبانہ تعارف ہو چکا تھا۔ اسی دوران حضرت عبدالحلیم صاحب کے مریدین ومتوسلین میں حضرت مولانا عبدالغفور صاحب ترکئی جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد میں مدرس کی حیثیت سے متعین ہو چکے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ بنوں کے رہنے والے حضرت مولانا عجب نور صاحب وہاں پہلے سے مدرس تھے۔ مولانا سیّد حامد میاں صاحب نے اس مدرسہ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

جامعہ قاسمیہ وہ مدرسہ ہے جس کی سنگ بنیاد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ۱۲ ر صفر ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۸۷ء کو رکھی تھی۔ اورانہوں نے اس کا نام "مدرسۃ الغرباء" رکھا تھا جو وہاں کافی عرصہ تک سنگ افتتاح پر کندہ رہا۔ مگر مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی نسبت جامعہ قاسمیہ کہلایا۔ یہ ایک شاہی دور کی بنی ہوئی مسجد کے اردگرد بنے ہوئے کمروں میں قائم کیا گیا تھا۔ اس لئے شاہی مسجد کی نسبت شاہی مدرسہ بھی کہلاتا تھا۔ یہ مدرسہ کتب

معقولات کی تدریس کی وجہ سے ہندوستان بھر میں شہرت رکھتا تھا۔ اور دُور دُور سے طلباء وہاں استفادہ کی غرض سے آتے تھے۔(۲۹)

اس وقت حضرت سیّد فخر الدین صاحب، حضرت سیّد محمد میاں صاحب، مولانا عجب نور صاحب، مولانا عبد الغفور صاحب ترکئی، ان کے بھائی ملا خدائے داد صاحب، حضرت مولانا محمد اسماعیل سنبھلی، مولانا محمد رضا اور قاری محمد عبد اللہ صاحب اس میں مدرسین تھے۔ جن کی شہرت سارے ہندوستان میں قابل اساتذہ کی حیثیت سے تھی۔

انہی وجوہات کی بنا پر حضرت عبد الحلیم صاحب نے اپنے بچوں، بھتیجوں سمیت مفتی محمود کو وہاں اعلیٰ تعلیم کے لئے بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

۱۹۳۶ء میں تعلیمی سال کے ابتداء میں اپنے بیٹوں صاحبزادہ محمد صاحب، صاحبزادہ حمید صاحب اور بھتیجوں صاحبزادہ یار محمد صاحب صاحبزادہ جان محمد صاحب اور مفتی محمود کو روانہ کیا۔ صاحبزادہ محمد، صاحبزادہ یار محمد اور صاحبزادہ جان محمد صاحب تو سیدھے مرادآباد پہنچے اور وہاں داخلہ کے امتحان کے پاس کرنے کے بعد داخل کر دیئے گئے جبکہ صاحبزادہ حمید نے مظاہر العلوم سہارنپور میں داخلہ لینے کی غرض سے سہارنپور اور مفتی محمود نے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لینے کی غرض سے دیوبند کا رُخ کر لیا۔ مقالہ نگار مفتی صاحب کے بارے میں ایک مضمون میں لکھتا ہے۔

> اسباق ابھی شروع نہیں ہوئے تھے کہ ان کے والد کو علم ہوا کہ محمود نے ساتھیوں کا ساتھ چھوڑ کر دار العلوم دیوبند میں داخلہ لے لیا ہے۔ اتفاقاً انہی دنوں صاحبزادہ احمد صاحب سرہند شریف جانے والے تھے۔ محمود کے والد خلیفہ محمد صدیق نے ان کو ہدایت کی کہ محمود دیوبند میں ہیں اس نے اپنے ساتھیوں کا ساتھ چھوڑ دیا ہے آپ پہلے دیوبند جائیں وہاں سے ان کو لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس مرادآباد چھوڑ آئیں۔ صاحبزادہ احمد دیوبند پہنچے۔ محمود کو ساتھ لے کر سہارنپور گئے۔ اور وہاں سے اپنے

> چھوٹے بھائی عبد الحمید کو لیا اور دونوں کو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں داخل کرایا۔(۳۰)

مقالہ نگار کے چچازاد بھائی مولوی سعد اللہ جان بھی انہی حضرات کے ساتھ مدرسہ شاہی مرادآباد میں زیر تعلیم تھے۔ مفتی صاحب چھ سال تک وہاں زیر تعلیم رہے۔ آپ نے درس نظامی کے ساتھ قراءات سبعہ و عشرہ بھی پڑھیں۔

مدرسہ اسلامیہ امروہہ و اجازت سند حدیث

مفتی صاحب اور ان کے ساتھی اپنے تعلیمی سلسلے کے آخری سال میں تھے۔ تقریباً پانچ مہینے نہایت اطمینان اور انہماک سے پڑھائی جاری تھی کہ مدرسہ کے طلباء نے مدرسہ کے ناظم کے رویّہ کے خلاف تحریک چلائی اور اس کے اخراج کا مطالبہ کیا۔ مطالبہ منظور نہ ہونے کی صورت میں طلبہ نے درسگاہوں میں بیٹھنے سے انکار کر دیا اور ہنگامہ شدت اختیار کر گیا۔ مقالہ نگار نے عنوان بالا کے تحت ماہنامہ "ترجمان اسلام" لاہور میں مفتی صاحب کے حالات میں تحریر کیا ہے۔(مقالہ نگار کو اس سلسلے میں کچھ تفصیلات مفتی صاحب نے خود، بعض تفصیلات صاحبزادہ حمید صاحب جو کہ اس وقت وہاں زیر تعلیم تھے اور پھر ابھی کچھ عرصہ پہلے صاحبزادہ جان محمد صاحب نے جو کہ اس وقت مفتی صاحب کے ساتھ شریک درس تھے بیان کی تھیں)۔

> آخری سال دورۂ حدیث شریف میں شریک تھے تقریباً پانچ مہینے اطمینان اور انہماک پڑھائی جاری تھی کہ طلبہ نے مدرسہ کے ایک ناظم کے رویّہ سے تنگ آکر اس کے اخراج کا مطالبہ کیا۔ مطالبہ منظور نہ ہونے کی صورت میں طلبہ نے درسگاہوں میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ اور ہنگامہ شدت اختیار کر گیا۔(۳۱)

اور یہی واقعہ مولانا حامد میاں نے بھی تحریر کیا ہے مگر وہ مختصر ہے۔ انہوں نے صرف اس واقعہ کی نشاندہی کی ہے اور اس سلسلے میں وہاں حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی تشریف آوری اور طلباء سے خطاب کرنے کا ذکر کیا ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں۔

> مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ جامعہ قاسمیہ کے نائب مہتمم صاحبؒ کے خلاف طلبہ ہو گئے۔ اور بات اتنی بڑھی کہ طلبہ نے پڑھائی چھوڑ دی اور کتابیں داخل کر دیں۔ اس وقت حضرت مولانا عجب نور کی تدابیر غالب آئیں طلبہ نے کتابیں واپس لے لیں اس موقعہ پر آئندہ کی اصلاح اور اُمور جامعہ پر غور کرنے کے لئے حضرت مدنیؒ کو بلایا گیا۔ آپ نے طلبہ کے سامنے خطاب فرمایا۔ طلبہ پر اس کا بہت اثر ہوا۔ (۳۲)

مقالہ نگار کو اس واقعہ کی جو تفصیلات معلوم ہوئی ہیں۔ اس کے مطابق یہ کہ یہ ہنگامہ حضرت مدنیؒ کی طلبہ کو سمجھانے بجھانے سے ختم ہوا تھا۔ اور یہ کہ اس کے بعد تمام طلباء نے فرداً فرداً ہر استاد سے معافی مانگ لی تھی اور جامعہ قاسمیہ میں پڑھائی دوبارہ شروع ہوئی تھی۔ مقالہ نگار لکھتا ہے۔

> مدرسہ کے مہتمم مولانا عبدالحق صاحب مدنیؒ نے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کو ہنگامہ ختم کرانے اور طلباء کو سمجھانے کی دعوت دی۔ وہ تشریف لائے اساتذہ کرام طلباء، اور انتظامیہ کا اجتماع ہوا۔ حضرت مدنی نے خطاب فرمایا طلباء کو نصیحت فرمائی اساتذہ اور بزرگوں کے احترام کی طرف توجہ دلائی اور ہنگامہ ختم کر کے پڑھائی کی ہدایت فرمائی۔ طلباء نے ان کی ہدایت پر ہڑتال ختم کرنے کا اعلان کیا۔ ہر طالبعلم نے فرداً فرداً ہر اُستاد سے معافی مانگی۔ اور پھر اطمینان سے پڑھائی شروع ہوئی۔ (۳۳)

ان طلبہ میں چند ایسے تھے جن کا ایک استاد صاحب سے بہت قریبی تعلق تھا۔ اور قابلیت کی وجہ سے وہ استاد صاحب ان پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ ان طلباء کی اس ہنگامہ میں شرکت کی وجہ سے وہ اُستاد ان سے بہت کبیدہ خاطر رہے تھے۔ اور جب حالات صحیح نہج پر آ گئے

تھے۔ اور اساتذہ کرام نے پڑھانا اور تمام طلبہ نے پڑھائی شروع کی تھی۔ مگر وہ استاد اپنے ان خاص طلبہ سے کسی طرح راضی نہ ہوئے تھے بلکہ مزید یہ کہ اُن کو اپنے اسباق میں درسگاہ میں بھی بیٹھنے نہ دیا تھا۔ طلبہ نے اپنی عمر اور اپنی سوچ و فکر کے مطابق ہر وہ حربہ استعمال کرایا تھا۔ مگر وہ استاد ان سے کسی طرح راضی نہ ہوئے تھے تو اُن طلباء نے مدرسہ قاسمیہ مراد آباد سے بستر اور سامان اٹھا کر قریب ہی امروہہ کا قصد کیا تھا۔ اور وہاں مدرسہ اسلامیہ میں داخلہ لیا تھا۔ یہ مدرسہ بقول قاری محمد طیب صاحبؒ کے "مولانا نانوتوی صاحبؒ نے قائم کیا تھا"۔ حضرت مولانا سیّد احمد حسن امروہویؒ مولانا نانوتویؒ کے خاص تلامذہ میں تھے ایک عرصہ تک یہاں کے صدرالمدرسین کے عہدے پر فائز رہے۔ اور آخری عمر تک درس حدیث میں منہمک رہے۔ (۳۴)

ان طلباء میں محمود بھی تھے۔ مقالہ نگار نے لکھا ہے۔

> ایک استاد صاحب کا محمود اور اس کے ساتھیوں سے خاص تعلق تھا۔ اس ہنگامہ کی وجہ سے وہ استاد خاص کر اپنے متعلقین سے بہت زیادہ کبیدہ خاطر تھا۔ ان طلباء نے ان سے معافی مانگی۔ ان کی منت سماجت کی لیکن استاد صاحب کسی صورت بھی راضی ہونے کے لئے تیار نہ ہوئے اور وہ رنجیدہ ہی رہے۔ (چند سال بعد وہ استاد صاحب راضی ہو گئے تھے) جب یہ طلبہ ہر طریقہ سے استاد صاحب کو راضی کرنے میں ناکام رہے تو انہوں نے مراد آباد سے جانے کا فیصلہ کیا۔ محمود، جان محمد، سعد اللہ جان (راقم الحروف کے عم زاد) اور ایک وزیرستانی طالبعلم وہاں سے امروہہ گئے۔ اور مدرسہ اسلامیہ میں داخلہ لیا۔ (۳۵)

صاحبزادہ جان محمد صاحب نے مقالہ نگار کے استفسار پر بتایا کہ وہ اُستاد حضرت مولانا عجب نور صاحب تھے۔ پاکستان بننے کے بعد انہوں نے اپنے آبائی شہر بنوں میں مدرسہ کی بنیاد رکھی تھی جس کا نام مدرسہ معراج العلوم ہے۔ ان کے بقول بعد میں انہوں نے اُن طلباء کو معاف کر دیا تھا۔ اور ان کے بقول وہ ہر سال اپنے مدرسہ کے سالانہ جلسے کے موقعہ پر مجھے اور حضرت مفتی صاحب کو دعوت دیا کرتے تھے۔ اور ہم اس جلسہ میں بڑے اہتمام سے شریک ہوتے تھے

اور وہ ہمیشہ ہم پر شفقت فرمایا کرتے تھے۔ یاد رہے کہ صاحبزادہ جان محمد صاحب جمعیۃ علماء اسلام ضلع بنوں کے عرصہ تک ضلعی امیر رہے ہیں۔

مفتی صاحب اور ان کے ہمراہی مدرسہ اسلامیہ امروہہ میں زیر تعلیم رہے۔ ان میں مفتی صاحب اور سعد اللہ جان دورۂ حدیث کے طلبہ تھے۔ جبکہ صاحبزادہ جان محمد صاحب اور وزیرستانی طالبعلم موقوف علیہ میں شریک تھے۔ چونکہ اس مدرسہ میں باقاعدہ سند حدیث کے اجراء اور اس کے اندراج کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس لئے مفتی صاحب اور سعد اللہ جان نے تعلیمی سال کے آخر میں سند حدیث کے اجراء کے لئے حضرت مولانا عبدالرحمٰن امروہوی سے اس غرض کے لئے رجوع کیا۔ مولانا عبدالرحمن صاحب حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے شاگرد تھے۔ اور ان کو ان کی طرف سے سند حدیث کی روایت کی اجازت ملی تھی۔ اس کے علاوہ عالم عرب کے مشہور محدث حضرت حسین ابن حسن الخزرجی سے بھی سند حدیث کی اجازت ان کے پاس تھی۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب ساری زندگی درس حدیث میں مصروف رہے تھے اور اس وقت ضعف اور بیماری کی وجہ سے اپنے گھر پر آرام فرما تھے۔

مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے مفتی صاحب اور سعد اللہ جان دونوں سے امتحان لیا اور اپنے دست مبارک سے سند حدیث تحریر کر کے عطاء فرمائی۔ مقالہ نگار نے لکھا ہے۔

> محمود اور سعد اللہ جان دورۂ حدیث کے شرکاء تھے۔ چونکہ اس مدرسہ میں باقاعدہ سند دینے اور اس کے اندراج کا انتظام نہیں تھا۔ اس لئے یہ دونوں ساتھی تعلیمی سال کے اختتام پر شیخ الحدیث مولانا عبدالرحمٰن صاحب امروہویؒ کے پاس تشریف لے گئے۔ (جو ضعیف العمری کی وجہ سے درس کا سلسلہ ترک کر چکے تھے) اور ان سے تحریری سند کی درخواست کی۔ مولانا نے ان کا امتحان لیا۔ اور اپنے دستِ مبارک سے درج ذیل تحریر فرما کر سند عطا فرمائی۔

بسم الله الرَّحمٰن الرَّحيم

الحمد لله و كفى و سلامٌ على عباده الّذين اصطفٰے امّا بعد فقد طلب مِنّى **اخونا فى اللهِ** المولوى المحمود بن المولوى محمّد صديق الساكن فى بلدة **بنياله من** مضافات ديره اسمٰعيل خان ان يروى عنّى الاحاديث فسمعت **بعض** مواضع البخارے فرأيته اهلًا لان يجاز فاجازه بما اجازنى به **مشايخنا** الكريم حضرتنا مولانا الجنجوهي و حضرتنا القاسم النانوتوى و حضرتنا مولانا الحسين ابن الحسن الخزرجي۔ فله ان يروى عنّى **الاحاديث** بشرائطه المعتبرة عند اهل ....و اوصيه بتقوى الله فى السرّ و **العلن** و الاجتناب عن المعاصى ما ظهر منها و ما بطن و ان لا يغفل عن خدمة الدين و النّصح لِله و لرسوله و للمؤمنين و ان لا ينسانى من الدعآء فى العسرة و الرخاء و آخر دعوانا ان الحمد لِله ربّ العٰلمين۔

حرّرهٗ ببنانه و اجازهٗ بلسانه عبده و ابن عبده و ابن امته عبد الرحمٰن ابن **الفاضل** الامين مولانا عنايت الله رضى الله عنه و ارضاهٗ

سنة احدى و ستين بعد الف
و ثلاثة مائة من الهجرة النبوية على
صاحبها الف الف صلوة و سلام
و بركته و تحيتهٗ۔(۳۶)

۱۹۶۲ء میں (قومی اسمبلی پاکستان کے ممبر منتخب ہونے کے بعد) دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ شاہی مراد آباد کے اساتذہ کی طرف سے بھی اجازت ملی تھی اور اعزازی اسناد عطا کئے گئے تھے۔(۳۷) مگر مولانا عبدالرحمن کی سند سب سے اعلیٰ سند حدیث ہے اس لئے کہ مولانا

عبد الرحمٰن براہ راست مولانا گنگوہیؒ اور مولانا نانوتویؒ کے شاگرد ہیں۔ مزید یہ کہ مشہور عرب محدث حسین بن الحسن الخزرجی سے آپ کو سند حدیث کی اجازت ملی ہے۔ جبکہ مدرسہ شاہی مرادآباد کے شیخ الحدیث مولانا فخر الدین، حضرت مولانا سیّد انور شاہ کشمیری کے شاگرد اور وہ حضرت گنگوہیؒ اور مولانا نانوتویؒ کے شاگرد ہیں۔ اس لئے حدیث کی یہ سند بنسبت ان کے ایک واسطہ کی کمی کی وجہ سے اعلیٰ قرار پائی جاتی ہے۔

اساتذۂ کرام

(۱) والدماجد خلیفہ محمد صدیق

بہت اچھے عالم تھے۔ حضرت سیّد احمد گل صاحب اور دیگر اساتذہ سے کسب فیض کیا تھا۔ سلاسل اربعہ میں مجاز تھے۔ مفتی صاحب نے قرآن حکیم ناظرہ اور ابتدائی فقہی کتب ان سے پڑھی تھیں۔ حضرت سیّد عبد الحلیم صاحب کے صاحبزادے بھی آپ کے شاگرد رہے ہیں

صاحبزادہ محمود صاحب اپنی خود نوشت ڈائری (غیر مطبوعہ) میں تحریر فرماہیں کہ "و تجوید قرآن مجید و تصحیح حروف از خلیفہ محمد صدیق کردم" یعنی میں نے قرآن مجید کی تجوید اور حروف کی تصحیح کی مشق خلیفہ محمد صدیق سے حاصل کی ہے۔

(۲) مولوی شیر محمد پنیالوی

مولوی شیر محمد صاحبؒ، ملا گل خان کے صاحبزادے اور مفتی صاحب کے ماموں ہیں۔ ابتدائی بعض فارسی کتابیں مفتی صاحب نے ان سے پڑھی ہیں۔

(۳) مولوی شیر محمد قندھاری

رشتے میں مفتی صاحب کے بہنوئی ہیں۔ خانقاہ میں رہائش پذیر تھے۔ بعض ابتدائی کتب مفتی صاحب نے ان سے پڑھی ہیں۔

(۴) حضرت سیّد عبد العزیز شاہ صاحب

حضرت سیّد عبد العزیز شاہ صاحب پیدائشی نابینا تھے۔ علم و معرفت کے لحاظ سے نہایت بلند مقام پر فائز تھے اپنے بڑے بھائی سیّد عبد الحلیم شاہ صاحب سے بیعت تھے انہی کی طرف سے اجازت و خلافت عطا ہوئی تھی سکول کی تعلیم سے فراغت کے بعد والد ماجد نے مفتی صاحب کو ان کے پاس ابا خیل ضلع بنوں بھیجا تھا۔ صرف و نحو کی ابتدائی کتب ان سے پڑھی تھی۔ علم نحو کی مشہور کتاب "کافیہ" شاہ صاحب کو زبانی یاد تھی۔ اور اپنے طلباء کو بھی یاد کراتے تھے مفتی صاحب نے کافیہ تک کتب ان سے پڑھی ہیں۔ شاہ صاحب کے دونوں بڑے صاحبزادے یار محمد اور جان محمد آپ کے ہم سبق تھے۔

(۵) مولانا غلام رسول صاحب

مولانا غلام رسول صاحب احمزخیل ضلع بنوں کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی کتب اپنے علاقے میں متعدد علماء سے حاصل کرنے کے بعد انہوں نے دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا تھا۔ بعد میں جامعہ امینیہ دہلی میں بھی پڑھتے رہے۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کے خصوصی شاگرد رہے ہیں۔ ان کے ذریعہ سے خانقاہ کے حضرات دارالعلوم دیوبند اور ان کے علماء و مدرسین سے واقفیت حاصل کر چکے تھے۔ مفتی صاحب نے ابا خیل سے واپسی کے بعد ان سے کچھ عرصہ خانقاہ یٰسین زئی میں اور گرمیوں کے دنوں میں شیخ بدین (پنیالہ اور پیزو کے درمیان ایک سردائی

پہاڑی مقام ہے جہاں خانقاہ یٰسین زئی کے حضرات کے اپنے مکانات ہیں۔ وہ گرمیوں میں وہاں منتقل ہو جایا کرتے تھے) میں کتابیں پڑھی ہیں۔ جن میں شرح جامی، سلّم العلوم، ہدایہ اولین، حسامی وغیرہ شامل ہیں۔

مقالہ نگار نے کئی دفعہ مفتی صاحب اور ان کی ملاقات کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مفتی صاحب ان کا بہت احترام کرتے تھے۔

مولانا غلام رسول صاحب کے صاحبزادے پروفیسر ڈاکٹر حمایت اللہ صاحب چیئرمین ڈیپارٹمنٹ آف ایگرانومی، فیکلٹی آف ایگریکلچر گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان نے اپنے والد بزرگوار کے بارے میں بتایا۔

> میرے والد کا سال پیدائش ۱۹۰۱ء ہے ۱۹۱۹ء میں وہ جامعہ امینیہ دہلی میں پڑھتے تھے۔ خلافت تحریک میں حصہ لیا۔ افغانستان کی طرف ہجرت کرنے والوں کے ساتھ تھے مگر سرحد سے واپس کر دیئے گئے تھے۔ فراغت کے بعد جامعہ امینیہ دہلی میں تقریباً ۴ سال مدرس رہے بعد میں ۹، ۱۰ سال دارالعلوم دیوبند میں مدرس رہے۔ اس کے بعد اپنے علاقے میں خانقاہ یٰسین زئی میں طلباء کو پڑھاتے رہے۔ اور خانقاہ میں امام مسجد رہے۔ ستمبر ۱۹۸۶ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

(۵) حضرت مولانا عبدالغفور ترکئی غزنوی

یہ غزنی کے رہنے والے تھے۔ پھر ان کا خاندان قندھار میں آباد ہوا۔ اس لئے قندھاری بھی کہلاتے ہیں۔ ان کا سارا خاندان خانقاہ یٰسین زئی کے متوسلین میں سے تھا۔ اس لئے انہوں نے کافی عرصہ اپنے بھائی سمیت خانقاہ میں گزارا ہے۔ متعدد علماء سے علم حاصل کیا تھا۔ معقولات میں بہت اونچے عالم و مدرّس تھے۔ مدرسہ شاہی مراد آباد میں مدرس ہوئے دیگر اساتذۂ کرام کے ساتھ ساتھ آپ کی وہاں تدریس کی وجہ سے مدرسہ شاہی مراد آباد کو معقولات کے درس

میں ہندوستان بھر میں شہرت ملی۔ مزاج میں سختی تھی۔ طلبہ کی کڑی نگرانی فرماتے تھے۔ کبھی **کبھی مارپیٹ** سے بھی کام لیتے تھے اس لئے بعض دفعہ مفتی صاحب فرماتے تھے کہ مجھے مولوی **عبدالغفور** صاحب کی تربیت نے "مولوی" بنایا ہے۔

مقالہ نگار نے "مولانا مفتی محمود۔ سوانحی نقوش" کے مضمون میں لکھا ہے۔

> مولوی عبدالغفور صاحب مدظلہ قندھاری مفتی صاحب کے مراد آباد کے اساتذہ میں سے ہیں۔ جامع المنقول والمعقول قابل مدرس ہیں۔ مزاج میں سختی تھی۔ آج کل بلوچستان میں ہیں۔
>
> حضرت مفتی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ مجھے استاد محترم مولوی عبدالغفور کی تربیت نے "مولوی" بنادیا ہے۔ زندگی میں قدم قدم پر میں ان کی تعلیمات اور ہدایات سے مستفید رہا ہوں۔ (۳۸)

مدرسہ شاہی مراد آباد میں مفتی صاحب ان کی خدمت کرتے تھے۔ اس لئے ہر وقت **ان سے** واسطہ پڑتا تھا۔ مفتی صاحب ان کی سخت مزاجی کے بہت سے واقعات سنایا کرتے تھے۔ **قیام پاکستان** کے بعد اپنے وطن افغانستان منتقل ہو گئے تھے۔ ببرک کارمل کے دور میں ان کے **مظالم** سے تنگ آکر پاکستان ہجرت کی تھی۔ بلوچستان میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ قیام پذیر **تھے۔** ۱۹۸۲ء میں خانقاہ یٰسین زئی تشریف لائے تھے۔ مہینہ بھر یہاں رہے۔ مقالہ نگار بھی ان **کی زیارت** و ملاقات سے مشرف ہو چکا ہے۔ اُن دنوں مولانا فضل الرحمٰن ڈیرہ اسماعیل خان جیل **میں قید** تھے۔ مولانا فضل الرحمٰن کی شدید خواہش پر جیل میں ان سے ملاقات کا اہتمام کر دیا گیا **تھا۔ لیکن** ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ غالباً ۱۹۸۴ء میں انتقال فرما چکے ہیں۔

ان کے بھائی خدائے داد بھی مدرسہ شاہی مراد آباد میں مدرّس تھے۔ مولانا صاحبزادہ **محمود** صاحب نے اپنی خود نوشت ڈائری (غیر مطبوعہ) میں لکھا ہے کہ میں نے قدوری اور کافیہ **ملا خدائے داد** سے پڑھی ہیں۔ لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مفتی صاحب کے اُستاد رہے ہیں یا نہیں۔

غالب خیال یہ ہے کہ مفتی صاحب کے استاد نہیں رہے کیونکہ ابتدائی درجات کی کتب وہ اس سے پہلے خانقاہ میں پڑھ چکے تھے۔ جبکہ ملا خدائے داد ابتدائی کتب کے مدرّس تھے۔

(۶) مولانا عجب نور صاحب

مولانا عجب نور صاحب کے متعلق مولانا سیّد حامد میاں صاحب (جو کہ مدرسہ شاہی مراد آباد کے اعلیٰ درجہ کے مدرّس اور شیخ الحدیث مولانا سیّد محمد میاں صاحب کے صاحبزادے ہیں اور اس وقت مدرسہ شاہی مراد آباد میں زیر تعلیم تھے) لکھتے ہیں۔

> مولانا عجب نور صاحب بنوں کے رہنے والے تھے۔ علوم عقلیہ کی تحصیل ریاست بھوپال میں نہایت قابل اساتذہ سے کی تھی۔ فلکیات میں بہت مہارت تھی۔ خود بھی بہت مطالعہ کرتے تھے اور ایسے طلبہ سے بہت خوش رہتے تھے جو ان سے دوران سبق دقیق سوالات کرے گزشتہ پڑھی ہوئی کتابیں یاد ہوں اور مطالعہ کا عادی ہو۔ وہ سوالات کی کثرت سے خوش ہوا کرتے تھے۔ وہ علم فلکیات کی کتاب تصریح پڑھاتے وقت مابین السطور بھی پڑھایا کرتے تھے۔ بہت جسیم اور جہیر الصوت تھے۔ ۱۹۴۴ء میں ان کے پاس حدیث کی کتاب مسلم شریف بھی آگئی تھی تقسیم کے بعد اپنے وطن بنوں تشریف لائے اور مدرسہ معراج العلوم کی بنیاد ڈالی۔
>
> مدرسہ شاہی میں ۴۴ء میں انہیں حدیث کی بڑی کتاب مسلم شریف دی گئی۔ حدیث پاک ایسا مضمون ہے جس میں بے حد حلاوت اور وسعت ہے چنانچہ جب انہوں نے معراج العلوم کی بنیاد ڈالی تو وہاں بخاری شریف بھی خود پڑھاتے رہے اور سب علوم وفنون عقلیہ سے ان کی طبیعت کلیۃً ہٹ گئی۔

مولانا عجب نور صاحب سے حضرت مفتی صاحب نے فلسفہ، منطق (معقولات) فلکیات کی کتابیں اور فقہ حنفی کی مہتمم بالشان کتاب ہدایہ آخرین پڑھی۔ (۳۹)

مولانا عجب نور صاحبؒ کی علمی شان بہت بلند تھی۔ ان کی علمی عظمت کے بارے میں **مولانا عبدالحق صاحبؒ** مہتمم و شیخ الحدیث دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، سابق ممبر قومی اسمبلی پاکستان و سابق مدرّس دارالعلوم دیوبند، اکثر دفعہ اپنی مجالس میں ان کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ ان کا ارشاد ہے۔

> مولانا عجب نور صاحبؒ بڑے متقی اور نیک انسان تھے۔ جید عالم اور قدیم وجدید علوم کے ماہر استاد تھے۔ ہمارے دیوبند کی طالب علمی کے زمانے میں ان کی علمی عظمتوں کا چرچا ہم سنا کرتے تھے۔ مرحوم کو مجھ سے خصوصی شفقت تھی اور دارالعلوم حقانیہ کی ترقی و بقاء اور استحکام کے لئے ہر وقت دُعا گو رہتے تھے۔ (۴۰)

مولانا عجب نور صاحبؒ کے بارے میں راقم الحروف نے سنا ہے کہ وہ مفتی صاحب کے بارے میں فرمایا کرتے تھے۔ کہ مجھے اپنے اس شاگرد پر فخر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو بہت اعلیٰ ذہانت سے نوازا ہے مگر اس کا حافظہ اس کی ذہانت سے بڑھ کر ہے۔ ایسے حافظہ کے شخص کو میں نے اس سے پہلے دیکھا نہیں اگرچہ سنا ضرور ہے۔

مولانا عجب نور صاحبؒ غالباً ۱۹۶۵ء میں انتقال فرما گئے ہیں۔ بنوں میں دفن ہوئے ہیں۔ رحمہ اللہ۔

(۷) مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ

مدرسہ شاہی مراد آباد میں مدرّس اور استاذ حدیث تھے۔ متعدد مفید کتابوں کے مصنف ہیں۔ "علماء ہند کا شاندار ماضی" آپ کی شاہکار تصنیف ہے۔ جو کئی جلدوں میں ہے۔ بچوں کے لئے سوال وجواب کی صورت میں "تاریخ اسلام" کتاب مرتب کی ہے۔ جو طلباء کے لئے بہت مفید ہے۔ اور بعض مدارس میں شامل نصاب ہے۔ "عہد زریں" دو جلدوں میں ہے۔ شان صحابہ پر بہت لاجواب کتاب ہے۔ بقول ان کے صاحبزادے حضرت مولانا سیّد حامد میاں صاحبؒ بانی و

مہتمم جامعہ مدنیہ راوی روڈ کریم پارک لاہور "والد محترم حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحب سے انہوں (مفتی محمود) نے علم ادب (عربی) کی کتابیں پڑھیں اور حدیث کی اہم کتاب ترمذی شریف پڑھی"۔(۴۱)

مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ کے بارے میں قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند "تاریخ دارالعلوم دیوبند" میں رقمطراز ہیں۔

> آپ دارالعلوم دیوبند کے ہونہار فاضل اور حضرت علامہ سیّد محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ کے تلامذہ میں سے ہیں علوم درسیہ سے فراغت کے بعد مدرسہ شاہی مراد آباد میں مدرّس اور مفتی کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ جمعیۃ علماء ہند کے ذمہ دار کارکنوں میں سے ہیں۔ حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کے حکم پر جمعیۃ علماء ہند کے ناظم بنے۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی وفات کے بعد ایک سال تک ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند کے عہدہ پر فائز رہے۔ جمعیۃ اور کانگریس کے بڑے مخلص سپاہی اور صف اوّل کے لیڈروں میں سے ہیں۔ کئی بار جیل گئے۔ متعدد مفید کتابوں کے مصنف ہیں۔ "علماء ہند کا شاندار ماضی" کئی جلدوں میں اور "تاریخ اسلام" آپ کی شاہکار تصانیف ہیں۔ بچوں کی اسلامی تعلیم سے بہت زیادہ شغف ہے۔ چنانچہ دینی تعلیم کے متعدد رسائل تصنیف فرمائے۔ جو بہت زیادہ مقبول ہوئے۔ تعلیم کے ہر شعبے میں اور ہر مضمون میں اسلامی رنگ دیکھنے کی تڑپ ہے۔ اور اس تڑپ کا مظاہرہ تصنیف کردہ کتابوں اور چارٹوں سے ہوتا ہے دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے کارگزار ممبر ہیں۔ مجموعی حیثیت سے علم و عمل میں دستگاہ اور صلاح و تقویٰ حاصل ہے۔ (۴۲)

مفتی صاحب اپنے تمام اساتذہ کا نہایت ادب واحترام فرماتے تھے۔ اساتذہ کرام کی بھی آپ پر ہمیشہ نظر شفقت رہتی تھی۔ مدرسہ شاہی مراد آباد میں اپنے اساتذہ میں آپ مولانا سیّد محمد میاں صاحب سے بہت متاثر تھے۔ اور فارغ اوقات میں ان کی مجلس میں جاتے اور ان سے استفادہ کرتے تھے۔ چونکہ مولانا سیّد محمد میاں صاحب تدریس سے فارغ اوقات میں تصنیف و تالیف کے

کام میں مصروف رہتے تھے۔ کافی دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ استاد اپنے شاگرد رشید سے حوالہ جات کی تلاش اور بعض اوقات مسوّدہ کو صاف لکھنے میں ان کی مدد لیتے۔ مولانا سیّد صاحبزادہ محمود صاحب جو کہ اس وقت مدرسہ شاہی مراد آباد میں ابتدائی کتب کے درجہ کے طالب علم تھے، لکھتے ہیں "مدرسہ شاہی مراد آباد میں تعلیم کے دوران مفتی صاحبؒ، مولانا محمد میاں صاحب سے بہت متاثر تھے۔ فارغ اوقات میں ان کی مجلس میں بیٹھتے اور تحریری کام میں ان کی معاونت کرتے"۔ (۴۳)

اس سلسلے میں مولانا حامد میاں صاحب نے لکھا ہے۔ "مفتی صاحب نے بتلایا کہ جس زمانے میں والد صاحب (مولانا سیّد محمد میاں صاحب) "شاندار ماضی" لکھ رہے تھے تو ایسا بھی ہوتا رہا کہ انہوں نے اس کے مسوّدہ کو صاف کر کے لکھا ہے۔ (۴۴)

اور یہی اپنے استاد کا اپنے ایک ہونہار طالب علم پر اظہار اعتماد اور اس کی قابلیت و صلاحیت کا اعتراف ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو تعلیم کے لئے اس کے حوالہ کرتا ہے۔ مولانا سیّد محمد میاں صاحب کے صاحبزادے مولانا سیّد حامد میاں نے لکھا ہے۔

> ۱۹۴۱ء تک مفتی صاحب جامعہ قاسمیہ میں رہے۔ ان دنوں میں قرآن پاک کی تعلیم سے فارغ ہوا تھا۔ فارسی قواعد کا مروجہ رسالہ جس کا نام رسالہ نادر ہے (اور وہ مولانا محمد شفیع صاحبؒ کے والد صاحب کی تصنیف ہے جو دارالعلوم دیوبند میں مدرّس فارسی تھے) والد صاحب نے مجھے شروع کرایا۔ پھر مفتی محمود سے فرمایا کہ وہ مجھے رسالہ کا سبق دے دیا کریں۔ اندازاً مجموعی طور پر میں نے اس کتاب کے چھ سات سبق پڑھے تھے۔ پھر یا تو سالانہ چھٹیاں ہوگئیں یا باقاعدہ فارسی کی کلاس میں داخلہ ہوگیا۔ (۴۵)

یعنی مفتی صاحب ابھی خود طالب علم تھے کہ اس کے اپنے استاذ نے ان کو اپنے بیٹے کو پڑھانے کا حکم دیا۔ اور مفتی صاحب نے ان کو پڑھایا۔ ان کے علاوہ مفتی صاحب نے صاحبزادہ محمود کو بھی بعض اہم کتب پڑھائی ہیں۔ جبکہ وہ خود اس وقت زیر تعلیم تھے۔ صاحبزادہ سیّد محمود صاحب نے اپنی خودنوشت ڈائری میں اپنے اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "و از مفتی محمود

کہ اکنوں طالب علم بود شرح تہذیب، شرح جامی، اصول الشاشی (خواندم)"۔

یعنی میں نے مفتی محمود سے کہ وہ اس وقت طالب علم تھے۔ شرح تہذیب، شرح جامی اور اصول الشاشی پڑھی ہیں۔

۱۹۷۲ء میں جب مفتی صاحب صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے تو مولانا سیّد محمد میاں صاحب نے آپ کو گرامی نامہ تحریر فرمایا جس میں مبارک بادی کے ساتھ ساتھ ان کو تقویٰ کی بھی تلقین کی گئی تھی۔ مولانا حامد میاں صاحب لکھتے ہیں۔

> ٦٧ ء میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (پاکستان لاہور) تشریف لائے تو حضرت مفتی صاحب جامعہ (مدنیہ لاہور) میں تشریف لے آئے اور دو دن قیام فرمایا۔ ان کے ساتھ ٦٥ ء کے محاذ لاہور کے نشانات اور شالامار و مقبرہ (جہانگیر) وغیرہ مقامات دیکھے۔
> اس تعلق کی بناء پر جب مفتی صاحب وزیر اعلیٰ (صوبہ سرحد) ہوئے تو والد صاحب نے انہیں ایک گرامی نامہ تحریر فرمایا جس میں مبارک باد کے ساتھ تقویٰ پر قائم رہنے کی تلقین تھی۔ کہ حق تعالیٰ کی طرف سے رہبری ہوتی رہی گی کیونکہ ایک مقام تک پہنچ جانا آسان ہے اور قائم رہنا مشکل ہے۔(۴٦)

مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ ۲۲/ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو فوت ہوئے اور دہلی میں مدفون ہوئے۔ مولانا سیّد حامد میاں صاحب نے تحریر کیا ہے۔"۱۹۷۵ء حضرت والد محترم کی وفات کے بعد مفتی صاحب میرے پاس تعزیت کے لئے تشریف لائے تھے"۔

(۸) حضرت مولانا فخر الدین صاحب

مولانا سیّد حدمد میاں صاحب نے لکھا ہے۔

> مولانا فخر الدین صاحب ہاپوڑ ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے بخاری شریف وغیرہ پڑھی تھی۔ اس زمانے میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مالٹا میں اسیر تھے۔ مولانا فخر الدین صاحب نے مدرسہ شاہی مراد آباد میں پڑھانا شروع کیا تو معقولات و فلکیات کی مشکل کتابیں بھی پڑھاتے رہے۔ انہیں تمام علوم میں درجہ کمال حاصل تھا۔ .....
> .... غرض اس معیاری درسگارہ میں
> حضرت مولانا فخر الدین صاحب نے طویل عرصہ تک پڑھایا۔ اور مراد آباد ہی ان کے لئے وطن بن گیا۔ ۴۴ ء میں حضرت سیّد حسین احمد صاحب اور پھر ان کی وفات کے بعد سے لے کر خود اپنی وفات تک دارالعلوم کے شیخ الحدیث رہے۔ اور جمعیۃ علماء ہند کے صدر رہے۔ انہوں نے بخاری شریف مراد آباد اور دیوبند میں ملا کر تقریباً ساٹھ سال پڑھائی ہے۔ ۷۲ء میں علالت بڑھنے پر مراد آباد آگئے وہیں وفات پائی اور مدفون ہوئے۔ رحمہ اللہ۔(۴۷)

حضرت مولانا سیّد فخر الدین صاحب کا تذکرہ مولانا قاری محمد طیب نے "تاریخ دارالعلوم دیوبند" میں ان الفاظ میں کے ساتھ کیا ہے۔

> سابق صدر المدرسین مدرسہ شاہی مسجد مراد آباد و موجودہ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند۔ آپ اونچے درجہ کے محدّث ہیں۔ جمعیۃ العلماء ہند اور کانگریس کی تحریکوں میں برابر حصہ لیتے رہے اور کئی بار جیل گئے۔ حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب کی وفات کے بعد آپ ہی کو جمعیۃ العلماء ہند کا صدر منتخب کیا گیا۔ ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء سے ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۳ء تک دارالعلوم میں آپ سے ۱۱٦۱ طلبہ نے بخاری شریف پڑھی۔(۴۸)

مولانا سیّد انظر شاہ کشمیری نے "دارالعلوم دیوبند میں درس حدیث" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جو کہ ماہنامہ الرشید ساہیوال کے "دارالعلوم دیوبند نمبر" میں شائع ہوا ہے۔

اس میں وہ مولانا فخر الدین صاحب اور مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ کے درس حدیث کی خصوصیات کا تذکرہ کچھ یوں کرتے ہیں۔

> آپ (حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ) کے متصلاً بعد حضرت مولانا فخر الدین علیہ الرحمۃ اور حضرت مولانا ابراہیم صاحب بلیاوی کا مشترکہ دور ہے۔ اوّل الذکر منقولات کے ماہر اور ثانی الذکر معقولات میں تبحر تھے۔ دونوں حضرات دارالعلوم کی خصوصیات اور اس کے امتیاز کے حافظ وامین اور درس میں اسی اختصاصی پہلو کے ترجمان وداعی تھے جو وراثۃً اپنے اکابر سے پہنچا تھا۔ مولانا فخر الدین صاحب حضرت شیخ الہند اور سیدنا الامام کشمیری کے براہِ راست شاگرد تھے۔ اور جناب مولانا بلیاوی صاحب حضرت شیخ الہند کے حلقۂ درس کے مستفید۔ مولانا مرادآبادی مرحوم کے درس میں بسط وتفصیل اور حاصل مطالعہ من وعن پیش کرنے کی عادت اور مولانا بلیاوی صاحب ایجاز واختصار کے خوگر۔ افسوس کہ جب یہ دونوں حضرات اس کائنات علم وفن سے جدا ہوئے تو علم کا وقار، دین ودانش کی آبرو، وجاہت علمی اور فضل وکمال بھی ان کے جنازوں کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ (۴۹)

(۹) حضرت مولانا حافظ عبد الرحمٰن امروہوی

حضرت مفتی صاحب کو آخری سال حدیث کی قلمی سند جاری کرنے والے حضرت مولانا عبد الرحمٰن امروہویؒ ہیں۔ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور شیخ الحدیث تھے۔ آپ کے بارے میں مولانا قاری محمد طیب صاحب نے لکھا ہے۔

> آپ حضرت احمد حسن صاحب امروہویؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے تفسیر کے بعض اسباق حضرت نانوتوی سے بھی پڑھے۔ ان دونوں بزرگوں کے فیوض سے آپ کے اوپر حدیث، فقہ اور تفسیر وغیرہ کے اسباق میں متکلّمانہ رنگ غالب تھا۔ جگہ جگہ حضرت نانوتویؒ کے علوم کا حوالہ بھی دیتے تھے اور انہیں وضاحت کے ساتھ بیان بھی فرماتے

> تھے۔ امروہہ میں ایک عرصہ تک درس دیا اور آخر میں کچھ عرصہ ۱۳۶۲ھ (۱۹۴۳ء) میں حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ گرفتار کرلئے گئے تو دیوبند میں بھی بعہدۂ صدر مدرّسی درس حدیث دیا ہے۔

جناب مولانا حکیم انیس احمد صدیقی نے "دارالعلوم کی تفسیری خدمات" کے عنوان کے تحت اکابر علماء دیوبند کی تفسیر سے متعلق خدمات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ جس کو ماہنامہ "الرشید ساہیوال" کے "دارالعلوم دیوبند نمبر" میں شائع کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں حکیم انیس احمد صدیقی نے حافظ عبد الرحمٰن صاحب امروہوی مرحوم کی تفسیری خدمات اور ان کے تفسیر کے درس کی خصوصیات کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں۔

> حضرت حافظ صاحب مرحوم حضرت مولانا نانوتویؒ کے شاگرد تھے۔ حضرت نانوتویؒ سے قرآن حکیم کا ترجمہ وتفسیر پڑھنے کا شرف آپ کو حاصل تھا۔ حضرت امروہوی کے درس کا طریقہ متاخرین کے درس سے بالکل مختلف تھا۔ متقدمین کے طرز پر جو طلباء مطالعہ کتب اور علم کے شائق رہتے تھے۔ اور مختصر بات کو خوب سمجھتے تھے خود کتاب کی عبارت سے نفس معانی آسانی سے حل کرلیتے تھے۔ استاد ان کو صرف اہم اور خاص چیزیں بتاتے تھے۔ یعنی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ طلباء کو نہیں پڑھایا جا رہا بلکہ اساتذہ اور علماء کو درس دیا جا رہا ہے۔ (۵۱)

(۱۰) حضرت مولانا قاری محمد عبد اللہ صاحب

حضرت مولانا قاری محمد عبد اللہ صاحب مدرسہ شاہی مرادآباد کے شعبۂ تجوید وقراءت کے مدرّس تھے۔ آپ تھانہ بھون کے رہنے والے تھے۔ علم قراءت میں کمال درجہ اور عبور حاصل تھا۔ مولانا حامد میاں صاحب نے لکھا ہے۔

> جامعہ قاسمیہ میں حضرت مولانا قاری محمد عبد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرّس قراءت وتجوید تھے۔ ان سے حضرت مفتی صاحب نے قراءات سبعہ وعشرہ پڑھیں۔ مولانا قاری

> عبداللہ صاحب تھانہ بھون کے رہنے والے تھے۔ علم قراءت میں کمال کا درجہ حاصل تھا۔ .... خداوند کریم نے نہایت اعلیٰ سیاسی بصیرت بھی بخشی تھی۔ ایسی بصیرت کہ جس کی تعریف حضرت مفتی صاحبؒ آخر وقت تک کرتے رہے۔ انہوں نے انگریز کے دور میں تحریک آزادی میں قید وبند کی صعوبتیں بھی اٹھائیں تھیں۔

حضرت مولانا قاری محمد عبداللہ صاحب کا علم قراءت و تجوید میں کمال مہارت کے بارے میں مولانا حامد میاں صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ بھی ان کی مہارت کے قائل تھے۔ وہ لکھتے ہیں "حضرت اقدس مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے کہ مجھے عرصہ سے مسئلہ "ضاد" میں اشکال تھا جو کسی سے حل نہ ہوتا تھا۔ حتّٰی کہ عزیزی قاری عبداللہ نے یہ اشکال رفع کر دیا"۔ (۵۲)

مولانا حامد میاں صاحب لکھتے ہیں کہ "حضرت تھانویؒ کے مجموعہ فتاویٰ کے پہلے نسخوں میں اس مضمون کا نوٹ تھا جو بعد کے نسخوں میں خذف کر دیا گیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ اس پر اظہار افسوس فرماتے تھے"۔ (۵۳)

بیعت وسلوک

عیسیٰ خیل کے مدرسہ میں تدریس کے دنوں میں آپ نے حضرت شاہ عبدالعزیز کے ہاتھ پر بیعت کی جو کہ آپ کے ابتدائی اساتذہ میں سے ہیں۔ اور آپ کے طالب علمی کے قیام مراد آباد کے دنوں میں آپ کے تمام اخراجات شاہ صاحب ہی ادا فرماتے تھے۔ مقالہ نگار نے لکھا ہے۔

> خلیفہ محمد صدیق صاحب خانقاہ کے ایک صوفی اور خادم تھے۔ دُنیا کی معاش سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ نہایت تنگی اور عُسرت سے بمشکل گزر اوقات ہوتا تھا۔ حضرت مفتی صاحب کو جب اعلیٰ تعلیم کے لئے مراد آباد بھیجا گیا تو ان کے تمام اخراجات حضرت شاہ

> صاحبؒ ادا فرمایا کرتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ ہر مہینے کے لئے ایک مقررہ رقم اپنے لڑکوں (صاحبزادہ یار محمد و صاحبزادہ جان محمد) اور محمود کے لئے بذریعہ منی آرڈر بھجوایا کرتے تھے۔ (۵۴)

شاہ صاحب ہی کے مشورہ پر آپ نے عیسیٰ خیل کے مدرسہ میں تدریس کا آغاز کیا تھا۔ اور شاہ صاحب ہی کے حکم پر آپ وہاں سے ابا خیل منتقل ہو گئے تھے۔ اور یہاں پڑھانا شروع کیا تھا۔ شاہ صاحبؒ ہی کے مشورہ پر آپ کی شادی کرادی گئی تھی اور شاہ صاحب ہی حکم پر آپ بحیثیت امام مسجد، عبدل خیل منتقل ہو گئے تھے۔

مفتی صاحب ہر دو مہینے بعد عیسیٰ خیل کے مدرسہ سے چھٹی لے کر ابا خیل آتے اور تین دن ابا خیل میں شاہ صاحب کے پاس ٹھہرتے تھے اور تصوف کے اسباق لیتے اور مراقبات و ختم خواجگان اور ذکر و اذکار کے حلقوں میں شریک ہوتے تھے۔ مقالہ نگار لکھتا ہے "عیسیٰ خیل میں قیام کے دوران انہوں نے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے بیعت کی ہر دوسرے مہینے شاہ صاحب کے پاس جاتے تین دن قیام فرماتے۔ غالباً ۱۹۵۲ء میں شاہ صاحب نے ان کو سلاسل اربعہ میں مجاز فرمایا تھا"۔ (۵۵)

مفتی صاحب، شاہ صاحب کی طرف سے سلاسل اربعہ میں مجاز تھے۔ لیکن اپنی تدریسی اور سیاسی مصروفیات کی وجہ سے ادھر بہت کم توجہ دی ہے۔ صرف چند گنے چنے افراد ہیں جن کو حضرت مفتی صاحب سے بیعت ہونے کا شرف حاصل ہے وہ بھی بہت زیادہ اصرار کے بعد ان کو بیعت کرایا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ صاحبزادہ محمود صاحب کو اپنے چچا اور مفتی صاحب کے استاد و پیرو مرشد حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے پوچھنا پڑا کہ آپ نے ان کو جو خلافت دی ہے۔ ان میں اس کی صلاحیت واستعداد بھی ہے؟

اس سلسلے میں صاحبزادہ محمود صاحب فرماتے ہیں۔

میرے چچا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے جب حضرت مفتی صاحبؒ کو خلافت عطا کی تو میں نے اُن سے کہا کہ آپ نے ایسے ہی خلافت دے دی۔ یا کچھ جواہر بھی اُن کے اندر ہیں۔ فرمانے لگے کہ علمی لیاقت کے ساتھ ان میں سلوک کی استعداد بھی پوری پوری ہے۔ اور تمہارا محور علوم ظاہری کی طرح علوم باطنی میں بھی بہت آگے ہے۔ اس کے بعد میرا شک رفع ہو گیا اور میری نظروں میں مفتی صاحبؒ کا احترام بڑھ گیا۔(۵۶)

مفتی صاحب نے سلوک کی منزلیں حضرت شاہ صاحبؒ کی نگرانی میں طے کئے۔ اور تمام لطائف کے اسباق کو مکمل کیا۔ اسی سلسلے کا ایک واقعہ مولانا سیّد حامد میاں صاحبؒ نے لکھا ہے جس سے مفتی صاحبؒ کے منازل سلوک طے کرنے کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

۱۹۷۵ء میں حضرت والد محترم (حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ رحمۃ اللہ علیہ) کی وفات کے بعد مفتی صاحبؒ میرے پاس تعزیت کے لئے تشریف لائے۔ اس دفعہ تصوّف کے موضوع پر گفتگو ہوتی رہی میں نے دریافت کیا کہ جناب کو آخری مراقبہ کیا تعلیم فرمایا گیا ہے فرمایا" فَاِنَّهٗ يَرَاكَ "میں نے عرض کیا کہ حضرت مدنیؒ کے یہاں "اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ "آخری تعلیم تھی۔ اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں اس سے پہلے سالک کو اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ یہی طریقہ حضرت مدنیؒ نے بھی اپنایا۔(۵۷)

ایک ایسا شخص جو ہمہ وقتی مصروفیات رکھتا ہو۔ درس و تدریس، مدرسہ کے طلبہ کی رات دن نگرانی کرتا ہو، دارالافتاء میں جواب طلب خطوط کا تحقیق کے بعد جواب لکھتا ہو، عوامی مسائل میں دلچسپی رکھنے والا ہو، ملکی مسائل پر گہری نظر رکھ کر اس کے حل کے لئے عملی اقدامات کرنے والا ہو، مراقبات سے، تصوف و سلوک سے کیا دلچسپی رکھتا ہو گا۔ مگر اس سلسلے میں یہ واقعہ بھی پڑھیئے اور اس شخص کے کمالات کا اندازہ لگائیے۔ مولانا حامد میاں صاحبؒ رقمطراز ہیں۔

اس سال اجتماع رائیونڈ کے موقع پر حضرت مفتی صاحبؒ اور حضرت مولانا عبیداللہ انور صاحب رائیونڈ گئے حضرت مفتی صاحب، حضرت مولانا انعام صاحب امیر جماعت تبلیغ کے پاس تشریف لائے۔ تو دیر تک مجمع پر سکوت کا عالم رہا۔ اس مجلس میں موجود سب

حضرات اسی کیفیت مراقبہ میں رہے۔ بعض لوگ جو جماعت کا پروگرام بنا رہے تھے۔ اس کیفیت سے ایسے متاثر ہوئے کہ اپنا کام چھوڑ کر اسی مراقبہ میں شامل ہو گئے۔ یہ واقعہ مجھے خود حضرت مولانا عبیداللہ انور صاحب نے سنایا اور یہ کہ یہ اثرات حضرت مفتی صاحبؒ کی قلبی حالت کی وجہ سے تھے۔(۵۸)

تلامذہ

مفتی صاحب کے یوں تو ہزاروں شاگرد ہیں۔ جنہوں نے متعدّد فنون و علوم میں آپ سے کسب فیض کیا ہے۔ اور اس کو اپنے تلامذہ تک منتقل کیا ہے جو کہ مفتی صاحب کے لئے صدقۂ جاریہ ہے۔ جو کہ پاکستان کے علاوہ افغانستان، ایران، بنگلہ دیش میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مگر ان میں چند ایک علم و عمل، درس و تصنیف اور تقریر و تبلیغ کے اعتبار سے بہت مشہور و معروف ہوئے۔

(۱) حضرت مولانا محمد موسیٰ روحانی بازی

مختلف فنون و علوم میں دو سو تحقیقی کتب کے مصنف ہیں۔ اکثر تصانیف عربی میں ہیں۔ اس لئے عربی ممالک میں زیادہ متعارف ہیں۔ فراغت کے بعد مدرسہ مطلع العلوم کوئٹہ میں مدرّس رہے۔ بعد میں دارالعلوم رحیمیہ بورے والا میں چند سال پڑھاتے رہے۔ غالباً ۱۹۵۸ء میں مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں مدرّس و شیخ الحدیث متعین ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں جامعہ اشرفیہ لاہور میں بحیثیت شیخ الحدیث تقرری ہوئی۔ ابتدائی کتب سے لے کر تمام کتب سوائے دو سال کے جب آپ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں زیر تعلیم رہے مفتی صاحب سے پڑھی ہیں۔ اور آپ ہی مفتی صاحب کے مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں تعیناتی کا ذریعہ بنے تھے۔ مولانا محمد موسیٰ روحانی بازی

اور مفتی صاحب کے باہمی استاد و شاگرد کے تعلق کے بارے میں یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ یہ واقعہ مولانا محمد موسیٰ روحانی بازی صاحب خود لکھتے ہیں۔

گزشتہ سال جب مفتی محمود عرب ریاستوں کے دورے پر گئے۔ تو ایک ریاست میں قاضی القضاۃ اور دیگر بڑے بڑے علماء جمع تھے۔ وہاں مفتی صاحب نے جو تقریر کی اُسے سن کر قاضی القضاۃ کہنے لگے "واقعی پاکستان میں بھی بڑے علماء بلکہ ہم سے بھی بڑے علماء موجود ہیں"۔ پھر انہوں نے کہا کہ میں نے پاکستانی علماء میں شیخ موسیٰ کی بہت سی کتب دیکھی ہیں ان جیسے علماء عرب میں بھی موجود نہیں۔ اِس موقع پر مفتی صاحب کے ایک ساتھی مولوی محمد یٰسین سے رہا نہ گیا اور وہ بول پڑے کہ شیخ! جس شیخ موسیٰ کو عربوں پر فوقیت دیتے ہیں جانتے بھی ہیں کہ وہ کون ہیں؟ وہ شیخ موسیٰ مفتی محمود کے تلمیذ ہیں۔ اور اس نے فنون کی تمام کتابیں مفتی محمود صاحب سے پڑھی ہیں۔ آپ کو شیخ موسیٰ کے علم سے مفتی محمود کے علم کا اندازہ کر لینا چاہیے۔ قاضی القضاۃ نے مفتی صاحب سے پوچھا! آپ نے تصانیف کی طرف کیوں نہیں توجہ دی؟ مفتی صاحب نے فرمایا "میری ایک تصنیف شیخ موسیٰ کو تو آپ نے پڑھ لیا ہے اگر اس قسم کی دو چار کتابیں اور پڑھ لیں۔ تو آپ کو یہ سوال مجھ سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ ہو گی۔ (۵۹)

مولانا محمد موسیٰ روحانی بازی کا ۲۰۰۰ء میں انتقال ہو گیا۔ اور لاہور میں مدفون ہوئے۔

(۲) صاحبزادہ محمود صاحب

خانقاہ یٰسین زئی کے حضرت سیّد عبد الحلیم صاحبؒ کے سب سے چھوٹے صاحبزادہ محمود صاحب نے مفتی محمود صاحب سے مراد آباد میں استفادہ کیا ہے۔ جب کہ اس وقت خود مفتی صاحب ابھی زیر تعلیم تھے۔ صاحبزادہ محمود صاحب نے اپنی ذاتی ڈائری میں اپنے اساتذہ کا ذکر کیا ہے جن سے انہوں نے کسبِ فیض کیا ہے۔ مفتی محمود صاحب کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے مفتی صاحب سے کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"واز مفتی محمود کہ اکنون طالب علم بود شرح تہذیب، شرح جامی اصول الشاشی (خواندم)"

ترجمہ: کہ میں نے مفتی محمود صاحب سے جبکہ وہ خود طالب علم تھے شرح تہذیب، شرح جامی اور اصول الشاشی پڑھی ہیں۔

صاحبزادہ محمود صاحب کا انتقال ۳۰/ اکتوبر 2008ء کو ہوا اور خانقاہ میں دفن ہیں۔

(۳) حضرت مولانا سیّد حامد میاں صاحبؒ

آپ حضرت مفتی محمود کے مدرسہ شاہی مراد آباد کے اُستاد حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ کے صاحبزادے ہیں۔ آپ نے اپنے گھر دیو بند میں قرآن پاک پڑھا اور اس کے بعد اپنے والد کے ہاں مدرسہ شاہی مراد آباد میں داخلہ لیا۔ ان کے والد صاحب نے مفتی محمود صاحب کو حکم دیا کہ وہ سیّد حامد میاں صاحب کو فارسی پڑھائے۔ اسی طرح وہ مفتی صاحب کے طالب علمی کے دور کے شاگرد ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد آپ نے پاکستان کی شہریت اختیار کی۔ لاہور میں ایک عظیم دینی مدرسہ جامعہ مدنیہ کے بانی و مہتمم اور شیخ الحدیث رہے ہیں۔ جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے مرکزی خازن اور بعد میں مرکزی امیر رہے ہیں۔

(4،5،6) حضرت مولانا عبد الرحیم صاحب، حضرت مولانا مفتی عبد الرحمٰن صاحب اور حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب

یہ تینوں حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے صاحبزادگان ہیں۔ تینوں بہت اچھے علماء تھے اول الذکر اور آخر الذکر دونوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ مولانا مفتی عبد الرحمٰن صاحب فارغ التحصیل ہونے کے بعد مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں مدرّس و نائب مفتی کی حیثیت سے متعین ہوئے۔ بعد میں متعدد مدارس میں تدریس کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ آخر میں راولپنڈی کے مولانا

قاری محمد امین صاحب کے مدرسہ میں شیخ الحدیث تھے۔ ضعف اور علالت کی وجہ سے آج کل تدریس کو ترک کر کے اپنے گاؤں ابا خیل میں رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ ۲۷ر رمضان ۱۴۳۱ھ مطابق ۱۹ر ستمبر ۲۰۰۹ء آپ کی تاریخ وفات ہے۔

(۷) مولانا محمد رمضان صاحب میانوالی

مولانا محمد رمضان صاحب، مفتی صاحب کے شاگرد رہے ہیں۔ کافی عرصہ تک تدریس کے ساتھ ساتھ جمعیۃ علماء اسلام ضلع میانوالی کے امیر رہے ہیں۔ مفتی صاحب کی حیات میں جمعیۃ علماء اسلام سے علیحدہ ہوئے تھے۔ اب انتقال کر چکے ہیں۔

(۸) مولانا محمد ضیاء القاسمی

آپ مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے فارغ التحصیل ہیں۔ جامعہ قاسمیہ فیصل آباد کے مہتمم ہیں۔ شعلہ بیان مقرر تھے۔ شروع میں تنظیم اہل سنت والجماعت کے مبلغ رہے۔ آپ پنجاب میں ہر دلعزیز رہے ہیں۔ کسی بھی جلسے، کانفرنس کے لئے آپ کا نام ہی اس کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ بعد میں جمعیۃ علماء اسلام سے منسلک ہو گئے۔ جمعیۃ علماء اسلام کے صوبائی ناظم اعلیٰ رہے ہیں۔ پھر مفتی صاحب کی حیات ہی میں جمعیۃ علماء اسلام سے علیحدہ ہوئے۔ بعد میں سپاہ صحابہ پاکستان کے سرپرست اعلیٰ رہے۔ ۱۹۹۰ء کے دہائی میں انتقال فرما چکے ہیں۔

(۹) مولانا نور محمد صاحب

وانہ جنوبی وزیرستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مفتی صاحب سے مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں کسب فیض کیا ہے۔ دارالعلوم وانہ جنوبی وزیرستان کے مہتمم و شیخ الحدیث ہیں۔ مدرسۃ البنات اور اس کے ساتھ سکول وکالج بھی چلا رہے ہیں۔ متعدد مفید علمی کتابوں کے مصنف ہیں۔ قومی

اسمبلی پاکستان کے ممبر رہے ہیں۔ بہت ہی باوجاہت و باوقار شخصیت ہیں۔ طویل عرصہ کے لئے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر چکے ہیں۔ جیل ہی میں حفظ قرآن اور ایجوکیشن بورڈ و یونیورسٹی سے متعدد امتحانات پاس کئے ہیں۔ درس حدیث و قرآن کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

(۱۰) خلیفہ محمد صاحب

مفتی صاحب کے چھوٹے بھائی جنہوں نے تمام درجوں کے کتب مفتی صاحب سے پڑھی ہیں۔

(۱۱) مولانا محمد اکبر صاحب

ضلع لکی مروت کے ایک گاؤں "نوی کلی" کے رہنے والے ہیں۔ مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں مفتی صاحب سے کسب فیض کیا ہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد کہروڑ پکا اور بستی مولویاں رحیم یار خان کے مدارس میں مدرّس رہے اور بعد میں مفتی صاحب کی دعوت پر مدرسہ قاسم العلوم ملتان تشریف لائے۔ اُس وقت سے لے کر مدرسہ قاسم العلوم ملتان ہی میں درس و تدریس کی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ۱۹۶۴ء سے لیکر تا حال (۲۰۰۹ء) ۴۵ سال ہو گئے اب تک پڑھا رہے ہیں۔ مدرّس، صدر المدرسین، شیخ الحدیث اور آج کل جامعہ قاسم العلوم ملتان کے نائب مہتمم ہیں۔ بہت سی صفات و کمالات کے مالک ہیں۔

(۱۲) مولانا قاری محمد حنیف صاحب

ملتان کے رہنے والے تھے۔ مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں پڑھتے رہے ہیں۔ نابینا تھے۔ پاکستان بھر کے مشہور خوش الحان مقرر رہے ہیں۔ صحابہ کرام اور بزرگان دین، خصوصاً اکابرین

دیوبند کے واقعات نہایت دلنشین انداز میں بیان کرتے تھے۔ ان کی تقریریں لوگ آج بھی ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ سے بڑے ذوق وشوق سے سنتے ہیں۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں انتقال فرما چکے ہیں۔

(۱۳) مولانا عبد القادر آزاد

آپ بہاولپور ڈسٹرکٹ کے باشندے ہیں۔ مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں طالب علم رہے ہیں۔ دین اسلام کی دعوت وتبلیغ کے لئے بہاولپور میں ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ مشہور مبلغ و مقرر تھے بعد میں محکمہ اوقاف میں خطیب مقرر ہوئے۔ آپ لاہور کے شاہی مسجد کے عرصہ دراز تک خطیب رہے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے پی ایچ۔ ڈی کیا تھا۔ انتقال فرما چکے ہیں۔

(۱۴) مولانا مفتی عبد اللطیف صاحب

آپ عبدل خیل ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے رہنے والے تھے۔ آپ نے اپنی تعلیم کی ابتداء مدرسہ مطلع العلوم کوئٹہ سے کیا تھا۔ جہاں حضرت مولانا محمد موسیٰ روحانی بازی مدرّس تھے۔ بعد میں اپنے استاد کے ساتھ جامعہ رحیمیہ بورے والا میں داخل ہوئے۔ اور جب مولانا محمد موسیٰ صاحب مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں بحیثیت مدرّس تشریف لے گئے۔ تو آپ نے بھی وہاں داخلہ لیا وہاں دیگر اساتذہ کے ساتھ مولانا مفتی صاحب سے بھی متعدد فنون کی کتابیں پڑھیں ۱۹۶۰ء میں دار العلوم کراچی سے دورۂ حدیث کیا تھا۔ اس کے بعد دار العلوم کراچی ہی میں مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ کی زیر نگرانی ایک سال تک دار الافتاء میں کام کیا۔ دو سال تک مدرسہ جامع العلوم بھکر میں مدرّس رہے۔ اس کے بعد حضرت مفتی صاحب کی دعوت پر مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں مدرّس ونائب مفتی مقرر ہوئے۔ "فتاویٰ مفتی محمود" میں آپ کے تحقیقی وتفصیلی فتاویٰ موجود ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں ملتان میں ہیضہ کی وبا سے انتقال فرما گئے۔ اور

عبدل خیل ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ مرحوم مقالہ نگار کے بڑے بھائی تھے۔

(۱۵) مولانا عبد البر محمد قاسم صاحب

آپ مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے مہتمم مولانا مفتی محمد شفیع کے صاحبزادے ہیں سارے درجات کی کتابیں مدرسہ قاسم العلوم میں پڑھی ہیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اسی مدرسہ میں مدرّس مقرر ہوئے۔ مفتی صاحب جب مدرسہ کے مہتمم منتخب ہوئے تو آپ نائب مہتمم بنائے گئے۔ مفتی صاحب کی غیر موجودگی میں مدرسہ قاسم العلوم کی جامع مسجد میں خطبۂ جمعہ ارشاد فرماتے تھے۔ مفتی صاحب کے انتقال کے بعد مستقل خطیب مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ کے لئے مدرسہ کے مہتمم بھی رہے ہیں۔

(۱۶) مولانا عبد المجید صاحب

مفتی صاحب کے قابل اور خصوصی شاگردوں میں سے ہیں۔ طلباء میں آپ بہت مقبول استاد ہیں۔ کچھ عرصہ کے لئے دار العلوم کبیر والا میں مدرّس رہے ہیں۔ بعد میں کہروڑ پکا تشریف لے گئے۔ آپ کے پاس ہر وقت طلباء کا جمع غفیر زیر درس رہتا ہے۔ شیخ الحدیث ہیں۔

(۱۷) مفتی محمد انور شاہ صاحب

ضلع لکی مروت کے ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اکثر کتابیں مفتی صاحب سے پڑھی ہیں۔ دورۂ حدیث بھی مدرسہ قاسم العلوم ملتان سے کیا ہے۔ دورۂ حدیث میں وفاق المدارس العربیہ کے تحت سالانہ امتحان میں پاکستان بھر میں اول پوزیشن سے کامیاب ہوئے تھے۔ فراغت کے بعد جامعۃ العلوم الاسلامیۃ کراچی میں تخصص فی علوم الحدیث کیا

مدرسہ جامع العلوم بھکر میں چندماہ مدرّس رہے تھے۔ مولانا مفتی عبداللطیف صاحب (جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے) کی انتقال پر ۱۹۶۸ء میں مفتی صاحب کی دعوت پر مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں مدرّس ونائب مفتی مقرر ہوئے۔ اور حضرت مفتی صاحب نوّر اللہ مرقدہٗ کے انتقال کے بعد مفتی مقرر ہوئے اور ایک طویل عرصہ افتاء کے ساتھ ساتھ تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وفاق المدارس العربیہ کے نظم ونسق کو نہایت معیاری بنادیا تھا۔ تقریباً ۲۷ سال تک ملتان میں قیام کے بعد چند گھریلو مصروفیات کی وجہ سے ملتان سے لکی مروت منتقل ہوگئے۔ وہاں جامعۃ الباقیات الصالحات کے شیخ الحدیث اور مہتمم ہیں جو علاقہ بھر میں بنات کی تعلیم کی معیاری درسگاہ ہے۔ اور آج کل اپنے قائم مدرسہ جامعۃ الباقیات الصالحات میں درس حدیث کے ساتھ ساتھ جامعہ مرکز اسلامی بنوں میں تخصص فی الافتاء کا کورس بھی پڑھاتے ہیں۔ وہ ہفتہ میں دودن وہاں دیتے ہیں۔ اور تاحال یہ سلسلہ جاری ہے۔

(۱۹) مولانا غلام یٰسین صاحب شاکر

آپ کا تعلق تونسہ ضلع ڈیرہ غازی خان سے تھا۔ مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں متعدد سال زیر تعلیم رہے تھے۔ دورۂ حدیث مدرسہ قاسم العلوم ملتان سے کیا تھا۔ شروع میں مدرسہ تعلیم الابرار ملتان میں مدرّس تھے۔ بعد میں دارالعلوم کبیروالا میں اعلیٰ درجے کے مدرّس مقرر ہوئے تھے۔ طلباء میں بہت مقبول تھے۔ کئی بیماریاں لاحق تھیں۔ انتقال فرماچکے ہیں۔

(۲۰) مولانا عبدالرحمٰن فخر صاحب

صوبہ بلوچستان کے رہنے والے ہیں۔ آپ کا تعلق بلوچ قوم سے تھا۔ متعدد مدارس میں زیر تعلیم رہے ہیں۔ فنون کی اکثر کتابیں مفتی صاحب سے پڑھی ہیں۔ معقولات میں آپ کے درس

کی بڑی شہرت رہی ہے۔ بلوچستان کے کئی مدارس میں مدرّس رہے ہیں۔ مولانا محمد موسیٰ صاحب کی لاہور تشریف لے جانے کے بعد مفتی صاحب نے آپ کو قاسم العلوم ملتان میں مدرّس مقرر کیا۔ کئی سال تک مدرسہ قاسم العلوم میں پڑھایا۔ اس کے بعد رحیم یار خان شہر کے کسی مدرسے میں مدرّس مقرر ہوئے۔ ابھی چند سال بیشتر جامعہ دارالعلوم نعمانیہ ڈیرہ اسماعیل خان میں بھی ایک سال تک مدرّس رہے ہیں۔

(۲۱) مولانا محمد جان صاحب کوئٹہ

آپ ضلع لکی مروت کے رہنے والے تھے۔ مگر ساری زندگی بلوچستان میں پڑھاتے رہے ہیں۔ بلوچستان میں آپ مشہور عالم دین اور شیخ الحدیث رہے ہیں۔ مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے فارغ التحصیل ہیں۔ بلوچستان کے بہت سے علماء آپ کے شاگرد رہے ہیں۔ نہایت متقی اور قناعت پسند تھے۔ وفات پاگئے ہیں۔

(۲۲) مولانا دُر محمد صاحب

بلوچستان کے بہت سے طالب علم مفتی صاحب کے پاس داخل رہے ہیں۔ ان میں ایک بہت اہم نام مولانا دُر محمد کا ہے۔ آپ مدرّس بھی رہے ہیں اور مشہور واعظ بھی۔

(۲۳) مولانا مفتی سعد الدین صاحب

مقالہ نگار کے بڑے بھائی ہیں۔ مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں مفتی صاحب سے پڑھتے رہے ہیں۔ دورۂ حدیث دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے کیا ہے۔ شروع میں بھکر، چوک سرور شہید اور کہروڑ پکا میں مدرّس رہے ہیں۔ بعد میں جب مفتی صاحب کی زیر سرپرستی جامعہ حلیمیہ

درہ پیزو کا قیام عمل میں آیا۔ تو اس کے تیسرے سال ان کو وہاں مدرّس و مفتی مقرر کیا گیا۔ بڑے قابل مدرّس و مفتی ہیں۔

(۲۴) مولانا محمد صاحب

مولانا محمد صاحب عبدل خیل ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے باشندے ہیں۔ اعلیٰ درجات کی تمام کتابیں مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں پڑھی ہیں۔ وہیں سے فارغ التحصیل ہیں۔ شروع میں درجہ فارسی کے قاسم العلوم ملتان میں مدرّس رہے اس کے ساتھ ساتھ دار الافتاء میں ناقل فتاویٰ تھے۔ 1990ء میں جامعۃ المعارف الشرعیہ ڈیرہ اسماعیل خان میں بحیثیت مدرّس تقرری ہوئی۔

(۲۵) مولانا فضل الرحمٰن

مفتی صاحب کے فرزند ارجمند ہیں۔ مفتی صاحب کی زیر نگرانی وزیر تربیت رہے ہیں۔ بول چال اور نشست و برخاست میں بہت زیادہ مفتی صاحب کے مماثل ہیں۔ دورۂ حدیث دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے ۱۹۷۹ء میں کیا ہے۔ مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں مدرّس و نائب مفتی رہے ہیں۔ چار مرتبہ قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے ہیں۔ جمعیۃ علماء اسلام کے سیکریٹری جنرل اور آج کل امیر ہیں۔

۱۹۹۳ء کے الیکشن میں ممبر قومی اسمبلی منتخب ہونے کے بعد آپ کو قومی اسمبلی کے سٹینڈنگ کمیٹی برائے اُمور خارجہ کا چیئرمین منتخب کیا گیا۔ اُمور خارجہ کی ذمہ داریوں کی وجہ سے آپ نے اس دوران دنیا کے بیشتر ممالک کے سرکاری دورے کیے۔ اور اس وقت کے سیاسی حالات و واقعات اور مسائل پر ان ممالک کے حکمرانوں ملاقاتوں اور تبادلہ خیالات کا آپ کو موقع ملا۔ آپ نے اسی حیثیت سے اقوام متحدہ کے "سلامتی کونسل" کے اجلاس سے "بارودی سرنگوں

کے استعمال کے مضرات اور اس کے سدّباب" پر تفصیلی تقریر کی۔ جس کو دنیا بھر کے ممالک کے نمائندوں نے سراہا۔ ۲۰۰۲ء کے الیکشن میں کامیابی کی صورت میں آپ نے قومی اسمبلی میں "متحدہ اپوزیشن" کے قائد کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔ جبکہ فروری 2008ء کا الیکشن آپ نے بنّوں جیتا۔ اور تا حال آپ "قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی برائے اُمورِ کشمیر" کے چیئرمین ہیں۔

(۲۶) مولانا قاضی حبیب الرحمٰن صاحب

آپ درابن کلاں ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو کہ "قاضی صاحبان" کے نام سے مشہور ہے۔ آپ مفتی صاحب کے مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے ابتدائی دور کے شاگردوں میں سے ہیں۔ آج کل کوئٹہ میں مقیم ہیں۔ اور وہاں تبلیغی مرکز کے بزرگوں میں سے ہیں۔ دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں بیرون ملک بہت سفر کئے ہیں۔ آپ کا بیان بہت ہی متاثر کن ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں ان سے بہت کام لیا ہے اور یہی ان کی مقبولیت کی نشانی ہے۔

نکاح، اولاد و احفاد

۱۹۴۶ء میں آپ کا پہلا نکاح، پنیالہ سے سات میل کے فاصلہ پر واقع گاؤں عبدل خیل میں صوفی نیاز محمد کی بیٹی سے ہوا۔ اس میں بھی حضرت سیّد عبد العزیز شاہ صاحبؒ کی رائے و مشورہ شامل تھا۔ اس پہلی بیوی سے سوائے مولانا فضل الرحمٰن کے اس سے پہلے جو اولاد ہوئی یا بعد میں ہوئی بچپن ہی میں وفات پا جاتی تھی، اس لئے ۱۹۶۰ء میں وانڈہ معظم گاؤں کے صوفی عبد الستار صاحب کی بیٹی سے دوسرا نکاح ہوا۔

پہلی بیوی سے مولانا فضل الرحمٰن ہوئے جن کی تاریخ پیدائش ۱۰ رذی الحجہ ۱۳۷۲ھ (مطابق ۲۱ راگست ۱۹۵۳ء) ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن کی شادی مفتی صاحبؒ نے ضلع لکی مروت کے حاجی فیض اللہ خان کی بیٹی سے کرائی تھی۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے تین صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں ہیں۔ بڑا بیٹا محمد اسعد محمود جامعہ خیر المدارس ملتان میں درجہ عالیہ کے طالب علم ہیں۔ بی۔ اے (پرائیویٹ) کر چکے ہیں۔ بہت ہی ذی استعداد ہیں۔

دوسرے بیٹے محمد انس محمود، جامعۃ المعارف الشرعیہ ڈیرہ اسمٰعیل خان میں درجہ خامسہ میں پڑھتے ہیں۔ وہ بھی پرائیویٹ طور پر بی۔ اے پاس کر چکے ہیں۔

تیسرے بیٹے محمد اسجد محمود سکول کے طالب علم ہیں۔ ساتھ ساتھ حفظ بھی کر رہے ہیں۔

مفتی صاحب کی دوسری بیوی سے جس دن پہلی اولاد (بیٹی) پیدا ہوئی۔ اسی دن پہلی بیوی سے مولانا عطاء الرحمٰن متولد ہوئے۔ تاریخ پیدائش ۲ رجولائی ۱۹۶۲ء ہے۔ مولانا عطاء الرحمٰن صاحب مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے فارغ التحصیل ہیں۔ جامعۃ المعارف الشرعیہ ڈیرہ اسمٰعیل خان میں مدرس ونائب مہتمم ہیں۔ گومل یونیورسٹی سے ایم۔ اے اسلامیات ہیں۔ دو دفعہ ممبر قومی اسمبلی منتخب ہوئے ہیں۔ جناب سیّد یوسف رضا گیلانی صاحب کی وفاقی کابینہ میں محکمہ سیاحت کے وفاقی وزیر ہیں۔ مولانا عطاء الرحمٰن صاحب کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ جو کہ زیر تعلیم ہیں۔

مفتی صاحب کے تیسرے بیٹے مولانا لطف الرحمٰن صاحب ہیں۔ آپ کی تاریخ پیدائش ۱۹ رمارچ ۱۹۶۵ء ہے۔ آپ مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے فارغ التحصیل ہیں۔ گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان سے ایم۔ اے اسلامیات (گولڈ میڈلسٹ) ہیں۔ ۱۹۹۵ء میں ڈسٹرکٹ پیپلز پروگرام کے چیئرمین رہے ہیں۔ صوبائی اسمبلی کے منتخب ممبر رہے ہیں۔ جمعیۃ علماء اسلام ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے ضلعی امیر ہیں۔ اور جمعیۃ علماء اسلام کے صوبائی اور مرکزی کونسل کے رکن ہیں۔ فعال نوجوان ہیں۔ عوامی مسائل کے حل میں سرگرمی سے مصروف کار رہتے ہیں۔

مفتی صاحب کے چوتھے صاحبزادے جناب حافظ ضیاء الرحمٰن صاحب ہیں۔ بی ایس سی انجینئرنگ کی ہے۔ اور محکمہ پی ٹی سی ایل میں انجینئر ہیں۔ حافظ قرآن ہیں۔ تاریخ پیدائش ۱۳ رنومبر ۱۹۷۵ء ہے۔

پانچویں اور سب سے چھوٹے صاحبزادے مولانا عبید الرحمٰن ہیں۔ مارچ ۱۹۸۰ء تاریخ پیدائش ہے۔ جامعہ دارالعلوم درویش مسجد پشاور صدر کے فارغ التحصیل ہیں۔ آج کل جامعۃ المعارف الشرعیہ کی نگرانی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ بی۔ اے کر چکے ہیں۔ علاقائی سیاست میں فعال ہیں۔

مفتی صاحب کی تینوں صاحبزادیاں شادی شدہ ہیں۔

مفتی صاحب کی دونوں اہلیہ کا ۱۹۹۴ء میں کچھ مہینوں کے فرق سے انتقال ہو گیا ہے۔ پہلے پہلی اہلیہ (مولانا فضل الرحمٰن اور مولانا عطاء الرحمٰن کی والدہ ماجدہ) جبکہ دوسری اہلیہ کا انتقال اس کے کچھ مہینے بعد ہوا تھا۔

عائلی وخانگی زندگی

مفتی صاحب کی شب وروز مصروفیتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اہل وعیال اور اپنی گھریلو زندگی کو نظر انداز کئے ہوئے ہوں گے۔ درس وتدریس، اہتمام، طلبہ کی نگرانی، سیاسی مشاغل، عوام سے ہر وقت رابطہ اور اس پر مستزاد یہ کہ اکثر سفر میں مصروفیت کی وجہ سے وقت ہی کتنا بچتا ہوگا۔ جس میں وہ اپنے اہل وعیال کی ضروریات کا خیال رکھ سکا ہوگا۔ اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کی نگرانی کر سکے گا۔ یہ تو پنبہ وآتش، جام وسندان، شیشۂ وآہن سے بیک وقت کھیلنے کا حکم رکھتا ہے۔ مگر مفتی صاحب نے یہ کر دکھایا اور اس سلسلے میں اعلیٰ مثالیں قائم کیں۔

عائلی وخانگی زندگی کی اہمیت کے بارے میں مولانا سیّد ابو الحسن علی ندوی اپنے والد صاحب مولانا حکیم عبد الحی صاحبؒ کی سوانح حیات میں رقمطراز ہیں کہ

> کوئی شخص کتنا ہی بڑا عالم وفاضل، مصنف ومفکر، سیاسی رہنما یا دین وملت کا خادم ہو اسلامی نقطۂ نظر سے اس کی عائلی ومعاشرتی زندگی اس کے اپنے اہل وعیال اور گھر والوں کے ساتھ اخلاق وتعلقات، اس کے متعلق ان کا تاثر اور شہادت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اور خواہ کوئی شخص اپنے اجتماعی اور ملّی مقاصد کی تکمیل میں کتنا ہی انہماک اور تصنیف ومطالعہ میں کتنا ہی استغراق رکھتا ہو۔ اس کی ذاتی اور گھریلو زندگی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ بلکہ در حقیقت اس کے کامل انسان اور مثالی مسلمان ہونے کا یہی معیار اور میزان ہے اس لئے کہ حدیث میں آیا ہے ﴿خيركم خيركم لاهله و انا خيركم لاهلي﴾ (ترمذی شریف) (تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لئے بہتر ہو۔ اور میں اپنے گھر والوں کے لئے تم میں سب سے بہتر ہوں۔ (۶۰)

مفتی صاحب کے زندگی کے اس پہلو کے بارے میں مکمل شہادت ان کے اہل وعیال اور آپ کے خدّام ہی کی رہی ہے۔ مفتی صاحب کے بڑے صاحبزادے مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے لکھا ہے۔

> مجموعی طور پر میں نے اپنے والد کو اپنی ۴۰ سالہ شعوری زندگی میں پانچ حیثیتوں سے دیکھا ہے۔ باپ، مربی، استاد، عالم، سیاستدان۔ بحیثیت باپ وہ قابل فخر تھے۔ وہ صرف "حقوق والدین" کے معلّم ہی نہیں تھے۔ بلکہ حقوق اولاد بھی ان کے پیش نظر رہتے تھے۔ باپ کی حیثیت سے میں اولاد کے لئے جو شفقت ہر باپ کو قدرت نے دی ہے، وہ ان کو بھی دی تھی۔ لیکن میرے محسوسات یہ ہیں۔ کہ یہ نعمت ان کو قدرت نے کچھ زیادہ فراوانی سے عطا فرمائی تھی۔ وہ بچوں کے ساتھ گھر میں اس طرح گھل مل جاتے تھے کہ ہمیں حیرت ہوتی تھی۔ کوئی بڑا آدمی اپنی اولاد کو اتنا خوش نہیں رکھ سکتا نہ اتنا بہلا سکتا ہے۔ جتنا وہ خوش رکھتے یا بہلاتے تھے۔ گھر میں بیٹھ کر یہ احساس ہی نہیں ہوتا

> تھا کہ یہ شخص اتنا بڑا رہنما ہے جو ہر وقت ملکی اور قومی مسائل میں الجھا رہتا ہے وہ چند لمحے جو بچوں کے ساتھ گزارتے تھے بڑے خوشگوار ہوتے تھے۔ (۶۱)

بحیثیت مربی اپنے بچوں کے ساتھ ان کا کیا رویّہ رہا؟ اور ان کی تربیت کا حق کس طرح ادا کیا؟ اس کے بارے میں مولانا فضل الرحمٰن رقمطراز ہیں۔

> بحیثیت مربی انہوں نے اپنی اولاد کی پرورش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ بچوں کی تعلیم وتربیت، بود وباش، رہائش، خوراک اور جائز ضروریات کا انہوں نے ہمیشہ خیال رکھا اور ساتھ ہی یہ احساس بھی دلایا کہ جائز ضرورت وہی ہوتی ہے جو جائز طریقے سے حاصل کی جائے۔ جس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے انسان کو ناجائز ذرائع اختیار کرنے پڑیں وہ جائز نہیں ہوتی............ بلکہ انہوں نے ہماری تربیت اس انداز میں کی کہ ہم نے تھوڑے کو ہمیشہ زیادہ سمجھا۔ اور جو میسّر آیا اس پر قناعت کی۔ زیادہ کی حرص نہیں کی۔ (۶۲)

اس مضمون کے آخر میں مولانا فضل الرحمٰن صاحب اپنے والد ماجد کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو کا ذکر کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ وہ اپنی اولاد کو کس قسم کی نصیحت کرتے تھے وہ لکھتے ہیں۔

> اسلامی نظام کا نفاذ ان کی سب سے بڑی آرزو تھی۔ وہ ہمیں اکثر ہدایت کرتے رہتے تھے کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے اپنی زندگی وقف کئے رکھنا، ظلم کو ظلم کہنے سے کسی حال میں باز نہ رہنا، حق کی حمایت کرنا اور باطل کے خلاف بھرپور جدوجہد کرنا، ہمارے لئے ان کی سب سے بڑی تعلیم اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ ہم اس تعلیم کو ہرگز نہیں بھول سکتے۔ ان کی میراث عدل وانصاف کا پیغام ہے۔ ہم اس پیغام کو تاحیات لوگوں تک پہنچاتے رہیں گے۔ ان کا مشن حق کی سرفرازی وسربلندی تھا۔ ہم اس مشن کو جاری رکھیں گے۔ اس وقت تک جب تک ہماری رگوں میں خون چلتا اور پہلو میں دل دھڑکتا ہے۔ (ان شاء اللہ)۔ (۶۳)

ایک اور مضمون میں مولانا فضل الرحمٰن صاحب اپنے والد گرامی کی خانگی زندگی کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں۔

والد محترم نے ہمارے خاندان کی جائز ضروریات کے بارے میں کبھی تساہل اور بخل سے کام نہیں لیا۔ ان کے افراد خانہ اور اہل خاندان نے بھی ان سے کبھی ایسی ضرورت و خواہش کا اظہار نہیں کیا جس سے مفتی صاحب کو تکدّر ہو اور ان کی طبیعت پر گراں گزرے اس کی وجہ یہ تھی کہ والد صاحبؒ نے اپنے خاندان کی ایسی تربیت کی تھی کہ وہ ان کے مزاج اور ان کے معاشی پوزیشن کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی ضروریات کا اظہار کرتے۔

والد صاحبؒ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھتے وہ بارہا فرماتے کہ جب میں لوگوں کو دین اسلام پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتا ہوں تو سب سے پہلے مجھے اور میرے خاندان کو عمل کی میزان پر پورا اُترنا ہوگا۔ وہ دینی تعلیم کو دنیاوی تعلیم پر ترجیح دیتے اور یہ بھی کوشش کرتے کہ ان کی اولاد دنیاوی علوم سے بھی بقدر ضرورت آراستہ ہوں۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ ان کے تمام لڑکے جید عالم بنیں اور اپنی زندگی خدمت دین میں صرف کریں۔ (۶۴)

مفتی صاحب کی اہلیہ نے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ "بچوں کی دینی تعلیم کے بارے میں ضرور متفکر رہتے تھے۔ اس کے علاوہ اگر ان کی کوئی خواہش تھی تو وہ یہ تھی کہ ان کا کوئی بچہ بڑا ہو کر دنیا کی مختلف زبانیں سیکھے۔ اکثر کہتے خدا کرے ایسا کوئی بچہ ہو جسے ساری زبانوں پر عبور حاصل ہو"۔ (۶۵)

ایک دفعہ مقالہ نگار کی موجودگی میں حضرت مفتی صاحب نے اپنے بیٹے مولانا فضل الرحمٰن کو نصیحت کی۔ اور وہ یہ تھی کہ "طلبِ علمِ دین میں محنت کریں"۔

ایک دن حضرت مفتی صاحب نے بطور نصیحت اپنے صاحبزادے فضل الرحمٰن سے فرمایا کہ " آج کل باوجود دنیا کی نعمتوں کی فراوانی کے طالب علم وہ محنت نہیں کرتے جو ہمارے زمانے کے طالب علم کیا کرتے تھے"۔ (۶۶)

عبدل خیل منتقلی و مستقل قیام

چونکہ اس سے قبل مفتی صاحب کی شادی عبدل خیل میں ہو چکی تھی۔ اس لئے وہاں آنے جانے سے وہ ان سے اور عبدل خیل کے رہنے والے مفتی صاحب سے خوب واقف ہو چکے تھے۔ اہل عبدل خیل بھی خانقاہ یٰسین زئی کے مریدین میں سے تھے۔ انہی دنوں اسی محلے کی مسجد کے پیش امام، جس محلے میں مفتی صاحب کے سسرال کا گھر تھا، جناب مولانا صالح محمد صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔ مولانا صالح محمد صاحب ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ جامعہ امینیہ دہلی کے فارغ التحصیل تھے۔ فاضل نوجوان تھے۔ بہت کم دن بیمار رہے اور فوت ہو گئے۔ یہ ۱۹۴۵ء کا واقعہ تھا۔ گاؤں کے لوگ خانقاہ یٰسین زئی گئے۔ اور ان سے اپنی مسجد کے لئے مستقل امام کا مطالبہ کیا۔ حضرت سیّد عبدالعزیز شاہ صاحبؒ کے مشورہ اور تجویز پر اس کے لئے مفتی محمود کا نام تجویز ہوا۔ حضرت شاہ صاحب کا مشورہ مفتی صاحب کے لئے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ اس طرح آپ بمع اہل و عیال عبدل خیل منتقل ہو گئے۔ شروع میں گاؤں ہی کے ایک شخص حافظ علی محمد نامی کے گھر رہے۔ ڈیڑھ سال کے عرصہ میں گاؤں والوں کے تعاون سے اپنا مکان تعمیر کرایا۔ آپ اس میں منتقل ہو گئے۔ آپ کے ساتھ طلباء کی ایک معقول تعداد بھی تھی۔ ان کی کفالت گاؤں والوں کے ذمہ تھی۔ مقالہ نگار نے لکھا ہے۔

ابا خیل میں مدرسہ کے بند ہونے اور تدریس کے سلسلے کے انقطاع کے بعد آپ خانقاہ یٰسین زئی (پنیالہ) اپنے گھر تشریف لائے۔ کہ انہی دنوں عبدل خیل کی مسجد کے امام

صاحب انتقال فرماگئے۔ گاؤں والوں کو امام کی ضرورت ہوئی۔ عبدل خیل کا ایک وفد شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس گیا اور ان سے مولوی محمود صاحب کو عبدل خیل میں امامت کے لئے جانے کا حکم دینے کا مطالبہ کیا۔ شاہ صاحب راضی ہوگئے۔ قیام پاکستان سے چند ماہ قبل ۱۹۴۷ء میں مولوی محمود صاحب اپنے پیرومرشد کے حکم پر عبدل خیل منتقل ہوگئے۔ امامت کرانے کے علاوہ گاؤں کے بچوں کو قرآن مجید (ناظرہ) اور ۱۵ مسافر طلباء کو مختلف فنون کی کتابیں پڑھاتے رہے ڈیڑھ سال عاریۃً ایک مکان میں رہے اس کے بعد زمین لی اور اپنا ذاتی مکان تعمیر کرایا۔ اور مستقل رہائش اختیار فرمائی۔ (67)

مدرسہ قاسم العلوم ملتان

مفتی صاحب کی مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں بحیثیت مدرّس و مفتی تشریف آوری ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ اس کے بارے میں مقالہ نگار نے لکھا ہے۔

> مدرسہ قاسم العلوم ملتان کو عرصہ سے ایک ماہر التدریس اور قابل مدرّس و مفتی کی تلاش تھی۔ کسی ذریعہ سے مدرسہ کی انتظامیہ کو مولوی محمود صاحب کی قابلیت اور تدریس کے تجربہ کا علم ہوا۔ انہوں نے ان سے رابطہ قائم کیا۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ مشورہ کے بعد ملتان جانے پر رضامند ہوئے۔ اور ذی الحجہ ۱۳۷۰ء مطابق اگست ۱۹۵۰ء آپ قاسم العلوم ملتان تشریف لے گئے۔ اور مسند تدریس و افتاء کو رونق بخشی۔
>
> اور "مولوی محمود" "مفتی محمود کے نام سے مشہور و معروف ہوگئے۔ ۱۳۷۵ء مطابق ۱۹۵۵ء میں آپ شیخ الحدیث کے مقام پر فائز ہوئے اس کے بعد ۱۳۹۵ء مطابق ۱۹۷۵ء میں قاسم العلوم کے بانی و مہتمم مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی علالت اور اہتمام کی معذوری کی بناء پر آپ کو مدرسہ کا مہتمم منتخب کیا گیا۔ (۶۸)

مفتی صاحب کا مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے انتظامیہ سے تعارف کیسے ہوا؟ ذریعہ کون بنے؟ مشاہرہ کیا طے ہوا؟ آپ سے رابطہ کیسے قائم کیا گیا؟ یہ تمام تفصیلات مولانا محمد موسیٰ روحانی بازی صاحب نے لکھی ہیں۔

> بعد میں مَیں نے ملتان کے قاسم العلوم میں داخلہ لے لیا۔ وہاں ایک مدرّس کی شدید ضرورت تھی میں نے آپ کا نام منتظمین کو پیش کیا۔ انتظامیہ نے بے چون وچرا آپ کی تقرری کی منظوری دے دی۔ میں نے آپ کو خط بھیج کر بلوالیا۔ یوں آپ ۱۳۷۱ء مطابق ۱۹۵۲ء میں مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں بطور استاد تشریف لے آئے۔ اس زمانے میں آپ کی تنخواہ صرف ستر روپیہ مقرر ہوئی۔ کچھ مدّت بعد مولانا عبدالخالق نے حضرت مفتی صاحب کو فتویٰ کا کام بھی سونپ دیا۔ فتویٰ جاری کرنے کی ذمہ داری کے بعد آپ "مولوی محمود" اور "مفتی محمود" دونوں ناموں سے پکارے جانے لگے۔ (۶۹)

آپ کی ملتان تشریف آوری اور مدرسہ قاسم العلوم میں بحیثیت مدرّس و مفتی تقرری کے بارے میں مولانا عبدالبر محمد قاسم صاحب نے "تاریخ قاسم العلوم ملتان" میں لکھا ہے کہ

> بعد ازیں پورے ملک سے استفتاء آنے پر ذی قعد ۷۰ھ میں شیخ الحدیث والفقہ حضرت مولانا مفتی محمود مدّظلہ بحیثیت مفتیٔ اعظم تشریف لائے۔ پھر ۷۵ھ میں شیخ الحدیث کے عہدے پر مقرر ہوئے۔ پھر ۹۴ھ میں ادارہ ہٰذا کے مہتمم منتخب ہوئے۔ (۷۰)

درج بالا حوالہ جات میں مذکورہ تاریخوں میں مولانا عبدالبرّ محمد قاسم صاحب کی تاریخیں اس لحاظ سے زیادہ صحیح اور درست ہیں کہ انہوں نے مدرسہ قاسم العلوم کے ریکارڈ سے یہ اخذ کئے ہیں۔ ذی قعد ۷۰ھ، عیسوی سن کے اعتبار سے اگست ۱۹۵۱ء کے مطابق ہے۔

بچپن اور جوانی کے پسندیدہ کھیل

خانقاہی ماحول کے اعتبار سے اس وقت بچے جو کھیل کھیلتے تھے۔ مفتی صاحب ان میں حصہ لیتے تھے۔ آپ کے چہرے پر بائیں جانب انگریزی کا "L" یا اُردو کا "ے" کی صورت میں جو نشان زخم تھا یہ بھی کھیل ہی کھیل میں گھومنے والی لکڑی سے بنے ہوئے ایک جھولے سے گرنے کی وجہ سے تھا۔ کھیل کے ساتھ گھر کا پانی بھرنا اور جنگل سے خشک لکڑیاں لانا بھی آپ کے روزمرہ ذمہ داریوں میں شامل تھا۔ ایک دفعہ خلیفہ محمد صاحب نے مقالہ نگار کو بتایا کہ "گھر کا پانی بھرنا احمد اور محمود کے ذمہ ہوتا تھا اسی طرح کبھی کبھار والد صاحب جنگل سے لکڑی جمع کرنے کے لئے بھیجا کرتے تھے"۔ (۷۱)

نوجوانی میں مفتی صاحب کے والی بال، اونٹ سواری اور نشانہ بازی خاص مشغلے تھے۔ جن میں انہیں خاص مہارت حاصل تھی۔ مقالہ نگار نے لکھا ہے۔

> والی بال، اونٹ سواری اور شکار مفتی صاحب کے جوانی کے محبوب مشغلے تھے لیکن نشانہ بازی میں انہیں خاص مہارت حاصل تھی۔ اور انہیں دعویٰ بھی تھا کہ علاقہ بھر میں کوئی مجھ سے زیادہ اور صحیح نشانہ باز نہیں۔ عید کے دن علاقے کے نوجوانوں کا خاص کھیل چاندماری ہوتی تھی۔ مفتی صاحب بھی اپنے شاگردوں اور متعلقین کے ہمراہ عید کے دن چاندماری کیا کرتے تھے۔ ان کا نشانہ کبھی خطا نہ ہوتا۔ (۷۲)

رانا مبارک علی، خانقاہ سراجیہ کندیاں کے متوسلین میں سے تھے۔ اور اپنی بے تکلفی اور بے ساختگی کی وجہ سے جلد ہی بزرگوں کا اعتماد حاصل کر لیتے تھے۔ مفتی صاحب کے بہت قریب رہے ہیں۔ کئی اسفار میں ان کو مفتی صاحب کی معیت حاصل رہی ہے وہ اس سلسلے میں ایک واقعہ لکھتا ہے۔

> بھٹو دور میں جب ان کی (مفتی صاحب) جان کو زیادہ خطرات لاحق ہو گئے تو دوستوں کے کافی اصرار پر ایک سٹین گن ساتھ رکھنا شروع کر دی۔ ایک بار وہ سٹین گن مجھے دی تو میں نے بصد احترام عرض کیا کہ یہ تو مجھے چلانا بھی نہیں آتی۔ اسے کیسے سنبھالوں گا۔ مفتی صاحب نے فرمایا کہ میرا نشانہ اتنا اچھا ہے کہ ٹیڈی پیسہ کہیں پھینک دو میں اسے بھی نشانہ بنا لوں گا۔ میں نے مذاقاً کہا کہ مجھے ایسے یقین نہیں آیا۔ مجھے نشانہ لگا کر دکھایئے۔ چنانچہ میں نے چند گز کے فاصلے پر ایک پیسہ رکھا اور مفتی صاحب نے اُسے اڑا دیا۔ (۷۳)

مفتی صاحب عبدل خیل میں قیام کے دوران یا جب بھی ملتان سے دینی مدارس میں تعطیلات کے دوران عبدل خیل تشریف لاتے۔ تو قرب و جوار کے طلباء کا ہمیشہ آپ کے ہاں ہجوم رہتا مفتی صاحب ان سے خوش طبعی فرماتے۔ ان کی مہمان نوازی کرتے۔ اور کھیل کود کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ دوڑ اور چھلانگ لگانے کے مقابلے ہوتے تھے۔ دو گروپ بنائے جاتے تھے اور دو اطراف میں نشانہ کھڑا کیا جاتا تھا۔ اور پتھر پھینکے جاتے تھے۔ جس گروپ کا پتھر اس نشان کے قریب پڑتا ان کے نمبر شمار ہوتے تھے۔ اور یہ ایک دلچسپ کھیل ہوتا تھا۔ لیکن اس سب کے باوجود مفتی صاحب نے ان کھیلوں کو کھیل برائے کھیل یا وقت گزاری کا بہانہ بنانے کی بجائے اس کو اصلاح خلق کے طور پر استعمال کیا۔ اور گاؤں کے کافی نوجوانوں کو ان کھیلوں کے ذریعہ اپنی طرف مائل کیا۔ اور نوجوانوں اور ایک زاہد خشک کے درمیان جو ایک خلیج ہوتا ہے۔ اور نوجوان ایک عالم دین کے پاس اٹھنے بیٹھنے میں ایک حجاب محسوس کرتے ہیں، ان کھیلوں کے ذریعہ مفتی صاحب اس خلیج کو پاٹتے تھے اور اس حجاب کو ختم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مقالہ نگار نے لکھا ہے۔

> لیکن ان تمام کھیلوں اور مشغلوں کو مفتی صاحب نے ایک اور اہم مقصد کے لئے استعمال فرمایا۔ ان کے ذریعہ سے گاؤں کے نوجوانوں سے ان کا تعلق پیدا ہوا۔ ان کی نشست و

برخاست اب مفتی صاحب کے پاس ہونے لگی۔ کافی نوجوانوں کے اخلاق سُدھر گئے۔ اور بعض نے باقاعدہ مفتی صاحب کے حلقۂ درس میں شمولیت اختیار کرلی۔(۷۴)

قیدوبند

مفتی صاحب کی پہلی گرفتاری تحریک آزادئ ہند کے دوران "تحریک سول نافرمانی" میں ہوئی تھی جس کی صحیح تاریخ کا علم نہ ہوسکا۔ جبکہ دوسری گرفتاری ختم نبوت کے دوران ۱۹۵۳ء میں ہوئی تھی ایک سال قید کی سزا ہوئی تھی۔ ایک انٹرویو میں خود بتاتے ہیں۔ "۱۹۵۳ء میں تحریک ختم نبوت کافی زور پکڑ چکی تھی۔ اس تحریک میں مَیں پیش پیش تھا۔ اس لئے مجھے کئی لوگوں اور لیڈروں کے ساتھ گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیا گیا"۔(۷۵)

مفتی صاحب کو ملتان جیل میں رکھا گیا جن میں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ وغیرہ علماء اور قائدین تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں گرفتار تھے۔ مفتی صاحب سات ماہ قید رہے۔ رمضان المبارک کا مہینہ اور عید بھی جیل میں منائی۔

آپ کی تیسری گرفتاری ۱۹۵۶ء میں ہوئی۔ ڈاکٹر احمد حسین کمال لکھتے ہیں کہ "۱۹۵۶ء میں آپ کو ون یونٹ کے منصوبے پر تنقید کے سلسلے میں پھر گرفتار کرلیا گیا تھا۔ لیکن طبقۂ علماء میں ناراضگی کی لہر کو محسوس کرکے حکومت نے جلد ہی رہا کردیا"۔(۷۶)

آپ کی چوتھی بار گرفتاری ۱۹۶۷ء میں ہوئی۔ آپ کی یہ گرفتاری ملتان میں حکومتی تعاون سے منعقد ہونے والے "جشن ملتان" کے خلاف جلسہ و جلوس کی قیادت کرتے ہوئے عمل میں آئی تھی۔ کیونکہ "جشن ملتان" کے نام سے رقص و سرور اور ناچ گانے کا پروگرام بھی تھا۔ مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی لکھتا ہے۔

۱۹۶۷ء کو ملتان میں "جشن ملتان" کے نام سے رقص و سرور اور ناچ گانوں کے ایک حکومتی پروگرام کا اعلان ہوا۔ مفتی صاحب نے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور پس دیوار زندان کردیئے گئے۔(۷۷)

عوامی احتجاج کی وجہ سے حکومت وقت کو اپنے پروگرام سے قبل "جشن ملتان" کو ختم کرنے کا اعلان کرنا پڑا۔ اور چند روز کی گرفتاری کے بعد مفتی صاحب اور ان کے دیگر رفقاء کو رہا کرنا پڑا۔

آپ کی پانچویں گرفتاری جناب ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں ۱۸ر مارچ ۱۹۷۷ء کو ہوئی۔ پروفیسر غفور احمد نے لکھا ہے "۱۸ مارچ کو مولانا مفتی محمود کو پشاور سے گرفتار کیا گیا۔ لیکن چند گھنٹوں کے بعد رہا کردیا گیا"۔(۷۸)

مفتی صاحب کی چھٹی بار گرفتاری بھٹو صاحب ہی کی دور حکومت میں ۲۵ر مارچ ۱۹۷۷ء کو عمل میں آئی تھی۔ آپ کو لاہور سے گرفتار کیا گیا تھا۔ پروفیسر غفور احمد لکھتا ہے۔ "۲۵ مارچ کو قومی اتحاد کے صف اوّل کے رہنماؤں کو گرفتار کیا گیا۔ لاہور سے مولانا مفتی محمود، میاں طفیل محمد، ملک قاسم اور مجھے (پروفیسر غفور احمد) گرفتار کرلیا گیا"۔(۷۹)

۲۷ مارچ کو لاہور سے مفتی صاحب کو ہری پور جیل منتقل کردیا گیا۔ اس دوران آپ کے فرزند ارجمند مولانا فضل الرحمٰن بھی دیگر علماء اور قومی اتحاد کے کارکنوں کے ہمراہ پشاور سے گرفتار کرکے ہری پور جیل لائے گئے تھے۔ اور جیل میں مفتی صاحب ان کو مشکوٰۃ شریف اور ہدایہ آخرین پڑھاتے رہتے تھے۔ جس میں تمام گرفتار علماء اور قومی اتحاد کے گرفتار کارکن شریک ہوتے تھے۔

قاتلانہ حملے

۲۰ اپریل کو مفتی صاحب ہری پور جیل سے سہالہ ریسٹ ہاؤس لے جائے گئے۔ وہاں سے آپ کو ۳۰ اپریل کو بیماری کے باعث ڈاکٹروں کے مشورہ پر کمبائنڈ ملٹری ہسپتال (C.M.H) راولپنڈی لے جایا گیا۔ اور داخل کرا دیئے گئے۔ ۳ مئی کو وہاں سے پھر سہالہ ریسٹ ہاؤس لائے گئے۔ ۲ جون کو مفتی صاحب اپنے دیگر رہنماؤں کے ساتھ وہاں سے رہا کر دیئے گئے تھے۔

"آپ کی آخری گرفتاری جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کی آمد پر ۵/ جولائی ۱۹۷۷ء کو عمل میں آئی تھی"۔(۸۰)

مفتی صاحب کو قتل کرنے کی پہلی کوشش اس وقت کی گئی جب وہ اپنے دیگر اکابر علماء کے ساتھ تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں ۱۹۵۳ء میں ملتان جیل میں قید تھے۔ مفتی صاحب نے یہ واقعہ ہفت روزہ "بیان" کے نمائندہ جناب مسرور احمد مسرور کو ایک سوال کے جواب میں بیان کیا ہے۔ جس کو بیان کے شکریہ کے ساتھ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور نے نقل کیا ہے۔

> میرے ساتھ اس (جیل کے) کمرے میں تین چار سیاسی قیدی تھے۔ جن میں حضرت احمد علی صاحب مرحوم اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی وغیرہ شامل تھے۔ ایک دن ہمیں جان سے مارنے کے لئے دودھ میں زہر ملا کر دے دیا گیا۔ لیکن "جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے"۔ ہوا یوں کہ میں اور میرے دو ساتھیوں نے دودھ چائے بنانے کے لئے استعمال کیا۔ اور اس زہریلے دودھ کی چائے بنا کر پی گئے جس کی وجہ سے زہر کا اثر زائل ہو گیا۔ اور ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ جبکہ دوسرے دو ساتھیوں جن میں قاضی احسان شجاع آبادی اور مولانا احمد علی مرحوم شامل تھے انہوں نے وہ زہریلا دودھ اسی طرح پی لیا جس کی وجہ سے ان کی حالت خراب ہو گئی۔ الٹیاں شروع ہو گئیں۔ ان دونوں کی حالت اس حد تک بگڑ چکی تھی کہ ہمیں یہ امید نہیں تھی کہ یہ بچ جائیں گے۔ لیکن خدائے تعالیٰ نے انہیں زندہ رکھنا تھا سو وہ بچ گئے۔ (۸۱)

اس واقعہ پر سخت احتجاج ہوا۔ جیل میں ہڑتال کر دی گئی۔ یہاں تک کہ اس وقت کے وزیر داخلہ کو جیل کا دورہ کرنا پڑا اس کی اس یقین دہانی پر کہ آئندہ ایسے واقعات نہیں ہوں گے۔ ہڑتال کے خاتمہ کا اعلان کرنا پڑا۔ مفتی صاحب بیان کرتے ہیں۔

> اس واقعہ پر ہم نے سخت احتجاج کیا اور جیل میں ہڑتال کرا دی جس کی وجہ سے اس وقت کے مرکزی وزیر داخلہ اکبر علی بھی جیل آئے۔ اور قیدیوں کو یقین دہانی کرائی کہ مستقبل میں ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آئے گا۔ مولانا احمد علی کی حالت بہت نازک ہو گئی تھی اس لئے انہیں لاہور جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ (۸۲)

مفتی صاحب پر دوسرا قاتلانہ حملہ ختم نبوت کانفرنس چنیوٹ کے لئے چنیوٹ پہنچنے کے موقع پر ہوا۔ مگر وہ بچ گئے۔ یہ واقعہ ۲۷/ دسمبر ۱۹۷۱ء کا ہے۔ اس واقعہ کی تفصیلات آل پاکستان مجلس ختم نبوت کے ناظم امور عامہ مولانا محمد شریف جالندھری نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بیان کیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

> پیر (۲۷/ دسمبر ۱۹۷۱ء) کی شام بعض مرزائیوں نے جان بوجھ کر جمعیۃ علماء اسلام کے جنرل سیکریٹری مولانا مفتی محمود کو ایک حادثہ میں ہلاک کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے آج یہاں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ گزشتہ شام مفتی محمود صاحب ختم نبوت کانفرنس میں شرکت کے لئے بذریعہ جیپ لائلپور سے چنیوٹ پہنچے تو سرگودھا روڈ پر عوام کے ایک بہت بڑے ہجوم نے ان کا استقبال کیا۔ اسی اثناء میں ربوہ کی جانب سے آتی ہوئی ایک تیز رفتار کار عین اس جگہ استقبال کرنے والوں پر چڑھ گئی جہاں مفتی محمود کی جیپ کھڑی تھی۔ مگر جیپ کے ڈرائیور نے نہایت ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے جیپ کو کار کی زد سے بچا لیا۔ انہوں نے الزام لگایا کہ اس کار میں بعض مرزائی سوار تھے۔ انہوں نے بتایا کہ کار کی لپیٹ میں آ کر متعدد افراد زخمی ہو گئے جنہیں طبی امداد کے لئے سول ہسپتال چنیوٹ پہنچا دیا گیا۔ (۸۳)

یوم پاکستان ۲۳ر مارچ ۱۹۷۳ء کو "متحدہ جمہوری محاذ" نے لیاقت باغ راولپنڈی میں جلسہ عام کا اعلان کیا تھا۔ بھٹو صاحب کی حکومت نے اس جلسہ کو ناکام بنانے کے لئے اپنے "فورس" کو استعمال کیا تھا۔ "فورس" نے خودکار ہتھیاروں کے اندھادھند استعمال سے مکمل غنڈہ گردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے متعدد کو ہلاک اور سینکڑوں کو زخمی کر دیا تھا۔ مفتی صاحب کے جلسہ گاہ میں پہنچنے سے قبل یہ فائرنگ شروع ہوئی تھی۔ آپ اس اندھادھند فائرنگ کے دوران سٹیج تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

جناب محمد نعیم آسی نے لکھا ہے۔

آپ پر براہ راست فائرنگ کی گئی۔ گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ اور آپ دیگر رہنماؤں پیر پگاڑا، خان عبدالولی خان، نوبزادہ نصراللہ خان، مولانا شاہ احمد نورانی اور پروفیسر عبدالغفور احمد وغیرہ آتش وخون کے اس معرکہ میں آخر تک سٹیج پر ڈٹے رہے۔

جناب نعیم آسی نے لکھا ہے کہ "جمہوری محاذ کے سیکرٹری جنرل پروفیسر عبدالغفور نے ہلاک شدگان کی تعداد ۱۸ بتائی ہے۔ اور روزنامہ "شہباز" پشاور نے ۵۰ اور روزنامہ "جمہور" لاہور کے مطابق اس ہنگامے میں کم از کم ۱۳۰ افراد ہلاک ہوئے۔ (۸۴)

لیاقت باغ کے اس سفاکانہ واقعہ کی خبر "نوائے وقت" لاہور نے یوں دی ہے۔

یوم پاکستان کے موقع پر لیاقت باغ میں اپوزیشن پارٹیوں کے متحدہ جمہوری محاذ کے زیر اہتمام ہونے والے جلسہ عام رائفلوں، سٹین گنوں اور دوسرے خودکار ہتھیاروں سے اندھادھند فائرنگ، دستی بموں، چاقوؤں اور لاٹھیوں کے وحشیانہ استعمال کے نذر ہوگیا۔ تقریباً تین گھنٹہ تک لیاقت باغ اور آس پاس کا علاقہ مکمل طور پر غنڈہ گردی اور لاقانونیت کی لپیٹ میں رہا۔ اس منظم خونین ڈرامہ میں کم از کم نو قیمتی جانیں ضائع ہوگئیں۔ اور پچھتر (۷۵) سے زائد افراد زخمی ہوئے۔ صوبہ سرحد سے تعلق رکھنے والے تیرہ بسوں اور ایک کار کو نذر آتش کر دیا گیا۔ (۸۵)

متحدہ جمہوری محاذ نے ۳ر جون ۱۹۷۳ء کو لاہور میں جلسہ کا اعلان کیا۔ حکومت نے اس کو بھی ناکام بنانے کی کوشش کی۔ لیکن متحدہ محاذ نے کامیاب جلسہ کرایا۔ متحدہ جمہوری محاذ کے رہنماؤں نے فیصلہ کیا کہ محاذ کے رہنما ۶ر جون ۱۹۷۳ء کو لاہور سے راولپنڈی بذریعہ ٹرین روانہ ہوں گے۔ ۶ر جون ۱۹۷۳ء کو متحدہ جمہوری محاذ کے جناب پیر پگاڑا شریف، مولانا مفتی محمود، خان عبدالولی خان، نوابزادہ نصراللہ خان، میاں طفیل محمد، مولانا شاہ احمد نورانی، محمد قاسم، چوہدری ظہور الٰہی اور سینکڑوں کارکن بذریعہ تیز گام لاہور سے راولپنڈی کے لئے روانہ ہوئے۔ ٹرین جب گوجرانوالہ ریلوے سٹیشن پہنچی۔ ہزاروں کارکن وہاں استقبال کے لئے موجود تھے۔ جب مولانا مفتی محمود تقریر کر رہے تھے تو باہر جنگلے کے پاس کھڑے چند افراد نے اندھادھند فائرنگ شروع کر دی۔ اس دوران محاذ کے رہنماؤں کو نشانہ بنایا گیا۔ ٹرین جب وزیر آباد پہنچی تو ٹرین کے نیچے دھماکہ ہوا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے دو دھماکے اور ہوگئے جس سے ٹرین لرز گئی۔ کئی کارکن زخمی بھی ہوئے۔ روزنامہ "نوائے وقت" لاہور نے اس واقعہ کے بارے میں جو خبر ۷ر جون ۱۹۷۳ء کو دی ہے وہ یوں ہے۔

ملتان اور لاہور میں متحدہ جمہوری محاذ کے جلسوں کو تشدّد اور غنڈہ گردی کے ذریعہ ناکام بنانے کی کوششوں کے بعد آج ایک اور ہولناک ڈرامہ کھیلا گیا۔ جب گوجرانوالہ اور وزیر آباد میں تیز گام کے ان ڈبوں پر فائرنگ کی گئی اور بم پھینکے گئے۔ جن میں محاذ کے لیڈر پیر پگاڑا شریف، خان ولی خان، نصراللہ خان، مولانا مفتی محمود، مولانا نورانی، ملک قاسم، چوہدری ظہور الٰہی، میاں طفیل محمد اور درجنوں کارکن لاہور سے پنڈی تک کا سفر کر رہے تھے۔ وزیر آباد میں بم دھماکہ اتنا شدید تھا کہ ٹرین لرز گئی۔ چوہدری ظہور الٰہی معمولی زخمی ہوئے جبکہ نصف درجن کے قریب کارکن سخت مجروح ہوئے تاہم باقی لیڈر معجزانہ طور پر بچ گئے۔

محاذ کے رہنما جب گوجرانوالہ پہنچے۔ تو عوام کا جم غفیر ان کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ یہاں محاذ کے رہنماؤں نے پرجوش خطاب کیا۔ جب مولانا مفتی محمود خطاب کر رہے تھے تو باہر جنگلے کے پاس کھڑے چند افراد نے اندھادھند فائرنگ شروع کی۔ اس دوران محاذ کے لیڈروں کو نشانہ بنایا گیا۔

ایک بج کر ۱۵ منٹ پر گاڑی وزیر آباد پہنچی تو یہاں بھی محاذ کے رہنماؤں نے عوام سے خطاب کیا۔ ولی خان کی تقریر کے دوران ایک بم گاڑی کے نیچے آکر گرا اور وہاں پھٹ گیا۔ یہ بم ریلوے سٹیشن کی عمارت کے چھجے پر بیٹھے ہوئے چند افراد پھینک رہے تھے۔ دوسرا بم اس کے بعد پھٹا۔ تیسرا بم لاؤڈ سپیکر پر آکر گرا جس سے وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ بم کے ٹکڑے ظہور الٰہی اور دوسرے اشخاص کو لگے جو اس وقت دروازے پر کھڑے تھے۔(۸۶)

مفتی صاحب پر یکے بعد دیگرے دو قاتلانہ حملے ۲۲ اور ۲۳/ اپریل ۱۹۷۵ء کو صوبہ سندھ کے ضلع ٹھٹھہ کے علاقے سجاول کے قریب ہوئے۔ مگر دونوں حملوں میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت فرمائی اور بال بال بچے۔ پہلے حملے کا تفصیلی واقعہ جناب محمد نعیم آسی صاحب نے لکھا ہے۔

اپریل کی ۲۲ تاریخ اور دوپہر کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ جب مفتی صاحب کا سات گاڑیوں پر مشتمل قافلہ حیدرآباد سے ۸۰ میل دور ضلع ٹھٹھہ کے علاقے سجاول کے نزدیک پہنچا۔ قریب ہی آمرا گوٹھ واقع ہے۔ کچھ افراد جو لاٹھیوں، کلہاڑیوں اور پستولوں سے مسلح تھے۔ اس مقام پر پہلے ہی ایک جیپ میں سوار ہو کر پہنچ چکے تھے۔ جیپ (ٹی۔ اے ۴۸۱) سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ ایک کے سوا باقی افراد قریب کی جھاڑی کی آڑ میں چلے گئے۔ سڑک پر جیپ کے ساتھ موجود تنہا شخص نے مفتی صاحب کی گاڑی پہنچتے ہی انہیں ہاتھ دے کر روکا۔ تاثر یہ تھا کہ وہ بھی استقبال کرنے والوں میں سے ہے۔ اور یہی تاثر قبول بھی کیا گیا۔ لہٰذا قافلہ ٹھہرا دیا گیا۔ قافلے میں آگے ایک جیپ (کے اے کے۔ ۱۸۳۱) تھی جونہی گاڑیاں ٹھہریں نقشہ بدل گیا۔ قریب کی جھاڑی سے مسلح حملہ آور نکل آئے۔ ان کی کلہاڑیوں، ڈنڈوں اور فائرنگ کا پہلا نشانہ

جیپ بنی اور پھر چشم زدن میں مفتی صاحب کی کار ان کی زد میں تھی۔ حسن اتفاق سے مفتی صاحب کی کار کا ڈرائیور حاضر دماغ اور غیر معمولی ہوشیار تھا۔ وہ کمال پھرتی سے کار کو حملہ آوروں کے نرغے سے نکال لے گیا۔ مفتی صاحب کے بچ نکلنے پر ملزمان فرار ہوگئے۔ مفتی صاحب کے ایک رفیق سفر محمد رحیم ڈنو اس حملے میں گولی لگنے سے شدید زخمی ہوئے۔ مفتی صاحب کو قدرت نے بال بال بچالیا۔(۸۷)

اسی رات سجاول میں مفتی صاحب نے ایک ہنگامی پریس کانفرنس میں اپنے اوپر کئے جانے والے قاتلانہ حملے کی تفصیلات بتائیں۔ ان کی اس پریس کانفرنس کے ناطے سے ۲۳ اپریل کے اخبارات میں قاتلانہ حملے کی خبر چھپی۔ جسے بعد ازاں بی بی سی، آل انڈیا ریڈیو اور کابل ریڈیو نے نشر کیا۔

سجاول سے ٹھٹھہ جاتے ہوئے دوسرے دن یعنی ۲۳ اپریل کو آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ محمد نعیم آسی صاحب لکھتے ہیں۔

اسی دوران مفتی صاحب کو نقصان پہنچانے کی ایک اور کوشش ہوئی ۲۳ اپریل کو مفتی صاحب کراچی جانے کے لئے سجاول سے ٹھٹھہ روانہ ہوئے جونہی ان کا قافلہ روانہ ہوا۔ کچھ افراد کار میں تعاقب پر مامور ہوئے جب مفتی صاحب کا قافلہ سجاول ٹول کے نزدیک پہنچا۔ تو پیچھے سے آنے والی کاروں نے "اور ٹیک" کے بہانے مفتی صاحب کی کار کو ٹکر مارنے کی کوشش کی۔ جس سے وہ الٹتے الٹتے بچی۔ ایک ڈی ایس پی کی ہمراہی میں پولیس کا دستہ بھی ساتھ چل رہا تھا۔ ڈی ایس پی جو کوئی شریف آدمی تھا اس نے موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے دو مرتبہ مفتی صاحب اور ان کے ساتھیوں کی گاڑیوں کو روکا۔ تاکہ ملزمان آگے نکل جائیں۔ اور "اور ٹیک" کے بہانے ٹکر مارنے کی کوشش نہ کریں (۸۸)۔

مفتی صاحب پر جو قاتلانہ حملہ صوبہ سندھ میں سجاول کے مقام پر ہوا۔ اس کی تفصیل مولانا سیّد محمد شاہ امروٹی صوبائی امیر جمعیۃ علماء اسلام صوبہ سرحد نے ایک انٹرویو میں جناب شعیب الرحمٰن کو بیان کر کے دی ہے۔ وہ اس قاتلانہ حملے کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

> ۱۹۷۵ء کا زرد موسم تو آپ کو یاد ہوگا جب تحصیل سجاول (سندھ) جاتے ہوئے راستے میں ان پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ کالعدم جمعیۃ علماء اسلام صوبہ سندھ کے صدر ہونے کی حیثیت سے میں ان کے ساتھ ہی کار میں بیٹھا تھا۔ کہ ہم سے آگے جانے والی پائلٹ جیپ اچانک رُک گئی اور سڑک کے دونوں جانب کھڑے کئے گئے افراد نے فائرنگ شروع کر دی ایک گولی پائلٹ جیپ میں بیٹھے ہوئے مولانا عبداللہ صاحب کے پاؤں میں لگی۔ دفعتاً ایک بڑی بڑی مونچھوں والا کلہاڑی بردار شخص ہماری طرف بڑھا اور کار کی ونڈ سکرین پر کلہاڑی سے وار کیا ونڈ سکرین ریزہ ریزہ ہوگئی پر خدا کے فضل سے مفتی صاحب کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ (۸۹)

آپ پر ایک اور قاتلانہ حملہ اس وقت ملتان ریلوے سٹیشن پر ہوا جب آپ متحدہ جمہوری محاذ کے دیگر مرکزی رہنماؤں کے ہمراہ بذریعہ خیبر میل کراچی جا رہے تھے۔ ملتان کے سٹیشن پر لاکھوں انسانوں کا جم غفیر اپنے رہنماؤں کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ اور وہاں رہنماؤں کے خطاب کا پروگرام رکھا گیا تھا۔ اس کی تفصیل مولانا قاری نورالحق ایڈوکیٹ نے اپنے ایک مضمون میں بیان کی ہے۔ وہ رقمطراز ہیں۔

> ہوا یوں کہ جب حملہ آور نے خنجر سے مفتی صاحب پر حملہ کیا تو مفتی صاحب جو گاڑی سے بمشکل (ہجوم کی زیادتی کی وجہ سے) اسٹیشن پر اترے۔ دوبارہ تقریر کے لئے انہیں بلایا گیا۔ تو وہ جونہی تقریر کے لئے ڈبے کے اندر چڑھنے لگے۔ تو حملہ آور نے خنجر سے حملہ کر دیا۔ مفتی صاحب حملہ کی زد سے بچ گئے۔ اس کا وار مولوی حفیظ جھنگوی (مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے اس وقت کے طالب علم) کے دائیں بازو پر پڑا۔ جس سے اس کا کرتہ پھٹ گیا اور وہ زخمی بھی ہوگیا۔ حملہ آور کو پکڑ کر پولیس کے حوالہ کیا گیا۔ جونہی

> محاذ کے کارکن پکڑنے کے لئے اس پر جھپٹے پولیس اسے بچا کر لے گئی اور اسے چھوڑ دیا گیا۔ (۹۰)

حضرت مفتی صاحب پر ایک اور قاتلانہ حملہ ضلع قصور کے کھڈیاں اڈہ پر ہوا۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت فرمائی۔ جس کی تفصیلات جناب گل نایاب چترالی نے اس وقت کے روزانہ اخبارات کے حوالہ سے لکھیں ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔

> مارچ ۱۹۷۹ء کے آخر میں پیپلز پارٹی کے دو کرائے کے غنڈوں نے مولانا مفتی محمود پر قاتلانہ حملہ کیا۔ یہ حملہ اس وقت کیا گیا جب مولانا مفتی محمود قومی اتحاد کے رہنماؤں کے ساتھ کھڈیاں اڈہ (موضع قصور) پہنچے تو وہاں اتحاد کے رہنما ان کے استقبال کے لئے موجود تھے انہوں نے مولانا مفتی محمود اور دیگر رہنماؤں سے اصرار کیا کہ وہ ایک ہوٹل چلیں اور اپنے خیالات سے انہیں مستفید کریں۔ چنانچہ مولانا مفتی محمود اور دیگر رہنما مقامی ہوٹل میں گئے۔ وہاں مولانا نے قومی اتحاد کے رضاکاروں سے خطاب کیا۔ جب مولانا مفتی محمود اور دیگر رہنما لاری اڈہ کی طرف روانہ ہوئے تو دو جوان روشن دین تیلی اور احمد دین تیلی ہاتھوں میں چھریاں لہراتے ہوئے بھٹو زندہ باد اور ضیاء الحق مردہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے مولانا مفتی محمود کی طرف بڑھے پاکستان قومی اتحاد کے رضاکاروں نے روشن دین عرف روشی کو جو مفتی صاحب کے قریب پہنچ چکا تھا قابو کر لیا۔ اس افراتفری میں دوسرا حملہ آور احمد دین چھری سمیت غائب ہوگیا۔ رضاکاروں نے روشی کو بمعہ چھری پولیس تھانہ کھڈیاں کے حوالہ کر دیا۔ (۹۱)

مولانا سمیع الحق صاحب نے بھی اپنے ایک مضمون میں مفتی صاحب پر قصور میں قاتلانہ حملہ کا ذکر کیا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں کہ " مفتی صاحب نے حملہ آور کو دیکھتے ہی معاف کر دیا۔ انہوں نے اُس سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اسے کس نے بھیجا ہے"۔ (۹۲)

مفتی صاحب پر کل نو قاتلانہ حملے ہوئے ہیں۔ مگر " جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے" اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان تمام حملوں میں محفوظ رکھا۔ نہ تو دشمن ان کو کوئی گزند پہنچا سکا اور نہ وہ ان

کوکلمہ حق کہنے سے باز رکھ سکے۔ اور یہی ہمارے اکابرین واسلاف کی پاکیزہ زندگیوں کا اوران کے مقصد حیات کا مشن تھا۔ جن پر مفتی صاحب گامزن رہے اوراپنے اخلاف کے لئے عظیم مثالیں بطور نمونہ کے چھوڑیں۔

خواب میں حضور ﷺ کی زیارت

خواب میں حضور ﷺ کی زیارت بہت بڑی سعادت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نصیب فرمادے۔ بعض بزرگ اس کے لئے وظائف کا سہارا لیتے ہیں۔ چلّہ کشی کرتے ہیں۔ خاص تعداد میں دُرود شریف کاوِرد کرتے ہیں۔ پھر بعض کے دل میں حسرت ہی رہ جاتی ہے۔ حضرت مفتی صاحب سے متعلق ایسے دوواقعات تحریری صورت میں ملتے ہیں۔ جس میں آپ خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی سعادت سے سرفرازی کا تذکرہ کرتے ہیں اورایک واقعہ میں ایک صاحب نسبت بزرگ کو مفتی صاحب کے لئے حضور ﷺ پیغام دیتے ہیں۔

حافظ بشیر احمد کمال صاحب (جو کہ آج کل دعوۃ اکیڈمی، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں ڈپٹی ڈائریکٹر ہیں) تحریر کرتے ہیں۔ کہ مفتی صاحب نے بتایا۔

> ایک دفعہ خواب دیکھ رہاہوں۔ کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور صحابہ کرامؓ ایک جگہ پر تشریف فرماہیں۔ اوراسی مجلس میں مَیں بھی نہایت شرمندگی اور ندامت کے ساتھ ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اسی اثناء میں ایک صحابی نے حضور ﷺ سے ایک مسئلہ پوچھا تو حضور ﷺ نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ سامنے جو سوفی صاحب بیٹھے ہیں یہ مسئلہ ان سے پوچھئے تو آپ کو صحیح سمجھائے گا۔ (۹۳)

مفتی صاحب کا ایک دوسراخواب جس میں آپ کو رسول اللہ ﷺ کی زیارت نصیب ہوتی ہے۔ وہ مولانا فضل الرحمٰن کا بیان کردہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ہم نے انہیں (مفتی صاحب کو) ۱۱راکتوبر ۱۹۸۰ء کو کراچی کے لئے رخصت کیا جہاں سے وہ عازم جدّہ ہونے والے تھے۔ اس سے قبل ملتان میں ہمیں بتایا کہ انہیں خواب میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ حضور ﷺ قبر مبارک میں لیٹے ہوئے ہیں۔ ہمارے درمیان کوئی چیز حائل نہیں اور حضور ﷺ مجھے بلارہے ہیں۔ (۹۴)
>
> مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے اس خواب کی مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت مفتی نے بتایا کہ اس خواب میں حضور ﷺ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ "اپنوں کو تقلید سے بچاؤ" مفتی صاحب نے بتایا کہ جب میں نے یہ سنا تو خواب ہی خواب میں میرا ذہن "تقلید ائمہ" کی طرف گیا۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ "قیاسات ائمہ تو عین نصوص ہیں" تو اس سے میرے خدشہ کا ازالہ ہوگیا۔ اور میں سمجھ گیا کہ یہاں تقلید سے مراد حضور ﷺ کا "غیروں کی تقلید ہے"۔ کہ اس سے مسلمانوں کو بچاؤ۔ نہ کہ تقلید ائمہ۔

یہی خواب مفتی صاحب نے رائیونڈ کے اجتماع سے واپسی پر مولانا عبیداللہ انور صاحب کو بھی سنایا تھا۔ بقول مولانا عبیداللہ انور "مفتی صاحب نے اس خواب کی تعبیر یہ بیان کی کہ آپ کا بلانا اس دنیا سے واپس ہونے کا اشارہ ہے"۔ (۹۵)

اور خواب کا وہ واقعہ جس میں ایک صاحب نسبت بزرگ کے ذریعہ حضور ﷺ، مفتی صاحب کو پیغام دیتے ہیں وہ مولانا قاری سعید الرحمٰن کا تحریر شدہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> آخر میں ایک ایسی بات کہنا چاہتا ہوں جس سے مفتی صاحب نے اپنی زندگی میں بیان کرنے سے منع فرمایا تھا۔ مدینہ منورہ میں ایک صاحب نسبت بزرگ نے خواب میں حضور ﷺ کی زیارت کی اور حضور ﷺ کی طرف سے مفتی صاحب کو ان الفاظ میں پیغام بشارت دیا۔
>
> قُلْ لَـہ مِنِّي السَّلام يتقوى بالله و لا يقول الا الحقّ و الله يقول الحق و يهدى السبيل۔

ترجمہ: میری طرف سے آپ کو سلام کہیں، ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے قوت وطاقت کے طلب گار ہو۔ ہمیشہ حق بات کہیں۔ اللہ تعالیٰ سچ اور حق کہتا ہے اور صحیح راستے کی رہنمائی کرتا ہے۔

میں نے جب عرض کیا کہ حضرت سفر نامے میں اس کو شائع کیا جائے تو پہلے تو کچھ نہ کہا۔ جب ریاض جانے کے لئے مدینہ منوّرہ ایئرپورٹ کی طرف جارہے تھے تو ازخود فرمایا کہ اس خواب کو مت لکھو اس سے خودستائی کا پہلو نکل آئے۔(۹۶)

حضرت مفتی صاحب کو خواب میں زیارت رسول ﷺ سے یقیناً کئی بار نوازا گیا ہے۔ کیونکہ اس ضمن میں آپ سے جب سوال کیا گیا۔ اور آپ نے اس کا جواب دیا۔ تو وہ منظر بڑا رقت آمیز تھا۔ آپ کے شاگرد رشید جناب محمد شریف عثمانی صاحب لکھتے ہیں۔

(دوران درس) ایک ساتھی نے سوال کر ڈالا۔ حضرت! کبھی زیارت رسول ﷺ بھی ہوئی ہے؟ بلاریب اس عظیم انسان سے عظیم سوال تھا۔

سب کے دل دھڑکنے لگے۔ مشتاق نگاہوں نے توجہ کی۔ یوں گویا ہوئے۔ عزیز ساتھیو! ہمارے اکابر کا طریق رہا ہے کہ جس کے اظہار میں ریاکاری کی بو آئے اس سے اجتناب ضروری ہے۔ ممکن ہے میرا کچھ کہنا ریاکاری پر محمول ہو۔ پھر کیا تھا کہرام مچ گیا۔ دل بے قرار ہوگئے۔ شیخ کے اس اشارے پر ترحمنا شیخ کی صدائیں بلند ہوئی۔ محدث کبیرؒ نے نگاہِ عاطفت جو گھمائی مرکز توجہ بن گئی۔ فرمانے لگے "بھائی آخر ہم بھی تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے خوشہ چین ہیں۔ بھلا وہ بھی کوئی محدث ہے جسے حدیث والے کی زیارت نصیب نہ ہو"۔ اس جملہ کا اظہار تھا کہ سب کی انکھوں میں آنسو بھر آئے۔(۹۷)

بیرون ملک سفر

مفتی صاحب نے کتنے اور کن کن ممالک کے سفر کئے ہیں۔ پوری تفصیل تو معلوم نہ ہو سکی اور نہ ہی تاریخوں کے اعتبار سے ان کا تعین ممکن ہو سکا۔ مگر اس کے باوجود جو کچھ اس وقت کے رسائل و جرائد سے معلوم ہو سکا۔ ان کی مدد سے اس کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

مفتی صاحب نے تعلیم سے فراغت کے بعد ایک سفر افغانستان کا کیا ہے۔ لیکن مہینہ اور سن معلوم نہ ہو سکا۔ وہ خود اس سفر کا تذکرہ بار بار فرمایا کرتے تھے۔

"آپ نے سب سے پہلا حج مئی ۱۹۶۰ء میں کیا ہے"۔(۹۸)

روزنامہ "ترجمان اسلام" لاہور کے مطابق ۲۰/اپریل ۱۹۶۰ء کو بحری جہاز کے ذریعہ کراچی سے آپ حج کی ادائیگی کے لئے روانہ ہوئے۔ جبکہ ۱۵/جولائی ۱۹۶۰ء کو آپ کی حج مبارک سے واپسی ہوئی۔

مارچ ۱۹۶۴ء مطابق ذی قعدہ ۱۳۸۳ھ آپ حکومت مصر کی دعوت پر مجمع البحوث الاسلامیة کے اجلاس میں شرکت کے لئے مصر تشریف لے گئے تھے۔ جس کے اجلاس جامعہ ازہر میں منعقد ہوئے تھے۔ ڈاکٹر احمد حسین کمال لکھتے ہیں۔

جنوری ۱۹۶۴ء میں جامعہ ازہر کے ریکٹر کی طرف سے، مولانا غلام غوث اور حضرت مفتی محمود کو ازہر میں قائم ہونے والے ایک جدید اسلامی شعبہ کی تقریبات میں شرکت کی دعوت موصول ہوئی۔ مارچ کے اوائل میں یہ دونوں حضرات اور ان کے ساتھ مولانا محمد یوسف بنوری قاہرہ تشریف لے گئے۔ اس دورہ میں مشرقی پاکستان کے مولانا تاج الاسلام صاحب بھی شریک تھے۔(۹۹)

مصر سے واپسی پر آپ سعودی عرب بھی گئے تھے۔ اور دوسرا حج ادا فرمایا تھا۔

حکومت مصر کی دعوت پر آپ دوسری مرتبہ ۱۹۶۵ء (مطابق محرم ۱۳۸۴ھ) میں مجمع البحوث الاسلامیة کے اجلاس میں شرکت کے لئے مصر گئے تھے۔ اور واپسی پر حج کی ادائیگی کے لئے سعودی عرب گئے تھے۔ جون ۱۹۶۵ء میں واپسی ہوئی تھی۔ جناب ڈاکٹر احمد حسین کمال صاحب رقمطراز ہیں۔

> حکومت مصر کے زیر اہتمام جامعہ ازہر نے قاہرہ میں علماء اسلام کی بین الاقوامی کانفرنس بلائی جس کے انعقاد کی تاریخیں مئی ۱۹۶۵ء میں مقرر کی گئی تھیں۔ اس کانفرنس میں حصہ لینے کی دعوت حضرت مفتی محمود اور مولانا غلام غوث ہزاروی کو بھی موصول ہوئی۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات اس دعوت پر قاہرہ تشریف لے گئے۔ ....
>
> ....جمعیۃ کے دونوں قائدین کانفرنس کی مصروفیتوں سے فارغ ہو کر دیار حبیب کی زیارت کے لئے گئے اور جون ۱۹۶۵ء میں یہ دونوں حضرات وطن واپس تشریف لے آئے۔ (۱۰۰)

۲۹ر ستمبر ۱۹۶۶ء (مطابق جمادی الاولیٰ ۱۳۸۶ھ) میں آپ تیسری مرتبہ مصری حکومت کی دعوت پر تشریف لے گئے تھے۔ واپسی پر عمرہ کی سعادت حاصل کی تھی۔

۱۲ر جولائی ۱۹۷۱ء (جمادی الاولیٰ ۱۳۹۱ھ) کو آپ نے ایک وفد کے ہمراہ مصر، لیبیا، سوڈان، شام، لبنان، کویت اور سعودی عرب کا دورہ کیا تھا۔ عہد ساز قیادت میں ہے کہ "۱۹۷۱ء کا سال بہت زیادہ دوڑ دھوپ میں گزرا۔ حضرت مفتی صاحب اور مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی سال کے وسط میں مصر، لیبیا اور سعودی عرب کے دورے پر گئے"۔ (۱۰۱)

> ۱۹۷۱ء ہی میں آپ کو روس کے مسلمان علماء کی طرف سے ایک اسلامی کانفرنس میں شرکت کی دعوت ملی۔ مگر بروقت پاسپورٹ کے نہ ملنے کی وجہ سے آپ نہ جاسکے۔
>
> عہد ساز قیادت میں ہے۔

> اسی سال روس سے بھی مفتی صاحب کو ایک اسلامی کانفرنس میں شرکت کی دعوت ملی لیکن یحیٰی حکومت کے لیت ولعل سے وقت پر پاسپورٹ تیار نہ ہو سکا اور مفتی صاحب کا تاشقند جانا نہیں ہوا۔ (۱۰۲)

جنوری ۱۹۷۲ء میں ایک سرکاری وفد میں مولانا غلام غوث ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں حج کا سفر فرمایا۔ جہاں وفد نے پاکستانی زائرین کے لئے کئے جانے والے فلاح و بہبود کے انتظامات کا جائزہ لینا تھا۔

اگلے سال ۱۹۷۳ء میں جبکہ آپ ان دنوں صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے ایک وفد کے ہمراہ آپ نے حج ادا فرمایا۔ اس وفد میں آپ کے ہمراہ مولانا غلام غوث ہزاروی صاحبؒ، مولانا عبد الحق صاحب اکوڑہ خٹک اور مولانا عبد الحکیم ایم این اے بھی تھے۔

۱۵ر جنوری ۱۹۷۳ء کو آپ بمع وفد حج کی ادائیگی کے لئے تشریف لے گئے تھے۔

۱۹۷۷ء میں جنرل ضیاء الحق کا مارشل لاء نافذ ہوا۔ اس نے ۹۰ دن کے اندر ۱۸ر اکتوبر ۱۹۷۷ء کو انتخابات کرانے کا اعلان کیا۔ ملک میں خوب گہما گہمی تھی۔ کہ اس نے اچانک ۱۵ر اکتوبر کو اعلان کر کے انتخابات ملتوی کروائے۔ اس سے دل برداشتہ ہو کر مفتی صاحب عرب ممالک کے دورہ پر تشریف لے گئے۔ چھ ہفتوں پر محیط اس دورہ میں آپ نے حج کی سعادت حاصل کی اور ۲۹ر نومبر ۱۹۷۷ء کو پاکستان واپس تشریف لائے۔ "مولانا مفتی محمود کی سیاسی زندگی" میں ہے "ان دنوں مولانا مفتی محمود عرب ممالک کے دورہ پر تھے۔ چھ ہفتوں کے غیر ملکی دورے کے بعد ۲۹ نومبر کو واپس کراچی پہنچے"۔ (۱۰۳)

اکتوبر ۱۹۷۸ء میں آپ نے حضرت الامیر حافظ الحدیث حضرت مولانا عبد اللہ درخواستی کی معیت میں حج کی سعادت حاصل کی۔

جولائی ۱۹۷۹ء میں آپ سعودی عرب کی حکومت کی دعوت پر مقابلہ حسن قراءت میں جج کی حیثیت سے تشریف لے گئے۔ راقم الحروف نے لکھا ہے کہ "۱۹۷۹ء میں سعودی عرب میں "مقابلہ حسن قراءت کانفرنس" میں وہاں کی حکومت کی دعوت پر شریک ہوئے اور منصف کے فرائض انجام دیئے"۔(۱۰۴)

مئی ۱۹۷۹ء میں آپ نے وزارۃ الاوقاف حکومت کویت کی دعوت پر کویت کا دورہ کیا۔ اسی سفر میں آپ نے ساؤتھ افریقہ کا بھی دورہ کیا۔(۱۰۵)

۱۹۸۰ء میں آپ نے حکومت ایران کی دعوت پر ایک وفد کے ہمراہ ایران کا دورہ کیا۔ اور مارچ ۱۹۸۰ء میں "صد سالہ جشن دارالعلوم دیوبند" میں شرکت کے لئے ہندوستان تشریف لے گئے تھے۔ سینکڑوں علماء کے وفد کی آپ نے قیادت کی تھی۔

مفتی صاحب کو جب عظیم الشان تاریخی اجتماع میں دعوت خطاب دی گئی۔ تو آپ نے اپنے خطاب کے آخر میں اسی طرح کے اجتماع کے انعقاد کی پاکستان، افغانستان اور بنگلہ دیش میں تجویز پیش کی۔ اور آپ نے اپنی طرف سے اور اپنی جماعت "جمعیۃ علماء اسلام" کی طرف سے اس اجتماع کی میزبانی کی پیشکش بھی کر دی۔ آپ نے فرمایا "اس لئے میری تجویز یہ ہے کہ بالکل اسی انداز میں جس طرح دارالعلوم دیوبند میں صد سالہ جشن کا انعقاد کیا گیا ہے اس طرح پاکستان، بنگلہ دیش اور افغانستان میں بھی خدمات سو سالہ دارالعلوم دیوبند کے اجتماعات کا انعقاد کیا جائے۔ تاکہ ایک طرف پوری دنیا کے سامنے دیوبند کا صد سالہ تاریخی کردار سامنے آئے اور دیوبند سے وابستہ کروڑوں افراد اپنے اکابرین کے علوم سے استفادہ کریں اور ان کے دیدار سے سیر اب ہوں۔ پاکستان کے سلسلے میں، میں پیشکش کرتا ہوں کہ میں اور میری جماعت جمعیۃ علماء اسلام تمام تر سیاسی وابستگیوں اور مفادات سے بالاتر ہو کر اپنی مادر علمی کی خدمت کے جذبے کے پیش نظر اس اجلاس کی میزبانی اور اکابرین کی خدمات کے لئے تیار ہیں۔ اور اگر دارالعلوم دیوبند براہ راست خود

میزبانی کرے تو خدام کی حیثیت سے بھی کام کرنے کے لئے تیار ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میری اس تجویز کو اخلاص پر محمول کرتے ہوئے اس کو شرف قبولیت بخشا جائے گا"۔

مفتی صاحب کی اس پیشکش اور تجویز سے حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ سمیت سب حاضرین بہت متاثر ہوئے۔ ایک طرف قاری صاحبؒ نے اس کو بہت سراہا۔ دوسری طرف جمعیۃ علماء ہند کے اکابرین نے بھی اس کو پذیرائی بخشی۔ لیکن مفتی صاحب کے ساتھ زندگی نے وفا نہیں کی۔ اور ۱۴ر اکتوبر ۱۹۸۰ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ قدرت نے یہ اعزاز مولانا فضل الرحمٰن صاحب اور جمعیۃ علماء اسلام کے دیگر اکابرین کے حصہ میں لکھ رکھا تھا۔ تاخیر تو اس میں واقعتاً ہوئی مگر اس کی کچھ وجوہات بھی تھیں۔

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا

اور "صد سالہ خدمات دار العلوم دیوبند" کے سلسلے میں جس اجتماع کی پیشکش مفتی صاحب نے کر دی تھی وہ قرعہ فال ان کے لائق فائق فرزند مولانا فضل الرحمٰن امیر جمعیۃ علماء اسلام کے نام نکلا۔ اور یہ اجتماع ڈیڑھ صد سالہ خدمات دار العلوم دیوبند کے نام سے صوبہ سرحد کے صدر مقام پشاور میں ۹، ۱۰، ۱۱ر اپریل ۲۰۰۱ء کو منعقد کیا گیا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس اجتماع میں ملک بھر سے ۲۲ لاکھ افراد نے شرکت کی۔ دار العلوم دیوبند سے مہتمم و شیخ الحدیث مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مدظلہ کی قیادت میں ۲۰ علماء پر مشتمل وفد، جمعیۃ علماء ہند کا وفد مولانا محمد اسعد مدنیؒ کی قیادت، اور ایک وفد چار علماء پر مشتمل مولانا شاہ عالم صاحب کی قیادت میں شریک ہوا۔ اس کے علاوہ یو کے، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، لیبیا، بنگلہ دیش، جنوبی افریقہ اور افغانستان و ایران کے وفود نے شرکت کی۔

جب افغانستان کے امیر المجاہدین ملا محمد عمر کا کیسٹ کے ذریعہ ریکارڈ پیغام سنایا گیا تو یہ بڑا جذباتی منظر تھا۔

اس موقعہ پر تمام بزرگ علماء نے مولانا فضل الرحمٰن کی دستار بندی کی۔

لاحق بیماریاں اور علاج

مفتی صاحب قابل رشک صحت کے مالک تھے۔ محنت ومشقت کے عادی ورزشی جسم پایا تھا۔ لیکن اس کے باوجود بھاری جسم کے مالک تھے۔ پچاس سال کے عمر کے بعد متعدد بیماریاں لاحق ہوئیں ٹیسٹ کرانے پر پتہ چلا کہ شوگر کا مرض ہے جس کا اثر یہ ظاہر ہوا جیسا محمد شریف کیانی معاون مدیر قومی ڈائجسٹ نے آپ کی تمام بیماریوں کی تفصیل بیان کی ہے۔

مفتی صاحب کو شوگر اور پیر میں تکلیف کے علاوہ بھی اور کئی طرح کے امراض نے گھیر رکھا تھا۔............ پہلی بار بائیں پیر کی چنگلیا میں تکلیف شروع ہوئی تھی۔ انگلیوں کے درمیان زخم ہو جاتا۔ چار پانچ ماہ کے علاج سے یہ زخم ٹھیک ہو گیا۔ دوسرے سال حج پر گئے تو انگلی ٹھیک تھی لیکن داہنے پیر کے انگوٹھے میں سامنے کے رُخ ایسا لمبا زخم نمودار ہو چکا تھا۔............ .... ایک بار وزن بڑھ گیا تو دل کی تکلیف شروع ہو گئی۔ کئی دن تک ہسپتال میں رہنا پڑا۔............ .... مفتی کے جسم میں شوگر کی مقدار بڑھنے لگی تھی۔ اور معاملہ گولیوں سے کنٹرول نہیں ہو رہا تھا ڈاکٹروں نے ان کے لئے انسولین تجویز کئے تھے۔............ پھر آہستہ آہستہ انہیں مفتی صاحب کو اینٹی بائیوٹک بھی لگانی پڑ گئیں کیونکہ ان کے پاؤں میں زخم بھی تھا۔(۱۰۶)

انگوٹھے کے زخم نے جب شدت اختیار کرلی اور ڈاکٹروں نے اس کے لئے آپریشن تجویز کیا۔ تو مفتی صاحب نے بجائے اس کے کہ کسی اعلیٰ ہسپتال میں کسی اچھے سرجن سے آپریشن کراتے ڈیرہ اسماعیل خان کے بگوانی شمالی نام کے گاؤں کے مشہور جراح سے اس کا علاج کرایا۔

شروع میں اس نے پٹی لگوانی شروع کی مگر جب اس سے افاقہ نہ ہوا تو اس نے بھی انگوٹھے کے جوڑ کی ہڈی نکالنے کی تجویز پیش کر دی۔ اور بھری بیٹھک میں بغیر کسی نشے یا دوائی کے زخم کو "الماس" لگائی اور زور سے اس کے جوڑ کو توڑا۔ اور ہڈی باہر نکالی۔ اور پٹی لگا دی۔ راقم الحروف بھی اس مجلس میں موجود تھا۔ مگر عین آپریشن کے وقت ناقابل برداشت منظر کی وجہ سے باہر نکل گیا۔ لیکن مفتی صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اور جب بعد میں ان سے تکلیف کے بارے میں پوچھا جاتا تو مذاق میں بات کو ٹال دیتے۔ لیکن اس کے باوجود انگوٹھے کا زخم صحیح نہ ہو سکا تو سرجن سے رجوع کیا۔ CMH راولپنڈی کے ڈاکٹر آف سرجری جناب لیفٹیننٹ جنرل (ر) ڈاکٹر شوکت حسن صاحب اس کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

مجھے صحیح تاریخ یاد نہیں شاید ۷۸ء کے دنوں کی بات ہے مفتی صاحب نے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ وہ سرکار یا حکومت کی وساطت سے مجھ تک نہیں پہنچے تھے بلکہ میری شہرت سن کر از خود اپنے علاج کے لئے آئے تھے۔ میں ان دنوں CMH پنڈی میں ہوتا تھا۔ وہ تقریباً اسّی دن میرے زیر علاج رہے۔ ملک کی ایک اہم سیاسی شخصیت تھے۔ اس لئے ہم نے VIP کی طرح ان کی دیکھ بھال کی اور علاج معالجہ پر جتنا خرچ بھی اٹھا وہ حکومت نے برداشت کیا۔ مفتی صاحب کے ایک پاؤں کے انگوٹھے سے پیپ رستی رہتی تھی۔ CMH پنڈی آنے سے پہلے وہ کراچی میں علاج کراتے رہے تھے۔ ڈاکٹر بیرونی طور پر دوائیں لگا کر اور مفتی صاحب کو انٹی بائیوٹک استعمال کرا کر زخم کا علاج کرتے۔ اس سے وقتی طور پر انہیں کچھ آرام آجاتا۔ لیکن چونکہ تکلیف اور فساد کی اصل جڑ اپنی جگہ بدستور موجود رہتی اس لئے کچھ عرصہ بعد ان کی تکلیف دوبارہ عود کر آتی۔ ہم نے CMH میں مفتی صاحب کے ایکسرے لئے اور خون پیشاب کے ٹیسٹ لئے تو انکشاف ہوا انہیں شوگر کے علاوہ بلڈ پریشر اور شریانوں میں کیلشیم کی تکلیف بھی ہے ایک چیز ہوتی ہے کولیسٹرول۔ یہ خون کی نالیوں میں زیادہ عرصہ تک موجود رہے تو پھر کیلشیم آتی

ہے اور یہ تکلیف یا شکایت جسم کے مختلف حصوں میں ہو سکتی ہے مثلاً ٹانگوں میں یا دماغ میں۔ یہ ایک ایسا مرض ہے کہ ڈاکٹر اسے دواؤں کے ذریعے کنٹرول تو کر سکتے ہیں لیکن ایک بار اگر یہ صورت پیدا ہو جائے تو پھر اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ اس کے برعکس اس کی زیادتی بڑھنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔

جناب ڈاکٹر ملک شوکت حسن صاحب نے مفتی صاحب کے تمام امراض کی تفصیل بیان کی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے مفتی صاحب کے ان امراض کا علاج کیسے کیا۔ مزید بیان جاری رکھتے ہوئے وہ اس کی تفصیل بتاتے ہیں۔

میرا کام بحیثیت سرجن مفتی صاحب کے انگوٹھے کے زخم کا علاج کرنا تھا۔ باقی امراض اور تکالیف کی دیکھ بھال اور علاج فزیشن کی ذمہ داری تھی۔ لیکن ہم لوگ یعنی سرجن اور فزیشن دونوں مل کر سوچتے کیونکہ آپریشن بہر حال ٹوٹل علاج کا ایک جزو تھا۔
ایکسرے اور لیبارٹری رپورٹوں کی روشنی میں مَیں نے مفتی صاحب کے انگوٹھے کے آپریشن کا فیصلہ کیا۔ مجھے پیر کا بڑھا ہوا حصہ کاٹنا تھا۔ شوگر کے مرض کی ایک پیچیدہ صورت تھی اس مرض میں یوں ہوتا ہے کہ اگر ٹھیک کر باقاعدگی سے علاج نہ کرایا جائے اور مریض کو مناسب آرام و سکون میسر نہ ہو تو اعصاب اور ریشے سن ہو کر آہستہ آہستہ بالکل مردہ ہو جاتے ہیں اور متاثرہ حصے میں زندگی کا احساس ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ مفتی صاحب کے انگوٹھے کے زخم کی بھی یہی کیفیت تھی۔ شوگر کی وجہ سے ان کے انگوٹھے میں مردہ اعصاب اور ریشوں کا ایک گچھا سا بن گیا تھا اور اس سے پیپ بہتی رہتی تھی۔ طبی اصطلاح میں ہم اسے "سلف" کہتے ہیں۔ میں نے زخم کھول کر اس "سلف" کو کاٹ کر نکال دیا اور صحت مند ریشے اور اعصاب باقی رہنے دیئے۔
مفتی صاحب کے پیر کا آپریشن تھا اس لئے یہ کوئی خطرناک آپریشن نہیں تھا۔ آپریشن کو چھوٹا یا بڑا، کے خانوں میں تقسیم کرنا درست نہیں۔ آپریشن چھوٹا ہو یا بڑا سرجن کو بہر حال پوری توجہ اور دھیان سے کرنا پڑتا ہے مجھے مفتی صاحب کے انگوٹھے کے آپریشن میں تقریباً آدھ گھنٹہ لگا۔ آپریشن کامیاب رہا۔ زخم تیزی سے مندمل ہونے

لگا۔ اور ان کا پیر بڑی حد تک ٹھیک ہو گیا۔ اس دوران باقی امراض کا علاج بھی ہوتا رہا۔ کچھ دواؤں کچھ ڈائٹ (خوراک) کنٹرول سے۔

آخر میں ڈاکٹر صاحب ہسپتال سے رخصت ہوتے وقت مفتی صاحب کی صحت کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

مفتی صاحب ہسپتال سے رخصت ہوئے تو ان کی صحت بدرجہا بہتر تھی بلڈ پریشر اور شوگر کنٹرول کر لیا گیا تھا انگوٹھے کا زخم بھی ٹھیک ہو چلا تھا۔ (۱۰۷)

ان دنوں مفتی صاحب کے ڈرائیور ظہور احمد آف لاہور تھے جو کہ مولانا عبید اللہ انور کے مرید تھے اور انہی کے حکم پر وہ ان دنوں مفتی صاحب کے ڈرائیور، خادم اور ڈسپنسر تھے۔ حالانکہ اپنا بہت اچھا کاروبار تھا۔ وہ CMH میں آپریشن کرانے کے بعد مفتی صاحب کی صحت کے بارے میں بتاتے ہیں۔

وہ سی ایم ایچ سے آپریشن کے بعد لاہور تشریف لائے تو میں ہی ان کا پرائیویٹ ڈسپنسر ہوتا۔ ان کے پاؤں کی پٹی کرتا۔ پیشاب ٹیسٹ کرواتا۔ انہوں نے پاؤں کا آپریشن بھی پاؤں سن کئے بغیر کروایا تھا۔ ایک دن پٹی کرتے ہوئے میں نے دیکھا چھ انچ لمبا زخم تھا۔ (۱۸۰)

اور یہی بات ایک مضمون میں مولانا تقی عثمانی صاحب نے بھی لکھی ہے۔

پچھلے دنوں جب میں اسلامی نظریاتی کونسل کا رکن تھا تو کثرت سے اسلام آباد جانا ہوتا تھا۔..................... اسی زمانے میں مفتی صاحب پاؤں کے انگوٹھے کے آپریشن کے سلسلے میں کافی مدت تک CMH میں مقیم رہے وہاں مفتی صاحب کی خدمت میں طویل طویل نشستیں رہیں۔............

.... اسی دوران حضرت مفتی صاحب کا یہ حیرت انگیز کمال بھی علم میں آیا۔ کہ ان کے انگوٹھے کا کئی انچ گہرا آپریشن اس طرح ہوا کہ مفتی صاحب نے بے ہوش یا سن کرنے والی دوا استعمال کرنے سے انکار کر دیا

تھا۔ ڈاکٹروں نے اصرار بھی کیا کہ یہ خاصا طویل آپریشن ہے اور سن کئے بغیر سخت تکلیف ہوگی۔ لیکن مفتی صاحب نہ مانے اور بالآخر سن کئے بغیر یہ آپریشن کیا گیا۔(۱۰۹)

لیکن بعد میں مفتی صاحب کو ایک اور تکلیف بھی ہوگئی تھی۔ وہ پھیپھڑوں میں پانی کا جمع ہونا ہے جس سے ان کو سانس میں تکلیف ہونے لگی اور لیٹتے وقت بوجھ محسوس کرتے جس سے آرام کرنا بڑا مشکل ہو جاتا۔ مفتی صاحب کی اہلیہ محترمہ نے ایک انٹرویو میں جب ان سے ان کی بیماری یا جسمانی تکلیف کے بارے میں پوچھا گیا، بتایا۔

اس رمضان میں (یعنی وفات سے ڈھائی ماہ پہلے) انہیں تکلیف ہوگئی تھی کہ وہ آرام سے لیٹ نہیں سکتے تھے۔ ہمارے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر کہتے ہیں پھیپھڑوں میں پانی بھر گیا ہے اور میرا بھی یہی خیال ہے کیونکہ جب میں لیٹتا ہوں تو تھوڑی دیر بعد بوجھ سا محسوس ہونے لگتا ہے۔ لیکن جب اٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں تو آرام آجاتا ہے۔ رات کو سوتے سوتے اچانک اٹھ کر بیٹھ جاتے ہم پوچھتے تو بتاتے کہ سینے پر بوجھ سا محسوس ہو رہا ہے تھوڑی دیر بعد ذرا افاقہ محسوس ہوتا تو دوبارہ لیٹ جاتے۔(۱۱۰)

مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے بتایا۔

حج کی سعادت حاصل کرنے کے لئے جس دن مفتی صاحب نے ملتان سے کراچی روانہ ہونا تھا اس سے قبل رات کو نماز عشاء کی ادائیگی کے بعد ملتان کے مشہور معالج، حکیم حاذق حنیف اللہ خان صاحب نے مفتی صاحب کا طبی معائنہ کیا۔

حکیم صاحب نے مفتی صاحب کو سفر حج پر نہ جانے کا مشورہ دیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ آپ ۱۶ دن تک میرا علاج کرائیں۔ لیکن شرط یہ ہوگی کہ ان ۱۶ دنوں میں آپ کوئی عمل نہیں کریں گے۔ اور صرف میری ہی ہدایات کے مطابق عمل پیرا ہوں گے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ صحت یاب ہو جائیں گے۔ حکیم صاحب نے مفتی صاحب کو بتایا کہ آپ کا دل بہت کمزور ہے۔ اگر خدانخواستہ ایک بھی دورہ آیا وہ برداشت نہیں کرسکے گا۔ وہ اس کا آخری دورہ ہوگا۔ مفتی صاحب

نے جواباً فرمایا حکیم صاحب آپ مجھے بے عمل کرنا چاہتے ہیں۔ پھر تو ایسی "بے عملی" کے لئے قبر ہی اچھی جگہ ہے۔ میں جب تک زندہ ہوں میں عمل و حرکت نہیں چھوڑ سکتا۔ اور حکیم صاحب موت کا جو دن مقرر ہے اس کو ٹالا نہیں جاسکتا۔ وہ اسی دن آکر رہے گی۔ پھر بے عمل ہو کر زندگی کے بقیہ دن کیوں گزاروں۔

مفتی صاحب کے معالج خصوصی ڈاکٹر محمد رحمٰن صاحب (جو کہ اس وقت جناح میڈیکل سنٹر کراچی سے منسلک تھے۔ ہارٹ سپیشلسٹ اور سرجن ہیں۔ اور آج کل رحمٰن میڈیکل سنٹر حیات آباد پشاور سے منسلک ہیں جو کہ انہیں کے نام پر اس سنٹر کا نام رکھا گیا ہے) وہ مفتی صاحب کے امراض کے بارے میں بتاتے ہیں۔

مفتی صاحب کو بنیادی طور پر دو بیماریاں تھیں۔ گردوں کی تکلیف اور شوگر کی تکلیف البتہ کبھی کبھی آپ کو دل میں ہلکا سا درد محسوس ہوتا تھا۔ جو اتنی خطرے والی بات نہیں تھی کیونکہ یہ کوئی باقاعدہ بیماری نہیں ہے۔ عموماً اس عمر میں استطاعت سے زیادہ محنت کی وجہ سے ایسا ہو جاتا ہے۔

مفتی صاحب میرے پاس اڑھائی سال تک زیر علاج رہے۔ میں نے ان کے جتنے بھی میڈیکل ٹیسٹ لئے دل میں تکلیف نام کو بھی نہ تھی۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ آپ کا انتقال دل کے دورہ سے ہوا مفتی صاحب کے پھیپھڑوں میں پانی تھا۔ گردوں میں تکلیف کی وجہ سے بدن اکثر سوج جاتا تھا۔ پاؤں کے انگوٹھے میں سوجن بھی تھا۔ جو کہ شوگر کی بیماری میں عام طور پر ہو جاتا ہے پھر بخار اور گردوں پر بوجھ جسمانی طور پر بہت کمزور کر دیتے تھے۔

میں نے مفتی صاحب کو مختلف اوقات میں تین مرتبہ چیک کیا تینوں مرتبہ آپ کو شدید بخار تھا۔ اور پاؤں میں انفیکشن کی وجہ سے بدن سوجا ہوا تھا انفیکشن کے لئے علاج انہیں انسولین دی جاتی تھی وہ انسولین سے ٹھیک ہو جایا کرتے تھے۔

انتقال سے ایک روز پہلے انہوں نے مجھے بلایا اور فرمایا "میں پرسوں حج پر جا رہا ہوں چلتے وقت طبی معائنہ ضروری ہے۔ اس وقت مفتی صاحب کی صحت بہت اچھی تھی۔ ڈاکٹر صمد میرے ساتھ تھے۔(۱۱۱)

اتنی بیماریوں اور جسمانی تکالیف کے باوجود مفتی صاحب کبھی شکایت زبان پر نہ لاتے۔ اور نہ ہی ان کا تذکرہ کرنا پسند کرتے بلکہ ان تکالیف کے باوجود خوش طبعی اور شگفتگی میں کبھی فرق نہ لاتے۔ اور ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے حسب روایت بے تکلف دوستوں اور شاگردوں کی محفل میں مزاح بھی کرتے جو شرعی حدود کے اندر ہوتی۔

حج کے لئے روانگی، کراچی آمد اور مصروفیات

مفتی صاحب نے اپنی حیات مستعار میں متعدد بار حج وعمرہ کی سعادت حاصل کی ہے۔ اپنی زندگی کے آخری حج کے بارے میں ایک دفعہ اپنے گھر عبدل خیل میں اپنی اہلیہ محترمہ کے سامنے حج کے ارادہ کا اظہار یوں فرمایا۔ وہ کہتی ہیں "حج پر جانے سے ایک دن پہلے صحن میں پیڑھی پر بیٹھے وضو کر رہے تھے۔ وضو سے فارغ ہو کر کہنے لگے۔ یہ تو اس صدی کا آخری حج ہے نہ معلوم ہم بھی ادا کر سکیں گے یا نہیں"۔(۱۱۲)

۴؍اکتوبر ۱۹۸۰ء کو حضرت مفتی صاحب عبدل خیل سے ملتان پہنچے۔ ۱۱؍اکتوبر ۱۹۸۰ء کو وہاں سے کراچی کے لئے سفر حج کے ارادے سے روانہ ہوئے۔(۱۱۳)

کراچی آمد کے سلسلے میں آپ کی آمد اور قیام اور دیگر مصروفیات کے بارے میں مولانا محمد جمیل خان شہید صاحب لکھتے ہیں۔

> مفتی صاحب نے آخر ایک مرتبہ فرمایا کہ اس مرتبہ حج کرنے کو بہت زیادہ دل چاہتا ہے۔ کیونکہ یہ حج اس صدی کا آخری حج ہے۔ اس دفعہ حج کی سعادت نصیب ہو جائے تو ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے پچھلی پوری صدی کے گناہ معاف فرما دیں۔

> یہی جذبہ تھا کہ جس نے حضرت مفتی صاحب کو اس حج پر آمادہ کیا۔ اور آپ نے اس کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ اس طرح آپ کا حج پر جانا طے ہوا اس دفعہ خلاف توقع حضرت مفتی صاحب نے جمعہ کی نماز (۱۰؍اکتوبر ۱۹۸۰ء) بہت اہتمام کے ساتھ قاسم العلوم (ملتان) کی مسجد میں پڑھائی۔ اور قاسم العلوم والوں نے بڑے اہتمام کو حضرت مفتی صاحب کو حج کے لئے روانہ کیا۔ ورنہ قاسم العلوم والے مفتی صاحب کا حج سے واپسی پر استقبال کرتے تھے۔ جبکہ آپ حج پر بہت چپکے سے تشریف لے جاتے۔ ۱۱؍اکتوبر کو ۱۱ بجے آپ ملتان سے کراچی کے لئے روانہ ہوئے اس بناء پر ۱۱؍اکتوبر ۱۹۸۰ء ایک بجے حضرت مفتی صاحب کی فلائٹ کو ملتان سے کراچی پہنچنا تھا۔ احباب ائیر پورٹ پر استقبال کے لئے گئے۔ چونکہ مجھے دفتر جنگ میں کام کرنا تھا اس بناء پر میں ائیر پورٹ حاضر نہ ہو سکا۔ شیخ محمد حنیف صاحب جس کے یہاں بیماری کے بعد حضرت مفتی صاحب قیام فرماتے ہیں۔ انہوں نے مفتی صاحب سے عرض کیا کہ سیدھا میرے گھر چلیں (کیونکہ حضرت مفتی صاحب ہمیشہ پہلے جامعہ بنوری ٹاؤن تشریف لے جاتے تھے پھر شام کو شیخ صاحب کے یہاں رات قیام کے لئے جاتے) حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ شیخ صاحب پہلے جامعہ بنوری ٹاؤن جاؤں گا اور اپنی "برادری" سے ملوں گا پھر شام کو آپ کے گھر چلوں گا۔ آخر کار آپ ائیر پورٹ سے سیدھے جامعہ بنوری ٹاؤن پہنچے۔.................
>
> ۱۵؍اکتوبر کو حضرت مفتی صاحب کی فلائٹ میں شیخ محمد حنیف کے ساتھ سیٹیں بک تھیں۔ اگرچہ حج کی آخری فلائٹ تو تیرہ تاریخ کو گئی۔ مگر چونکہ حضرت مفتی صاحب کا ویزہ حج کا نہیں بلکہ خصوصی طور پر سعودی حکومت نے جاری کیا تھا۔ اس لئے آپ ۱۵ تاریخ کی حج فلائٹ سے روانہ ہونے کے لئے تیار ہوئے اس طرح تقریباً ۴ دن حضرت مفتی صاحب کو کراچی میں مل گئے۔(۱۱۴)

یہ چاروں دن مفتی صاحب نے کراچی میں خوب مصروف گزارے انہی دنوں میں آپ کا روزانہ معمول رہا کہ آپ کچھ دیر کے لئے ضرور جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن تشریف

لاتے۔ انہی دنوں میں آپ نے ڈاکٹر محمد رحمٰن اور ڈاکٹر صمد سے طبی معائنہ بھی کرایا۔ ڈاکٹر محمد رحمٰن صاحب نے جناب زاہد بلند شہری معاون مدیر "ترجمان اسلام" لاہور کو انٹرویو دیتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں بتایا۔

> انتقال سے ایک روز پہلے انہوں نے مجھے بلوایا اور فرمایا "میں پرسوں حج پر جارہا ہوں چلتے وقت طبی معائینہ ضروری ہے"۔ اس وقت مفتی صاحب کی صحت بہت اچھی تھی۔ ڈاکٹر صمد میرے ساتھ تھے۔ میں نے مفتی صاحب سے ازراہ مزاح کہا۔ مفتی صاحب! آپ تو پھر سے جوان ہوگئے ہیں۔ مفتی صاحب فرمانے لگے اللہ کا کرم ہے اس نے صحت دی ہے۔ انہوں نے فوراً ہی ای سی جی کرائی۔ اس موقع پر بھی دل میں کوئی خاص نقص نہیں تھا۔ پھیپھڑے بالکل صاف تھے اور بخار بھی نہیں تھا۔ مفتی صاحب کی اتنی اچھی صحت میں نے پچھلے اڑھائی سالوں میں نہیں دیکھی۔ انگوٹھے میں البتہ معمولی سازخم تھا۔ میں نے سپرٹ سے صاف کرکے مرہم لگادیا اور عرض کیا "ان شاءاللہ یہ آپ کو کوئی تکلیف نہیں دے گا آپ راستے میں انگوٹھے کو سپرٹ سے صاف کرکے مرہم لگا دیا کریں۔ (۱۱۵)

۱۳/ اکتوبر کو جناب پیر پگاڑا سے ملاقات کے ان کے بنگلہ پر تشریف لے گئے تھے۔ شام کا کھانا بھی انہی کے ہمراہ کھایا تھا۔ (۱۱۶)

۱۴/ اکتوبر کو صبح پروگرام کے مطابق آپ سے ملاقات کے لئے جناب خان عبدالولی خان صاحب، جناب شیر باز خان مزاری اور جناب عابد زبیری صاحب تشریف لائے۔ ان سے ملکی سیاسی حالات پر گفتگو کی۔ (۱۱۷)

اور پھر آپ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن تشریف لے گئے۔ جہاں آپ نے چیدہ چیدہ علماء کرام ومفتیان عظام کو ملاقات کے لئے بلایا تھا۔ اور ان سے زکوٰۃ کے مسئلے پر بات چیت کرنی تھی۔ ۱۲:۵۰ بجے پر آپ نے ان سے "زکوٰۃ کے مسئلہ" پر گفتگو کا آغاز کیا۔ ابھی تقریباً پندرہ

منٹ ہی گزرے تھے کہ آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ اور آپ خالق حقیقی سے جاملے۔

جبکہ مولانا جمیل خان شہید نے لکھا ہے کہ مفتی صاحب کے میزبان شیخ محمد حنیف کے بقول ڈاکٹر صمد صاحب نے مفتی صاحب کی صحت کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا۔ ان کو مکمل آرام کا مشورہ دیا۔ اور حج پر نہ جانے کا مشورہ دیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

> کراچی میں آپ کے دو خصوصی معالج ڈاکٹر عبدالصمد صاحب اور سرجن محمد رحمٰن آپ کو روزانہ آکر چیک کرتے ان کو آپ کی صحت کی طرف سے بہت تشویش تھی وہ باربار یہ کہتے رہے کہ حضرت مفتی صاحب آپ کو آرام کی شدید ضرورت ہے مگر آپ ہنس کر ٹال دیتے۔ مفتی صاحب کے میزبان شیخ محمد حنیف صاحب کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر عبدالصمد صاحب نے حج پر تشریف لے جانے سے قبل فرمایا کہ مفتی صاحب کی صحت بہت خراب ہے آپ اوّل تو یہ کوشش کریں کہ مفتی صاحب حج پر نہ تشریف لے جائیں۔ اگر وہ راضی نہ ہوں تو مفتی صاحب کے آرام کا بہت زیادہ خیال رکھیں۔ ڈاکٹری نقطۂ نظر سے آپ کا یہ عمل آپ کی صحت کے لئے بہت مضر ہے۔ مگر مفتی صاحب ہمیشہ یہ فرماتے تھے کہ چند روزہ زندگی ہے۔ اچھا ہے کسی کام ہی آجائے۔ (۱۱۸)

وفات حسرت آیات

جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی میں اس اہم اجلاس میں شریک علماء حضرات میں سے حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ، مولانا مفتی جمیل خان شہیدؒ اور حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہٗ نے آپ کی وفات کے واقعہ کو تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ اور تقریباً سب نے ایک ہی قسم کے واقعات ذکر کئے ہیں۔ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے لکھا ہے۔

حضرت مفتی صاحب اپنے پہلے نکتے سے فارغ ہو چکے تھے اور دوسرے نکتے کو بیان کرنے سے پہلے بات کو سمیٹ رہے تھے کہ احقر نے، جو اُن کے بالکل سامنے بیٹھا تھا، چہرے پر اچانک معمولی سی کمزوری اور سفیدی محسوس کی اور چند لمحوں کے لئے ہونٹوں میں ہلکی سی لرزش بھی پیدا ہوئی اسی حالت میں اچانک حضرت مفتی صاحب نے اپنا بایاں ہاتھ پیشانی اور سر پر رکھا اور کچھ کہے بغیر بائیں کروٹ پر گر گئے۔ یہ سب کچھ چند ثانیوں میں اس قدر آنا فانا ہو گیا کہ ہم سب حیران و پریشان رہ گئے۔ کسی نے منہ میں پانی ڈالا۔ کسی نے قلب کی مالش شروع کر دی۔ کوئی ڈاکٹر کی تلاش میں دوڑا۔ حواس مجتمع کرنے پر اندازہ یہ ہوا کہ دل کا دورہ پڑا ہے۔ اس کے باوجود کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ آپ کے صرف چند لمحوں کے سانس باقی رہ گئے ہیں۔ دل کے تکلیف کے وقت جو فوری دوا دی جاتی ہے وہ بھی زبان کے نیچے رکھ دی گئی تھی۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے نبض اور سانس دونوں غائب تھے۔ امراض قلب کے ہسپتال میں فون کیا گیا تو ڈاکٹر صاحبان نے صورت حال سننے کے بعد فوراً ہسپتال لانے کا مشورہ دیا۔ ہم انہیں ہسپتال لے گئے۔ وہاں ڈاکٹر صاحبان ہسپتال سے باہر پہلے سے منتظر تھے۔ اور انہوں نے گاڑی ہی میں اپنی کاروائی شروع کر دی۔ بعد میں ایمرجنسی وارڈ لے جاکر تقریباً نصف گھنٹہ تک ڈاکٹر صاحبان کوشش کرتے رہے یہ نصف گھنٹہ انتہائی امید و بیم کی حالت میں گزرا۔ لیکن پیغام اجل آپہنچا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر سیّد سلیم نے باہر نکل کر افسردہ لہجے میں بتایا کہ کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ حضرت مفتی صاحب کی روح ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی پرواز کر چکی تھی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّـآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ (۱۱۹)

مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی وفات کا واقعہ ذرا زیادہ تفصیلات کے ساتھ لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

آج حضرت مفتی صاحب معمول سے زیادہ ہشاش بشاس نظر آئے۔ حضرت مفتی صاحب کے یاد فرمانے پر جناب مولانا محمد رفیع عثمانی مہتمم دارالعلوم کراچی اور جناب مولانا محمد تقی عثمانی قانون زکوٰۃ کے بعض پہلوؤں پر گفتگو کرنے کے لئے تشریف

لائے۔ قریباً ساڑھے بارہ بجے رفیق محترم جناب مولانا محمد جمیل خان (شہید) صاحب راقم الحروف کو باصرار مفتی صاحب کی خدمت میں لے گئے۔ اس ناکارہ کو ان حضرات کی تشریف آوری کا علم نہیں تھا۔ اور نہ ہی موضوع گفتگو کے بارے میں کچھ خبر تھی۔

.... اس وقت مجلس میں یہ حضرات موجود تھے۔ جناب مولانا طاسین صاحب مجلس علمی کراچی، مولانا مفتی احمد الرحمٰن، مولانا محمد رفیع عثمانی، مولانا محمد تقی عثمانی، صاحبزادہ مولوی محمد بنوری اور مولانا جمیل خان (شہید)۔ تھوڑی دیر میں جناب مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر بھی تشریف لائے (بعد میں معلوم ہوا کہ ان کو بھی حضرت مفتی صاحب نے بطور خاص یاد فرمایا تھا) کوئی پندرہ بیس منٹ تک لطف و مزاح کی باتیں ہوتی رہیں۔

.... کہ فقرہ مکمل کر کے ایک لمحے کے لئے خاموش ہوئے بایاں ہاتھ پیشانی پر رکھا اور یکا یک بائیں پہلو کی طرف مائل پیچھے کو گر گئے۔ اس جانب جناب صاحبزادہ مولوی محمد بنوری بیٹھے تھے ان کی گود میں آرہے۔ آج تک کسی کو اتنی آسانی سے مرتے نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے کسی کو وہم بھی نہ ہوا کہ حضرت مفتی صاحب زبان حال سے "لستُ علی صحبتکم بحریص" کہتے ہوئے ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکے ہیں۔ ہم سب یہی سمجھے کہ دل کے دورہ کی وجہ سے سکتہ کی سی بیہوشی ہو گئی ہے اس لئے مولانا طاسین نے منہ میں پانی ڈالا راقم الحروف نے زور سے مقام قلب کو مسلنا شروع کیا۔ ڈاکٹر عبدالرزاق اور مفتی احمد الرحمٰن صاحب نے پاؤں کی مالش شروع کر دی۔ مولانا محمد رفیع صاحب نے زبان کے نیچے وہ دوائی رکھی جو شدید دورۂ قلب میں دی جاتی ہے مولانا تقی عثمانی، مولانا محمد بنوری اور مولانا محمد جمیل خان (شہید) ڈاکٹروں کی طرف دوڑے مگر وہاں کیا رکھا تھا۔ حضرت مفتی صاحب نے وقفہ وقفہ سے دو چار ہچکیاں لیں اور ابدی نیند سو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّـآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ راقم الحروف نے مصنوعی دانت اپنے ہاتھ سے نکالے اور آنکھ پر سے چشمہ اتارا زندگی کی تمام علامتیں ختم ہو چکیں تھیں۔

اور یقین آچکا تھا کہ حضرت مفتی صاحب کی روح پرواز کر چکی ہے لیکن ان کے معالج ڈاکٹروں کا اصرار تھا کہ انہیں ہسپتال ضرور لایا جائے چنانچہ ہسپتال لے گئے۔ اور آدھ گھنٹے تک نظام تنفس جاری کرنے کی کوشش کی گئی بالآخر اشک بار آنکھوں سے جناب ڈاکٹر اسلم صاحب اور ان کے رُفقاء نے موت کی تصدیق کر دی۔(۱۲۰)

مولانا محمد جمیل خان شہید نے لکھا ہے کہ " جس گاڑی میں مفتی صاحب کو ہسپتال لے جایا گیا وہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کی مسجد کے باہر ایک دُکاندار جاوید محمد کی ملکیت تھی اور وہ "سوزوکی" تھی"۔

جنازہ وتدفین

مولانا جمیل خان شہید لکھتے ہیں۔

(۱۴/اکتوبر ۱۹۸۰ء مطابق ۴/ذی الحجہ ۱۴۰۰ھ بروز منگل) دوبجے (بعد از دوپہر) حضرت مفتی صاحب کی وفات کا اعلان کر دیا گیا۔ ساتھی تمام جمع ہوئے کہ آپ کی تدفین کہاں کی جائے۔ ملتان میں صاحبزادہ فضل الرحمٰن صاحب کو ٹیلیفون پر اطلاع دی گئی۔ اور ان کی رائے کے مطابق میت کو ڈیرہ اسماعیل خان لے جانے کی تیاری کی گئی۔ احباب جمع ہوئے کہ جہاز چارٹرڈ کرایا جائے اتنے میں گورنر صاحب کی طرف سے ٹیلی فون آیا کہ صدر صاحب کو اطلاع مل گئی ہے اور انہوں نے حضرت مفتی صاحب کی خدمات کو محسوس کرتے ہوئے ان کے لئے فضائیہ کا جہاز بھیجنے کی پیشکش کی ہے۔ اور وہ چھ بجے روانہ ہو گا۔ اس لئے نماز (جنازہ) کا اعلان عصر کے بعد کیا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ایئر فورس کا طیارہ رات کو ملتان ائیر پورٹ پر نہیں اتر سکتا۔ اس لئے دوسرے دن صبح جہاز میں میت جائے گی۔ عشاء کی نماز کے بعد جنازہ کا اعلان کر دیا گیا۔ مدرسہ کے اسی مہمان خانہ میں غسل کا اہتمام کیا گیا جس میں آپ تشریف رکھتے تھے۔ قاری عبدالحق صاحب اور مولانا عبدالقیوم نعمانی نے طلبہ کی امداد سے حضرت مفتی صاحب کو غسل دیا۔ .... غسل کے بعد آپ کی میت کو جامعہ بنوری ٹاؤن کے دارالحدیث میں دیدار عام کے لئے رکھ دیا گیا۔ عشاء کی نماز تک ہزاروں افراد نے آپ کا دیدار کیا۔ عشاء کی نماز میں پوری مسجد اور مدرسہ لوگوں سے بھر گیا۔ ہر طرف سر ہی سر نظر آرہے تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد جنازہ نماز کے لئے رکھا گیا۔ گورنر سندھ، نواب صاحب (نوابزادہ نصر اللہ خان) ولی خان، پگاڑا صاحب اور ملک کے دوسرے تمام بڑے بڑے رہنما آپ کے جنازہ میں شریک ہوئے۔ جنازہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ قبلہ ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب نے پڑھایا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ حضرت مفتی صاحب کی نماز جنازہ میرے لئے باعث نجات ثابت ہو گا۔ جنازہ کے بعد نعش مبارک دارالحدیث میں دیدار کے لئے رکھ دی گئی۔ تمام رات ہزاروں افراد آپ کی زیارت کرتے رہے۔ جامعہ بنوری ٹاؤن کے طلبہ تمام رات آپ کے سرہانے تلاوت کلام پاک میں مصروف رہے طلبہ نے جس نظم وضبط کا مظاہرہ کیا۔ وہ قابل ستائش ہے۔ صبح نماز فجر سے پہلے آپ کی میت ایمبولینس میں رکھ دی گئی۔.................. ایئر پورٹ پر مفتی احمد الرحمٰن کی اقتداء میں نماز فجر ادا کی گئی۔ نماز فجر کے بعد میت کو جہاز میں رکھا گیا۔ اس سے قبل ائیر فورس کی طرف سے میت کو سلامی پیش کی گئی۔ تقریباً سات بجے جہاز اُڑا اور پورے آٹھ بجے جہاز ملتان ائیر پورٹ پر اترا۔ ملتان ائیر پورٹ پر ہزاروں افراد کا غمزدہ ہجوم موجود تھا۔ میت کو ایک ٹرک پر رکھ کر سپورٹس گراؤنڈ ملتان لے جایا گیا۔ نماز جنازہ حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی مدظلہٗ نے پڑھائی۔ ہجوم کا اصرار تھا کہ دیدار عام کرایا جائے مگر ڈیرہ اور عبدل خیل جانے کی وجہ سے ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ نو بجے ڈیرہ کی طرف جانا تھا مگر پتہ چلا کہ جنرل محمد ضیاء الحق صاحب ڈیرہ میں مفتی صاحب کا خود استقبال فرمائیں گے۔ جہاز تین گھنٹے مؤخر کر دیا گیا۔ اتنے میں مولانا عبیداللہ انور اور میاں طفیل محمد صاحب وغیرہ ائیر پورٹ پہنچ گئے اس لئے ائیر پورٹ پر تیسری مرتبہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔ اور یہ نماز مولانا عبیداللہ انور صاحب نے پڑھائی۔

تقریباً بارہ بجے ملتان ائیر پورٹ سے جہاز روانہ ہوا اور پون گھنٹہ بعد ڈیرہ اسماعیل خان پہنچ گیا۔ ڈیرہ میں گورنر سرحد، اعلیٰ سول اور فوجی حکام اور ہزاروں افراد موجود تھے ڈیرہ اسماعیل خان میں مکمل تعطیل تھی۔ اور ائیر پورٹ سے جناز گاہ تک دونوں طرف ہزاروں افراد کھڑے ہوئے تھے ڈیرہ میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ (ڈیرہ میں نماز جنازہ حضرت صاحبزادہ مولانا محمود صاحب خانقاہ یٰسین زئی کی امامت میں ادا کی گئی) وہاں سے مفتی صاحب کی میت کو ایک کھلی ویگن میں رکھ کر ہزاروں گاڑیوں کے جلوس میں عبدل خیل لے جایا گیا۔ عبدل خیل میں ہر طرف آدمی ہی آدمی نظر آرہے تھے پتہ چلا کہ صدر پاکستان کچھ دیر بعد پہنچنے والے ہیں۔ تین بجے کے قریب صدر صاحب (جنرل ضیاء الحق، چوہدری ظہور الٰہی، چوہدری صفدر، جنرل سوار خان اور کرنل سالک وغیرہ کے ہمراہ) پہنچے۔ اور نماز جنازہ کی تیاری ہوئی۔ نماز جنازہ سے قبل صاحبزادہ فضل الرحمٰن صاحب کی دستار بندی کی گئی۔ (دستار بندی حضرت صاحبزادہ احمد صاحب خانقاہ یٰسین زئی کے دست مبارک سے ہوئی) صاحبزادہ فضل الرحمٰن نے نماز جنازہ پڑھائی۔ (وہ خود ملتان سے جہاز کے ذریعے کراچی پہنچے تھے اور میت کے ساتھ واپس آئے تھے، مگر اس سے قبل کسی جنازہ میں شریک نہیں ہوئے تھے) نماز کے بعد حضرت مفتی صاحب کو ان کی آخری آرام گاہ کی طرف لے جایا گیا۔ صدر پاکستان نے جنازہ کو کندھا دیا۔ مفتی صاحب کو عبدل خیل کے عام قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ سنت کے مطابق کچی قبر بنائی گئی۔ (جو اب تک اسی حالت میں ہے) حضرت مفتی صاحب کے جنازہ کے ہمراہ کراچی سے پچیس افراد اور ملتان سے بیس افراد جہاز میں تشریف لے گئے تھے۔ مولانا عبداللہ درخواستی ملتان سے عبدل خیل تک ساتھ رہے۔ اور نوابزادہ نصر اللہ خان کراچی سے عبدل خیل تک جنازہ کے ہمراہ رہے۔ (۱۲۲)

ذاتی اوصاف و کمالات

مفتی صاحب کی ساری جدوجہد دین اسلام کی سربلندی کے لئے تھی۔ اس لئے دینی معاملات میں کبھی غفلت و کوتاہی کو روانہ رکھتے تھے۔ آپ روزانہ تہجد کا اہتمام کرتے اور اپنے معمولات کو ہر حال میں پورے کرتے۔ باجماعت نماز کا ہمیشہ التزام فرماتے۔ قاری سعید الرحمٰن جو کہ راولپنڈی میں آپ کے میزبان رہے ہیں اور غیر ملکی سفر میں شریک سفر۔ وہ لکھتے ہیں۔

مفتی صاحب عام طور پر رات کو دیر سے سوتے تھے۔ کبھی کبھی دو اڑھائی بج جاتے لیکن صبح سویرے تہجد کے وقت ضرور اٹھتے۔ اور اپنی معمولات پوری کرتے۔ اور بعد نماز فجر تھوڑی دیر کے لئے آرام فرماتے جب بھی کسی تقریب یا دعوت میں جاتے تو وہاں سب سے پہلے نماز کا اہتمام فرماتے اور اس کے بعد پروگرام وغیرہ میں شرکت کرتے۔

مولانا عبید اللہ انور رقمطراز ہیں۔

مفتی صاحب ایک عالم باعمل، عارف باللہ اور ہمارے بزرگوں کی اعلیٰ مجاہدانہ روایات کے محافظ وامین تھے قدرت نے انہیں بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ تحمل و بردباری میں اپنی مثال آپ تھے جس قدر ان کا ظاہر خوبصورت تھا اس قدر ان کا باطن بھی خوبصورت تھا۔

مولانا مفتی محمود کی علمیت، ملکی حالات پر گہری نظر، خدا پرستی اور بے لوث دینی خدمت کے جذبے نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ ملک کا ہر شخص ان کی علمی قابلیت کا معترف تھا۔ اور علمی اور فقہی مسائل کے سلسلے میں ان کی رائے حتمی سمجھی جاتی تھی۔ علوم حدیث کے لئے طلبہ کا ان کی طرف بکثرت رجوع تھا۔......................

حضرت شیخ الہند مولا محمود الحسن نوّر اللہ مرقدہٗ اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں سنا تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور ان کی احکام کی پیروی انہوں نے سیاسی میدان میں کبھی ترک نہیں کی۔ مگر آنکھوں سے اس پر کسی کو عمل پیرا دیکھا تو وہ مفتی محمود تھے۔ آپ نے اپنی پوری زندگی میں سیاسی اتار چڑھاؤ کے باوجود کبھی احکام

خداوندی سے انحراف کیا اور نہ خدا کے علاوہ کسی اور سے خوف محسوس کیا۔ بڑے بڑے اجلاسوں کے دوران آپ نے نماز باجماعت کبھی ترک نہیں کی۔ اور اس کی تلقین وہ اپنے کارکنوں کو بھی کرتے رہے۔ انہیں نہ تو کبھی قتل کی دھمکیوں نے مرعوب کیا اور نہ جیلوں کے خوف سے وہ کلمہ حق سے باز رہے۔ فرماتے کہ جب تک خدا تعالیٰ نے میری زندگی کے دن رکھے ہیں کوئی مجھے مار نہیں سکتا۔ اور جب موت کا وقت آ گیا تو کوئی بچا نہیں سکتا اس بناء پر میں دُنیا والوں سے خوف کیوں کھاؤں۔ (۱۲۴)

کسی بھی قومی رہنما کے لئے شرافت، دیانت اور صداقت ضروری ہیں۔ دنیا میں کتنے رہنما ہیں جن کے تینوں اوصاف کی شہرت ہو؟ ایسا یقیناً ہوں گے لیکن بہت کم۔ مفتی محمود کے ان تینوں اوصاف کی ان کے مخالف بھی گواہی دیتے ہیں۔ وہ انہی اوصاف کی وجہ سے تمام مکاتب فکر کے رہنماؤں اور کارکنوں میں قابل احترام سمجھے جاتے تھے۔

ان کے رفقاء، ہم عصر، ہم سفر اور ہم نشین ان کی فراست، تدبر اور دوسرے اوصاف کے معترف اور قدر دان تھے۔ یہی وہ اوصاف حمیدہ تھے جنہوں نے ملک کے چاروں صوبوں کے عوام میں انہیں ہر دلعزیز رہنما بنا دیا تھا۔ (۱۲۵)

"مفتی صاحب متواضع اور خلیق تھے۔ ان کا علم وسیع اور حلم وسیع تر"۔ (۱۲۶)

مفتی صاحب ایک انتھک انسان تھے۔ مسلسل بھاری بھر کم مجالس میں شرکت، سیاسی مباحث، احباب سے ملاقاتوں، پریس کانفرنسوں، عوامی اجتماعات اور جلسوں میں خطابات کے باوجود اُن میں چڑچڑاپن، اضمحلال، کمزوری کے آثار کبھی نہیں پائے جاتے تھے۔ وہ ہر آنے والے سے بڑے ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ ملتے۔ اجتماعی اور انفرادی مسائل کے حل اور اس سلسلے میں گفتگوئیں اور دُور و نزدیک علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں سے شکایت سننا اُن کے عمومی پروگرام ہوتے۔ آپ کے ہاں امیر و غریب کی کوئی تمیز نہیں تھی۔ غریب بھی اسی عزت و وقار کا اہل ہوتا جیسا کہ کوئی امیر آدمی۔ حتّٰی کہ غیر مسلم وفود بھی جب ملاقات کے لئے حاضر ہوتے تو حضور ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے جیسا کہ آپ نے نجران کے عیسائی وفد کے ساتھ سلوک

کیا تھا۔ ان سے بہتر سے بہتر طور پر پیش آتے۔ ہر بات غور سے سنتے اور ان کے مسائل کے حل کے لئے جو کچھ اُن سے ہو سکتا تھا کرتے۔ طلبہ دینی مدارس کے ہوں یا کالج کے، آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور راہنمائی حاصل کرتے۔ (۱۲۷)

(مفتی صاحب) اپنے آپ کو لوگوں کا خادم سمجھتے تھے ان کے دل میں خدا کا خوف تھا آخرت کا ڈر تھا۔ میں نے بڑے بڑے بردبار لوگوں کو دیکھا ہے لیکن اس قدر بردبار آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھا جو با اختیار بھی ہو اور بردبار بھی............ ان کی سیاست سے ہمیں اختلاف تھا ان کی بعض باتیں ہمارے سیاسی نظریات کے سخت خلاف تھیں لیکن ان کا کردار ایک مؤمن کا کردار تھا۔ ان کا یہ کردار مثالی تھا۔ وہ اس کے آئینے میں کسی دوسری دُنیا کی مخلوق نظر آتے تھے۔ (۱۲۸)

مفتی صاحب ایک روشن دماغ رہنما، روشن ضمیر سیاستدان، بالغ نظر عالم، تجربہ کار فقیہ، صاحب اجتہاد بزرگ، استقامت کے کوہ گراں، شجاعت کے سدّ آہنی، عابد شب زندہ دار اور عارف باللہ انسان تھے۔ ان کا وجود ایسا خضر راہ تھا۔ جو ہر نازک دور میں قوم کی رہنمائی کا پیغام دیتا تھا۔ ان کی ذات ایک ایسی قندیل جو تاریک ترلحات میں روشنی کا مینار ثابت ہوتی تھی۔ دینی طاقتوں کے لئے ان کی شخصیت مرکز ثقل کی حیثیت رکھتی تھی۔ جہاں تک ملکی قوتیں کھنچی چلی آتی تھیں ان کی دل آویز شخصیت دین و سیاست کا ایک حسین امتزاج تھی۔ جسے پاکستان کے تمام علاقوں میں قومی اتحاد و یکجہتی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ ان کی ذات میں قدرت نے ایسی بے بہا صفات جمع کر دی تھیں جنہوں نے ان کو عہد حاضر کی تاریخ ساز شخصیت بنا دیا تھا۔

میرے نزدیک ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بے انتہا بہادر انسان تھے انتخابی معرکوں میں کم نظر و کم سواد مخالفین ہر قسم کے حملے کرنے سے دریغ نہیں کرتے میں نے انتہائی نازک مواقع پر بھی انہیں غصہ سے بے قابو ہوتے نہیں دیکھا وہ تحمل اور بردباری اور صبر و شکر کی ایک اعلیٰ روایت کے امین تھے۔ اپنے بڑے سے بڑے مخالف کا نام بھی ہمیشہ احترام سے لیتے تھے۔............ مفتی صاحب کی

ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ عالم با عمل تھے ان کے کردار میں پختگی پر ان کے مخالف بھی یقین رکھتے تھے۔ میں نے سفر میں انہیں کبھی نماز قضا کرتے نہیں دیکھا۔ بلکہ ہری پور جیل میں ہم اکٹھے تھے تو ان دنوں مفتی صاحب کو دیکھا کہ رات کو تہجد کے علاوہ نوافل کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔ ان کی عبادت کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ دن کو دوستوں سے محو گفتگو اور رات کو خدا سے راز و نیاز۔ وہ عالم ضرور تھے مگر عالم سے بڑھ کر عامل و عارف انسان تھے ایک اور بات جو صرف مفتی صاحب ہی کی ذات میں نظر آئی۔ وہ یہ کہ وہ اپنے ملنے والوں پر بہت مہربان تھے۔ بڑوں سے تو بہر حال ان کے مرتبے کے مطابق معاملہ کرتے تھے ہم نے چھوٹوں سے بھی ملتے ہوئے بھی انہیں بڑا متواضع پایا۔ چھوٹے سے چھوٹے کارکن پر بھی وہ اس قدر شفقت فرماتے تھے۔ کہ اس شفقت میں احترام کی جھلک نمایاں ہوتی تھی۔..........

مفتی صاحب ہمارے دور میں عہد رفتہ کے انسان تھے وہ چودھویں صدی میں قافلۂ حریت کے آخری جرنیل تھے جسے شاہ ولی اللہ، اور سیّد احمد شہید نے ترتیب دیا۔ جس کو حافظ ضامن شہید، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی نے مضبوط و مستحکم کیا جس کے سالاروں میں شیخ الہند مولانا محمود حسن، شیخ الاسلام سیّد حسین احمد مدنی شامل تھے اس جماعت حقّ کے تیار کردہ قافلۂ تسلیم و رضا کے علم و عمل، ایثار و استقامت، اخلاص و قربانی اور جہاد و عزیمت کی امانتیں ان کے آخری جرنیل مفتی محمود نے چودھویں صدی کے اختتام پر پندرھویں صدی کی دہلیز تک پہنچا دیں۔ تاکہ نئی صدی میں اپنے قابل فخر اسلاف کے مشن پر چلنے والوں کے لئے یہ چیزیں متاع عمل اور سرمایۂ نجات بنی رہیں۔(۱۲۹)

حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نوّر اللہ مرقدہٗ کی زندگی آئینے کی طرح صاف اور شفاف تھی ایک ایک گوشہ ایسا تھا جو کہ سب کو متاثر کر دیتا تھا ہم نے اپنی زندگی میں ایسا شخص نہیں دیکھا۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے بارے میں سنا تھا کہ آپ جامع شخصیت کے مالک تھے۔ ایک طرف سیاسی میدان کے شہسوار، دوسری طرف تدریس کے مایۂ

ناز اور تیسری طرف طریقت کے بے مثل شیخ۔ یہی جامعیت ہم نے مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ میں دیکھی۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے زمانے میں تو سیاست اتنی گندی اور جھوٹی نہ تھی۔ جتنی کہ موجودہ دور میں ہو گئی ہے۔ اب عام طور پر یہ تاثر ہے کہ کوئی شخص سیاست میں رہ کر شریف، سچا اور دیانت دار نہیں رہ سکتا۔ مگر حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نے ایک ایسا نمونہ چھوڑ دیا کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی امداد شامل حال ہو اور انسان اللہ تعالیٰ کو اپنا مددگار بنا لے تو اس راستے پر بھی وہ اپنا دامن بچا کر چل سکتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے اس گندے ماحول میں اپنے آپ کو دین پر نہ صرف قائم رکھا بلکہ کسی بھی لمحہ تقویٰ اور پرہیز گاری کو نہیں چھوڑا۔..........

..........میں نے بارہا مفتی صاحب کی مجلسوں میں شرکت کی آپ کے ساتھ سفر کی معیّت بھی حاصل رہی۔ مگر میں نے آپ کو زندگی میں کبھی خلاف سنّت کام کرتے نہیں دیکھا۔ آپ ہمیشہ دین کا لحاظ فرماتے۔ باوجود شدید بیماری کے جماعت کی نماز ترک نہیں فرماتے تھے۔ اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ خود جماعت قائم فرماتے۔ کوشش ہوتی کہ دینی معاملات میں رخصت کی بجائے عزیمت پر عمل کیا جائے۔(۱۳۰)

خدا خوفی کا ایک وصف یہ ہوتا ہے کہ انسان، انسانوں کی طرف سے بے خوف ہو جاتا ہے مفتی صاحب کو قدرت نے ہر خوف سے بے نیاز کر دیا تھا۔ ان کے نزدیک طاقت کا سرچشمہ اللہ کی ذات تھی۔ اور وہ اس ذات کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔(۱۳۱)

حضرت مفتی صاحب دینی معاملات میں جس قدر حساس اور غیّور تھے اور جس قدر جری اور بے باک تھے وہ تو آپ کے زندگی کے ماہ و سال سے عیاں ہے کہ آپ دین اسلام کی سربلندی کے لئے حکومت وقت سے ٹکراتے رہتے تھے۔ آپ کی حیات مستعار کا ہر دن جابر حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی زندہ تفسیر تھی۔(۱۳۲)

وہ علم کے پہاڑ تھے۔ اور علم ان کو مستحضر تھا۔ سیاست میں آنے کے بعد اپنا سابقہ طور طریقہ نہیں چھوڑا حکمرانوں کے اشاروں اور چالوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اتباعِ شریعت

، سیاسی بصیرت، انتھک محنت، سوچی سمجھی پالیسی پر استقلال اور استقامت اور بات کو سلیقے کے ساتھ پیش کرنا اور پھر تقریر میں ایک موضوع پر قائم رہنا ان کی خوبیاں تھیں۔(۱۳۳)

دینی واجتماعی مسائل میں اس بے مثال جرأت وجسارت کے باوجود ذاتی حقوق میں آپ بالکل کمزور تھے۔ آپ نے مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں تقریباً تیس سال بسر کئے مدرّس، صدر مدرّس، مفتی، شیخ الحدیث اور مہتمم، ان تمام عہدوں پر فائز رہے لیکن کبھی بھی اپنے مشاہرہ میں اضافہ کا یا اپنے لئے مراعات کا بلکہ ضرورت تک کا مطالبہ نہیں کیا مطالبہ تو کجا! اشارہ تک نہیں کیا۔

حلیم وکریم ذات نے بڑی فیاضی سے تحمل وبردباری کا وافر حصہ آپ کو عنایت فرمایا تھا۔ ان کمال کا مظاہرہ تو عموماً آپ کی عمومی وخصوصی مجالس میں ہوتا رہتا تھا سینکڑوں ہزاروں ساتھی اس کا مشاہدہ کرتے رہتے تھے۔ شدید ترین اختلافات میں آپ نرم سے نرم الفاظ اختیار کرتے۔ راہِ اعتدال پر قائم رہنے کی پوری کوشش فرماتے ذاتیات میں بالکل نہیں پڑتے تھے سیاسی اختلافات کی بناء پر متعدد مرتبہ اپنوں اور بیگانوں نے آپ کو بے جا الزامات کا نشانہ بنایا لیکن آپ نے ہمیشہ عفو ودرگزر سے کام لیا۔ یا زیادہ سے زیادہ اصولی جواب پر اکتفا کیا۔..............................

.... آپ اپنی ذات کے سلسلے میں نہ کسی کی مدح وثنا سے متاثر ہوتے تھے اور کسی کی ہجو ومذمت اور سب وشتم سے مشتعل ہوتے تھے۔ صرف اور صرف اپنے کام سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اپنی منزل مقصود کی طرف رواں دواں رہتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب فطرتاً اجتماعیت پسند تھے۔ عزلت اور گوشہ نشینی سے کوسوں دور رہتے۔ ملک اور قوم کے دینی ودنیاوی اور انفرادی واجتماعی مسائل حل کرنے میں کوشاں رہتے۔(۱۳۴)

مفتی صاحب میں معاملات کی فہم بھی تھی اور حرف ضبط بھی بلا کا تھا۔ مختلف اجلاسوں کے دوران میں نے دیکھا کہ جب ان پر تنقید کی جاتی تھی یا ان کے کسی رویہ پر اعتراض

کیا جاتا تھا تو وہ برافروختہ نہیں ہوتے تھے مشتعل نہیں ہوتے تھے۔ معترض کو ٹوکتے نہیں تھے۔ پورے سکون کے ساتھ بات سنتے اور پھر بڑے ٹھنڈے دل سے اس کا جواب دیتے تھے۔ اور اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے۔..................

.... فروعی اور فقہی اختلافات کو حد سے بڑھانے کے سخت خلاف تھے۔..................

.... یادداشت پر بے حد زور ڈالنے کے باوجود میں کوئی چیز ان کے خلاف نہیں ڈھونڈ سکتا انہیں کبھی ایک جماعت کے لیڈر کے طور پر بات کرتے نہ سنا وہ ہمیشہ سب کے رہے، سب ہی کے نظر آئے۔ انہیں حلیف جماعتیں مشترکہ متاع سمجھتی تھیں اور لاریب وہ تھے بھی۔..............

.... مفتی صاحب نے اصولوں پر کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ انہوں نے جس معاملہ کو حق سمجھا اس کے لئے جان لڑادی۔..............

.... مفتی صاحب کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ سیاسی معاملات کو سیاسی معاملات کے طور پر دیکھتے اور پرکھتے تھے۔ نہ مذہبی تعصبات کو ان پر اثر انداز ہونے کی اجازت دیتے تھے۔ اور نہ سیاسی اقدامات کی تائید پر آمادہ ہوتے تھے۔(۱۳۵)

بحیثیت خطیب ومقرر ان کو اپنے تمام معاصرین میں اس لحاظ سے ایک فوقیت حاصل تھی ان کا لہجہ شستہ، زبان ستھری، گفتگو بے لاگ اور مدلل ہوتی تھی۔ بات ہمیشہ سنجیدگی سے کرنے اور سننے کے عادی تھے۔ اپنے بدترین مخالفوں کا نام بھی احترام سے لیتے تھے اسی لئے ہر طبقے میں ان کا نام بھی احترام سے لیا جاتا تھا۔ اور ان کے کام کی تعریف ہوتی تھی۔ ہر دلعزیزی کا یہ مقام حاصل کرنے میں ان کے دیگر علمی اوصاف کا بھی یقیناً دخل ہوگا لیکن میرے خیال میں سب سے زیادہ جس چیز نے انہیں ہر دلعزیز بنایا وہ ان کی سلجھی ہوئی گفتگو، ہر ایک سے ان کے مرتبے کے مطابق پیش آنا، ہمیشہ سچ

کہنا سچ کا ساتھ دینا اور حق کے لئے ڈٹ جانا تھا ان کے معاصرین انہیں ایک تبحر عالم دین اور مدبر سیاستدان سمجھتے تھے۔(۱۳۶)

ان کے بارے میں میری رائے یہ تھی کہ وہ غیر معمولی انسان ہیں اوران کی شخصیت ہمارے معروف علماء سے بالکل مختلف ہے۔ پروقار شخصیت، پراعتماد گفتگو، علمی اور عقلی باتیں، سلجھا ہوا انداز، دوٹوک اور کھری باتیں، ٹھہر ٹھہر کر بولنے کی عادت، ہنس مکھ چہرہ اور باغ و بہار شخصیت تمام ایسے اوصاف تھے جو دیکھنے والے کو بہر حال متاثر کرتے تھے۔اور مفتی صاحب کے بارے میں میرا تاثر ہی بہت خوبصورت تھا۔ اُن سے مل کر ان کے پاس بیٹھ کر ان سے گفتگو کر کے میں نے پہلی ملاقات کے دوران تین باتیں محسوس کیں۔

(۱) مفتی صاحب ذہین بالطبع ہیں اوران کے علم میں توسّع ہے۔

(۲) مفتی صاحب وسیع المطالعہ اور استدلال میں ذکی ہیں۔

(۳) مخاطب کے استدلال کو سنتے، سمجھتے تھے اور قبول کرنے میں پس وپیش نہیں کرتے۔...

.... اس تمام گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ مفتی صاحب کو میں نے ہر حال اور ہر رنگ میں دیکھا۔اور بہت قریب سے دیکھا ہے۔میں نے انہیں ہر موقع اور ہر مقام پر اسلام کا سچا نمائندہ مخلص جانثار اور نڈر سپاہی پایا ہے ان کی زندگی اسلام کے لئے وقف تھی اور وہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی اعلیٰ روایات کے حامل اور امین تھے۔(۱۳۷)

وہ فی الواقع علماء کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔جس پر علماء کا لفظ سجتا اور صادق آتا تھا۔ آج جبکہ ”علماء“ بڑھ گئے ہیں علم گھٹ گیا ہے۔ لیکن مفتی صاحب سے تعلق رکھنے والا، ان کی صحبت میں بیٹھنے والا اوران سے ملنے جلنے والا ہر شخص ان سے اختلاف رکھنے کے باوجود یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ علم دین میں کسی سے ہیٹے اور کمتر تھے۔بلکہ بعض باتوں میں انہیں اپنے معاصرین پر فوقیت حاصل تھی۔ اوران کی ”رسوخ العلم“ ہونے کی

ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ درس وتدریس میں گزرا۔ سیاست میں بھرپور حصہ لینے کے باوجود انہوں نے علم کے کوچے سے مکمل طور پر قطع تعلق نہیں کیا بلکہ انہیں جب بھی موقع ملتا وہ گاہے بگاہے علم کی بادیہ پیمائی کے لئے نکل ہی پڑتے۔ میرے دل میں مفتی صاحب کے احترام کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ میں نے اپنی تمام تر کوتاہیوں، خامیوں، بے بضاعتوں، سیاست وخطابت کی مصروفیتوں اور مشغولیتوں کے باوجود طالبعلمی کے دور سے اپنا رشتہ نہیں توڑا اور بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا لکھنے پڑھنے کا سامان کئے رکھا۔ اپنی ان علمی مصروفیتوں اور مطالعہ کی روشنی میں بہت کم لوگ تھے جو دل کو بھائے۔ مفتی صاحب ان لوگوں میں سے تھے جنہیں علم و مطالعہ کے جس پہلو سے بھی دیکھا، جانچا، پرکھا کامل ومکمل پایا۔(۱۳۸)

مجھے اس بالمشافہ گفتگو سے اندازہ ہو گیا کہ مفتی صاحب اپنے دل میں اتحاد بین المسلمین کے لئے بڑی تڑپ رکھتے ہیں۔اور فرقہ واریت سے انہیں طبعی نفرت ہے چونکہ اس وقت وہ نوجوان تھے اس لئے ایک نوجوان عالم کی زبانی اتنی سنجیدہ اور فکر انگیز گفتگو میرے لئے خوشی کا باعث بنی نوجوان عموماً جذباتی ہوتے ہیں۔ان کی سوچ بھی جذباتی ہوتی ہے ان کے فیصلے بھی جذباتی ہوتے ہیں۔مجھے اطمینان ہوا کہ ہمارے ہم عمر علماء میں وہ ایک پختہ کار، صائب الرائے اور زیرک انسان ہیں۔ ان کی یہی صفت میرے دل کو زیادہ بھائی۔(۱۳۹)

انہوں نے ایک دور میں ملک کے وسیع تر مفاد میں یہ فیصلہ کیا کہ طبقۂ اہل سنت کے درمیان جو اختلافات پائے جاتے ہیں۔انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹادیا جائے.........

.... یہ مفتی صاحب کے وسیع النظر اور وسیع الظرف ہونے کی دلیل تھی۔اس سلسلے میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں انہوں نے ایسے مذہبی اتحاد کے لئے اپنی جماعتی اور سیاسی پوزیشن کو بھی داؤ پر لگا دیا.................. لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے عقائد میں پختہ نہیں تھے۔وہ اپنے عقائد میں بڑے سخت واقع ہوئے تھے البتہ وہ تنگ

دل یا تنگ نظر نہیں تھے۔ کیونکہ تنگ نظری جہالت کی پیداوار ہوتی ہے ان کی غیر اہل سنت کے بارے میں طبع کتب پر خاص وسیع نظر تھی۔ اہل حدیث علماء کے ساتھ وہ ہمیشہ محبت کا اظہار کرتے تھے۔(۱۴۰)

مفتی محمود صاحب سے تحریک ختم نبوت کے دوران (تعلقات کا) کا آغاز ہوا "تعلقات" کا لفظ اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ ان کے ساتھ رسمی لگاؤ نہیں تھا دلی قرب تھا۔ ان کے ساتھ میری قربت کا سبب ان کی وسعت نظری اور وسعت قلبی تھی۔ وہ عقائد کے اختلافات کو عقائد کی حد تک رکھتے تھے ان اختلافات کو سیاسیات میں لانے کے قائل نہیں تھے۔ ان کا دل بہت بڑا تھا۔ اور اس دل میں اختلاف کے ساتھ رواداری بھی موجود تھی۔ ان کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں کے اختلافات کم ہوں اور ان کے درمیان زیادہ سے زیادہ محبت و رواداری کی فضا پیدا ہو۔(۱۴۱)

"مفتی صاحب دل کے صاف ہیں کوئی ان کی عزت کرے نہ کرے وہ ہر ایک کی عزت کرتے ہیں اور کسی کے خلاف دل میں میل نہیں رکھتے"۔(۱۴۲)

"مفتی محمود کی عظمت کے لئے اتنی ہی بات کافی ہے کہ قدرت نے انہیں اپنے ان عظیم روحانی اجداد کا قابل فخر جانشین بنایا تھا۔ لیکن قدرت نے انہیں بہت سے ذاتی اوصاف سے بھی متصف فرمایا تھا"۔(۱۴۳)

لیکن ان تمام محبتوں، قربتوں، شفقتوں، رفاقتوں کے باوجود میرے اور ان کے تعلقات کے لئے "رفاقت" کا لفظ استعمال درست نہیں یہ لفظ میرے وجود سے بلند اور ان کے مقام سے فروتر ہے میں ان کا خادم تھا وہ میرے مخدوم تھے۔ میں راہی تھا وہ رہنما، میں سپاہی تھا وہ سپہ سالار، میں ماتحت تھا وہ افسر، میں چھوٹا تھا وہ بڑے۔ بہت بڑے۔ مجھ ہی سے نہیں اپنے تمام معاصرین سے بڑے۔ علم، عمل، اخلاق، اخلاص ہر چیز میں بڑے اور ہر مقام پر بڑے۔(۱۴۴)

مفتی اعظم کی پوری زندگی باوقار اور بامثال تھی۔ آپ کی شخصیت نہ صرف اپنوں بلکہ دوسروں کے لئے بھی قابل فخر تھی۔ آپ کے زندہ ضمیر اور اعلیٰ کردار کا مخالفین کو بھی اعتراف تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے انسان صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اور زندہ رہنے کے واضح نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسی ہستیوں کا بدل ملنا مشکل ہوتا ہے۔ مگر ان کے کارنامے اور زندگی کے خطوط آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوتے ہیں۔(

۱۴۵)

وہ حفظ مراتب کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ اپنے لیڈر ساتھیوں سے ان کے مرتبے کے مطابق سلوک کرتے اور علماء سے بھی اس طرح پیش آتے کہ جس طرح ان کے ساتھ ان کے مرتبے کے مطابق پیش آنا چاہیئے۔ اور مجلس میں آنے والے نوجوانوں سے اسی شفقت و محبت سے پیش آتے جس کے وہ مستحق ہوتے۔ اس سلسلے میں مَیں نے بہت سے عملی مظاہرے دیکھے ہیں۔ انہیں اپنے دوستوں سے بھی ملتے دیکھا ہے۔ دشمنوں سے بھی ملتے دیکھا ہے۔ حریفوں سے بات کرتے ہوئے دیکھا اور حلیفوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بھی دیکھا وہ ملاقات میں کسی کے علمی یا معاشرتی مرتبے کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔(۱۴۶)

لیکن میں ان کی جس بات کا سب سے زیادہ معترف ہوں۔ وہ ان کی اپنے اسلاف واکابر سے محبت تھی۔ دینی مدارس، ماحول اور جماعتوں میں سب سے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ کوئی شخص اپنے بڑوں سے کتنا قریب ہے۔ اگر شاگرد استاد سے قریب نہ ہو، مرید پیر سے قریب نہ ہو۔ اخلاف اپنے اسلاف سے ذہنی اور فکری اعتبار سے قریب نہ ہوں تو ایسے افراد کو مذہبی حلقوں میں کبھی پذیرائی نہیں مل سکتی۔ جو لوگ اکابر سے کٹے ہوئے اور اسلاف سے ہٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ انہیں دینی طبقوں میں عزت و عظمت کا ملنا محال ہوتا ہے خواہ وہ کتنے صاحب علم ہوں۔ دینی حلقے ان کے ظاہر پر تو کسی حد تک اعتماد کر لیتے ہیں ان کے باطن پر اعتماد نہیں کرتے۔ معاشرتی تعلقات کے باعث ان کا احترام کر سکتے ہیں لیکن دینی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی برتری تسلیم نہیں کرتے

پاکستان، حضرت مجدد الف ثانیؒ سے لے کر ہندوستان میں کلمۂ اسلام بلند کرتے والے ان لاکھوں مسلمانوں کی میراث ہے جسے ان کے خونِ شہادت کے نتیجے میں حاصل کیا گیا تھا۔ مفتی محمود نے ان لاکھوں شہیدوں، حضرت تھانوی و حضرت مدنی اور دوسرے علماء حقہ کی اس میراث کی حفاظت کے لئے اپنی عمر وقف کئے رکھی۔ میں مفتی صاحب کی زندگی کے اس پہلو سے زیادہ متاثر تھا کہ وہ اپنے اسلاف سے محبت کرتے تھے۔ اپنے اکابر سے وہ جس محبت و شیفتگی کا اظہار اکثر کرتے رہتے تھے۔

مفتی صاحب کو اپنے بزرگوں سے بڑی عقیدت تھی۔ اسی عقیدت نے انہیں مرجع عقیدت بنایا تھا۔ اسی طرح حضرت تھانویؒ سے بھی انہیں بڑی محبت تھی۔ ان کی باتیں سن کر آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ مفتی صاحب کی جماعتی زندگی کی عظمت کا ایک راز یہ بھی ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کے سچے پیروکار تھے اور ان کے کارکن انہیں ان بزرگوں کا نعم البدل سمجھتے تھے۔ وہ تو اپنے بڑوں کے جانشین بننے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن اب ان کا نعم البدل مشکل ہی سے پیدا ہو گا۔(۱۴۷)

حضرت مفتی صاحب کے مذکورہ بالا حالات پڑھ کر یہ تصور قائم ہو گا کہ وہ ایک مصروف مفکر اور علم و سیاست میں منہمک شخص ہوں گے۔ یا تنہائی ملتی ہو گی تو عبادت میں مشغول ہو جاتے ہوں گے۔ حالانکہ ان سب باتوں کے باوجود خوش طبع تھے۔ ظریف الطبع لوگ بھی ان کے پاس آتے اور خوش کن باتوں سے محظوظ ہوتے لیکن ظرافت میں بھی علمیت ہوتی تھی۔........... مفتی صاحب کو اپنے اکابر کے ایسے لطیفے بہت پسند تھے جن میں دقتِ نظر ہو۔(۱۴۸)

مفتی صاحب مرحوم خوش طبع انسان تھے۔ ان کی خندہ روئی اور بذلہ سنجی سے مجالس محظوظ ہوتی تھیں۔ اور رُوکھاپن اور خشک مزاجی سے وہ ہمیشہ دُور رہتے تھے ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملاقات کرتے تھے۔.........

بسا اوقات تقاریر کے دوران اپنے مطلب کو نہایت عمدگی سے لطائف کے ذریعہ ادا کر جاتے تھے۔(۱۴۹)

ویسے تو مفتی صاحب کے لطائف بے شمار ہیں لیکن ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

(1) مولانا محمد ادریس نے روزنامہ "وفاق" لاہور (مفتی محمود نمبر) میں مفتی صاحب کے درس قرآن کا واقعہ لکھا ہے۔

پھر ایک روز پڑھاتے ہوئے ایک آیت پر مفتی صاحب نے اپنا واقعہ بیان کیا۔ وہ آیت یہ ہے ﴿وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ﴾(الانعام:68)

ترجمہ: کہ جب اللہ کی آیتوں سے کفر اور استہزا سنو تو ان لوگوں کے پاس مت بیٹھو یہاں تک کہ وہ دوسری باتوں میں مشغول ہو جائیں۔

اس کی تفسیر کے بعد مفتی صاحب نے فرمایا کہ ہم اپوزیشن میں تھے اور اس دوران ہم نے ایک دفعہ اسمبلی سے واک آؤٹ کیا تو مولانا غلام غوث ہزاروی نے اٹھ کر کہا کہ آخر یہ اسلام میں کہاں جائز ہے۔ مفتی صاحب نے کہا کہ میں نے اس آیت کا ٹکڑا پڑھ دیا کہ جب تم اللہ کی آیتوں کا انکار اور ان سے استہزا ہوتا سنو تو ان لوگوں کے پاس مت بیٹھو۔ مولانا چپ ہو گئے۔ اب کچھ عرصہ کے بعد ہم دوبارہ شریک ہو گئے تو ہزاروی صاحب نے کہا کہ وہ پھر آ گئے ہو۔ تو میں نے آیت پڑھی اور کہا کہ اللہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ یہاں تک کہ وہ دوسری باتوں میں مشغول ہو جائیں۔ اس پر ہزاروی صاحب نے کہا بس! بس! میں آپ سے بات نہیں کرتا۔

(۲) شیخ محمد حنیف (کراچی) نے "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمد نمبر) ص 251 پر لکھا ہے کہ

(مفتی صاحب نے) ایک بار 1977ء کے انتخابات کے بعد اپنی نظر بندی کا ایک واقعہ سنایا۔

میں ذیابیطس کا مریض ہوں اور ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ذیابیطس کا مریض اکثر ذہنی پریشانی میں مبتلا رہتا ہے۔ سہالہ میں نظر بندی کے دوران بھٹو مرحوم نے مجھ سے پوچھا کہ مفتی صاحب آپ بتایئے کہ آپ کو کوئی پریشانی ہے؟ اس کے جواب میں مَیں نے انہیں کہا کہ میری سب سے بڑی پریشانی آپ ہیں۔ آپ کے ہوتے ہوئے اور کیا پریشانی ہو سکتی ہے؟

(۳) **مفتی صاحب کا یہ لطیفہ بہت مشہور ہے۔ جو آپ کی حاضر جوابی کی واضح مثال ہے۔**

بھٹو صاحب نے ایک دفعہ مفتی صاحب سے کہا کہ مفتی صاحب میں آئندہ عام انتخابات میں آپ کے مقابلہ میں بندر کھڑا کروں گا اور کامیاب کراؤں گا۔ مفتی صاحب نے فی الفور جواب دیا۔ بھٹو صاحب آپ سے بڑا بندر کوئی اور ہوگا؟ (اس جواب سے وہ لوگ صحیح لطف اٹھا سکتے ہیں جو بھٹو صاحب کے مزاج سے واقف ہیں)۔ یاد رہے کہ مفتی صاحب نے 1970ء کے عام انتخابات میں ڈیرہ اسماعیل خان کی قومی اسمبلی کی سیٹ پر بھٹو کو تیرہ ہزار ووٹوں سے شکست دی تھی۔

(۴) **مفتی صاحب کی شگفتہ مزاجی کا ایک واقعہ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) میں تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔**

مولانا مفتی محمود بہت شگفتہ مزاج تھے اکثر آپ اپنے ہم مجلسوں کو لطائف سنایا کرتے تھے۔ اسمبلی کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے جس سے آپ کی ظرافت کا اندازہ ہو جائے گا۔ اسمبلی میں ایک دفعہ نکاح بیوگان کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ اور مختلف طرف سے اس سلسلے میں تقاریر ہو رہی تھیں۔ اتنے میں ایک خاتون رکن (غالباً بیگم نون تھیں) نے کھڑے ہو کر کہا (جو خود بھی بیوہ تھیں) اب یہ مسئلہ ایسا نہیں رہا کہ اس پر بحث کی جائے۔ کیونکہ اب عورتوں کو خود اس بات کا احساس ہو گیا ہے اور وہ اب دوسری خواتین کو اس سلسلے میں ترغیب دیتی ہیں کہ وہ نکاح کریں۔ اس پر حضرت مفتی صاحب اُٹھے اور فرمایا کہ صرف زبانی ترغیب اور تبلیغ سے کیا ہوتا ہے؟ کوئی عملی ثبوت بھی ہونا چاہیئے۔

(۵) **شعیب الرحمٰن مرحوم نے روزنامہ "وفاق" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص48 پر لکھا ہے کہ**

1974ء کی بات ہے مفتی صاحب کراچی میں تھے۔ اتفاق سے میں بھی وہیں تھا۔ ایک نوجوان دوست جو آج کل روزنامہ "جنگ" کراچی میں کام کرتے ہیں، آئے اور مفتی صاحب سے کہنے لگے "حضرت میرے والد بہت سخت ہیں اور مجھے اجتماعی سرگرمیوں میں حصے لینے سے منع کرتے ہیں" حضرت مفتی صاحب نے ان کے والد گرامی کا نام دریافت کیا پھر پوچھا وہ کس کے مرید ہیں۔ نوجوان نے کہا "حضرت تھانوی" کے مفتی صاحب نے مسکراتے ہوئے ارتجالاً فرمایا۔

ے مرید تھانوی ہیں اس لئے تھانے سے ڈرتے ہیں

(۶) **یہ واقعہ بھی جناب شعیب الرحمٰن نے لکھا ہے (حوالہ بالا)**

ایک مرتبہ بھٹو مرحوم نے مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے استفسار کیا۔ کیا آپ نے ہٹلر اور مسولینی کی سوانح پڑھی ہیں۔ مفتی صاحب نے کہا "نہیں"۔ بھٹو نے کہا یہ دونوں میری پسندیدہ کتابیں ہیں اور میں نے انہیں متعدد بار پڑھا ہے اور یہ ہمیشہ میرے تکیہ کے نیچے رہتی ہیں۔ مفتی صاحب نے کہا "تعجب ہے کہ آپ نے اپنی پسندیدہ کتابوں کا آخری باب نہیں پڑھا"۔ ان کا اشارہ ہٹلر اور مسولینی کے انجام کی طرف تھا۔ بھٹو نے کھسیانے ہو کر موضوع بدل دیا۔

(۷) **مولانا سیّد عبدالمجید شاہ ندیم نے ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) میں یہ واقعہ لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔**

ایوب خان اسمبلی میں جب عائلی قوانین کے مسئلہ پر حضرت مفتی صاحب سرکاری پالیسی پر شدید نکتہ چینی کر رہے تھے۔ تو ایک مرتبہ سرکاری ممبران نے مفتی صاحب مرحوم کے خلاف یہ منصوبہ تیار کیا کہ جب مفتی صاحب اسمبلی میں قدم رکھیں تو خواتین ممبران پردہ کر لیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت مفتی صاحب جونہی اسمبلی میں داخل ہونے لگے۔ خواتین ممبران نے چادروں سے چہرے ڈھانپ لئے اور سرکاری بنچوں سے آوازے کسنے لگے اور قہقہے بلند ہوئے۔

بنگال کے مولوی فرید احمد مرحوم نے بتایا تھا کہ یہ صورت حال دیکھ کر مجھے بہت صدمہ ہوا کہ ایک مایۂ ناز عالم دین اور جلیل القدر فقیہہ کی اس بیہودہ انداز میں تضحیک بڑی دلخراش حرکت تھی۔

مگر مفتی صاحب بڑے وقار اور سنجیدگی سے اپنی نشست کی طرف بڑھتے رہے اور طوفان بدتمیزی سے بے نیاز ہو کر اپنی نشست پر پہنچتے ہی مائیک پر کھڑے ہو گئے اور بولے۔ مسٹر سپیکر اور معزز ارکان اسمبلی! آج میں آپ سب فرزندان اسلام کو مبارک باد کہتا ہوں کہ مسلم خواتین کی نمائندگی کرنے والی ممبر عورتوں کو یہ احساس ہو گیا ہے کہ اسلام نے غیر محرم سے پردہ کرنے کا حکم دیا ہے وہ بالکل صحیح اور واجب التعمیل ہے۔

چنانچہ آپ نے دیکھا آج انہوں نے اس پر عمل کرتے ہوئے پردہ کر لیا ہے۔ اس پر آواز آئی کہ مفتی صاحب! صرف آپ سے کیوں؟ مفتی صاحب نے برجستہ جواب دیا "شاید پوری اسمبلی میں انہیں میرے سوا کوئی مرد نظر نہیں آیا اور اس سے جو معزز ارکان کی توہین ہوئی اس پر مجھے بے حد افسوس ہے"۔

مفتی صاحب کے اس جواب نے سرکاری عناصر کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ اور عائلی قوانین کے خلاف اس مرد مجاہد کا جہاد جاری رہا۔

(8) مفتی صاحب بڑے حاضر جواب تھے۔ بعض دفعہ بات سے بات ایسی نکالتے کہ مخاطب لاجواب ہو جاتا۔

مفتی صاحب کے ساتھ جیل میں دو فوجی افسر تھے جو بھٹو حکومت کے خلاف سرگرمیوں میں شرکت کے الزام میں سزا یافتہ تھے۔ اور جس فوجی عدالت نے ان کو سزا دی تھی اس کے سربراہ جنرل ضیاء الحق تھے۔ انہوں نے مفتی صاحب سے درخواست کی کہ ہماری سفارش کیجئے تاکہ ہمیں رہائی ملے۔ کیونکہ بھٹو کے جتنے بھی مخالف تھے۔ وہ سب رہا ہو گئے ہم پر بھی یہی الزام تھا لہٰذا ہمیں رہا کیا جائے۔

حضرت مفتی صاحب نے جنرل ضیاء الحق سے جو بھٹو کے خلاف سازش کر کے صدر پاکستان بنے تھے بات کی۔ جنرل ضیاء الحق نے کہا کہ حضرت مفتی صاحب! یہ فوجی ہیں اور ہم نے فوجی قانون کے تحت ان کے کیس کی سماعت کی اور جج میں خود تھا اور میں نے ان کو صفائی کے تمام مواقع دیئے۔ یہ صفائی پیش نہ کر سکے۔ حضرت مفتی صاحب نے جب ان کی بات سن لی۔ تو فرمایا۔ ان کا جرم کیا تھا؟ جنرل ضیاء الحق نے کہا کہ ایک منتخب حکومت کے خلاف انہوں نے فوجی بغاوت کی سازش کی اور اس کی سزا جو ہم نے دی یہ کم ہے۔ میں نے بڑی رعایت کی ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے فرمایا بھئی جو جرم انہوں نے کیا وہی آپ نے کیا جو جرم انہوں نے سازش کا کیا وہ آپ نے بھی کیا ان کی سازش پکڑی گئی وہ قیدی بن گئے۔ اور وہی سازش آپ نے بھی کی اور آپ صدر مملکت ہیں۔ قصور میں دونوں کا کوئی فرق نہیں۔ صرف اتنا فرق ہے کہ آپ صدر ہیں اور وہ بے چارے عام فوجی۔ ضیاء الحق یہ جواب سن کر لاجواب ہو گئے۔

(۹) حضرت مفتی صاحب نے صوبہ سرحد کی وزارت عُلیا کا منصب سنبھالا۔ تو سب سے پہلے آپ نے صوبہ میں شراب پر پابندی لگا دی۔ بھٹو صاحب اس پر بہت سیخ پا ہوئے۔ ایک دفعہ ملاقات میں بھٹو نے مفتی سے سوال کیا کہ شراب کو قرآن نے کہاں حرام کہا ہے؟ حضرت مفتی صاحب نے فوراً متعلقہ آیت تلاوت کی۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِنَّمَا ٱلۡخَمۡرُ وَٱلۡمَيۡسِرُ وَٱلۡأَنصَابُ وَٱلۡأَزۡلَٰمُ رِجۡسٞ مِّنۡ عَمَلِ ٱلشَّيۡطَٰنِ فَٱجۡتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُونَ ﴿٩٠﴾

اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوّا اور تھان اور فال نکالنے کے پانسے کے تیر یہ سب گندی باتیں، شیطانی کام ہیں۔ ان سے بالکل الگ رہو تاکہ تم فلاح یاب ہو۔

فرمانے لگے شراب کو قرآن حکیم نے پلید کہا ہے۔ بھٹو نے کہا کہ اس کو پلید کہا ہے۔ حرام کہاں کہا؟ حضرت مفتی صاحب نے فرمایا جو چیز حرام ہوتی ہے ضروری نہیں کہ وہ پلید بھی ہو لیکن جو چیز پلید ہوتی ہے وہ ضروری ہے کہ حرام بھی ہو۔ چوری کا نوٹ حرام ہے لیکن پلید نہیں۔ پیشاب پاخانہ پلید اور نجس ہے اور حرام بھی ہے۔ بھٹو حیران ہو گیا کہ کیسے عجیب دلائل ہیں۔

(10) ایک دفعہ مولانا عبدالحق صاحب نے حضرت مفتی صاحب کو دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں نماز پڑھانے کے لئے آگے کر دیا۔ مفتی صاحب چونکہ مسافر تھے اس لئے انہوں نے دو رکعت پڑھا کر سلام پھیر دیا۔ اور فرمایا۔ میں مسافر ہوں آپ اپنی نماز پوری کر لیں۔ مقتدیوں میں سے ایک صاحب جو کہ عالم دین بھی تھے۔ نماز پوری کر کے سلام پھیرنے کے بعد سخت غصہ میں کہنے لگے۔ مقیم کی موجودگی میں مسافر کو کیوں امام بنایا؟ حضرت مفتی صاحب نے برجستہ فرمایا۔ تاکہ تمہیں یہ مسئلہ معلوم ہو جائے کہ مقیم کی موجودگی میں بھی مسافر امام بن سکتا ہے۔ اعتراض کرنے والے صاحب بغلیں جھانکنے لگے۔

خلاصہ بحث

باب ہذا میں مفتی صاحب کے حالات زندگی سے بحث کر کے، آپ کی ولادت، خاندانی حالات، ماحول، بچپن کے حالات، ابتدائی و اعلیٰ تعلیم، تدریس، قید و بند کی صعوبتیں، قاتلانہ حملے، بیرونی اسفار، جسمانی عوارض وغیرہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان میں آپ کے خاندانی اور ابتدائی حالات میں سے بیشتر وہ ہیں جو مفتی صاحب نے خود راقم الحروف کو بتائے ہیں۔ جو علیحدہ علیحدہ مضامین میں ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور کے شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور ماہنامہ "تبصرہ" لاہور میں ایک انٹرویو کی صورت میں مفتی صاحب نے خود مدیر "تبصرہ" کے سوالات کے جوابات کی صورت میں بیان کئے ہیں، سے اخذ کئے گئے ہیں۔ جبکہ اس کے علاوہ آپ کے ذاتی حالات آپ سے متعلق لکھی گئی کتب و رسائل اور اخبارات سے تلاش کر کے ترتیب دیئے گئے ہیں۔

باب ہذا میں کوشش کی گئی ہے کہ آپ کے ذاتی حالات کو زیادہ سے زیادہ سامنے لایا جائے تاکہ یہ، معلوم ہو سکے۔ کہ آپ کی علمی، دینی اور سیاسی خدمات کی انجام دہی میں آپ کے ابتدائی ماحول، اور انداز تربیت کا کتنا بڑا کردار ہے۔ نیز یہ کہ آپ کے ابتدائی حالات عام انسانوں کی طرح ہیں۔ وہ کوئی ایسی بالائی مخلوق نہیں تھے کہ جن کی پیروی نہ کی جاسکے۔ بلکہ اگر اب بھی بچوں کو ایسا ایک صالح ماحول فراہم ہو سکے تو کوئی وجہ نہیں کہ قوم کے نونہال کل کے ذمہ دار شہری نہ بن سکیں۔

حوالہ جات

(1) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص ۵۔ ج ۲۳۔ ش ۱ (۲ تا ۸/ جنوری ۱۹۸۱ء)۔ مرکزی دفتر جمعیۃ علماء اسلام پاکستان۔ چوک رنگ محل لاہور۔

(2) مفتی محمود، مولانا۔ ماہنامہ "تبصرہ" لاہو (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۶۔ ج ۱۱۔ ش ۳ (جنوری ۱۹۷۰ء)۔ دفتر ماہنامہ "تبصرہ" بیرون دہلی دروازہ لاہور۔

(3) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص ۵۔ ج ۲۳۔ ش ۱ (۲ تا ۸/ جنوری ۱۹۸۱ء)۔

(4) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص ۵۔ ج ۲۳۔ ش ۱ (۲ تا ۸/ جنوری ۱۹۸۱ء)۔

(5) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص ۵۔ ج ۲۳۔ ش ۱ (۲ تا ۸/ جنوری ۱۹۸۱ء)۔

(6) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص ۵۔ ج ۲۳۔ ش ۱ (۲ تا ۸/ جنوری ۱۹۸۱ء)۔

(7) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص ۵۔ ج ۲۳۔ ش ۱ (۲ تا ۸/ جنوری ۱۹۸۱ء)۔

(8) مفتی محمود، مولانا۔ ماہنامہ "تبصرہ" لاہو (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۶۱۔ ج ۱۱۔ ش ۳ (جنوری ۱۹۷۰ء)۔

(9) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص ۶۔ ج ۲۳۔ ش ۱ (۲ تا ۸/ جنوری ۱۹۸۱ء)

(10) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص ۶۔ ج ۲۳۔ ش ۱ (۲ تا ۸/ جنوری ۱۹۸۱ء)

(11) مفتی محمود، مولانا۔ ماہنامہ "تبصرہ" لاہو (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۶۔ ج ۱۱۔ ش ۳ (جنوری ۱۹۷۰ء)

(12) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۳۵۔ ج ۲۳۔ ش ۱۶، ۱۷ (۱۷ تا ۳۰/ اپریل ۱۹۸۱ء)

(13) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۵۳۔ ج ۲۳۔ ش ۱۶، ۱۷ (۱۷ تا ۳۰/ اپریل ۱۹۸۱ء)

(14) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۵۳۔ ج ۲۳۔ ش ۱۶، ۱۷ (۱۷ تا ۳۰/ اپریل ۱۹۸۱ء)

(15) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص ۶۔ ج ۲۳۔ ش ۱ (۲ تا ۸/ جنوری ۱۹۸۱ء)

(16) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص ۶۔ ج ۲۳۔ ش ۱ (۲ تا ۸/ جنوری ۱۹۸۱ء)

(17) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص ۶۔ ج ۲۳۔ ش ۱ (۲ تا ۸/ جنوری ۱۹۸۱ء)

(18) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص ۶۔ ج ۲۳۔ ش ۱ (۲ تا ۸/ جنوری ۱۹۸۱ء)

(19) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص ۶۔ ج ۲۳۔ ش ۱ (۲ تا ۸/ جنوری ۱۹۸۱ء)

(20) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص۶۔ ج۲۳۔ ش۱ (۲ تا ۸/ جنوری ۱۹۸۱ء)

(21) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص۶۔ ج۲۳۔ ش۱ (۲ تا ۸/ جنوری ۱۹۸۱ء)

(22) فضل الرحمٰن، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص۳۳۔ ج۲۳۔ ش۱۶، ۱۷ (۱۷ تا ۳۰/ اپریل ۱۹۸۱ء)

(23) ندوی، ابوالحسن علی، مولانا، سیّد۔ حیات عبدالحیؒ۔ ص۹۱۔ مجلس نشریات اسلام، ا۔کے۔۳۔ ناظم آباد نمبر۱ کراچی نمبر۸۔ ۱۹۹۸ء

(24) ندوی، ابوالحسن علی، مولانا، سیّد۔ حیات عبدالحیؒ۔ ص۱۹، ۲۰۔

(25) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص۵۔ ج۲۳۔ ش۱ (۲ تا ۸/ جنوری ۱۹۸۱ء)

(26) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص۳۶۔ ج۲۳۔ ش۱۶، ۱۷ (۱۷ تا ۳۰/ اپریل ۱۹۸۱ء)

(27) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص۳۸۔ ج۲۳۔ ش۱۶، ۱۷ (۱۷ تا ۳۰ اپریل ۱۹۸۱ء)

(28) مفتی محمود، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور۔ ص۲۳۹۔

(29) حامد میاں، سیّد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص۳۸۔ ج۲۳۔ ش۱۶، ۱۷ (۱۷ تا ۳۰ اپریل ۱۹۸۱ء)

(30) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص۶۔ ج۲۳۔ ش۱ (۲ تا ۸/ جنوری ۱۹۸۱ء)

(31) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص۶۔ ج۲۳۔ ش۱ (۲ تا ۸/ جنوری ۱۹۸۱ء)

(32) حامد میاں، سیّد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص۹۲۔ ج۲۳۔ ش۱۶، ۱۷ (۱۷ تا ۳۰/ اپریل ۱۹۸۱ء)

(33) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص۶۔ ج۲۳۔ ش۱ (۲ تا ۸/ جنوری ۱۹۸۱ء)

(34) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص۶۔ ج۲۳۔ ش۱ (۲ تا ۸/ جنوری ۱۹۸۱ء)

(35) محمد طیب، مولانا، قاری۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند۔ ص۵۶، ۵۷۔ دارالاشاعت مولوی مسافرخانہ کراچی نمبر۱۔ ۱۹۷۲ء

(36) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص۵۔ ج۲۳۔ ش۱ (۲ تا ۸/ جنوری ۱۹۸۱ء)

(37) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص۵۔ ج۲۳۔ ش۱ (۲ تا ۸/ جنوری ۱۹۸۱ء)

(38) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص۳۸۔ ج۲۳۔ ش۱۶، ۱۷ (۱۷ تا ۳۰ اپریل ۱۹۸۱ء)

(39) حامد میاں، سیّد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص۸۴۔ ج۲۳۔ ش۱۶، ۱۷ (۱۷ تا ۳۰ اپریل ۱۹۸۱ء)

(40) عبدالحق، مولانا۔ صحبتے با اہل حق۔ ص۵۸۔ مؤتمر المصنفین اکوڑہ خٹک

(41) حامد میاں، سیّد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۸۵۔ ج ۲۳۔ ش ۱۶، ۱۷ (۱۷ تا ۳۰/ اپریل ۱۹۸۱ء)

(42) محمد طیب، مولانا، قاری۔ تاریخ دار العلوم دیوبند۔ ص ۸۰، ۸۱۔

(43) محمود، صاحبزادہ، سیّد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۴۲

(44) حامد میاں، سیّد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۸۶۔ ج ۲۳۔ ش ۱۶، ۱۷ (۱۷ تا ۳۰/ اپریل ۱۹۸۱ء)

(45) حامد میاں، سیّد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۸۶۔ ج ۲۳۔ ش ۱۶، ۱۷ (۱۷ تا ۳۰/ اپریل ۱۹۸۱ء)

(46) حامد میاں، سیّد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۸۵۔ ج ۲۳۔ ش ۱۶، ۱۷ (۱۷ تا ۳۰/ اپریل ۱۹۸۱ء)

(47) حامد میاں، سیّد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۸۳، ۸۴۔ ج ۲۳۔ ش ۱۶، ۱۷ (۱۷ تا ۳۰/ اپریل ۱۹۸۱ء)

(48) محمد طیب، مولانا، قاری۔ تاریخ دار العلوم دیوبند۔ ص ۷۰۔

(49) کشمیری، انظر شاہ، سیّد، مولانا۔ ماہنامہ "الرشید" ساہیوال (دار العلوم دیوبند نمبر)۔ ص ۳۱۶۔ ج ۴۔ ش ۲، ۳۔ جامعہ رشیدیہ ساہیوال۔ ۱۹۷۶ء

(50) محمد طیب، مولانا، قاری۔ تاریخ دار العلوم دیوبند۔ ص ۷۰۔

(51) صدیقی، انیس احمد، مولانا، حکیم۔ ماہنامہ "الرشید" ساہیوال (دار العلوم دیوبند نمبر)۔ ص ۳۱۶۔ ج ۴۔ ش ۲، ۳۔

(52) حامد میاں، سیّد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۸۵۔ ج ۲۳۔ ش ۱۶، ۱۷ (۱۷ تا ۳۰ اپریل ۱۹۸۱ء)

(53) حامد میاں، سیّد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۸۵۔ ج ۲۳۔ ش ۱۶، ۱۷ (۱۷ تا ۳۰ اپریل ۱۹۸۱ء)

(54) اکبری، عبد الحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۳۶۔ ج ۲۳۔ ش ۱۶، ۱۷ (۱۷ تا ۳۰ اپریل ۱۹۸۱ء)

(55) اکبری، عبد الحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص ۶۔ ج ۲۳۔ ش ۱

(56) محمود، صاحبزادہ، سیّد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۴۲

(57) حامد میاں، سیّد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۹۳۔ ج ۲۳۔ ش ۱۶، ۱۷ (۱۷ تا ۳۰ اپریل ۱۹۸۱ء)

(58) حامد میاں، سیّد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۹۳۔ ج ۲۳۔ ش ۱۶، ۱۷ (۱۷ تا ۳۰ اپریل ۱۹۸۱ء)

(59) روحانی، بازی، محمد، موسیٰ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۸۴

(60) ندوی، ابو الحسن علی، مولانا، سیّد۔ حیات عبد الحیٔ۔ ص ۲۱۷۔

(61) فضل الرحمٰن، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۶۲

(62) فضل الرحمٰن، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۶۴

(63) فضل الرحمٰن، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۳۳

(64) فضل الرحمٰن، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۳۳

(65) اہلیہ محترمہ مولانا مفتی محمود۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۵۴

(66) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۳۶۔ ج ۲۳۔ ش ۱۶، ۱۷ (۱۷ تا ۳۰/ اپریل ۱۹۸۱ء)

(67) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص ۸۔ ج ۲۳۔ ش ۱

(68) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص ۸۔ ج ۲۳۔ ش ۱

(69) روحانی بازی، موسیٰ، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۲۳۵

(70) عبدالبر، محمد قاسم، مولانا۔ تاریخ قاسم العلوم ملتان۔ ص ۸۔ مدرسہ قاسم العلوم ملتان۔ ۱۳۹۶ء

(71) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۴۰۔ ج ۲۳۔ ش ۱۶، ۱۷ (۱۷ تا ۳۰/ اپریل ۱۹۸۱ء)

(72) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۳۷۔ ج ۲۳۔ ش ۱۶، ۱۷ (۱۷ تا/ ۳۰ اپریل ۱۹۸۱ء)

(73) مبارک علی، رانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۲۶۰

(74) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۳۷۔ ج ۲۳۔ ش ۱۶، ۱۷ (۱۷ تا ۳۰/ اپریل ۱۹۸۱ء)

(75) مفتی محمود، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص ۵۔ ج ۱۶۔ ش ۲۰ (۲۵ مئی ۱۹۷۳ء)

(76) کمال، احمد حسین، ڈاکٹر۔ عہد ساز قیادت۔ ص ۸۴۔ جمعیۃ پبلیکیشنز وحدت روڈ لاہور۔ ۲۰۰۱ء ایڈیشن دوم

(77) فاروقی، ضیاء الرحمٰن، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۳۵۶

(78) غفور احمد، پروفیسر۔ پھر مارشل لاء آگیا۔ ص ۱۲۲۔ جنگ پبلشرز تیسرا ایڈیشن 1959ء

(79) غفور احمد، پروفیسر۔ پھر مارشل لاء آگیا۔ ص ۱۴۰۔

(80) غفور احمد، پروفیسر۔ پھر مارشل لاء آگیا۔ ملخصاً۔

(81) مفتی محمود، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص ۵۔ ج ۱۶۔ ش ۲۰ (۲۵/ مئی ۱۹۷۳ء)

(82) مفتی محمود، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص ۵۔ ج ۱۶۔ ش ۲۰ (۲۵/ مئی ۱۹۷۳ء)

(83) جالندھری، محمد شریف، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص ۱۱۔ ج ۱۴۔ ش ۲ (۸/ جنوری ۱۹۷۱ء)

(84) آسی، محمد نعیم۔ مولانا مفتی محمود (حیات وخدمات)۔ ص ۲۰۱، ۲۰۲۔ مسلم اکادمی وزیر پورہ سیالکوٹ۔ ۱۹۷۷ء

(85) .... روزنامہ نوائے وقت لاہور۔ ۲۵/ مارچ ۱۹۷۳ء

(86) .... روزنامہ نوائے وقت لاہور۔ ۷/ جون ۱۹۷۳ء

(87) آسی، محمد نعیم۔ مولانا مفتی محمود (حیات وخدمات)۔ ص ۲۳۰

(88) آسی، محمد نعیم۔ مولانا مفتی محمود (حیات وخدمات)۔ ص ۲۳۱

(89) امروٹی، محمد شاہ، سید، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۵۶

(90) قریشی، نورالحق، قاری، ایڈوکیٹ۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۳۷

(91) چترالی، گل نایاب خان۔ مفتی محمود کی سیاسی زندگی۔ ص ۴۰۳، ۴۰۴۔ دارالعلوم محمدیہ ناصر پارک بلال گنج گلی نمبر ۱، لاہور۔ ۲۰۰۲ء

(92) سمیع الحق، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۲۹

(93) کمال، بشیر احمد، حافظ۔ روزنامہ "وفاق" لاہور۔ ص ۶۱

(94) فضل الرحمٰن، مولانا۔ روزنامہ "وفاق" لاہور۔ ص ۱۸

(95) انور، عبیداللہ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۲۱

(96) سعید الرحمٰن، قاری، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۷۸

(97) عثمانی، محمد شریف۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۳۴۲

(98) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۷۔۳۔ ج ۲۳۔ ش ۱۶، ۱۷ (۱۷ تا ۳۰/اپریل ۱۹۸۱ء)

(99) کمال، احمد حسین، ڈاکٹر۔ عہد ساز قیادت۔ ص ۹۵

(100) کمال، احمد حسین، ڈاکٹر۔ عہد ساز قیادت۔ ص ۹۷

(101) کمال، احمد حسین، ڈاکٹر۔ عہد ساز قیادت۔ ص ۱۳۴

(102) کمال، احمد حسین، ڈاکٹر۔ عہد ساز قیادت۔ ص ۱۳۴

(103) چترالی، گل نایاب خان۔ مفتی محمود کی سیاسی زندگی۔ ص ۳۷۹

(104) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص ۹۔ ج ۲۳۔ ش ۱

(105) سعید الرحمٰن، قاری، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۷۴

(106) کیانی، محمد شریف۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۴۷، ۴۸

(107) شوکت، حسن، ملک، ڈاکٹر۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۲۴۹، ۲۵۰

(108) ظہور احمد۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۴۷

(109) عثمانی، محمد تقی، مولانا۔ روزنامہ "وفاق" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۲۷

(110) اہلیہ محترمہ مفتی محمود۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۵۴

(111) محمد رحمٰن، ڈاکٹر۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۴۴۸، ۴۴۹

(112) اہلیہ محترمہ مفتی محمود۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۵۶

(113) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص ۷۔ ج ۲۳۔ ش ۱

(114) جمیل خان شہید، مفتی، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۳۶۳، ۳۶۴

(115) محمد رحمٰن، ڈاکٹر۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۴۴۹

(116) جمیل خان شہید، مفتی، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۳۶۴

(117) جمیل خان شہید، مفتی، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۳۶۵

(118) محمد حنیف، شیخ۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۲۵۲

(119) عثمانی، محمد تقی، مولانا۔ محمد حنیف، شیخ۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۲۵۲

(120) لدھیانوی، محمد یوسف۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۲۵۴ تا ۲۵۶

(121) جمیل خان شہید، مفتی، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۳۶۶

(122) جمیل خان شہید، مفتی، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۳۶۷، ۳۶۸

(123) سعید الرحمٰن، مولانا، قاری۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۷۴

(124) انور، عبید اللہ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۲۰

(125) نور الہدیٰ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۵۰

(126) بنوری، محمد ایوب، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۱۷

(127) صدر الشہید، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۲۲

(128) سعید الرحمٰن، قاری، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۷۳، ۱۷۴

(129) جلالی، عبد العزیز، قاری۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۷۲

(130) سمیع الحق، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۲۹، ۱۳۰

(131) احمد الرحمٰن، مولانا، مفتی۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۶۳

(132) فیض احمد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۷۰

(133) محمد زکریا، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۳۳

(134) فیض احمد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۷۰، ۷۱

(135) غفور احمد، پروفیسر۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۹۱، ۹۲

(136) عبد الرحمٰن، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۶۲

(137) اشرف، عبد الرحیم، حکیم۔ ص ۱۳۵ تا ۱۳۸

(138) ظہیر، احسان الٰہی، علامہ۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۳۹

(139) عبید اللہ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۴۴

(140) ظہیر، احسان الٰہی، علامہ۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۴۰

(141) کراروی، علی غضنفر، علامہ۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۴۲

(142) قریشی، محمد یوسف، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۴۹

(143) تاج محمود، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۵۴

(144) عبد الحکیم، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۵۶

(145) قادری، محمد عرفان۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۹۸

(146) مظاہری، گلزار احمد، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۶۰

(147) عبد الرحمٰن، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۶۲، ۱۶۳

(148) حامد میاں، سیّد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۹۳ تا ۹۵

(149) فتح محمد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۰۵

باب دوم

علمی خدمات

آپ کا علمی مقام

مولانا مفتی محمودؒ کا علمی مقام بہت بلند ہے۔ اُن کی صفات میں علم کی صفت ایک غالب صفت ہے۔ اور اس علمی مقام کی وجہ سے ان کا علمی ودینی حلقوں میں نہ صرف احترام کیا جاتا تھا بلکہ بڑے بڑے ہم عصر علماء اُن کے سامنے استفادہ کے لئے دم بخود بیٹھے رہتے تھے۔

اس سلسلے میں مولانا حامد میاں تحریر کرتے ہیں۔

> مفتی صاحب کے آخری دور کی سیاسی شہرت سے خیال ہوتا تھا کہ وہ ایک سیاسی لیڈر ہی تھے۔ حالانکہ وہ بہت بڑے مدرس بھی تھے حدیث، تفسیر، فقہ کے علاوہ فلکیات، فلسفہ اور منطق کے بہت قابل ترین استاد تھے۔ حق تعالیٰ نے سب علوم میں کمال اور دقتِ نظر سے نوازا تھا۔ وہ اس دور کے بہت ہی بلند پایہ فقیہ و مفتی بھی تھے ان مشاغل کے ساتھ منصب افتاء پر بھی فائز رہے اور مدرسہ قاسم العلوم میں ان کے ہاتھ سے بیس ہزار سے زائد فتاوی تحریر ہوئے۔(۱)

جن حضرات نے مولانا مفتی محمودؒ کو قریب سے دیکھا ہے اور ان کی محفل میں کچھ دیر کے لئے شرکت کا موقع ملا ہے۔

وہ برملا اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔ مولانا محمد موسیٰ روحانی بازی رقمطراز ہیں۔

> حضرت مفتی محمود نور اللہ مرقدہ جامع الکمالات انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی عالم دین میں بیک وقت اتنے کمالات جمع نہیں دیکھے۔ آپ بہت بڑے محدث، فقیہ، فن منطق کے ماہر فلسفی، بے نظیر قاری، اصول پسند، فصیح و بلیغ مبلغ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے سیاستدان اور مفتی بھی تھے۔ مجمع میں تمام حاضرین کو اپنے دلائل اور اخلاص سے متاثر کر لیا کرتے تھے کسی کو تابع و گرویدہ بنانا انہی کا کام تھا۔ آپ ظاہری و باطنی، دینی و دنیاوی، علمی و غیر علمی تمام خوبیوں کا مجموعہ تھے حقیقت تو یہ ہے کہ آپ اس آیت کے مصداق تھے۔

﴿و زاده بسطة فی العلم و الجسم﴾ ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے اسے علم و جسم میں کشادگی نصیب فرمائی۔(۲)

مولانا مفتی محمودؒ کے کمالات کے بارے میں ہم عصر علماء کا اعتراف کوئی مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ مولانا محمد ایوب بنوریؒ آپ سے عمر میں بڑے تھے۔ اور ان کی ساری زندگی درس و تدریس میں گزری تھی وہ لکھتے ہیں۔ "جناب مولانا مفتی محمود کا مقام علماء دین میں بھی اونچا تھا۔ آپ ایک جید عالم دین تھے۔ تمام علوم دینیہ پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ مفاہمت میں بے مثال تھے۔ مطالعہ وسیع تھا۔ درس و تدریس سے خاص دلچسپی اور شغف تھا"۔(۳)

علمی مشاغل کے ساتھ ساتھ سیاست کے میدان میں بھی آپ نے کارہائے نمایاں انجام دیئے مگر ساری تگ و دو کے باوجود آپکی ساری شہرت اور عزّت ایک عالم دین ہونے کی وجہ سے تھی جس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ آپ نے سیاست اور سیاسی مصروفیتوں کو کبھی علم اور علمی مشاغل پر غالب نہیں آنے دیا۔ ایک بزرگ سیاستدان سردار عبدالقیوم خان آپ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

جہاں تک مفتی صاحب کو علمی اور سیاسی حیثیتوں میں سے کسی ایک حیثیت کو دوسری حیثیت پر ترجیح دینے کا سوال ہے تو یہ ایک مشکل بات ہے میں نے ان کو دونوں حیثیتوں میں دیکھا۔ انکی دونوں حیثیتوں پر غور کیا میں نے انہیں علمی اور سیاسی ہر دو اعتبار سے غیر معمولی انسان پایا۔ البتہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ان کی ذات شخصیت اور وجود پر علم غالب تھا بسا اوقات یوں محسوس ہوتا تھا کہ سیاست میں وہ مجبوراً حصہ لے رہے ہیں ان کی اس سے ذاتی دلچسپی نہیں ان کی دلچسپی کا مرکز صرف اور صرف علم ہے۔(۴)

مولانا مرحوم کے بارے میں قریباً یہی تاثرات مولانا مفتی تقی عثمانی کے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

یہ حضرت مفتی صاحب کی انتہائی نمایاں خصوصیت تھی کہ سیاست میں اس درجہ انہماک کے باوجود ان کا علمی استحضار اور علمی ذوق پوری طرح برقرار رہا جب کبھی کسی علمی مسئلے کی بات آتی تو معلوم ہوتا کہ اس کے تمام مالہ وماعلیہ پوری طرح حضرت مفتی صاحب کی نگاہ میں ہیں اور جب اس موضوع پر بات کرتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی علمی کتاب کا درس ہو رہا ہے۔ مفتی صاحب کی علمی استعداد اور استحضار کی یوں پختگی کی جو وجہ مولانا محمد تقی عثمانی نے بیان کی ہے وہ خود ان کے الفاظ میں درج ذیل ہے۔

سیاسی مصروفیات کے باوجود اس علمی ذوق اور علمی پختگی ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ جس ماحول میں گئے۔ وہاں اپنی ذہانت، طباعی اور علمی وسعت کا لوہا منوایا۔ بات دراصل یہ تھی کہ مفتی صاحب ایک طویل عرصہ تک علمی مشاغل میں ہمہ تن مصروف رہے اپنی علمی استعداد کو پختہ کیا اور معلومات کو وسعت دی۔

اس کے بعد عملی سیاست میں داخل ہوئے جو لوگ علم میں پختگی حاصل کئے بغیر سیاست ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتے ہیں حضرت مفتی صاحب ان سے یکسر مختلف تھے اور ان کا طرز عمل اس معاملہ میں مشعل راہ ہے۔(۵)

عوام النّاس میں سیاستدان کی حیثیت سے اگرچہ آپ کو ایک خاص شہرت حاصل تھی مگر حقیقت میں آپ ایک سیاستدان سے زیادہ ایک عالم دین کی حیثیت سے علمی دنیا میں شہرت رکھتے تھے۔ چنانچہ مولانا امیر الزمان کشمیری لکھتے ہیں۔ "عام لوگ حضرت مفتی صاحب کو ایک سیاستدان کی حیثیت سے جانتے تھے لیکن اصل میں مفتی صاحب ایک عظیم محدّث اور متکلّم اور (علوم) عقلیہ اور نقلیہ پر مکمل دسترس رکھتے تھے اس کے ساتھ ساتھ اسلامی قانون پر جتنا گہرا مطالعہ ان کا تھا۔ اتنا شاید کسی اور کا نہ ہو"۔(۶)

اگرچہ مولانا مفتی محمودؒ نے اپنے اکابرین کے اتباع میں امت مسلمہ کی رہنمائی کا فریضہ انجام دینے کی خاطر سیاست کی وادی میں قدم ضرور رکھا۔ مگر آپ کا مقصد سیاست برائے سیاست

یاسیاست برائے اقتدار نہ تھا بلکہ اس سے مقصد مسلمانوں کی رہنمائی اور اسلام کی دعوت و تبلیغ تھا۔
اس بارے میں مولانا محمد ایوب بنوریؒ لکھتے ہیں۔

> علمی ماحول اور علماء میں اپنے آپ کو پاکر حظ اور سرور محسوس فرماتے۔ درحقیقت آپ قول و فعل کے سچے، اعلاء کلمۃ اللہ کے داعی اور اسلام کے حقیقی جانثار سرفروش تھے اور علم و عمل میں اسلاف کا نمونہ تھے۔ آپ ستھری سیاست اور بامقصد جمہوریت کے قائل تھے اور آپ کی سیاست اسلام کی تبلیغ تھی۔(۷)

بناء بریں مولانا مفتی محمود کی علمی برتری نہ صرف پاکستان میں بلکہ تمام اسلامی دنیا میں تسلیم کی جاتی تھی اور آپ اس لحاظ سے عالمگیر شہرت کے مالک تھے۔ مولانا محمد ایوب جان بنوریؒ لکھتے ہیں۔

> ان کی علمی برتری صرف سرحد اور بلوچستان تک محدود نہیں رہی، پورے ملک بلکہ پوری دنیا میں اس کی دھوم مچی۔ عرب ممالک میں ان کی ثقاہت کو بلند پایہ علماء بھی تسلیم کرتے تھے۔ علماء ازہر اور علماء مصر تمنا رکھتے تھے کہ مفتی محمود تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی کام کریں۔ لیکن ان کے پاس وقت کی کمی تھی۔(۸)

مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے بھی آپ کی علمی حیثیت کے ساتھ ساتھ آپ کی بین الاقوامی شہرت اور حیثیت کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> آپ کی شخصیت علمی حلقوں میں بہت زیادہ معروف ہے۔ اس وقت پاکستان کی پارلیمنٹ کے ممبر ہیں۔ حق گوئی میں بے باک ہیں۔ فقہی اور حدیثی استعداد کے ساتھ عصری معلومات پر کافی عبور رکھتے ہیں۔ پارلیمنٹ میں آپ کی تقریریں شرعی اور عصری معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہوتی ہیں۔ افتاء آپ کا خاص منصب ہے۔ اور آپ کے فتاویٰ ملک میں اعتماد و وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ وطن صوبہ سرحد (مغربی پاکستان) ہے۔ آپ اپنی گوناگوں علمی خصوصیات کی وجہ سے مصر کی عالمی مؤتمر میں بھی طلب

> کیے گئے اور وہاں آپ کا بلیغ خطاب وقعت کے ساتھ سنا گیا۔ آپ دارالعلوم کے ممتاز فضلاء اور پاکستان کے مشاہیر میں سے ہیں۔(۹)

ایک بہت بڑے عالم ہونے کی حیثیت سے آپ کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ جبکہ آپ کا علمی استحضار حیران کن تھا۔ ایک عالم کا مطالعہ وسیع ہوتا ہے۔ مگر علمی استحضار کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ وسعت مطالعہ سے کماحقہٗ نہ خود کوئی فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ اور نہ کسی اور کو مستفید کر سکتا ہے جس سے وہ ہمیشہ ایک شدید کمی کا شکار رہتا ہے۔ مولانا مفتی محمود کو اللہ تعالیٰ نے اس پہلو سے بھی خوب نوازا تھا۔ آپ کا علمی استحضار لاجواب تھا۔ اس سلسلے میں مولانا اجمل خان لکھتے ہیں "قدرت نے انہیں اتنی اعلیٰ اور منفرد خصوصیات سے نوازا تھا کہ علم و دانش کے اس بحر بے کراں کا علمی استحضار بڑے بڑے علماء کے لئے قابل رشک تھا۔ ان کی فاضلانہ بصیرت مسلّمہ تھی۔(۱۰)

آپ ہمہ صفات شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کی ذات کو خالق باری تعالیٰ نے تمام کمالات کا جامع بنایا تھا۔ اس حوالے سے مولانا تاج محمود لکھتے ہیں۔ "مفتی صاحب ایک بہترین مدرس، بلند پایہ شیخ الحدیث، عظیم المرتبہ فقیہ، مشہور زمانہ مفکر، منجھے ہوئے سیاستدان، سنجیدہ خطیب اور مانے ہوئے پارلیمنٹیرین اور مقرر تھے"۔(۱۱)

اس حقیقت کا اظہار حکیم عبدالرحیم اشرف نے، جن کا تعلق مسلک اہل حدیث سے تھا اور سیاسی لحاظ سے بھی مفتی صاحب کے ہم خیال نہ تھے۔ یوں کیا ہے۔

> کتابی اور اکتسابی علم تمام علماء کے پاس ہوتا ہے۔ لیکن یہ علم نہ ہر وجود پر کھلتا ہے اور نہ ہر وجود میں بولتا ہے۔ مفتی صاحب کے وجود پر یہ علم کھلتا بھی تھا اور ان کی شخصیت میں علم بولتا بھی تھا۔ ان کا تعارف نام و نسب سے نہیں بلکہ علم و کسب سے ہوتا تھا۔ اسی طرح مطالعہ و استدلال بھی سب علماء کرتے ہیں لیکن ہر عالم کی شخصیت اسکے کثیر المطالعہ ہونے کی آئینہ دار نہیں ہوتی۔ استدلال بھی تمام اہل علم کرتے ہیں۔ مگر ان کے استدلال میں ذکاوت نہیں ہوتی۔ مفتی صاحب کی شخصیت و گفتگو ان کے

وسیع النظرف، بالغ نظر اور کثیر المطالعہ ہونے کی آئینہ دار تھی۔ علاوہ ازیں ان کے استدلال میں ذکاوت موجود تھی۔ جس سے سامع پر علم اور صاحب علم دونوں کا خاطر خواہ اثر پڑتا تھا۔(۱۲)

مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق سکندر مہتمم جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی رقمطراز ہیں۔

محدث العصر، جانشین حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ حضرت علامہ سیّد محمد یوسف بنوری نوّر اللہ مرقدہ کی زبانی اکثر و بیشتر حلاوت آمیز جملے بار بار کانوں کی سماعت سے ٹکرا کر عقیدت و محبت میں اضافے کا باعث بنے کہ اللہ تعالیٰ نے مفتی محمود کو بلا کی ذہانت، غیر معمولی حافظہ اور بے مثال فقاہت و ذکاوت اور سمجھ بوجھ عطا فرمائی ہے۔(۱۳)

وہ مزید لکھتے ہیں۔

قرآن و حدیث اور فقہ تینوں علوم میں عظیم مہارت آپ کے علو مرتبہ کی روشن دلیل ہے۔ درس حدیث کے ساتھ افتاء کی شمولیت ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ لیکن مفتی محمودؒ نے جس سہل انداز سے ان دونوں منصبوں کو نبھایا اس نے علماء کرام کے قلوب میں آپ کی علمیّت کی دھاک بٹھادی۔(۱۴)

مولانا مفتی محمود سے کروڑوں مسلمان عقیدت و محبت رکھتے تھے، اس کی وجہ بھی آپ کی جامعیت تھی۔ مولانا محمد سرفراز خان صفدر صاحب لکھتے ہیں۔

مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ سلسلۃ الذھب کی وہ کڑی ہیں۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے بڑی جامعیت سے نوازا۔ دین اسلام کے تمام شعبوں میں ان کو مہارت تامہ عطا فرمائی۔ وہ بیک وقت محدث بھی تھے اور مفسّر بھی۔ فقیہ کی حیثیت سے دنیا بھر کے علماء کرام ان پر اعتماد کرتے تھے۔ تقریر و تحریر کے میدان میں ایک دنیا ان کی مہارت کی داد دیتی تھی۔ اور مدرس کی حیثیت سے تشنگان علوم ان سے جواہر علمی چنتے تھے ....

.........سب سے قابل ذکر بات یہ ہے کہ مفتی محمودؒ کی اس حیثیت کو موافق و مخالف

ہر ایک نے تسلیم کیا.................... مگر ان کے علم و فضل کی روشن کرنوں نے ان کو کروڑوں مسلمانوں کی دلوں کی آواز اور محبت و عقیدت کا محور بنادیا۔(۱۵)

مشہور اہل حدیث عالم اور متعدد عربی کتب کے مصنف علامہ احسان الٰہی ظہیر، مفتی صاحب کے علمی مقام کے بارے میں لکھتے ہیں۔

وہ فی الواقع علماء کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جن پر علماء کا لفظ سجتا اور صادق آتا تھا .... اپنی ان علمی مصروفیتوں اور مطالعہ کی روشنی میں بہت کم لوگ جو دل کو بھائے۔ مفتی صاحب ان لوگوں میں سے ایک تھے۔ جنہیں علم و مطالعہ کے جس پہلو سے بھی دیکھا، جانچا، پرکھا، کامل مکمل پایا۔(۱۶)

مفتی صاحب کی عالمانہ حیثیت ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ اور اپنے دور کے تمام علماء خواہ ان کا تعلق جس مسلک سے بھی رہا آپ کی علمیت کے معترف نظر آتے ہیں۔ اور یہی کسی عالم کی علمیت کا سب سے بڑا ثبوت ہوتا ہے۔

مولانا عبید اللہ صاحب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور لکھتے ہیں۔" مفتی صاحب کے علم کے اپنے، بیگانے، دوست، دشمن سبھی معترف تھے ان کے وسیع علم سے اکثر اہل علم متاثر ہوتے تھے"۔(۱۷)

یہی بات مولانا عبد الرحمان صاحب شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور، مفتی صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

ان کا علمی مقام اتنا بلند تھا کہ اس پر کچھ کہنا، سورج کی روشنی پر دلائل دینے والی بات ہے۔ سورج کی روشنی پر دلائل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ روشن ہوتا ہے۔ اور اپنی روشنی کا ہر دیکھنے والے سے اقرار کراتا ہے۔ اسے دیکھنے کے لئے آنکھوں کی اور صرف آنکھوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مفتی صاحب کے علم پر ایک زمانہ شاہد عدل ہے اور انکی

بعض خوبیوں کو دیکھ کر ان کے مخالفین بھی ان کی علمی عظمت کا اعتراف کرتے تھے۔ (۱۸)

اللہ تعالیٰ نے مفتی صاحب کو جو علمی فراست و بصیرت عطا فرمائی تھی وہ مجتہدانہ تھی۔ مولانا محمد ایوب جان بنوریؒ رقمطراز ہیں۔

> مفتی محمود علم کے حوالے سے بہت بڑے آدمی تھے۔ ان کو خدا نے مجتہدانہ بصیرت عطا فرمائی تھی۔ وہ بیک وقت محدث، مفسّر، مفتی اور قومی رہنما تھے۔ اگر سیاست میں حصہ نہ لیتے تو علمی میدان میں منفرد نوعیت کا علمی کام کرتے اور وہ جس قدر بڑے ہمیں نظر آتے ہیں اس سے زیادہ بلکہ ہمارے تصوّرات سے کہیں زیادہ بڑے انسان ہوتے۔

وہ آگے چل کر لکھتے ہیں۔

> ایک بار میں نے ان کے ساتھ باجوڑ تک طویل سفر کیا۔ سارے راستے میں علمی باتیں ہوتی رہیں۔ بعض مسائل پر انہوں نے جو دلائل دیئے وہ میرے لئے بالکل نئے تھے۔ ان سے علمی نکات اور فقہی استدلال سن کر مجھے اپنا علم و مطالعہ محدود اور سطحی نظر آتا تھا۔ (۱۹)

مولانا محمد ایوب جان بنوریؒ صاحب جو علمی میدان کے شہسوار اور بحر علم کے شناور ہیں وہ مولانا مفتی محمود صاحب کی علمی شہرت اور علمی گہرائی کے بارے میں اپنا تأثر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

> جہاں تک مجرد علم کا تعلق ہے تو صوبہ سرحد اس لحاظ سے کبھی پسماندہ نہیں رہا۔ یہاں ہر دور میں بڑے بڑے علماء اور فضلاء موجود رہے۔ خود مفتی محمود کے دور میں بھی صوبہ سرحد میں اس پایہ کے علماء بکثرت موجود رہے لیکن جہاں تک علم کے استعمال کا تعلق ہے تو اس بارے میں دوٹوک بات کہی جاسکتی ہے کہ پورے صوبہ میں مفتی محمود کا کوئی علمی حریف نہیں تھا۔ جن علماء کے پاس علم تھا ان کے پاس اس کے استعمال کا طریقہ

> نہیں تھا جن کے پاس طریقہ اور سلیقہ تھا ان کے پاس شستہ اور رواں زبان نہیں تھی۔ مفتی صاحب کو قدرت نے اس دولت سے وافر حصّہ عطا فرمایا تھا۔ (۲۰)

وہ مفتی صاحب کی عالمگیر شہرت کی وجہ یہ بتاتے ہیں۔

> وہ عربی، اُردو، فارسی اور پشتو میں اظہار خیال پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ گفتگو میں سنجیدگی، متانت، مٹھاس اور قوت استدلال کا عنصر غالب تھا۔ وہ باتوں ہی باتوں میں بڑے بڑے مسائل حل کر دیتے تھے۔ مختلف زبانوں پر قادر ہونے سے بھی ان کی شہرت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ پشتو نے انہیں سرحد و بلوچستان میں متعارف کرایا۔ تو اُردو نے پاکستان میں نمایاں کیا اور عربی نے سرزمین حجاز میں ان کی مقبولیت بڑھائی۔ (۲۱)

مفتی صاحب کا علمی مقام بہت بلند تھا۔ علمی استحضار کے ساتھ ساتھ ان کا قوت استدلال بہت بڑھ کر تھا۔ اس لئے وہ جو بھی بات کرتے وہ دلائل کی بنیاد پر ہوتی تھی۔ اور سامع کو ان کے زور استدلال کے سامنے اپنا مؤقف تبدیل کرنا پڑتا تھا۔ مولانا اسفندیار لکھتے ہیں۔

> مفتی صاحب جو بات بھی فرماتے مدلّل اور کسی بات کو تسلیم کرتے تو وہ بھی دلائل کی بنیاد پر۔ وہ نہ اپنا حکم کسی پر ٹھونستے تھے۔ اور نہ کسی کا حکم یا بات بغیر دلائل کے تسلیم کرتے۔ ان کے دلائل اس قدر مضبوط اور محکم ہوتے کہ بڑے سے بڑا آدمی ان دلائل کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ (۲۲)

ان کی قوت استدلال کے بارے میں مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق سکندر لکھتے ہیں۔

> بارہا اکابر علماء کرام کی موجودگی میں حضرت مولانا مفتی محمود کے مدلّل انداز اور استحضار کی کیفیت دیکھ کر اکابر علماء کی نظروں میں جو خراج تحسین دیکھا اور محبت و شفقت کے جذبات محسوس کئے۔ اس کی وجہ سے مفتی محمود صاحبؒ کی علمی حیثیت مزید اجاگر ہوتی چلی گئی۔ اب تک بغیر دلیل کے گفتگو کرتے ہوئے مولانا مفتی محمودؒ کو نہیں دیکھا گیا۔ واقعی وہ دلائل کے بادشاہ تھے۔ (۲۳)

مفتی صاحبؒ کی گفتگو کا انداز مبنی بر دلائل ہوتا تھا۔ عام بات بھی کرتے تو دلائل کی بھرپور قوت کے ساتھ کرتے۔ اگر کسی نے اختلاف رائے کا اظہار کیا تو کبھی بُرا محسوس نہ کرتے۔ اخلاق کا دامن کبھی نہ چھوڑتے اور اختلاف رائے کی صورت میں بھی رواداری کے قائل ہوتے۔ مولانا گلزار احمد مظاہری لکھتے ہیں۔

> ۱۹۸۰ء کے اوائل میں جب وہ دورہ ایران پر تشریف لے گئے۔ تو اتفاق سے ہم دونوں گئے بھی ایک ہی جہاز میں اور آئے بھی ایک ہی جہاز میں اس دوران بہت باتیں ہوئیں بہت سے مسائل پر تبادلہ خیال ہوا۔ وہ اختلافات پر اخلاقیات کو ترجیح دیتے تھے۔ ہر بات دلیل سے کرنے اور سننے کے خواہشمند ہوتے تھے۔ اختلافات کے باوجود رواداری کے قائل تھے مسائل حاضرہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔(۲۴)

اور آپ کے بارے میں یہی مشاہدہ آپ کے ساتھ عرصہ تقریباً ۱۵ سال تک مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے درجہ حدیث کے استاد اور آپ کے بعد اسی مدرسہ کے مہتمم مولانا فیض احمد صاحب کا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں۔

> حضرت مفتی صاحب، اسلام کے زبردست متکلم اور کامیاب وکیل تھے۔ ملکی اور ملی مسائل پر گہری اور محیط نگاہ رکھتے تھے اور شب وروز ان کے حل کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔ جب کسی مجلس میں کسی مسئلہ پر کلام فرماتے تو شق وار بحث کرتے تھے۔ نہایت مؤثر انداز میں واقعاتی دلائل وشواہد سے اسے مبرہن کرتے تھے۔ انصاف پسند مخاطب کو اعتراف وتسلیم کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ آپ کا کلام نہایت سہل، سلیس اور عام فہم ہوتا تھا۔ لیکن واقعات وحقائق اور دلائل وشواہد سے بھرپور۔ آپ کا مخاطب بڑے سے بڑا عالم ہو یا وکیل، ہائی کورٹ کا جج ہو یا ملک کا سربراہ، دستور اسمبلی کا سپیکر ہو یا کسی جماعت کا قائد آپ کے انداز بیان اور قوت استدلال سے متاثر ہو کر اپنے آپ کو تسلیم واعتراف پر مجبور پاتا تھا۔(۲۵)

مفتی محمود کا علمی مقام بہت بلند ہے۔ اس لحاظ سے تمام موافق و مخالف اس بات پر متفق نظر آتے ہیں۔ کہ علمی حیثیت سے آپ کو اللہ تعالیٰ نے جامعیت عطا فرمائی تھی۔ اس سلسلے میں مولانا مفتی محمد جمیل خان شہید رقمطراز ہیں۔

> بعض شخصیات کو اللہ تعالیٰ ایسی جامعیت عطا فرماتے ہیں کہ دین اسلام کے تمام شعبوں میں ان کی خدمات سورج نصف النہار کی مثال بنی ہوتی نمایاں محسوس ہوتی ہیں۔ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور فقیہ اُمت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی روحانی اولاد کی جامع ترین شخصیات کی فہرست کو ہم دیکھتے ہیں تو شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ کی شخصیت اپنی جامعیت میں ایسی ہے جس کی نظیر مشکل ہے۔ آپ کے بعد شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی خدمات کو دیکھتے ہیں تو آپ کی شخصیت میں جامعیت ہی جامعیت نظر آتی ہے۔ چودھویں صدی کے آخری حصے میں جامعیت کی حامل اگر کسی شخصیت پر ہماری نگاہیں ٹھہرتی ہیں۔ تو وہ ذات گرامی مولانا مفتی محمودؒ صاحب کی ہے۔ اپنی زندگی کے قیمتی ترین لمحات میں انہوں نے زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جس میں ان کی خدمات کو دنیا بھر کے علماء کرام اور اصحاب علم نے خراج تحسین نہ پیش کیا ہو۔(۲۶)

مولانا مفتی محمودؒ کی جامعیت کے بارے میں مولانا مفتی جمیل خان شہید نے مولانا مفتی احمد الرحمٰن کے حوالہ سے یوں لکھا ہے۔

> حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نور اللہ مرقدہ کی زندگی آئینے کی طرح صاف اور شفاف تھی ایک ایک گوشہ ایسا تھا جو کہ سب کو متاثر کر دیتا تھا۔ ہم نے اپنی زندگی میں ایسا شخص نہیں دیکھا۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے بارے میں سنا تھا کہ آپ جامع شخصیت کے مالک تھے۔ ایک طرف سیاسی میدان کے شہسوار، دوسری طرف تدریس کے مایۂ ناز اور تیسری طرف طریقت کے بے مثل شیخ۔ یہی جامعیت ہم نے مولانا مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ میں دیکھی۔(۲۷)

آپ کی جامعیت، علمی کمالات اور متعدد علوم میں کامل دسترس کے بارے میں آپ کے عالم فاضل بیٹے، مولانا فضل الرحمٰن لکھتے ہیں۔

بحیثیت عالم ان کا مقام بہت بلند تھا۔ لیکن اگر اس سے مراد مجرد علم ہے تو اس بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا ممکن نہیں کہ وہ کس پایہ کے عالم تھے۔ اس کا فیصلہ کرنا خود علماء کے لئے مشکل ہے۔ جنہوں نے ان کے فقہی استدلال سُنے انہوں نے انہیں فقیہ مانا۔ جنہوں نے حدیث پڑھی انہیں محدث نظر آئے۔ جنہوں نے تفسیر پڑھاتے دیکھا انہوں نے مفسّر قرار دیا۔ جنہوں نے منطق وفلسفہ پڑھاتے دیکھا انہوں نے ایک معقولی عالم سمجھا۔ جنہوں نے میدانِ سیاست میں بولتے دیکھا انہوں نے ایک سیاستدان کی حیثیت سے پہچانا۔ وہ کتنے بڑے عالم تھے؟ یہ طویل بحث ہے۔(۲۸)

حضرت مفتی صاحب کی علمی گہرائی کی وجہ آپ کی خداداد صلاحیت واستعداد، آپ کے اساتذہ کرام کی قابلیت اور آپ کی خداداد قوت استدلال کے ساتھ ساتھ آپ کا ہمیشہ مطالعہ کتب کی طرف رجحان بھی تھا۔ اس بارے میں مولانا محمد تقی عثمانی صاحب بیان کرتے ہیں۔

۱۹۷۹ء میں اسلامی نظریاتی کونسل کا ممبر تھا............ ان دنوں مفتی محمودؒ، راولپنڈی کے C.M.H میں زیر علاج تھے۔ میں حدود وزکوٰۃ کے مسائل کے سلسلے میں حضرت مفتی صاحب سے مشورہ کرنے آپ کے پاس جایا کرتا تھا۔ اور ہر ہر موقع پر آپ کی علمی گہرائی وگیرائی کا نہ صرف یہ کہ اندازہ ہوتا تھا بلکہ حیرانی بھی۔ کہ اتنی مصروفیات کے باوجود آپ علمی مسائل کی پیچیدگیوں کو بخوبی جانتے ہیں اور مطالعہ بھی بدستور جاری ہے۔(۲۹)

تدریسی خدمات

مولانا مفتی محمود ۱۹۴۱ء میں جب تحصیل علم سے فارغ ہوئے۔ تو اسی سال اپنے وطن واپس لوٹے۔ کچھ عرصہ اسی انتظار میں رہے کہ کسی موزوں مدرسہ سے درس وتدریس

کی دعوت ملے تو وہاں یہ سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ انہی دنوں آپ کو، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کا شرف حاصل ہوا۔ اور آپ نے تصوف کے ابتدائی اسباق لئے۔(۳۰)

"اسی سال ان کو مدرسہ معین الاسلام عیسیٰ خیل (ضلع میانوالی کی موجودہ تحصیل) سے تدریس کی دعوت ملی۔ اور پندرہ روپے مشاہرہ طے ہوا"۔(۳۱)

آپ عیسیٰ خیل میں قیام کے دوران درس نظامی کی ابتدائی کتب کا درس دیتے رہے۔ اسی عرصہ میں حضرت شاہ عبدالعزیز کی سرپرستی میں آبا خیل (سابقہ ضلع بنوں اور موجودہ ضلع لکی مروت) میں ایک دینی مدرسہ کے قیام کا فیصلہ ہوا۔ ۱۹۴۵ء میں مولانا مفتی محمود کو عیسیٰ خیل سے بلایا گیا۔ اور تیس روپے مشاہرہ پر آپ کو وہاں مدرّس رکھا گیا۔(۳۲)

دو سال تک آپ نے وہاں پڑھایا۔ فنڈ کی کمی کی وجہ سے اور علاقہ میں قحط کی صورت حال درپیش ہونے کی وجہ سے مدرسہ بند کرنا پڑا۔ اور بہت بعد میں مدرسہ کے کتب خانہ میں موجود کتب اور دیگر سامان کو مدرسہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک منتقل کر دیا گیا۔ جس کے لئے مولانا عبدالحق صاحبؒ خود ابا خیل تشریف لائے تھے۔(۳۳)

"۱۹۴۷ء میں آپ خانقاہ یٰسین زئی سے عبدل خیل منتقل ہوگئے۔ جہاں آپ نے امامت کے ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا"۔(۳۴)

"اگست ۱۹۵۰ء میں آپ مدرسہ قاسم العلوم ملتان تشریف لے گئے۔ اور درس وتدریس کے ساتھ افتاء کی ذمہ داری بھی سنبھالی۔ ۱۹۵۵ء میں آپ کو شیخ الحدیث بنایا گیا"۔(۳۵)

"۱۹۷۵ء میں مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے مہتمم مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی علالت کے باعث مدرسہ کی مجلس شوریٰ نے آپ کو مدرسہ کے اہتمام کی ذمہ داری بھی سونپ دی"۔(۳۶)

مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں تدریس کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہی مولانا مفتی محمودؒ کا شمار ملک کے قابل ترین مدرسین میں ہونے لگا۔ علوم منقولہ و معقولہ دونوں کے بہترین استاد کی حیثیت سے ملک گیر شہرت حاصل ہوئی اور طلباء کا رجحان روز بروز بڑھنے لگا۔ پاکستان کے کونے کونے سے طلباء کی آمد کے علاوہ ایران، افغانستان وغیرہ سے بھی طلباء آپ کے حلقۂ درس میں شریک ہونے لگے۔ ایک بہترین مدرس کی جو خوبیاں ہو سکتی ہیں وہ سب آپ میں موجود تھیں۔

آپ ایک کامیاب مدرس رہے۔ آپ کو بہت کم عرصہ میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ اس سے قبل ایک طالب علم کی حیثیت سے بھی آپ نے پڑھنے اور سیکھنے کے ساتھ ساتھ پڑھانے، سکھانے کا عمل بھی جاری رکھا تھا۔ جب آپ مدرسہ شاہی مراد آباد میں طالب علم تھے۔ تو دو ایسے طلباء کا ذکر ملتا ہے۔ جنہوں نے آپ سے باوجود طالب علم ہونے کے پڑھا ہے۔ ان میں ایک آپ کے اسی مدرسہ کے مدرس خاص اور جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا محمد میاں کے صاحبزادے حضرت مولانا حامد میاں صاحب بانی و مہتمم جامعہ مدنیہ لاہور اور دوسرے ڈیرہ اسماعیل خان کی مشہور خانقاہ یٰسین زئی کے صاحبزادہ محمود صاحب تھے۔ جنہوں نے ابتدائی فارسی کتب آپ سے پڑھی ہیں۔ اس لئے جب آپ حصول علم سے فارغ ہوئے تو تدریس میں مشغول ہوئے جس کا آپ کو طالب علمی کے زمانہ میں اچھا خاصہ تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔

مولانا عبدالرحیم اشرف صاحب لکھتے ہیں۔

> مفتی صاحب مکرّم و محترم نے ابتدائی تعلیم میٹرک (صحیح مڈل ہے) کے بعد شعوری زندگی کا آغاز ایک دینی درسگاہ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے کیا۔ اور جب وہ علوم و فنون سے فارغ ہوئے تو انہیں یہ سعادت نصیب ہوئی کہ یکسوئی کے ساتھ مسند تدریس پر بیٹھ گئے۔ اور قال اللہ اور قال الرسول میں ہمہ تن مشغول و مصروف ہو گئے۔ تا آنکہ وہ ایک جید عالم اور کامیاب مدرّس تسلیم کئے گئے۔ اور آخر کار شیخ الحدیث کے منصب جلیل پر فائز ہوئے۔ (۳۷)

ایک مدرس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس میں افہام و تفہیم کا مادہ ہو۔ تا کہ وہ اپنی بات طلبہ کے ذہن نشین کر سکے۔ یہ خوبی بھی آپ میں کمال درجہ کے ساتھ موجود تھی۔ محمد سعید الرحمٰن علوی لکھتے ہیں۔ "مرحوم میں افہام و تفہیم کا مادہ غضب کا تھا۔ اور مسند تدریس پر بیٹھ کر وہ ویسے بھی کھل جاتے۔ اور پھر علوم کی گرہیں کھلتیں تو سبحان اللہ"۔ (۳۸)

مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں آپ کے ابتدائی شاگردوں میں سے مولانا ضیاء القاسمی بیان کرتے ہیں۔

> بحیثیت استاد اُن کا اپنا مقام تھا۔ جو انہوں نے خود ہی بنایا تھا۔ اس میں کسی خارجی قوت کا عمل دخل نہیں تھا۔ وہ مقام یوں بنا کہ قاسم العلوم میں طلباء کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ ان کے اسباق مفتی صاحب کے پاس ہوں۔ گویا ہر درجے کے طلباء یہ چاہتے تھے۔ کہ ان کی درسی کتابوں کے لئے مفتی صاحب کو پابند بنایا جائے۔ کیونکہ مفتی صاحب کا طرز تعلیم دوسرے اساتذہ سے مختلف تھا۔ وہ آسان زبان میں سمجھاتے، مختصر جملوں میں بات کہتے اور طلباء کو کتابوں کا رٹا لگانے سے بے نیاز کر دیتے ان کا سمجھایا ہوا مسئلہ ذہن سے محو نہیں ہو سکتا تھا۔ (۳۹)

مولانا مفتی محمودؒ کی درسی خصوصیات کے بارے میں اس سے زیادہ وضاحت مولانا عبدالقادر آزاد بیان کرتے ہیں۔ جو آپ کے شاگرد رہے ہیں۔

> درس و تدریس میں ان کا مخصوص انداز تھا۔ اور اس میں فقیہانہ رنگ غالب تھا۔ لیکن مسائل کی تفہیم میں وہ ہمیشہ اختصار کرتے۔ اور وہ مسائل جو دوسرے اساتذہ کے ہاں مہینوں اور برسوں میں بیان ہوتے، سمجھے اور سمجھائے جاتے مفتی محمودؒ ایسے "ادق" مسائل کو گھنٹوں اور منٹوں میں نمٹا دیتے۔ اور جو مسائل طویل مباحث کے بعد سمجھنے والے ہوتے۔ ایسے مسائل کو وہ انتہائی سادہ اور عام فہم مثال میں سمجھا کر شاگردوں کو مطمئن کر دیتے۔ اور پھر طلباء کو مزید سوالات کی دعوت دیتے۔ اور اس وقت تک نئے سے نیا جواب دیتے رہتے۔ جب تک آخری اور کم سے کم ذہین اور زیادہ سے زیادہ

غبی آدمی کی بھی تسلی نہ ہو جاتی۔ اس بات میں مفتی صاحب ایک منفرد استاد تھے۔(۴۰)

سیاست کے میدان میں ان کی بڑی شہرت تھی۔ عام سیاسی جلسوں اور جلوسوں، اخباری کانفرنسوں، جماعتی میٹنگز کے ساتھ پارلیمنٹ میں بھی آپ بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے اور اس میں بھی اہم کردار ادا کرتے۔ کچھ عرصہ قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف رہے۔ اور اس منصب کے تقاضوں کے پیش نظر عام ممبر قومی اسمبلی کی نسبت انکی سرگرمیاں اور مصروفیات بھی بہت زیادہ تھیں۔ لیکن ان سب کچھ کے باوجود اپنی درسگاہ میں آپ صرف ایک محقق اُستاد ہی ہوتے تھے۔ مولانا ضیاء القاسمی لکھتے ہیں۔

> وہ اپنی درس گاہ میں صرف محقق ہوتے تھے اور کچھ نہیں۔ درس گاہ میں بیٹھے مفتی محمود کو دیکھ کر کسی کو گمان بھی نہیں ہوتا تھا۔ کہ یہی محقق اور مدرس میدان سیاست کا بھی شہسوار ہے۔ کیونکہ ان دونوں میدانوں میں بعد المشرقین ہے۔ درسگاہ کی دنیا کا مزاج، ماحول، اصطلاحات، طور طریقے الگ ہوتے ہیں اور میدان سیاست کی ہر چیز جدا۔(۴۱)

مفتی صاحب کی درسی خصوصیات کے بارے میں مولانا مفتی محمد یوسف لکھتے ہیں۔

> وہ طلبہ کو مطمئن کئے بغیر درس گاہ سے نہیں اٹھتے تھے۔ عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ کلاس کا وقت ختم ہوا تو اساتذہ جگہ چھوڑ دیتے ہیں کسی طالب علم کا کوئی سوال ہے تو اگلے روز پر جا پڑا۔ دوسرے روز ضروری نہیں کہ طالب علم اپنا سوال دہرائے یا اسے اس کا موقع بھی ملے۔ مفتی صاحب کی یہ عجیب عادت تھی کہ وہ جب تک تمام سوالات کے جوابات نہیں دیتے تھے اس وقت تک درس گاہ نہیں چھوڑتے تھے۔ ان کے تیور بتا دیتے تھے کہ وہ ہر سوال کا فوری جواب دے کر یہ بات ختم کرنا چاہتے ہیں اس معاملہ میں آج کی بات کل پر ٹالنے کے روادار نہیں تھے۔ اور نہ سوالات سے ان کی طبیعت پر کوئی اثر پڑتا تھا۔(۴۲)

مولانا مفتی محمود کے انداز تدریس اور طلباء پر شفقت نے آپ کی طرف تشنگان علوم دین کو متوجہ کیا اور دور دراز سے طلباء آپ کی طرف آپ سے استفادہ کے لئے آنے لگے۔ کوئی ۵۵ سالہ تدریس کا تجربہ رکھنے والا الشیخ الحدیث علامہ محمد سرفراز خان صفدر صاحب اس بارے میں بیان کرتے ہیں۔ ”مولانا مفتی محمود صاحب ایک مدرّس کی حیثیت سے علمی دنیا پر ظاہر ہوئے اور آپ کے دلکش انداز تدریس نے طلباء کو آپ سے استفادہ کی طرف راغب کیا“۔(۴۳)

مفتی صاحب کے اوّلین شاگرد اور ابتداء سے انتہاء تک آپ ہی سے پڑھنے والے اور کثیر التصانیف، عالمی شہرت یافتہ عالم مولانا محمد موسیٰ صاحب روحانی بازیؒ آپ کے بارے میں بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

> بحیثیت استاد وہ کیسے تھے تو اس سلسلے میں یہ بات میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ میں نے اپنے شیوخ میں کسی کو اتنا ذہین نہیں پایا۔ وہ جتنے سیاست میں اعلیٰ تھے اتنے ہی ذہانت میں بلند اور درس و تدریس میں بھی ارفع تھے۔ مدرسہ میں جن اساتذہ کے پاس ہمیں کتاب کے مشکل مقامات سمجھ نہیں آتے تھے۔ ہم وہ مفتی محمود کے پاس جا کر حل کر لیتے تھے۔(۴۴)

سیاست میں پوری سرگرمی کے باوجود اپنے طلباء کے لئے اس بات کو ناپسند کرتے کہ وہ سیاست میں حصہ لیں۔ اور اپنے مدرسہ کے طلباء کے علاوہ ان کو جہاں جہاں دینی مدارس کے طلبہ سے خطاب کا موقعہ ملتا تو وہ ان کو ہمیشہ بحیثیت طالب علم سیاست کی خار دار وادی سے دور رہنے کی تلقین فرماتے۔ چنانچہ مولانا محمد یوسف صاحب لکھتے ہیں۔

> اتنے مشہور قومی رہنما ہونے کے باوجود اپنی درس گاہ میں وہ سب کچھ بھول جاتے تھے۔ وہ طلبہ کو سیاست سے بچانے کی طرف خصوصی توجہ دیتے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی مدرسہ کے حدود میں سیاسی گفتگو نہیں کی۔ اتنے بڑے سیاستدان کی کلاس میں سیاست شجر ممنوعہ تھی۔ ایک بار تو ایسا بھی ہوا کہ اسلام آباد سے آکر درس حدیث دیتے رہے۔

وہاں پر تمام گفتگو سیاسی اور درس گاہ میں تمام گفتگو غیر سیاسی، خالصۃً علمی۔ ہم حیران تھے کہ یہ ایک ہی آدمی دو مقامات پر دو جداگانہ روپ میں کیسے نظر آتا ہے۔ اسلام آباد ہے تو خالص سیاستدان اور ملتان ہے تو بڑا عالم۔ یہ ممکن نہیں کہ آدمی صبح کی گفتگو شام کو بھول جاتا ہو۔ اور شام کی بات کو صبح فراموش کر دے اتنی جلدی مزاج میں تبدیلی لانا ممکن نہیں۔ لیکن ہم نے مفتی محمود کی شخصیت میں یہ "اجتماع ضدین" اپنی آنکھوں سے دیکھا۔(۴۵)

مولانا مفتی محمود صاحبؒ نے سیاسی مصروفیتوں کو درس و تدریس کے سلسلے میں حائل نہ ہونے دیا۔ جبکہ بہت سے علماء جب سیاست کے میدان میں آجاتے ہیں تو سیاست ہی کے رہ جاتے ہیں۔ اور درس و تدریس کا سلسلہ چھوٹ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا سیّد حامد میاں صاحب لکھتے ہیں۔

مفتی صاحب کے آخری دور میں سیاسی شہرت سے خیال ہوتا ہے کہ وہ ایک سیاسی لیڈر ہی تھے۔ حالانکہ وہ بہت بڑے مدرّس بھی تھے۔ حدیث، فقہ کے علاوہ فلکیات، فلسفہ اور منطق کے قابل ترین استاد تھے۔ حق تعالیٰ نے سب علوم میں کمال اور دقتِ نظر سے نوازا تھا۔(۴۶)

ایک مدرّس نہ صرف کتاب کے پڑھانے اور اس کے مشکل عبارات حل کرانے تک محدود ہوتا ہے بلکہ مثالی استاد وہ ہوتا ہے جو اپنے طلباء پر شفیق بھی ہو۔ اس لحاظ سے بھی آپ کا رویہ اپنے طلباء کے ساتھ شفقت والا ہوتا تھا۔ مولانا محمد موسیٰ روحانی بازی بیان کرتے ہیں۔

دورانِ تعلیم مفتی صاحب کا اپنے تلامذہ سے سلوک ایک سخت گیر استاد کا نہیں بلکہ ایک شفیق باپ کا سا ہوتا تھا۔ ان کا رویہ طلباء کے ساتھ ہمیشہ مشفقانہ رہا۔ ہم ان کا بھی احترام کرتے تھے لیکن وہ ہمارے ساتھ ایک دوست کی طرح گھل مل کر باتیں کرتے تھے۔(۴۷

مفتی صاحب کی اسی شفقت کی وجہ تھی کہ آپ سبق کا ناغہ نہیں ہونے دیتے تھے۔ بیماری کی حالت میں سبق ضرور پڑھاتے۔ ایک مرتبہ اس قدر بیمار ہوئے کہ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ آپ کے لئے آرام بہت ضروری ہے۔ مگر طلبہ کی درخواست کے باوجود آپ نے سبق پڑھایا۔ اس موقع پر آپ نے طلباء کو جو جواب دیا مولانا عبدالقیوم حقانی کے بقول وہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے۔ "میں اپنی زندگی بچانے کے لئے ان غریب طلباء کی زندگی برباد کر دوں بحیثیت اُستاد میں نے ان کے مستقبل کی ذمہ داری لی ہے"۔ بیماری کی حالت میں بھی حضرت مفتی صاحب لگاتار چھ گھنٹے پڑھاتے تھے۔(۴۸)

درس کے سلسلے میں آپ اتنے حساس تھے۔ کہ اگر سیاسی مصروفیات کی وجہ سے بروقت مدرسہ نہ پہنچ پاتے تو رات کے وقت دیر تک پڑھاتے۔ یہاں تک کہ وہ مرحلہ بھی آیا کہ جب آپ ۱۹۷۲ء میں صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کے منصب پر فائز ہوئے اور جب ۱۹۷۷ء کی تحریک چلی تو شب و روز کی مصروفیات کی وجہ سے درس کا سلسلہ آپ سے کچھ عرصہ کے لئے چھوٹ گیا۔ لیکن اس کا بھی آپ کو ہمیشہ قلق رہا۔ اس سلسلے میں مولانا عبید اللہ انور صاحب بیان کرتے ہیں۔ "مشغلۂ تدریس کے ترک کا انہیں شدید احساس تھا۔ یہ ترک اختیاری نہیں اضطراری تھا۔ کیونکہ وہ ملک و ملت کی تعمیر و ترقی کے مشکل ترین کام میں مشغول ہوگئے تھے"۔(۴۹)

ایک باکمال مدرّس کی خوبی یہ ہے کہ وہ طلبہ کی تعلیم و تربیت کرتے وقت ان کی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے ہر ایک طالب علم پر انفرادی توجہ بھی دے۔ اور ان کی سمجھ و صلاحیت کے مطابق ان کو بات سمجھائے۔ اور ان کی ذہنی صلاحیتوں کو اجاگر کرے۔ نہ کہ ان کو دبائے اور ان کی سمجھ بوجھ کی صلاحیتوں کو ختم کرنے کی کوشش کرے۔ مفتی صاحب میں یہ خوبی کمال درجہ کی تھی۔ مولانا محمد یوسف لکھتے ہیں۔

در حقیقت وہ چاہتے تھے کہ لائق طلباء کی کلاس میں اتنی محنت کی جائے کہ تمام طالب علم لائق اور باصلاحیت بن جائیں ایک ہی کلاس کے طالب علموں کو پڑھاتے ہوئے وہ ذہین اور غبی ہر قسم کے طلبہ کا خیال رکھتے۔ ان کی سمجھ اور صلاحیت کے مطابق بات کرتے۔(۵۰)

اس سلسلے میں مولانا محمد یوسف صاحب مزید لکھتے ہیں۔"کلاس میں مفتی صاحب کی توجہ کمزور طالب علموں کی طرف ہوتی تھی"۔(۵۱)

اس بارے میں مولانا فضل الرحمٰن اپنے تاثرات یوں بیان کرتے ہیں۔

بحیثیت استاد وہ سخت گیر واقع ہوئے تھے۔ تعلیمی کوتاہی ان کے نزدیک ناقابل معافی جرم کی حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ نرم خو بھی تھے۔ اگر سبق یاد نہ کرنے پر ان پر جلال غالب آجاتا تھا۔ تو سبق یاد کرنے پر ان کا جمال بھی دیدنی ہوتا تھا۔ میں نے ان کے چہرے پر نرمی کے آثار دیکھے ہیں۔

آگے چل کر مولانا فضل الرحمان ان کے پڑھانے اور سمجھانے کے انداز کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

سبق پڑھانے کا انداز حکیمانہ تھا۔ وہ پڑھانے سے زیادہ سمجھانے کے قائل تھے۔ ان کی سمجھائی ہوئی بات ناقابل فراموش ہوتی تھی۔ مشکل ترین بحث کو چند آسان جملوں میں اس طرح سمجھاتے کہ وہی مشکل بحث سب سے آسان نظر آتی اور اسے انتہائی آسان الفاظ میں بیان کرنے کی قدرت حاصل ہو جاتی۔(۵۲)

حدیثی خدمات

"مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں ۱۹۵۵ء میں آپ کو حدیث کی کتابوں کے مدرّسین میں شامل کیا گیا"۔(۵۳)

جب مولانا عبدالخالق صاحبؒ سابق مدرس دارالعلوم دیوبند، مستقل طور پر اپنے قائم کردہ مدرسہ دارالعلوم کبیر والا تشریف لے گئے۔ تو علم حدیث سے شغف اور اس میں وسعت مطالعہ کی وجہ سے مدرسہ قاسم العلوم کی انتظامیہ نے آپ کو شیخ الحدیث کے منصب پر فائز کیا۔ اور صحیح بخاری اور جامع ترمذی آپ کے زیر درس رہیں۔

اس سلسلے میں مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے حدیث کے مدرس اور مفتی صاحب کے بعد قاسم العلوم کے مہتمم مولانا فیض احمد صاحب لکھتے ہیں۔"حضرت مفتی صاحب اپنے دور کے عظیم محدث بھی تھے۔ مدت دراز تک مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے۔ دورۂ حدیث کی سب سے زیادہ اہم کتابیں صحیح بخاری اور جامع ترمذی آپ کے زیر درس رہیں"۔(۵۴)

علم حدیث میں آپ کو ایک ممتاز مقام حاصل رہا۔ اور آپ کے ہم عصر تمام علماء اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ آپ کا درس حدیث میں اندازِ تدریس تحقیقی تھا۔ حکیم عبدالرحیم اشرف لکھتے ہیں۔"مفتی محمود علیہ الرحمۃ تدریس کے پر سکون ماحول میں اس نعمت سے سرفراز ہوئے کہ انہوں نے اسلامی علوم واحکام میں تحقیقی انداز معمول بنایا۔ اور ان کی حیثیت ایک محقق شیخ الحدیث کی قرار پائی"۔(۵۵)

یہی وجہ تھی کہ آپ کی طرف طالبان علوم حدیث کا رجحان بڑھا۔ اور دور دراز سے طلباء آپ سے کسب فیض کے لئے اُمڈ آئے۔ مولانا نورالہدیٰ لکھتے ہیں "ملک کا ہر شخص آپ کی قابلیت کا معترف تھا۔ اور علمی وفقہی مسائل کے سلسلے میں ان کی رائے حتمی سمجھی جاتی تھی۔ علوم حدیث کے طلبہ کا ان کی طرف بکثرت رجوع تھا۔(۵۶)

صرف پاکستان ہی نہیں قریبی ممالک کے طلباء بھی آپ سے پڑھنے اور خصوصاحدیث کی سند اجازت کے لئے حاضر ہوتے۔ اس بارے میں مولانا فیض احمد تحریر کرتے ہیں۔"پاکستان،

بنگلہ دیش، افغانستان، ایران کے سینکڑوں علماء کرام نے آپ سے علمی استفادہ کیا اور حدیث کی سند اجازت حاصل کی"۔(۵۷)

علم حدیث میں وسعت مطالعہ کی بناء پر آپ کو بہت سی احادیث نبوی ازبر تھیں۔ چنانچہ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب رقمطراز ہیں "خاص طور سے احادیث انہیں صرف مفہوماً نہیں لفظاً و متناً بہت یاد تھیں۔(۵۸)

علم حدیث کے لئے جہاں وسعت مطالعہ کے ساتھ ساتھ علمی و دینی رسوخ اور ذہنی قوت لازمی ہے وہاں قوت حافظہ بھی اسکے لوازمات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مفتی محمود کو بے مثال قوّت حافظہ سے نوازا تھا۔ مولانا فیض احمد صاحب لکھتے ہیں۔ "صحیح بخاری اور جامع ترمذی کے درس میں طویل و عریض فقہی مباحث، ائمہ اربعہ، امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ کے مذاہب و دلائل اور متعلقہ سوالات و جوابات نہایت تفصیل کے ساتھ محض اپنے حافظہ سے بیان فرماتے تھے"۔(۵۹)

علم حدیث میں اسی رسوخ کا نتیجہ تھا کہ آپ نے جامع ترمذی کی شرح تالیف کی۔ مولانا فیض احمد لکھتے ہیں۔ "بے شمار علمی، تدریسی، تنظیمی اور سیاسی مصروفیات کے باوجود آپ نے جامع ترمذی کی عربی شرح بھی تالیف فرمائی"۔(۶۰)

فقہی خدمات

علم فقہ سے آپ کو خصوصی شغف تھا۔ بلکہ آپ کو خانقاہ یٰسین زئی میں جو ابتدائی ماحول ملا وہ خالصۃً دینی، اصلاحی اور علمی ماحول تھا۔ اور وہاں فقہی مباحث زیادہ تر موضوع بحث رہتے۔ دیگر کتب کے علاوہ بحر الرائق، ردّ المحتار (شامی)، البدائع والصنائع اور مولانا عبدالحیّ لکھنویؒ کی فقہی تصانیف درساً درساً، سبقاً سبقاً پڑھی پڑھائی جاتی تھیں۔ ایسے ماحول کی وجہ سے آپ کا بھی

زیادہ تر رجحان علم فقہ کی طرف رہا۔ مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں آپ کی تقرری بحیثیت مدرّس ہوئی۔ تو تدریس کے ساتھ ساتھ افتاء کا کام بھی آپ کے سپرد ہوا۔ مدرسہ قاسم العلوم کی انتظامیہ کو تلاش بھی ایسے عالم کی تھی۔ کہ وہ تدریس کے ساتھ فتویٰ نویسی کا کام بھی انجام دے۔ مقالہ نگار لکھتا ہے۔

مدرسہ قاسم العلوم ملتان کو عرصہ سے ایک ماہر التدریس اور قابل مدرس و مفتی کی تلاش تھی۔ ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ مطابق اگست ۱۹۵۰ء آپ قاسم العلوم تشریف لے گئے۔ اور مسند تدریس و افتاء کو رونق بخشی۔(۶۱)

اس بارے میں مولانا محمد موسیٰ صاحب روحانی بازیؒ لکھتے ہیں۔

> فتویٰ نویسی کی وجہ سے آپ مولوی محمود کے ساتھ ساتھ مفتی محمود کے نام سے پکارے جانے لگے۔............کچھ عرصے بعد مولانا عبدالخالق نے فتوے کا کام بھی انہی کو سونپ دیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں ان کی شہرت ہوگئی۔ اور ابتدائے سال ہی سے طلباء کی کوشش ہوتی۔ کہ ان کی کتابیں مفتی صاحب کو دی جائیں۔ انہوں نے تدریس اور افتاء کا کام ساتھ ساتھ جاری رکھا۔ اس طرح چند سال تک وہ مولوی اور مفتی محمود رہے بعد ازاں مفتی محمود رہ گئے۔(۶۲)

آپ کی فقاہت کے بارے میں عصر حاضر کے مشہور عالم، شیخ الحدیث اور علوم انور شاہ کشمیری کے وارث حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ کی رائے بیان کرتے ہوئے مولانا مفتی احمد الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں۔

> اللہ تعالیٰ نے اُن کو فقہ میں خاص مقام عطا فرمایا تھا۔ حضرت مولانا بنوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ اس وقت پاکستان میں ان سے بڑا کوئی مفتی نہیں۔..................ایک موقع پر آپ نے فرمایا کہ میری نظروں سے آج تک کوئی عالم ایسا نہیں گزرا جس نے فقہ کی کتاب "شامی" (جو کہ آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے اور

ہر جلد میں سات سو صفحات ہیں) کا بالاستیعاب ایک دفعہ بھی مطالعہ کیا ہو۔ مسائل کے مطابق اسی کو دیکھتے ہیں۔ مگر مفتی صاحب نے اس کتاب کو بالاستیعاب تین دفعہ اوّل سے آخر تک پڑھا ہے۔ اور ان کو اس کتاب پر مکمل عبور حاصل ہے۔ فقہی کتب کی گہرائی سے مطالعہ، اور فقہاء کرام کی مزاج شناسی کی وجہ سے آپ کو فتویٰ نویسی میں جو اعلیٰ مقام حاصل ہوا۔ مولانا بنوریؒ فرماتے ہیں کہ کسی مسئلہ پر آپ کے فتویٰ کے بعد کسی اور فتوؤں کی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔(۶۳)

مولانا حامد میاں صاحب لکھتے ہیں "وہ اس دور کے بہت ہی بلند پایہ فقیہ و مفتی بھی تھے۔ ان مشاغل کے ساتھ منصب افتاء پر بھی فائز رہے۔ اور مدرسہ قاسم العلوم میں ان کے ہاتھ سے بیس ہزار سے زائد فتاویٰ تحریر ہوئے"۔(۶۴)

شیخ المشائخ، سلسلہ نقشبندیہ کے بزرگ اور عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے امیر حضرت مولانا خان محمد صاحب دامت برکاتہم آپ کی تحریر کردہ فتاویٰ کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "جامعہ قاسم العلوم کے رئیس مفتی کی حیثیت سے آپ نے جو محققانہ فتاویٰ جاری کئے۔ وہ ایسا علمی خزانہ ہے جس سے امت مسلمہ رہتی دنیا تک استفادہ کرتی رہے گی۔ علماء کرام اس سے خوشہ چینی کر کے اُمت کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیں گے"۔(۶۵)

مفتی صاحب کے صاحبزادے مولانا فضل الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں۔

> مفتیان کرام کے اسی سلسلۃ الذہب کی ایک سنہری کڑی میرے والد محترم حضرت مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ آپ اپنے دور کے بہترین فقیہ اور مفتی تھے۔ سن ۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۷۵ء تک کے دور افتاء میں آپ نے تقریباً بائیس ہزار فتاویٰ جاری فرمائے۔ جو نوع بنوع مسائل سے متعلق تھے آپ کو چونکہ اللہ تعالیٰ نے حدیث وفقہ میں مہارت کے ساتھ ساتھ سیاسی بصیرت بھی عطا فرمائی تھی۔ اس بناء پر آپ کے فتاویٰ نہایت مدلل، معتدل اور متوازن ہوتے تھے۔(۶۶)

چنانچہ یہی وجہ تھی کہ آپ کے فتاویٰ نہ صرف پاکستان میں بلکہ بیرون ملک بھی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ ہندوستان، ایران، افغانستان حتی کہ مغرب و یورپ میں آباد مسلمان بھی مشکل مسائل میں حل کے لئے آپ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ مولانا مفتی جمیل خان شہید لکھتے ہیں۔ "ادھر آپ کی فقاہت اور فہم و تدبر کی وجہ سے قاسم العلوم نے رئیس الافتاء کے منصب کو بھی آپ ہی سے زینت بخشنے کا فیصلہ کیا تو آپ کے فتاویٰ نے پورے ملک ہی نہیں بیرونِ ملک بھی آپ کی فقاہت کی دھوم مچادی"۔(۶۷)

مفتی صاحبؒ کے فتاویٰ کو معاصر علماء کی ہمیشہ تائید حاصل رہی ہے۔ وہ اس بات کا برملا اعتراف کرتے ہیں کہ فقہ وافتاء میں آپ امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔ وہ یہ بات بھی تسلیم کرتے ہیں کہ جدید مسائل میں آپ کی رائے بڑی مدلل اور وزنی ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا قاری سعید الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں۔

> آپ کو فقہ سے خصوصی لگاؤ تھا۔ اور ہزاروں فتاویٰ آپ کے قلم سے نکل کر ملک کے طول و عرض میں پھیلے۔ علوم کا سطحی علم رکھنے والے افراد تو بہت ہوتے ہیں۔ لیکن گہرائی اور عمق رکھنے والی شخصیتیں اس دور میں بہت کم رہی ہیں۔ مفتی صاحب کی شخصیت خصوصاً فقہ اور افتاء کے معاملہ میں امتیازی حیثیت کی مالک تھی۔ جدید مسائل اور نت نئے پیدا ہونے والے معاملات میں مفتی صاحب کی رائے بڑی وزنی اور گہری ہوتی تھی۔............ بارہا مجھے ایسی مجالس میں شرکت کا موقع ملا جہاں بڑے بڑے علماء موجود ہوتے تھے۔ جدید مسائل پر مفتی صاحب قوت استدلال سے اپنی بات منوالیتے۔(۶۸)

مولانا فیض احمد صاحب آپ کی فقہ وافتاء کے بارے میں مولانا محمد یوسف بنوریؒ اور اپنی رائے درج ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

تفقّہ، تدبّر، انجام بینی اور دور اندیشی میں آپ کو ممتاز مقام حاصل تھا۔ عالم اسلام کے محدّث اعظم، عارف باللہ، حضرت مولانا محمد یوسف بنوری قدّس سرّہ، حضرت مولانا مفتی محمود کو "فقیہ النّفس" فرمایا کرتے تھے۔ تفقّہ اور فہم دین آپ کا طبعی و فطری وصف تھا۔ معاملہ فہمی، حقیقت شناسی کا جوہر قسّام ازل نے آپ کی طبیعت میں ودیعت کر دیا تھا۔ آپنے تقریباً تیس سال مدرسہ قاسم العلوم کے دارالافتاء کو زینت بخشی۔ قدیم و جدید مسائل پر ہزاروں فتوے آپ کے قلم، آپ کے مشورہ یا آپ کی سرپرستی میں لکھے گئے۔ (۶۹)

مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی مفتی و شیخ الحدیث جامعۃ العلوم الاسلامیۃ بنوری ٹاؤن کراچی لکھتے ہیں۔

فقہ کے بارے میں راقم اس قدر جانتا ہے کہ حضرت مفتی صاحب قدس اللہ سرّہ بہت ہی کامیاب اور دقیقہ سنج مفتی تھے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان نے ایک مرتبہ راقم کے سامنے حضرت مفتی صاحب کے تفقّہ اور فقہ میں اصابت رائے کی تعریف کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب کو فقاہت نفس سے سرفراز فرمایا تھا۔ (۷۰)

حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی مزید لکھتے ہیں۔

دس بارہ سال قبل حضرت بنوری قدس اللہ سرّہ کی زیر سرکردگی مفتیان کرام کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی۔ جس کا کام اسلام کے مالیات کے نظام پر غور و فکر اور اس سلسلہ میں دفعات مرتب کرنا تھا۔ حضرت مفتی صاحب اس کمیٹی کے اجلاس میں برابر شریک رہے۔ بلکہ اس کے روح رواں ہی حضرت مفتی صاحبؒ تھے۔ اس اجلاس میں راقم کو مفتی صاحب کے علم و فضل کو دیکھنے اور محسوس کرنے کا موقع ملا۔ (۷۱)

فقہی کتابوں کے مطالعہ اور فقہی مباحث کے شغف سے آپ کا مزاج ایسا بن گیا تھا۔ کہ عام معاملات خصوصاً سیاسی مسائل میں بھی آپ فقہی استدلالات سے کام لیتے۔ اور فقہی

استدلالات کی روشنی میں ان کے بارے میں رائے قائم کرتے۔ چنانچہ مولانا گلزار احمد مظاہری لکھتے ہیں۔

مسائل حاضرہ پر گہری نظر رکھتے تھے بلکہ اکثر یوں ہوتا کہ وہ مسائل حاضرہ پر بات کرتے ہوئے فقہی استدلال سے بھی کام لیتے تھے۔ اس سے اندازہ یہ ہوتا تھا۔ کہ وہ سیاسی مسائل کو اجتہاد و تفقّہ کی ترازو میں تولتے ہیں۔ اور پھر ان مسائل کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتے ہیں۔ (۷۲)

آپ کے مزاج پر فقہ اور فقہی استدلال کے غلبہ کے بارے میں آپ کے دور طالب علمی کے قریبی ساتھی، مخلص دوست اور اپنے دور کے مشہور مدرّس عالم، سابق ممبر قومی اسمبلی مولانا صدر الشہید صاحبؒ جو مدرسہ معراج العلوم بنوں کے مہتمم بھی رہ چکے ہیں، لکھتے ہیں۔

میرے نزدیک ان کا فقہی مقام سب سے زیادہ بلند تھا۔ بحیثیت فقیہ وہ اس دور کے آدمی نہیں تھے۔ گزشتہ دور کے انسان تھے۔

(پھر آگے وہ اس کی وجہ لکھتے ہیں) یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ان کی لیاقت و ذہانت کو میں طالب علمی کے زمانے سے دیکھتا آیا ہوں۔ فقہ سے انہیں شروع سے دلچسپی تھی۔.............. درسی کتب تو انہوں نے سبقاً پڑھی تھیں۔ ان کے علاوہ بہت سی غیر درسی فقہی کتابیں بھی انہیں ازبر تھیں۔ (۷۳)

مفتی صاحب، استفتاء کا جواب نہایت احتیاط سے لکھتے۔ اس لئے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ان کے قلم سے غلط فتویٰ نکلا ہو۔ یا کسی عالم یا مفتی نے آپ کے فتویٰ پر اعتراض کیا ہو۔ مسئلے کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اس کا جواب تحریر کرتے۔ اس سلسلے میں مولانا صدر الشہید لکھتے ہیں۔

میری معلومات کے مطابق ایسا بہت کم ہوا ہے کہ مفتی صاحب کو کسی مسئلے پر پریشانی ہوئی ہو اور ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ ان کے قلم سے کوئی غلط فتویٰ نکلا ہو۔ اور بعد ازاں اس پر انہیں ندامت کا سامنا کرنا پڑا ہو۔.................. اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ فتویٰ صادر کرنے سے پہلے متعلقہ مسئلے کی تمام کلیات و جزئیات کو سمجھتے

تھے۔ اس کے بعد اس موضوع پر جملہ کتب کو سامنے رکھتے تھے، تب جا کر یہ فیصلہ کر
تے تھے کہ کس مسئلہ پر کیا فتویٰ دینا درست ہو گا۔.............................

میں نے بہت سے مسائل پر اُن سے خود بھی بات کی ہے۔ وہ بے پناہ حافظے اور قوتِ
استدلال کے مالک تھے۔ فتویٰ زبانی ہو یا تحریری دونوں میں احتیاط ملحوظ رکھتے تھے۔

.... مفتی صاحب مرحوم پہلے ہی فتویٰ کامل احتیاط سے
لکھتے تھے۔ اور آج تک ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا۔ کہ ان کے تحریر کردہ فتویٰ پر کسی مفتی
یا عالم نے اعتراض کیا ہو یا انہوں نے اپنے کسی فتوے سے رجوع کیا ہو۔(۷۴)

مفتی صاحب کے مزاج میں حد درجہ اعتدال تھا۔ یہی وصف ان کے فتوؤں میں بھی نظر
تا ہے۔ وہ افراط و تفریط اور مبالغہ آرائی سے ہمیشہ مجتنب رہتے تھے۔ مولانا صدر الشہید" لکھتے ہیں۔

ان کے ہاں ایک انفرادیت پائی جاتی تھی اور وہ تھی فتویٰ دینے میں اعتدال کی راہ۔ ان کا
طریق کار یہ تھا کہ کسی مسئلے کا ایک رُخ کیسا ہی واضح اور کتنا ہی روشن کیوں نہ ہو وہ مسئلے
کے دوسرے پہلو کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ جب تک مسئلے کے دوسرے
پہلو پر پوری تحقیق نہیں کر لیتے تھے فتویٰ ہرگز نہیں دیتے تھے۔ اس کے علاوہ اس بات
کا وہ خیال رکھتے تھے کہ کسی مسئلے کے اثبات یا نفی میں دلائل لکھتے وقت مبالغہ اور افراط و
تفریط سے کام نہ لیا جائے.............. چونکہ بحیثیت مفتی انتہائی
اعتدال پسند تھے۔ اس لئے یہ اعتدال ان کی شخصیت کا لازمہ بن چکا تھا۔ یہی وجہ ہے
کہ ان کی قومی زندگی میں بھی ہمیشہ اعتدال نظر آتا تھا۔(۷۵)

مولانا اجمل خان صاحب نے بھی مفتی صاحب کے فتوؤں کے بارے میں لکھا ہے کہ
ی عالم یا مفتی ان کے کسی فتویٰ پر اعتراض نہیں کر سکا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "انہوں نے مدرسہ
م العلوم ملتان میں منصب افتاء پر فائز ہو کر تقریباً ۲۲ ہزار فتوے صادر کئے۔ اور کسی ایک فتویٰ
ھی کوئی عالم یا مفتی انگشت نمائی نہیں کر سکا۔(۷۶)

یہی بات مفتی جمیل خان شہید نے بھی یوں بیان کی ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمود صاحب" علمیت کے ساتھ فقہ و حکمت اور فہم و ذکاوت ہر اعتبار
سے اس درجہ پر تھے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے "مفتی" کے لفظ کو ان کے نام کا جُز بنا
دیا تھا۔ آپ کے فتاویٰ ہزاروں کی تعداد میں جاری ہوئے کسی ایک فتویٰ پر کوئی شخص
انگلی تک نہیں اُٹھا سکتا۔(۷۷)

اس ضمن میں مفتی محمود کے قاسم العلوم ملتان کے دور اوّل کے شاگرد، مولانا نور محمد
مہتمم دار العلوم وانا جنوبی وزیرستان جو خود بھی ایک قابل مدرس، شیخ الحدیث اور متعدد کتب کے
مصنف ہیں، لکھتے ہیں۔ "چونکہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۴ء تک، بندہ کا حضرت مفتی صاحب سے بہت
قریبی تعلق اور وابستگی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ مفتی صاحب کے کسی فتویٰ کو علماء نے کسی سقم یا لغزش
کی اساس پر مسترد کر دیا ہو۔ یا آپ کو نظر ثانی کا مشورہ دیا ہو"۔(۷۸)

فتویٰ کے معاملے میں آپ قوّت استدلال سے کام لیتے۔ اور اپنے موقف پر زور دار
دلائل سے مضبوطی سے قائم رہتے۔ یہاں تک کہ مقابل کو آپ کے موقف کے تسلیم کئے جانے
کے بغیر کوئی چارہ نہ رہتا۔ مولانا محمد اجمل خان صاحب نے مفتی صاحب کا ڈاکٹر معروف الدوالیبی
کو رجم کی سزا سے متعلق بحث اور استدلال کو تفصیل سے بیان کیا ہے وہ آخر میں لکھتے ہیں کہ " مفتی
صاحب کی گفتگو جاری تھی کہ ڈاکٹر دوالیبی یک دم کھڑے ہو کر مفتی صاحب سے لپٹ گئے۔ اور
کہنے لگے۔ بس مفتی صاحب! میں نے آج تک اتنے زور دار دلائل نہیں سُنے"۔(۷۹)

مفتی صاحب فتویٰ دینے میں کامل احتیاط سے کام لیتے اور اس کے تمام مثبت منفی
پہلوؤں کو وقت نظر سے دیکھتے اس کے بعد کسی استفتاء کا جواب لکھتے تھے خاص کر وہ استفتاء جو کسی
شخص پر فتویٰ لگانے کی غرض سے ہوتا تھا۔ سابق صدر ایوب خان کے دور میں ۱۱۳ علماء نے جناب
ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے ہمنواؤں پر "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح استعمال کرنے پر فتویٰ لگایا تو
مفتی صاحب اور ان کی جماعت نے اس کی پر زور مخالفت کی اور اس کو دین اسلام کے مزاج کے

خلاف قرار دیا اور یہ کہ ان علماء اور مفتی حضرات نے فتویٰ لگانے میں احتیاط سے کام نہیں لیا ہے۔

اس سلسلے میں مفتی صاحب نے ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور میں درج ذیل بیان شائع کیا۔

> مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے کہیں اسلامی سوشلزم کا ذکر کر کے سوشلزم کو اسلام سے جوڑنے کی کوشش کی اس پر سرکار پرست قسم کے نام نہاد "علماء" نے آسمان سر پر اُٹھا لیا اور اس کو اسلام کی مخالفت اور سرکار دو عالم ﷺ کی توہین کا حوالہ دے کر مسلمانوں کے جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی یہاں تک کہ جمعہ کے اجتماعات میں ان کے بیان کے خلاف یوم احتجاج منانے کی اپیل بھی کر دی گئی مجھے تعجب ہے کہ معمولی قسم کے واقعات کو سیاسی اغراض کے تحت مذہبی اہمیت دے کر عوام کے جذبات سے بے خوف وخطر کھیلا جا رہا ہے۔ کیا ان علماء کرام نے یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ بھٹو صاحب سوشلزم سے کیا مراد لے رہے ہیں؟ خود بھٹو صاحب سے وضاحت طلب کئے بغیر ان کو گردن زدنی قرار دینے کا مطلب کہیں یہ تو نہیں کہ حکومت کو خوش کر کے اپنی اغراض کی تکمیل کرانا مقصود ہو۔ کیا موجود حکومت کے جاری کردہ عائلی قوانین کے نفاذ سے جو صراحتاً اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں۔ موجودہ حکومت کی طرف سے اسلام کی توہین نہیں ہوئی؟ کیا تحریف فی الدین اور انکار سنّت اور انکار ختم نبوّت کے فتنوں کی سرپرستی سے پیغمبر اسلام ﷺ کی کوئی توہین نہیں ہوئی؟ (۸۰)

فتویٰ کے معاملہ میں آپ جتنے محتاط اور افراط و تفریط سے گریز کرنے والے ہوتے تھے۔ اسی قدر آپ وسیع الظرف اور وسیع النظر بھی تھے۔ وہ دوسروں کی آراء کو نہایت تحمل سے سنتے۔ وزنی ہونے کی صورت میں قبول کرنے میں کبھی پس و پیش سے کام نہ لیتے اور اپنا مؤقف بھی فقہاء کرام کی آراء کی صورت میں پیش کرتے اور قوّت استدلال سے اس کو اور زیادہ قوی کر دیتے۔

مولانا مفتی محمد جمیل خان شہید، مولانا محمد تقی عثمانی کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔

> مولانا مفتی محمود صاحب بہت زیادہ وسیع النظر اور وسیع الظرف تھے ان کے سامنے ہر وقت فقہاء کرام کی آراء رہتی تھیں۔ اور مسائل کے سلسلے میں سب سے پہلے مخالف

> کے نقطۂ نظر کو تحمل اور سنجیدگی کے ساتھ سنتے اور اس کے بعد پہلے اس کے دلائل کو رد فرماتے اور بعد میں اپنے دلائل جو کہ فقہاء کرام کی آراء پر مشتمل ہوتے تھے اپنے مؤقف کی تائید میں پیش کرتے۔ (مولانا محمد تقی عثمانی صاحب آگے لکھتے ہیں) مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ "یا مجھے قائل کیجئے یا میرے دلائل کو تسلیم کریں"۔ (وہ اس سلسلے میں مفتی صاحب کا قول نقل کرتے ہیں) "فقہی مسائل نہ میرے ہیں اور نہ آپ کے، ہم نے کتاب و سنت اور فقہاء کرام کی آراء کے مطابق حل کرنے ہیں۔ اور اس میں ترجیح کا مدار دلائل پر ہے۔ یا مجھے اپنے دلائل سے قائل کر لیجئے یا میرے دلائل کو تسلیم کیجئے"۔ (۸۱)

فقہی مسائل کے بارے میں آپ علماء کرام اور مفتیین عظام سے گفتگو فرماتے۔ اور ان میں ان کی نیت اور کوشش یہ ہوتی تھی کہ علماء کرام کا متفقہ موقف سامنے لایا جائے۔ وہ کبھی یہ کوشش نہیں کرتے تھے کہ مذہبی وفقہی مسائل کو سیاسی رنگ دیا جائے۔ مولانا جمیل خان شہید، مولانا محمد تقی عثمانی کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔

> مفتی محمود صاحبؒ نے کبھی مذہبی مسئلے کو سیاسی رنگ دینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ مذہبی مسائل کے معاملات میں سیاست دانوں سے مشورہ کی بجائے علماء کرام سے گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ اور ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ مذہبی مسائل کے سلسلے میں علماء کرام کا متفقہ مؤقف پیش کیا جائے۔ (۸۲)

فقہی مسائل میں آپ کی فہم و فراست اور بصیرت و دیانت ہی اس بات کی وجہ بنی کہ بڑے بڑے علماء کرام اور مفتیین عظام آپ کے فتاویٰ پر اعتماد رکھتے تھے۔ چنانچہ مولانا قاضی عبدالکریم صاحب کلاچوی لکھتے ہیں۔

> حتیٰ کہ جلیل القدر علماء آپ کے فتاویٰ پر اعتماد رکھتے ہیں۔ قوت استدلال اور مبسوط معلومات کے پیش نظر یہاں تک سنا گیا ہے کہ گزشتہ سال پنڈی میں بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کے دوران عائلی قوانین کمیٹی میں جب تک آپ کو شریک نہیں کیا گیا

پاکستان کے بعض اکابر اور مسلّم العلم والفتویٰ علماء دین نے بھی اس کمیٹی کے رکن بننے سے انکار کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان بزرگوں کے حسن ظن کو پورا فرمایا اور جب آپ نے اس پر مدلل بحث کو مکمل کر لیا تو موثق ذرائع کے مطابق غالباً مشرقی پاکستان کے ہی ایک رکن کمیٹی نے جو ان قوانین کی تائید میں مضمون پیش کرنے والے تھے۔ از راہِ دیانت اپنی رائے بدل لی اور مضمون پڑھنا چھوڑ دیا۔ (۸۳)

جدید فقہی مسائل کے حل میں آپ کی خدمات

شریعت اسلامیہ، جامد نہیں ہے بلکہ حالات وواقعات اور وقت وزمانہ کی رعایت کے ساتھ اس کے احکامات بھی نئی نئی شکلیں اختیار کرتی جاتی ہیں۔ اور یہ ہر زمانے کی ضرورت رہی ہے۔ اور انسانی زندگی کا بحیثیت مسلمان ہونے کے یہ نہایت اہم پہلو ہے جس میں علماء کرام اور مفتیانِ عظام شریعت کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر شرعی مسائل میں امت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی لکھتے ہیں۔

> جدید صنعتی اور فکری انقلاب نے جو بہت سے مسائل پیدا کر دئے ہیں۔ ان میں ایک جدید دور میں پیدا ہونے والے مسائل کا فقہی اور شرعی حل بھی ہے۔ جو جدید ایجادات اور نئے معاملاتی نظام کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان مسائل کا حل کرنا ایک مشکل اور دشوار کام ہے اس لئے کہ اس کام کے لئے قرآن وحدیث اور فقہ کے قدیم ذخیرہ میں ان کی نظائر اور ان سے قریب ترین صورتیں تلاش کرنی ہوتی ہیں احکام کی علتوں اور اسباب پر غور کرنا ہوتا ہے۔ اور اپنے زمانے کے عرف اور رواج کو سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ اس مشکل اور دشوار کام کا حل کرنا علماء کے ذمہ ہے اور وہی اس کا صحیح حل تلاش کرنے کے اہل ہیں۔ چنانچہ ہر زمانے کے اہل علم وارباب افتاء نے اپنے اپنے دور کے مسائل حل کئے ہیں۔ (۸۴)

اسی شرعی ضرورت کے پیش نظر مولانا مفتی محمود نے ۱۹۶۵ء میں ہفت روزہ "شہاب لاہور" کے ذریعہ بعنوان "علماء کرام کی آزمائش۔ نئے مسائل چیلنج کر رہے ہیں" ایک مضمون شائع کرایا جس میں وہ لکھتے ہیں۔

> دینی مدارس اور علماء کو پیش آمدہ نئے مسائل اور مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ اور ایسے اصول اپنانے چاہیں جن سے زمانہ حال کا مقابلہ کیا جاسکے۔ یورپ سے نئے نئے مسائل ہمارے ہاں درآمد ہو رہے ہیں۔ اور ان مسائل پر اسلامک ریسرچ کے اداروں کی طرف سے مہر تصدیق ثبت کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اخبارات، رسائل، ریڈیو اور دیگر ذرائع سے کتاب وسنت پر صریح مخالف اسلام کو عین اسلام ثابت کرنے کے لئے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اور واضح اسلامی احکامات کے متعلق غلط فہمیاں پیدا کی جارہی ہیں۔ حالانکہ اسلام کے اصول بدلے نہیں جاسکتے اور قطعی نصوص میں تحریف کی اجازت کسی طرح نہیں دی جاسکتی۔

اس کے بعد مفتی صاحب نے اس وقت اس سلسلے میں مختلف اشخاص اور اداروں کی طرف سے جو مذموم کوششیں ہو رہی تھیں ان کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> اسلامی مشاورتی کونسل کے ایک رکن نے بیئر شراب کے حلال ہونے کی رائے اپنی سالانہ رپورٹ میں دی ہے۔ نیز اس رپورٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ موجودہ بینک سسٹم اور کاروباری سود وہ ربو نہیں جو قرآن نے حرام قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں مختلف قسم کے بیمہ جات مثلاً زندگی کا بیمہ، مال تجارت کا بیمہ وغیرہ کے شرعی جواز کی صورت نکالنے کی کوشش شروع ہے۔ مصر کے ملک میں بینک میں تو عورتوں کا دودھ جمع کیا جاتا ہے۔ زچہ بچہ اور بہبودیٔ اطفال کے اداروں اور شفاخانوں میں وہ دودھ بچوں کو پلایا جاتا ہے۔ حالانکہ اسلام میں اس دودھ کے استعمال کرنے سے رضاعی حرمت ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اس کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی اور اس کو شرعاً جائز ثابت کرنے کی کوشش شروع

ہے۔ کراچی میں ذبیحہ کا بندوبست مشین سے کیا جارہا ہے۔ ایسا ذبح بالکل ناجائز ہوگا۔ اب لوگ مجبور ہوں گے کہ مشین کے ذریعہ ذبح کئے گئے گوشت کو کھائیں۔

حالات کا تجزیہ پیش کرنے کے بعد مفتی صاحب علماء کرام اور مفتیین عظام کی توجہ اس شرعی ضرورت کی طرف مبذول کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

> ان حالات کا تقاضا ہے کہ علماء امت حل کرنے نئے پیدا شدہ مسائل کا جائزہ لیں۔ اور ان مسائل پر ٹھوس دلائل پیش کر کے تحریر وانشاء کے ذریعہ سے عامۃ المسلمین کو صحیح صورت حال سے آگاہ کریں۔(۸۵)

اگر ایک طرف مولانا مفتی محمود نے جدید پیدا شدہ مسائل کو شرعی نقطۂ نظر سے حل کرنے کی طرف اُمت کے علماء کرام کو متوجہ کرنا ضروری خیال کیا۔ تو دوسری طرف اُمت کو ایسے مسائل میں الجھنے سے بچنے کی تلقین کی جو اُمت میں انتشار پیدا کرنے کی غرض سے باطل قوتوں اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے والوں کی طرف سے اُٹھائے جاتے ہیں۔ اور اہم دینی وشرعی ذمہ داریوں سے علماء کرام کی توجہ لایعنی مباحث کی طرف کھینچنے کی مذموم کوششیں کی جاتی ہیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب ملک میں علماء کرام کے اندر یہ مسئلہ اٹھانے کی کوشش کر کے ان کو غیر ضروری مسائل میں پھنسانے کی کوشش کی گئی کہ کوّا حلال ہے یا حرام ہے۔ مفتی صاحب نے باطل قوتوں کے ارادوں کو بھانپتے ہوئے علماء کرام اور اپنی جماعت کے کارکنوں کو ان مباحث میں الجھنے سے بچنے کی تلقین کی۔ آپ نے لکھا۔

> آج کل پنجاب کے مختلف شہروں میں علماء اور عوام میں کوّے کی حلت وحرمت پر بحثیں چل رہی ہیں جس میں سرکاری مولوی پیش پیش ہیں۔ بعض سادہ لوح علماء فضول اور بے مقصد مباحثوں اور مجادلوں میں الجھ کر عامۃ المسلمین میں افتراق کا سبب بن رہے ہیں۔

آپ نے فرمایا۔

> کوّے کے حلال وحرام ہونے کی اس بحث میں یہ سادہ لوح علماء نہیں سمجھتے کہ دین اور اہل دین کا کس قدر نقصان ہے اس سے نہ صرف عام مسلمانوں میں خلفشار اور تصادم رونما ہوگا بلکہ ملحد وبے دین طبقہ کو علماء کے خلاف ایک اور ہتھیار ہاتھ آجائے گا۔(۸۶)

مسئلہ رؤیت ہلال میں ریڈیو، ٹیلیفون وغیرہ کے استعمال کا حکم

مسئلہ رؤیت ہلال کے بارے میں پاکستان میں علماء کو خصوصاً اور عام مسلمانوں کو عموماً ہر رمضان المبارک اور شوّال کے چاند کے بارے میں پریشان کن صورت حال سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ حکومتی سطح پر بھی کوئی ایسے اقدامات وانتظامات نہیں تھے۔ جسے شرعی اعتبار سے اطمینان بخش کہا جاسکتا۔ ادھر جدید ذرائع ابلاغ مثلاً ٹیلیفون، ریڈیو وغیرہ کے ذریعہ چاند کے ثبوت، عدم ثبوت نے نئی تحقیق کی ضرورت کو مزید دوچند کر دیا تھا۔ اس ضرورت کے پیش نظر سب سے پہلے ان حالات کے اعتبار سے جس شخصیت نے اس شرعی ضرورت کو محسوس کیا وہ مولانا مفتی محمود صاحبؒ تھے۔ اگرچہ اس وقت تک ان کی شہرت ایک محدود حلقے تک تھی۔ لیکن انہوں نے اس سلسلے میں ایک اہم قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے اس سلسلے میں پہلے پہل بارہ سوالات مرتب کیے۔ اور پاکستان کے علاوہ ہندوستان کے مفتیین کرام کے پاس بھیجے۔ اور خود بھی ان سوالات کے جوابات مرتب کئے۔ جو کتابی صورت میں " زبدة المقال فی رؤية الهلال " کے نام سے چھپی ہے اور جس کا اب اُردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ اور اسے فتاویٰ مفتی محمودؒ جلد سوم کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ علماء کرام اور مفتیین حضرات کی طرف سے جو جوابات موصول ہوئے ان میں سے بعض جوابات ایک دوسرے کے خلاف تھے۔ اس ضرورت کے پیش نظر مولانا مفتی محمود صاحب نے ۱۵، ۱۶ ر ستمبر ۱۹۵۴ء کو مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں ان علماء کا اجلاس طلب کیا۔ تاکہ کوئی

متفقہ لائحہ عمل سامنے لایا جاسکے۔ دو دن کے اجلاس کے بعد جو متفقہ موقف سامنے لایا گیا۔ وہ علماء کے متفقہ فیصلے کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

"علماء کا متفقہ فیصلہ" کے عنوان سے جو فیصلے شرعی نقطہ نگاہ سے لکھے گئے ہیں۔ ان میں بڑی احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا مفتی محمود صاحب لکھتے ہیں۔

"اس میں اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ متون معروفہ و مشہورہ کی مفتیٰ بہ روایات کے خلاف کوئی بات نہ ہو۔ اور اختلاف و خود رائی کی جو وباعام پھیلی ہوئی ہے اس کا انسداد ہو سکے"۔ (۸۷)

انہوں نے اسی پر ہی بس نہ کیا بلکہ یہ ارادہ بھی ظاہر کیا کہ یہ کوشش کی جائے گی کہ تمام علماء کا اتفاق حاصل کیا جائے ان کی تصدیق حاصل کی جائے اور پھر عملی اقدامات کے لئے حکومت سے رجوع کیا جائے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔ "ان جوابات اور طے شدہ مسائل کی ایک ایک کاپی تمام اطراف و اکناف کے علماء کرام کی خدمت میں پیش کی جائے گی۔ اور اتفاق و تصدیق کے بعد جو بات حکومت سے متعلق ہے۔ اس کی منظوری کی استدعا حکومت سے کی جائے گی"۔ (۸۸)

رؤیت ہلال میں جدید آلات کے شرعی حکم کے بارے میں مفتی محمود صاحبؒ نے ایک فتویٰ کی تصحیح کی ہے جو ان کے معین مفتی مولانا عبداللطیف کا تحریر شدہ ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

جدید آلات مثلاً ٹیلیفون، ریڈیو، تار وغیرہ کے ذریعہ سے شہادت تو کسی قسم کی نہیں دی جاسکتی۔ کیونکہ شاہد کے لئے قاضی کے سامنے پیش ہونا ضروری ہے۔ جو ان آلات کی صورت میں مفقود ہے۔ ہاں اگر ان آلات کی خبر مستفیض اور محقق بمنزلہ متواتر ہو جائے بایں طور کہ مختلف شہروں سے یا ایک شہر سے متعدد (حد تواتر کو پہنچی ہوئی جو مفید یقین ہو) تاریں، ٹیلیفون، خبر رؤیت ہلال کی موصول ہو جائیں۔ یا مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے یا ایک ریڈیو اسٹیشن سے مختلف اوقات میں متعدد آدمیوں کی طرف سے

رؤیت ہلال کی خبریں نشر کی جائیں۔ اور اس شہر کے عالم و مفتی کو یقین ہو جائے تب رؤیت ہلال کا اس شہر میں اثبات ہو سکتا ہے۔ لیکن معلوم رہے کہ خبر مستفیض خود حجت مثبت رؤیت نہیں۔ بلکہ یہ تو رؤیت کی خبر پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ اصل تو چاند دیکھنے والوں کی شہادت ہے۔ (۸۹)

حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ کی دلچسپی سے جہاں یہ قابل عمل تجاویز سامنے لائی گئیں۔ وہاں یہ بھی فیصلہ ہوا کہ حکومت وقت کو اس طرف متوجہ کیا جائیگا کہ وہ علماء کے متفقہ فیصلے کی روشنی میں ان شرائط کے تحت رؤیت ہلال کے مسئلہ کے لئے پیش رفت کرے۔ اور انہوں نے ایسا کیا۔ وہ خود ایک استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں۔

واضح ہو کہ احقر خود مرکزی وزیر داخلہ سے اس سلسلے میں تفصیلی گفتگو کر چکا ہے۔ وہ خود معترف ہیں کہ ہم سے ذمہ داری نبھانے میں کوتاہی ہوئی ہے آئندہ کے لئے انہوں نے صحیح شرعی نظام سے شہادت لینے اور اعلان ہلال کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ مجھ سے کچھ ضروری مشورے بھی لئے گئے ہیں۔ (۹۰)

اور ساتھ یہ تصریح کر دی کہ جب تک حکومت علماء کے بیان کردہ شرائط کے تحت رؤیت ہلال کے مسئلہ کو نہیں سنبھالے گی۔ اس کا کوئی فیصلہ اور اعلان واجب العمل نہ ہو گا۔ وہ لکھتے ہیں۔ "لیکن موجودہ صورت حال میں ان کا فیصلہ اور اس کا اعلان واجب العمل نہیں ہے"۔

علماء کے فیصلے کی روشنی میں ایک شرط یہ بھی حکومت کے سامنے رکھی گئی تھی کہ وہ مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی میں علماء کو بطور رکن شامل کریں۔ اور پھر اس کمیٹی کے فیصلہ کا اعلان حاکم مجاز کی طرف سے ریڈیو کے ذریعہ کر دیا جائے۔ تو اس پر عمل کرنا واجب ہو گا۔ وہ لکھتے ہیں۔

ہاں اگر حکومت ہلال کمیٹی میں علماء کی جماعت کو بطور ارکان شامل فرمائے اور جماعت علماء مجاز کے سامنے تحت احکام شرع ہلال صوم یا فطر ہو جائے اور اس کا اعلان ریڈیو میں

حاکم مجاز کی طرف سے ہو تو اس کے حدود ولایت میں سب کو اس پر عمل کرنا لازم ہو گا۔(۹۱)

مولانا مفتی محمود کی یہ مساعی جاری رہیں اور مختلف مواقع پر وہ حکومت کے کارپردازوں سے اس بارے میں گفت وشنید کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ ۱۹۶۲ء میں ڈیرہ اسماعیل خان سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ انہوں نے متعدد بار قومی اسمبلی کے فورم پر اس بات کو اُٹھایا۔ مگر شنوائی نہیں ہوئی۔ حکومت "مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی" وقتاً فوقتاً بناتی رہی۔ بحریہ کے سربراہ کی صدارت میں دیگر فوجی اداروں کے نمائندے اور بیوروکریٹس اسکے ممبر بنائے جاتے رہے۔ اور یہ ایک ایڈمنسٹریشن مسئلہ کی حد تک رہا۔ جس کی وجہ سے حکومتی انتظامات علماء کا اعتماد حاصل نہ کر سکے۔ اور ہمیشہ ہلال صوم وعید کے موقع پر ملک میں انتشار کی کیفیت رہی۔ اور دین کے اہم شعائر کو مذاق بنایا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ جب ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں مفتی محمود صاحب قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور ۱۹۷۳ء کے دستور کے لئے تجاویز کے لئے کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ تو حضرت مفتی صاحب ایک تجربہ کار پارلیمینٹیرین، سیاسی رہنما اور ایک اہم مذہبی سکالر کی حیثیت سے جہاں دیگر اسلامی دفعات کو آئین کا حصہ بنانے میں کامیاب رہے وہاں مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کی تشکیل اور اسکے لئے شرعی قواعد وضوابط کو بھی آئین کا حصہ بنانے میں حکومت کی رضامندی حاصل کی۔

مولانا نور محمد صاحب آف وانا ۱۶/ ستمبر ۱۹۵۴ء کے اجلاس میں شریک رہے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

> حضرت مفتی صاحب کی کوششوں سے حکومت نے ہلال کمیٹی کو ازسرنو علماء کی تجاویز کے مطابق تشکیل دیا۔ جس میں مختلف مکاتب فکر کے جید علماء شامل کئے گئے اور ریڈیو پر روزہ اور عید کے اعلان کو شرعی قیود کا پابند بنا دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک بھر کے علماء کرام نے ریڈیو اور ٹی وی کے اعلان پر روزہ اور عید منانا شرعاً تسلیم کیا۔(۹۲)

مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کے بارے میں مولانا مفتی محمودؒ کی اپنی رائے آپ کی تفسیر "تفسیر محمود" میں موجود ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

> اس وقت جو رؤیت ہلال کمیٹی ہے چونکہ گورنمنٹ نے اس کو مکمل اختیارات دے دیئے ہیں لہٰذا وہ مجاز اتھارٹی ہے۔ اگر قواعد شرعیہ کے موافق صاف صاف گواہی لے لے اور فیصلہ کرے تو درست ہو گا۔ اور اس فیصلہ کو عوام تک پہنچانے کے لئے شہادت شرط نہیں ہے۔ لہٰذا ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ اگر رؤیت اور عدم رؤیت کی خبر نشر ہو جاتی ہے تو وہ قابل قبول ہو گی۔ اب موجودہ کمیٹی میں چونکہ سب علماء ہیں۔ لہٰذا اس کمیٹی کا فیصلہ نافذ ہو گا۔ اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اس کمیٹی کے فیصلے کی جو خبر شائع ہو گی وہ درست ہو گی۔(۹۳)

مشینی ذبیحہ کا مسئلہ

مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ کی اس مسئلے میں تحقیق نے امت مسلمہ کو مشینی ذبیحہ کے استعمال سے بچانے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ یہ تحقیق حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے ساتھ مشینی ذبیحہ کے مسئلے پر اختلاف کی صورت میں سامنے آئی ہے۔ مفتی محمد شفیع صاحب کا ایک فتویٰ ماہنامہ "بینات" بابت ماہ ذی قعدہ ۱۳۸۴ھ بمطابق مارچ ۱۹۶۵ء میں "ذبح کا مسنون طریقہ" کے عنوان کے تحت شائع ہوا تھا۔ جو کہ جنیوا (سوئزرلینڈ) سے آئے ہوئے ایک استفتاء کے جواب میں تھا۔ جس میں ان سے مشینی ذبیحہ کے متعلق شرعی حکم دریافت کیا گیا تھا۔ اس فتویٰ کی رو سے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے مشینی ذبیحہ کو جائز فرمایا تھا۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں کہ

> بجلی کی مشینوں کے ذریعہ اُوپر کی طرف سے چُھری گردن پر رکھ کر گردن کاٹ دینے سے بظاہر یہ صورت تو نہ ہوگی کہ عروق ذبح قطع ہونے سے پہلے موت واقع ہو جائے

کیونکہ یہ قطع بڑی سرعت اور تیزی کے ساتھ ہوگا اس لئے اگر مشین کی چُھری گردن پر رکھنے والے نے بسم اللہ کہہ کر چُھری رکھی ہے تو گو غیر مشروع طریقہ سے ذبح کرنے کا گناہ ہوا مگر گوشت حلال ہوگیا۔ [مولانا مفتی رشید احمد۔ احسن الفتاویٰ۔ ج ۷۔ ص ۴۶۷]

مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا استدلال مولانا اجمل خانؒ نے یوں ذکر کیا ہے۔

اگر کسی مسلمان شخص نے "بسم اللہ، اللہ اکبر" کہہ کر مشین کا بٹن آن کر دیا۔ تو مشین کے چلنے سے جتنے جانور ذبح ہونگے وہ سارے حلال ہوں گے۔ کیونکہ مشین چلانے والا مسلمان ہے۔ اور اس نے بوقت ذبح اللہ کا نام لیا ہے۔ مشین تکبیر کی شرط پوری نہیں کر سکتی وہ شرط اس مسلمان نے بٹن آن کرتے وقت پوری کر دی تو یہ ذبیحہ حلال ہوگا۔ کیونکہ تکبیر اور ذبح دونوں کا ظہور ہوا۔ (۹۴)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے یہ فتویٰ دے کر مشینی ذبیحہ کو حلال قرار دیا۔ بلکہ بقول مولانا مفتی محمود صاحب کے حضرت مفتی صاحب (مفتی محمد شفیع صاحب) جیسی عظیم معروف علمی شخصیت کے اس فتویٰ سے یورپ اور امریکہ میں مروج طریق پر جس کا اسلامی ذبیحہ سے کوئی علاقہ نہیں اسلامی ذبح کی مہر تصدیق ثبت ہوگئی۔ اور پاکستانی مستغربین "آج تک مشینی ذبیحہ کے طریقے کو ملک میں رائج کرنے سے کتراتے تھے کیونکہ علماء کرام ایسے ذبیحہ کی حلت اور عام استعمال میں رکاوٹ تھے۔ آج سے ان کی مشکل آسان ہوگئی۔ (۹۵)

مولانا مفتی محمود صاحب نے اپنے دلائل کی قوت پر مولانا مفتی محمد شفیعؒ کے اس فتویٰ کی سختی سے تردید کی اور اپنا مؤقف ماہنامہ "بینات" ماہ صفر ۱۳۸۵ھ میں ایک مکتوب کی صورت میں شائع کرا دیا۔ مفتی محمود صاحب نے لکھا "مہربان من! میں یہ سمجھتا ہوں کہ بٹن دبانے والا مسلمان بھی ہو اور بٹن دباتے وقت تسمیہ بھی پڑھے تب بھی مشین کے مروّجہ ذبیحہ کو حلال نہیں کہا جا سکتا بلکہ وہ مردار ہے"۔ (۹۶)

مولانا مفتی محمود صاحب نے اسکے وجوہات سے جو بحث کی ہے وہ بطور دلیل کے ایک یہ ہے۔

آپ یہ دیکھیں کہ بٹن دبانے والے نے صرف اتنا ہی تو کیا ہے کہ برقی طاقتور مشین کا جو کنکشن کٹ چکا تھا۔ اور ان دونوں کے درمیان جو مانع تھا اس کو دور کر دیا۔ اور پھر سے کنکشن جوڑ دیا اور بس۔ دراصل مشین کی چھری کو چلانے والی اور جانور کا گلا کاٹنے والی برقی لہر کرنٹ ہے۔ نہ کہ ایک مسلمان کے ہاتھ کی قوت محرکہ اور یہ گلا کاٹنا برقی قوت اور مشین کا فعل ہے نہ کہ اس مسلمان کا۔ اور ذبح اختیاری میں ذبح کرنے والے کا فعل اپنے ہاتھ سے گلا کاٹنا اور اسکی تحریک کا مؤثر ہونا شرط ہے۔ یہاں تو بٹن دبانے والے نے سوائے رفع مانع کے اور کچھ نہیں کیا۔ رفع مانع سے فعل ذبح کی نسبت رافع کی طرف کس طرح ہو سکتی ہے؟ اور اس کو ذبح کرنا کیسے کہا جا سکتا ہے؟ (۹۷)

مفتی محمود صاحبؒ مزید دلیل دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اس طرح اگر کہیں ایک تیز دھار آلہ مثلاً چُھری یا چاقو اوپر کسی رسی سے بندھا ہوا لٹک رہا ہو اور اسکے نیچے بالکل سیدھ میں مُرغی یا بکری کا بچہ یا کوئی جانور کھڑا ہے۔ اب اگر کوئی مسلمان تسمیہ پڑھ کر رسی کاٹ دے اور وہ آلہ اپنی طبعی ثقل سے نیچے گر کر اس جانور کا گلا کاٹ دے تو کیا یہ ذبیحہ حلال ہوگا؟ کیا یہ فعل ذبح اس رافع مانع مسلمان کی طرف منسوب ہوگا اور اس مسلمان کو جانور ذبح کرنے والا کہا جائے گا اور اس مذبوحہ جانور کو مسلمان کا ذبیحہ کہا جائے گا۔ (۹۸)

مذکورہ بالا اس دلیل کے نتیجہ کے طور پر وہ مزید لکھتے ہیں۔ "جس طرح اس مثال میں اس ذبیحہ کی حلت کا حکم نہیں ہے اور یہ ذبیحہ حلال نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو مشینوں کے ذبیحہ پر حلت کا حکم کیسے لگایا جا سکتا ہے"۔ (۹۹)

مضمون کے آخر میں مولانا مفتی محمود صاحبؒ، مولانا مفتی محمد شفیع سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس فتویٰ پر نظر ثانی فرما کر اسکی اصلاح فرمائیں۔ وہ لکھتے ہیں۔ "اس لئے مفتی محمد

شفیع صاحب مدظلہ العالی سے باادب درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس فتویٰ پر نظر ثانی فرما کر اس کی اصلاح فرمائیں اور بینات میں اس کو جلد از جلد نمایاں طور پر شائع کریں"۔(۱۰۰)

مشینی ذبیحہ کے بارے میں مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی نے "احسن القضاء فی الذبح باعانۃ الکھرباء" رسالہ لکھا ہے اور اس کو اپنے فتاویٰ "احسن الفتاویٰ ج ہفتم" کا حصہ بنایا ہے جس میں انہوں نے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا وہ فتویٰ جو مشینی ذبح کے "حلت مع عدم جواز کا فتویٰ" کے نام سے اور مولانا مفتی محمود صاحب کا "حرمت کا فتویٰ" کے نام سے شامل اشاعت کیا ہے۔ اور پھر دونوں میں " محاکمہ " کے نام سے اپنا نقطۂ نظر مع حوالہ جات نقل کیا ہے اور انہوں نے اس میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے فتویٰ کی تائید کی ہے جبکہ مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی مفتی و شیخ الحدیث جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی نے مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے فتویٰ اور مولانا مفتی محمود صاحب کے فتویٰ دونوں کو ماہنامہ بینات میں نقل کرتے ہوئے مفتی محمودؒ کی تائید کی ہے اور مفتی محمودؒ کے فتویٰ کے بارے میں مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے حوالے سے لکھا ہے۔ "حضرت بنوریؒ ذبح بالنار کے اس واضح مطلب کو سن کر بہت محظوظ ہوئے اور دیر تک داد دیتے رہے"۔(۱۰۱)

مشینی ذبیحہ کے بارے میں حضرت مفتی صاحب کے مؤقف کے بارے میں مولانا محمد ایوب جان بنوریؒ لکھتے ہیں۔

> وہ جید عالم اور بہترین فقیہ تھے۔ افتاء اور تدریس کی خدمات بھی انہوں نے انجام دیں۔ ایک دفعہ "مشینی ذبیحہ" کا مسئلہ پیش آیا۔ چنانچہ مصر کے مفتی محمد عبدہٗ نے اس کی حلت کا فتویٰ دیا۔ اور اسکے شاگرد علامہ رشید رضا مصری نے اسکی تائید میں کئی مضامین لکھے۔ ادارۂ تحقیقات اسلامی کے چیئرمین ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی وساطت سے یہ بات پاکستان پہنچی۔ پاکستان کے بعض علماء کے بھی متاثر ہونے کا خطرہ تھا۔ جبکہ

> حضرت مفتی صاحبؒ مرحوم و مغفور نے مضبوط و ٹھوس دلائل سے ثابت کیا۔ کہ مشینی ذبیحہ کسی طرح بھی حلال نہیں ہو سکتا۔ اور اس طرح پوری قوم ہی کو نہیں بلکہ پوری ملت اسلامیہ کو حرام گوشت کے استعمال سے بچالیا۔(۱۰۲)

اس بات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ مولانا مفتی غلام مرتضیٰ صاحب نے لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

> خاص کر مفتی اعظم کے دو کارنامے تو میرے نزدیک بہت زیادہ اہم ہیں۔ ایک یہ کہ پوری پاکستانی قوم کو مردار اور حرام گوشت سے بچالیا۔ جسکی مختصر تفصیل اس طرح ہے کہ مشینی ذبیحہ کا مسئلہ جب مصر میں آیا تو مصر کے مفتی عبدہٗ مرحوم نے اسکی حلت کا فتویٰ دیا۔ اور علامہ رشید رضا مصری نے اپنے استاد کی تائید میں مضامین لکھے۔ اس مسئلہ کی وجہ سے پورے مصر میں ہنگامہ ہوا۔ اور مفتی محمد عبدہٗ کو عہدۂ افتاء سے الگ کر دیا گیا۔ اور یہی مسئلہ پاکستان میں ڈاکٹر فضل الرحمان کے واسطے سے آیا۔ اور اس نے عربی سے اُردو جامہ اس مسئلہ کو پہنایا۔ اور یہاں بھی اس مسئلہ کو تازہ کیا۔ اور پاکستان کے بعض ثقہ اہل علم نے بھی مشینی ذبیحہ کی حلت میں فتویٰ جاری کیا۔ تو مفتی اعظم مفتی محمود صاحب نے قرآن و حدیث کے دلائل سے ثابت کیا کہ مشینی ذبیحہ حرام ہے کیونکہ قرآن مجید کی نص قطعی ﴿ وَ الْمُنْخَنِقَةُ وَ الْمَوْقُوْذَةُ ﴾ ہے تو مشینی ذبیحہ بھی اس میں داخل ہے۔ اور یہ بھی حرام ہے۔ یہ کیسے حلال ہو سکتا ہے۔(۱۰۳)

مشینی ذبیحہ کے حرمت کے بارے میں مولانا مفتی محمود صاحب نے امتِ مسلمہ کو ایک بڑی آزمائش سے بچایا اور اس سے نہ صرف عام مسلمان بچ گئے بلکہ حکومت پاکستان جس نے ذبح کے لئے مشینیں منگوانے کا ارادہ کیا تھا وہ بھی اس حرام فعل کے ارتکاب سے محفوظ ہو گئی۔ اس سلسلے میں مولانا غلام غوث ہزارویؒ صاحب لکھتے ہیں۔

> حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مفتیٔ اعظم ہیں اور ایسے حق گو مفتی کہ ان کا وجود مسعود نہ ہوتا تو آج پاکستان کے مسلمان مشینی ذبح کا جھٹکا حلال سمجھ کر کھاتے رہتے۔ اللہ تعالیٰ

بھلا کرے حضرت مفتیٔ اعظم مفتی محمود صاحب کا کہ انہوں نے اس کا جواب لکھ کر فضل الرحمٰن (ڈائریکٹر جنرل اسلامی تحقیقاتی کونسل) کا راستہ روک لیا اور نہ حکومت نے تو مشینیں منگا ہی لی تھیں۔(۱۰۴)

بندوق کی گولی سے شکار کا حکم

اس مسئلہ میں فقہاء و مفتیین کے اختلاف سے قبل مسئلہ کی اصل حقیقت بیان کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں۔

ذبح کے دو طریقے ہیں ایک ان جانوروں کے ذبح کا طریقہ جو آدمی کے قابو میں ہوں اس کو فقہ کی اصطلاح میں "ذبح اختیاری" کہتے ہیں۔ دوسری صورت ایسے جانور کو ذبح کرنے کی ہے جو آدمی کے قابو میں نہ ہو مثلاً شکار کے جانور، جن کو دور ہی سے نشانہ لگا کر مارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان کے ذبح کا طریقہ ان جانوروں سے ذرا مختلف ہے جو انسان کے قابو میں ہوں۔ اور اس کو فقہ کی اصطلاح میں "ذبح اضطراری" کہتے ہیں۔(۱۰۵)

ذبح اختیاری اور ذبح اضطراری کی تقسیم کے بعد مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی لکھتے ہیں۔

ذبح اضطراری میں حلق کے خاص رگوں کو کاٹنا ضروری نہیں۔ بلکہ اس قدر کافی ہے کہ جس چیز کو شکار کے لئے استعمال کیا جائے وہ شکار کو زخمی کر دے زخمی کرنے کے بعد اگر شکار کرنے والا زندہ حالت میں اسے پکڑ لے تو پھر اب حلق کی ان رگوں کو کاٹنا ہوگا اور اگر اس کے پہنچنے سے پہلے ہی جانور مر چکا تھا تو اس کا زخمی ہو جانا کافی ہے اور اب وہ حلال ہے شکار کے معاملہ میں یہ خصوصی سہولت قرآن و حدیث کی تصریحات سے ماخوذ ہے۔(۱۰۶)

شکاری جانوروں کو بندوق کی گولی سے مارنے کی صورت میں اگر بندوق چلانے والا مسلمان ہو اور گولی چلاتے وقت "بسم اللہ، اللہ اکبر" پڑھ کر گولی چلائے اور وہ شکار کو لگے اور اسکی موت واقع ہو جائے تو یہ شکار حلال ہوگا یا حرام۔ ہدایہ اور فقہ کی دیگر کتب کی تصریح سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس بات کا یقین ہو جائے کہ جانور کی موت زخم سے ہوئی ہے تو وہ بلاشبہ حلال ہے اور اگر یقین ہو کہ چوٹ سے ہوئی ہے تو بلاشبہ حرام ہے۔ ہدایہ کی عبارت یہ ہے۔

والاصل فی ہذہ المسائل ان الموت ان کان مضافا الی الجرح بیقین کان حلالاً و ان کان مضافًا الی الثقل بیقین کان حرامًا و ان وقع الشك و لا یدری مات بالجرح او بالثقل کان حرامًا احتیاطًا(۱۰۷)

مولانا مفتی محمود صاحبؒ نے نومبر ۱۹۵۶ء مطابق ربیع الاول ۱۳۷۶ھ، مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی جو اس وقت دارالعلوم کراچی میں مفتی و مدرس تھے کو ایک خط میں لکھا۔ "اس مسئلہ (بندوق کی گولی سے شکار) میں احقر کو خود تردّد ہے مندرجہ ذیل دلائل پر آپ نظر ڈال کر اپنی رائے سے مطلع فرمائیں اور نفس دلائل کے تحت فانظرالی ما قال ولا تنظرالی من قال کے بموجب رائے قائم فرمائیں"۔(۱۸۰)

اس کے بعد مولانا مفتی محمود صاحب نے حلت و حرمت پر دلالت کرنے والی متعدد روایات کا ذکر کر کے اپنی رائے لکھی ہے۔ وہ مذکورہ خط میں لکھتے ہیں۔

اور اب کبوتر سے لیکر ہرن تک کا شکار بندوق سے ہی ہوتا ہے قدرت علی الذکاة الاختیاریة شاذونادر ہی مل سکتی ہے۔ اخراج الدم بھی کامل ہوتا ہے۔ تو اس ضرورت شدیدہ میں باوجود تمیز الدم المسفوح باکمل وجہ وھوالمقصود حرام قرار دینے کے معنی یہ ہوں گے کہ اس زمانہ کے لوگ رخصت خداوندی سے متمتع نہ ہوں۔(۱۰۹)

مولانا مفتی محمود اس مسئلے میں اپنی رائے کے اظہار میں کس قدر احتیاط سے کام لیتے ہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ دونوں قسم کے دلائل کے ذکر کے باوجود نہایت احتیاط سے اپنی رائے لکھتے ہیں۔ اور اسکی وجہ کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ بلاوجہ جدید آلات اور جدید زمانہ کے ساتھ احکام میں ترمیم کرنا الحاد اور زندقہ ہے اور فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کی عبارات واشارات کے خلاف کوئی حکم نافذ کرنا بھی فتنہ سے خالی نہیں۔ لیکن شرعی دلائل کی موجودگی میں فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے اصول مقرر کردہ کے تحت کسی مسئلہ پر غور نہ کرنا بھی قابل ملامت ہوگا۔ جدید آلات اور ضروریات زمانہ پر غور وفکر نہ کرنا اور بندوق کی گولی کو بندقہ طین پر قیاس کر کے سبکدوش ہو جانا علماء کے شایاں نہیں۔ اور پھر بندوق میں فقط گولی اور چھرے سے تو شکار نہیں ہوتا۔ بلکہ نوکدار گولی کے کارتوس کی نوک تو معراض کی نوک سے کم نہیں ہوتی۔ سب کو ایک حکم میں لانا بھی کیسے صحیح ہوگا۔ (۱۱۰)

مولانا رشید احمد لدھیانویؒ نے فقہاء کرام کی متعدد عبارات کا حوالہ دیا ہے اور عقلی دلائل سے بھی سہارا لیا ہے۔ لیکن آخر میں مولانا مفتی محمودؒ کے اس قول "بلکہ نوکدار گولی کی نوک تو معراض کی نوک سے کم نہیں ہوتی"۔ کے تحت لکھتے ہیں۔

اقول، ایسی گولی کے شکار کی حلت میں کوئی شبہ نہیں اور نہ ہی اس میں کسی قسم کے اختلاف کی گنجائش ہے۔ امداد المفتیین میں بھی ایسے شکار کی حلت کا فتویٰ درج ہے۔ البتہ اگر ایسی کوئی گولی اتنے چھوٹے جانور کو ماری جو گولی کی ثقل ہی کا تحمل نہیں کر سکتا۔ یعنی اگر گولی تیز نوکدار نہ ہوتی تو بھی ثقل ہی سے جانور مر جاتا تو یہ جانور حلال نہ ہوگا۔ (۱۱۱)

مولانا محمد ایوب جان صاحب بنوریؒ، حضرت مفتی صاحب کے مؤقف کی وضاحت یوں کرتے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب نے بہت سے دلائل پیش کئے ان میں سے ایک دلیل یہ بھی تھی کہ بندوق سے جب فائر کیا جاتا ہے تو اس وقت اس سے ایک آگ نکلتی ہے اور وہ زخمی ہو جاتا ہے اور آگ سے ذبیحہ کو فقہاء حلال قرار دیتے ہیں۔ اس لئے یہ حلال ہے۔ (۱۱۲)

نوٹ کی شرعی حیثیت اور اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم

نوٹ کی حیثیت سند وحوالہ کی ہے یا ثمن عرفی کی۔ اس کے بارے میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ مولانا عبدالحئی صاحب لکھنویؒ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے فتاویٰ موجود ہیں۔ اور ان میں اس مسئلے میں اختلاف بھی ہے۔ ان حضرات کے بعد سب سے پہلے حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ نے تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ پر اظہار خیال فرمایا ہے۔ مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ کے ایک تفصیلی خط کے جواب میں مولانا مفتی محمود صاحب کے معاون مفتی، مولانا مفتی عبداللطیف نے اور بعد ازاں خود مفتی محمود نے اس کا تفصیلی جواب لکھا ہے۔ جس میں تمام اکابرین کی آراء کو پیش نظر رکھا ہے۔ بعد میں تو اس مسئلے پر مولانا محمد تقی عثمانی صاحبؒ مولانا رشید احمد لدھیانویؒ اور دیگر مفتیین نے اظہار خیال کیا ہے۔ جبکہ مفتی محمود کا فتویٰ ۱۳۸۸ھ بمطابق ۱۹۶۸ء کا لکھا ہوا ہے۔

مفتی محمود صاحب اس قسم کے ایک استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں۔ جو کہ اس مسئلے کے بارے میں ان کا مؤقف ہے اور اب تمام علماء ومفتیین کی یہی رائے ہے۔ "اس لئے اگر کوئی شخص نوٹ کو زکوٰۃ میں ادا کر دے تو اگرچہ احتیاط کی صورت نہیں ہے۔ لیکن عموم بلویٰ اور عرف عام کے تقاضے کے تحت اس کی زکوٰۃ ادا ہو جائیگی"۔ (۱۱۳)

بھلا کرے حضرت مفتی اعظم مفتی محمود صاحب کا کہ انہوں نے اس کا جواب لکھ کر فضل الرحمٰن (ڈائریکٹر جنرل اسلامی تحقیقاتی کونسل) کا راستہ روک لیا ورنہ حکومت نے تو مشینیں منگا ہی لی تھیں۔(۱۰۴)

بندوق کی گولی سے شکار کا حکم

اس مسئلہ میں فقہاء و مفتیین کے اختلاف سے قبل مسئلہ کی اصل حقیقت بیان کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں۔

ذبح کے دو طریقے ہیں ایک ان جانوروں کے ذبح کا طریقہ جو آدمی کے قابو میں ہوں اس کو فقہ کی اصطلاح میں "ذبح اختیاری" کہتے ہیں۔ دوسری صورت ایسے جانور کو ذبح کرنے کی ہے جو آدمی کے قابو میں نہ ہو مثلاً شکار کے جانور، جن کو دور ہی سے نشانہ لگا کر مارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان کے ذبح کا طریقہ ان جانوروں سے ذرا مختلف ہے جو انسان کے قابو میں ہوں۔ اور اس کو فقہ کی اصطلاح میں "ذبح اضطراری" کہتے ہیں۔(۱۰۵)

ذبح اختیاری اور ذبح اضطراری کی تقسیم کے بعد مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی لکھتے ہیں۔

ذبح اضطراری میں حلق کے خاص رگوں کو کاٹنا ضروری نہیں۔ بلکہ اس قدر کافی ہے کہ جس چیز کو شکار کے لئے استعمال کیا جائے وہ شکار کو زخمی کر دے زخمی کرنے کے بعد اگر شکار کرنے والا زندہ حالت میں اسے پکڑ لے تو پھر اب حلق کی ان رگوں کو کاٹنا ہوگا اور اگر اس کے پہنچنے سے پہلے ہی جانور مر چکا تھا تو اس کا زخمی ہو جانا کافی ہے اور اب وہ حلال ہے شکار کے معاملہ میں یہ خصوصی سہولت قرآن و حدیث کی تصریحات سے ماخوذ ہے۔(۱۰۶)

شکاری جانوروں کو بندوق کی گولی سے مارنے کی صورت میں اگر بندوق چلانے والا مسلمان ہو اور گولی چلاتے وقت " بسم اللہ، اللہ اکبر" پڑھ کر گولی چلائے اور وہ شکار کو لگے اور اسکی موت واقع ہو جائے تو یہ شکار حلال ہوگا یا حرام۔ ہدایہ اور فقہ کی دیگر کتب کی تصریح سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس بات کا یقین ہو جائے کہ جانور کی موت زخم سے ہوئی ہے تو وہ بلاشبہ حلال ہے اور اگر یقین ہو کہ چوٹ سے ہوئی ہے تو بلاشبہ حرام ہے۔ ہدایہ کی عبارت یہ ہے۔

و الاصل فی هذه المسائل ان الموت ان کان مضافا الی الجرح بیقین کان حلالاً و ان کان مضافًا الی الثقل بیقین کان حرامًا و ان وقع الشك و لا یدری مات بالجرح او بالثقل کان حرامًا احتیاطًا(۱۰۷)

مولانا مفتی محمود صاحبؒ نے نومبر ۱۹۵۶ء مطابق ربیع الاول ۱۳۷۶ھ، مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی جو اس وقت دارالعلوم کراچی میں مفتی و مدرس تھے کو ایک خط میں لکھا۔ "اس مسئلہ (بندوق کی گولی سے شکار) میں احقر کو خود تردّد ہے مندرجہ ذیل دلائل پر آپ نظر ڈال کر اپنی رائے سے مطلع فرمائیں اور نفس دلائل کے تحت فانظرالی ما قال ولا تنظرالی من قال کے بموجب رائے قائم فرمائیں"۔(۱۸۰)

اس کے بعد مولانا مفتی محمود صاحب نے حلت و حرمت پر دلالت کرنے والی متعدد روایات کا ذکر کر کے اپنی رائے لکھی ہے۔ وہ مذکورہ خط میں لکھتے ہیں۔

اور اب کبوتر سے لیکر ہرن تک کا شکار بندوق سے ہی ہوتا ہے قدرت علی الذکاۃ الاختیاریۃ شاذ و نادر ہی مل سکتی ہے۔ اخراج الدم بھی کامل ہوتا ہے۔ تو اس ضرورت شدیدہ میں باجود تمیز الدم المسفوح باکمل وجہ وھوالمقصود حرام قرار دینے کے معنی یہ ہوں گے کہ اس زمانہ کے لوگ رخصت خداوندی سے متمتع نہ ہوں۔(۱۰۹)

درہم ومثقال کے وزن میں اختلاف اور اس کا حل

درہم ومثقال کا وزن جس کے اعتبار سے سونے چاندی کی زکوٰۃ کا حساب لگایا جاتا ہے، کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال منقول ہیں جس کی وجہ سے اکثر علماء کو اشتباہ ہو جاتا ہے۔ مفتی محمودؒ کی زیر نگرانی، علماء کے مختلف اقوال کو سامنے رکھ کر اس مسئلے کا حل مولانا مفتی عبد اللطیف نے پیش کیا ہے۔ جس کی مفتی محمود صاحبؒ نے تصحیح کی ہے۔ مفتی عبد اللطیف صاحب نے اس سلسلے میں مولانا مفتی محمودؒ کی تقریر ترمذی کا حوالہ دیا ہے۔ جو اس وقت غیر مطبوعہ تھی اب اس کی پہلی جلد طبع ہو چکی ہے۔ اس میں ہے۔

اما زکوٰۃ الذهب و الفضة فالاتفاق علی انه لا تجب فی اقل من مأتی درهم و عشرین مثقالا و لقد اخطأ مولانا عبدالحیّ المرحوم اللکهنوی فی حساب النصاب بدراهمنا و اوزاننا المعروفة و الصحیح ما قال مولانا ثناء الله الفانی فتی و غیرهم من علماء دیوبند (۱۱۴)

مفتی صاحب نے درہم ومثقال کے وزن میں مولانا عبد الحئی لکھنوی کے مؤقف کے مقابلے میں مولانا ثناء اللہ پانی پتی اور دیگر علماء دیوبند کی رائے کو زیادہ صحیح قرار دیا ہے۔

مرزائیوں کی اولاد کے ارتداد کا مسئلہ

پاکستان کے آئین ۱۹۷۳ء کی تشکیل کا مرحلہ درپیش تھا۔ مولانا مفتی محمود ان اہم رہنماؤں میں تھے جو آئین کی تشکیل وترتیب میں پیش پیش تھے۔ خاص کر اسلام سے متعلق آئینی شقوں میں ان کا سب سے بڑا کردار تھا۔ آئین سازی کے اس مرحلے میں یہ مسئلہ درپیش تھا۔ کہ کیا کسی کو ارتداد اختیار کرنے کی آزادی ہو گی یا نہیں؟ کیا یہ شہری آزادی کے ضمن میں آتا ہے یا

نہیں۔ مفتی صاحب کا اس بارے میں واضح موقف تھا کہ کسی کو ارتداد اختیار کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ ارتداد کی سزا موت ہوگی۔ جیسا کہ ارشاد ہے "قال علیه الصلوٰة و السلام من بدّل دینه فاقتلوه" ایک اسلامی جماعت نے اس کی مخالفت کی۔ اور عذر یہ پیش کیا کہ پھر یورپ میں جو لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو رہے ہیں ان پر پابندی لگ جائے گی اور ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ لیکن مفتی محمود صاحب اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ کہا حضور ﷺ کے زمانے میں یہ خطرہ نہیں تھا؟ تھا اور زیادہ تھا۔ ایک وہ لوگ جنہوں نے دین اسلام چھوڑ کر قادیانیت اختیار کی ان کے ارتداد میں تو کوئی شک نہیں اور نہ ہی کسی کو اختلاف ہے۔ مسئلہ قادیانیوں کی اولاد کا ہے۔ کہ وہ مرتد ہیں یا کافر؟ اس سلسلے میں علامہ علی غضنفر کراروی (ممتاز شیعہ عالم اور سیاسی رہنما) مولانا مفتی محمود کا مؤقف بیان کرتے ہیں۔

انہوں (مفتی محمود) نے فرمایا کہ میرا اپنا نقطۂ نظر یہ ہے کہ زیر بحث لوگ اسی آخری قسم کے مرتد ہیں۔ جو لوگ براہ راست گمراہی کا شکار ہوئے وہ مرتد ملی ہیں۔ اور جو ان مرتد ملی کی اولاد ہونے کے باعث اس ارتداد کو اختیار کئے ہوئے ہیں وہ مرتدِ فطری ہیں۔ اور چونکہ یہ دونوں جہاد کے منکر ہونے کے باوجود عملاً حربی بھی ہیں۔ اس لئے ان کے لئے احکامات سخت ہیں۔ ان لوگوں کو مرتد اور ان کی اولاد کو کافر سمجھنا خود ان کا نقطۂ نظر ہے۔ اور ان کی غرض یہ ہے کہ انہیں اسلامی ریاستوں میں ذمیوں کے حقوق مل سکیں۔ درحقیقت وہ ان حقوق کے مستحق نہیں بلکہ اپنے عقائد واعمال کی رو سے اس سزا کے مستحق ہیں جو مرتد کے لئے اسلام نے تجویز کی ہے۔ مرتد خواہ براہِ راست مرتد بنا ہو یا مرتد کے رشتے کے حوالہ سے وہ ہر صورت میں مرتد ہے۔ اور اس کی سزا قتل ہے۔ (۱۱۵)

ایک حنفی کے لئے کسی خاص مسئلہ میں ائمہ ثلاثہ میں کسی دوسرے امام کی پیروی کا مسئلہ

کیا کسی حنفی کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ کسی خاص مسئلہ میں مخصوص حالات کے باعث امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کو چھوڑ کر امام ابو یوسفؒ، امام محمد یا ائمہ ثلاثہ میں سے کسی کے قول کو ترجیح دے کر اسکی رائے کو عمل کے لئے اپنائے؟

اس سلسلے میں مولانا مفتی محمود صاحب کا اپنا نقطۂ نظر ہے جس میں وہ منفرد نظر آتے ہیں۔ مولانا عبید اللہ صاحب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور لکھتے ہیں۔

> اور ان کی فقہی رائے کو میں نے ہمیشہ قوی پایا بعض مسائل میں وہ اپنی انفرادی رائے بھی رکھتے تھے۔ ایسی رائے کے حق میں ان کے پاس قوی دلائل ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر فقہی مسائل پر عمل کے سلسلے میں ان کی رائے یہ تھی کہ مخصوص حالات میں ایک حنفی کے لئے جائز ہوگا کہ وہ کسی خاص مسئلے میں ائمہ اربعہ میں کسی کی پیروی کرلے۔ ایسا آدمی ان کے نزدیک حنفیت سے خارج نہیں ہوتا تھا۔(۱۱۶)

آگے جا کر مولانا عبید اللہ صاحبؒ، مولانا مفتی محمود صاحب کے اس بارے میں دلائل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ نے متعدد مسائل میں امام صاحب سے اختلاف کیا ہے۔ ان کی اپنی ترجیحات ہیں لیکن ان پر حنفیت سے خروج کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ وہ اپنے اختلافات اور ترجیحات کے باوجود حنفی تھے"۔(۱۱۷)

مولانا عبید اللہ صاحب، مفتی صاحب کی دوسری دلیل یوں بیان کرتے ہیں۔

> اسی طرح اگر کسی مسئلے میں امام صاحب کا قول موجود نہ ہو، یا قول تو موجود ہو مگر سمجھ نہ آئے، یا سمجھ تو آئے لیکن حالات کی خاص نوعیت کے تحت اس پر عمل ممکن نہ ہو تو کسی دوسرے امام کی پیروی درست ہوگی۔ اس سلسلے میں ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر ایسی مشکل

> صورت پیش آئے تو صاحبین کے قول پر عمل کیا جائے۔ اگر صاحبین کے قول میں بھی یہی صورت پیش آئے تو امام محمدؒ کے قول کو ترجیح دی جائے۔ اس کے بعد در پیش مسئلہ میں ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کے اقرب قول پر عمل کر لیا جائے۔ ان کے نزدیک کسی خاص مسئلے میں خاص حالات میں خروج عن الحنفیت تو جائز ہے لیکن مذاہب اربعہ سے خروج جائز نہیں۔(۱۱۸)

مولانا عبید اللہ صاحب کے بقول "اس نقطۂ نظر میں مفتی صاحب منفرد تھے" مزید وہ یہ بتاتے ہیں۔

> مفتی صاحب کے بقول "یہ بات صرف علماء کا کام ہے جن کی مذاہب اربعہ پر وسیع نظر ہے۔ جو کسی مسئلے کے ترجیحی پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اور وہ "خاص حالات" کی قید بھی لگاتے ہیں۔ اور ان کی نشاندہی وہ یوں فرماتے ہیں کہ جب ملکی قوانین کی تدوین کے سلسلے میں علماء کسی مشکل سے دوچار ہو جائیں۔ تو اس رعایت سے فائدہ اٹھا سکیں۔ کیونکہ اصل چیز کسی امام کا قول نہیں اصل چیز وہ "نص" ہے جس کی روشنی میں وہ قول متشکّل ہوا۔(۱۱۹)

خلائی سائنسدانوں کی چاند تک رسائی کا مسئلہ

غالباً ۱۹۶۶ء میں امریکہ کے خلائی سائنس دانوں کی شب و روز تجربوں اور عملی کارروائیوں کے نتیجے میں یہ ممکن ہوا کہ وہ چند سائنس دانوں کو راکٹ کے ذریعہ چاند تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے جس سے سائنسی دنیا میں ترقی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اور وہ چاند کے علاوہ دیگر سیاروں تک مصنوعی سیاروں کے ذریعہ پہنچنے کے منصوبے بنانے لگے۔ بعض علماء کرام نے اس واقعہ کے وقوع سے سرے سے انکار کر دیا اور اس کو ناممکن بتایا۔ اور سائنسی تحقیقات و ایجادات کو شرعی اصولوں کے منافی قرار دے کر اس کو تسلیم کرنے والوں پر فتویٰ

دینے تک سے گریز نہیں کیا۔ انہیں دنوں کی بات ہے کہ ایک عالم دین مولانا ابو مسعود نقشبندی نے "خلائی تسخیر اور قرآن کریم" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ جس میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ سائنس کی ترقی سے اسلام کی حقانیت مزید اُجاگر ہو کر سامنے آگئی ہے۔ اس کتاب کی مولانا مفتی محمودؒ نے تقریظ لکھی ہے جس میں وہ لکھتے ہیں۔

ہادیٔ اسلام ﷺ نے بہ جسد اطہر آسمانوں پر جانے کا دعویٰ فرمایا۔ مسلمانوں نے ایمان لا کر اس واقعہ کی تصدیق کی۔ دنیائے کفر نے انکار کیا۔ اور چودہ سو سال تک اسلام اور کفر کے درمیان یہ مسئلہ مابہ النزاع رہا۔ آج روس اور امریکہ کی سائنسی مادی ترقی سے ثابت ہوا کہ یہ اسلام اور وحی الٰہی کا فیصلہ ہی امر واقعہ تھا۔ اور دُنیائے کفر غلط فہمی اور ہٹ دھرمی میں مبتلا تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع الی السّماء قرآن سے ثابت ہے۔ اسی پر اُمت کا اجماع ہے آج کے سائنسی دور میں خود عیسائی دنیا کے لئے یہ ممکن نہ رہا کہ اس کا انکار کرے ان کا انکار ضد اور عناد کی بنیاد پر ہی ہو سکتا ہے حقائق کی بنیاد پر بالکل نہیں۔

ان مثالوں کے بعد مفتی صاحب نے وحی اور وزن اعمال کی مثالیں دے کر اس اہم مسئلہ کو اقرب الی الفہم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

حدیث شریف میں نزول وحی کا ایک طریق یہ بتلایا گیا ہے۔ ﴿اَحْیَاناً یَأْتِیْنِیْ مِثْلُ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ﴾ ترجمہ: کبھی کبھی وحی گھنٹی کی آواز ٹن ٹن کی طرح میرے پاس آتی ہے۔

دنیائے کفر کو اعتراض تھا کہ ٹن ٹن کی آواز سے ذو معنی کلام کس طرح سمجھایا جاسکتا ہے؟ لیکن اب ٹیلیگرام سسٹم نے ثابت کر دیا کہ ٹن ٹن سے بھی کلام بلیغ سمجھا جاسکتا ہے۔ وزن اعمال کی آیات اور احادیث پر بھی اعتراض تھا کہ یہ اعمال جو اعراض ہیں ان کا وزن کس طرح ممکن ہو سکتا ہے وزن تو اجساد کا ہو سکتا ہے۔ اب گرمی اور سردی کو سائنس کی ترقی کے اس دور میں عام طور پر تولا جاتا ہے درجۂ حرارت و برودت کو ہر

شخص معلوم کر سکتا ہے بخار تک کو تھرمامیٹر کے ذریعہ سے تولا جاتا ہے باوجود غیر طبعی حرارت (بخار) وغیرہ امور سب اعراض ہیں۔

آخر میں آپ نے نتیجہ کے طور پر لکھا ہے کہ

غرض یہ کہ سائنس کی ترقی سے واقعات عالم کی صحیح تشخیص ممکن ہو گئی ہے۔ اور اس طرح وحی الٰہی سے بتلائے ہوئے حقائق پر سے پردہ اُٹھتا جا رہا ہے۔ اور اسلام کی حقانیت دلوں پر بیٹھتی جا رہی ہے۔ (۱۲۰)

اسی ضمن میں آپ کی اپنی تفسیر میں ہے۔

یاد رہے کہ اللہ کی صفات میں فلسفہ سے جرح کرنا صحیح نہیں۔ فلسفہ کا اسلام سے تعلق اس قسم کا نہیں ہے جیسا کہ سمجھ لیا گیا ہے۔ عام لوگ اس وجہ سے متاثر ہو گئے کہ فلسفہ کو عربی میں منتقل کر دیا گیا ہے فلسفہ عربی میں ہونے کی وجہ سے لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ بھی اسلام کا جزو ہے چنانچہ انہوں نے تقابل شروع کر دیا۔ اور حرکت فلک، گردش کواکب اور ستاروں کا آسمان میں مرکوز ہونا ایسی بحثیں شروع کر دیں۔ اور خرق والتیام میں الجھ گئے۔

مفتی صاحب سائنسدانوں کے چاند پر پہنچنے سے پیدا شدہ صورت حال کو زیر بحث لاتے ہیں اور کہتے ہیں۔

اور پھر جب سائنسدان چاند پر چلے گئے۔ تو کہنے لگے اسلام پر ضرب لگ گئی۔ اور پھر وہاں سے پتھر اور دیگر اشیاء لے کر آئے تو اور زیادہ فکر مند ہو گئے اور جب مریخ پر گئے۔ تو حیران ہوئے کہ وہ کیا تعلق تھا؟ ان کے غلط ہونے سے جملہ مشینوں کے ساتھ کیسے نکل گئے۔ حتیٰ کہ تنگ آکر کہا کہ اسلام پر ضرب لگ گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ فلسفیانہ مسائل کا قرآن سے اسلام پر ضرب نہیں لگی۔ بلکہ بطلیموس کی غلاظتیں ختم ہو گئیں۔

آپ آگے چل کر ایسے لوگ جو یونانی فلسفے سے متاثر ہو چکے تھے۔ اور اس کو عین اسلامی تعلیمات قرار دے رہے تھے۔ ان کے فاسد خیالات کی تردید کرتے ہیں۔ اور یہ بتاتے ہیں

کہ سائنس دانوں کی جدید تحقیق سے اسلامی نظریات اور حضور ﷺ کے واقعہ معراج اور عقیدہ رفع عیسیٰ الی السّمآء کی تصدیق وتوثیق ہوتی ہے نہ کہ تردید۔ وہ کہتے ہیں۔

> اب ہمارا عقیدہ ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ معراج پر تشریف لے گئے تھے۔ اس کے منکرین چودہ سو سال سے موجود تھے لیکن آج سائنس کے اس کارنامے سے ہم جیت گئے۔ ہم نے کہا تھا کہ عیسیٰؑ آسمانوں پر زندہ ہیں لیکن آج تک ایک طبقہ انکار کر رہا تھا وہ بھی آج شرمندہ ہے آج ہم جیت گئے۔ اسلام جیت گیا۔ ہمیں خوشی ہونی چاہئے تھی نہ کہ اُلٹا ہم کہیں کہ اسلام پر ضرب لگ گئی۔ یہاں شکست اسلام کی نہیں۔ اس یونانی حکمت کی ہے جس یونانی حکمت کو ایک طبقہ اسلام سمجھ بیٹھا تھا۔ حالانکہ اس کا اسلام سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔(۱۲۱)

بینک کی طرف سے زکوٰۃ کی جبری وصولی کا مسئلہ اور مولانا مفتی محمود کا موقف

صدر ضیاء الحق نے اپنے دورِ حکومت میں ۲۰ر جون ۱۹۸۰ء کو ایک آرڈیننس بعنوان "زکوٰۃ و عشر آرڈیننس مجریہ ۱۹۸۰ء" جاری کیا۔ جس کے زکوٰۃ کی وصولی سے متعلق حصہ پر فوراً عمل درآمد کا حکم نامہ بھی ساتھ جاری ہوا جبکہ عشر کی وصولی سے متعلق حصہ پر ۱۵ر مارچ ۱۹۸۳ء سے عملدرآمد کا فیصلہ ہوا۔ اس آرڈیننس کے ذریعہ بینکوں کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ اپنے اکاؤنٹ ہولڈرز سے یکم رمضان المبارک کو اس سال کے "نصاب زکوٰۃ" کی مناسبت سے کٹوتی کریں گے۔

مولانا مفتی محمود نے ۲۶ر جون ۱۹۸۰ء کو ایک استفتاء کے جواب میں تحریری فتویٰ جاری کیا۔ جس میں انہوں نے فقہی کتب کے حوالہ جات سے یہ ثابت کیا کہ اس طرح جبراً رقم کی کٹوتی کی صورت میں زکوٰۃ کی ادائیگی نہیں ہوتی۔ اور اسکے لئے انہوں نے دس وجوہات تحریر کیں

اور اس میں انہوں نے یہ فتویٰ جاری کیا کہ اکاؤنٹ ہولڈرز اپنے طور پر زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام کریں گے۔ بینک کے ذریعہ کٹوتی کی صورت میں زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔ انہوں نے لکھا ہے۔

> حکومت کے آرڈیننس کے تحت حکومت نے بینک سے لوگوں کی رقمیں کاٹ لی ہیں۔ اس میں شرعی اصول کے مطابق چند غلطیوں کی نشاندہی ضروری ہے۔ تاکہ اگر ممکن ہو تو حکومت اپنے احکام میں ترمیم کر کے انہیں شرعی اصول کے مطابق بنادے اور عامۃ المسلمین بھی صحیح صورت حال کو سمجھ سکیں۔(۱۲۲)

اور پھر یہی بات آپ نے ہفت روزہ "چٹان" لاہور کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے کہی۔

> مجھے جو اختلاف ہے وہ زکوٰۃ کی وصولی کے طریقہ کار سے ہے۔ اگر زکوٰۃ اسلام کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق وصول کی جائے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں چند اعتراضات ہیں ان کا ازالہ ضروری ہے۔ اس طرح اعتراضات بھی ختم ہو جائیں گے۔ اور ہم اس اقدام کی حمایت بھی کریں گے۔ پھر آپ نے دس اعتراضات گنوائے۔(۱۲۳)

زکوٰۃ کی بینک کی طرف سے جبری کٹوتی کا یہ مسئلہ نہایت معرکۃ الآراء مسئلہ رہا ہے۔ خاص کر اُس وقت یہ اور زیادہ اہمیت اختیار کر گیا جب کراچی کے بعض علماء و مفتیین نے اس مسئلہ پر مولانا مفتی محمودؒ کے مؤقف کے برعکس مؤقف اختیار کیا۔ مفتی صاحب نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا۔ اور اکتوبر ۱۹۸۰ء میں حج کے لئے جاتے ہوئے چند روز کراچی میں قیام کیا۔ اور ایک دن اس مسئلہ پر گفت و شنید اور متفقہ مؤقف اختیار کرنے کے لئے ان علماء کرام کو جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی میں بُلا کر بحث کا آغاز کیا۔ آپ نے ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

یہ مسئلہ سیاسی نہیں بلکہ خالصتاً دینی ہے اس لئے اس مسئلہ پر بھی آپ حضرات کو بلایا ہے کہ علماء دیوبند کی طرف سے ایک متفقہ بات ہو آپ نے کچھ اور فرمایا اور میں نے کچھ اور کہا۔ اس لئے یا تو آپ مجھے قائل کریں یا میرے دلائل کے بعد میرے مؤقف کی تائید کریں۔ (۱۲۴)

اس پر کراچی کے علماء کرام سے گفت وشنید کے پس منظر کے بارے میں مولانا محمد تقی عثمانی نے جو کچھ لکھا ہے اس سے اس کی خوب وضاحت ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

پچھلے دنوں جب زکوٰۃ وعشر آرڈیننس نافذ ہوا تو اس پر غور کرنے کے لئے ہماری "مجلس تحقیق مسائل حاضرہ" کے کئی اجلاس ہوئے اور آخر میں ایک تحریر مرتب ہوئی جو ماہنامہ "البلاغ" کراچی کے رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نے بھی اس موضوع پر ایک فتویٰ تحریر فرمایا تھا۔ ان دونوں تحریروں کے درمیان بعض مسائل میں اختلاف تھا۔ ہماری خواہش تھی کہ کسی وقت اس مسئلہ پر زبانی گفتگو ہو جائے۔........................

.اب ذی قعدہ کے آخر میں مفتی صاحب سفر حج پر جانے کے لئے کراچی تشریف لائے تو شروع میں ہمیں تشریف آوری کا علم نہ ہوا۔ ایک رات حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے صاحبزادے جناب محمد بنوری کا فون آیا۔ انہوں نے مفتی صاحب کی تشریف آوری کی اطلاع دی اور ساتھ ہی حضرت مفتی صاحب کا پیغام پہنچایا کہ انہوں نے ہم دونوں کو (احقر اور حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی) کو زکوٰۃ کے مسئلہ پر گفتگو کے لئے بُلایا ہے۔ (۱۲۵)

مولانا محمد تقی عثمانی صاحب ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ "مجلس تحقیق مسائل حاضرہ" کے مؤقف پر مشتمل تحریر ملک بھر کے اہل فتویٰ علماء کی خدمت میں بھیجا گیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

الحمدللہ! ان میں سے پندرہ حضرات نے اس تحریر پر اصل مسئلے میں کسی ترمیم کے بغیر مجلس کی آراء سے اتفاق کرتے ہوئے تصدیقی دستخط ثبت فرمائے اور چار حضرات نے

بعض نکات سے اختلاف فرمایا یا اپنے تردد کا اظہار کیا ہے اس سلسلے میں ان حضرات کے دلائل یا شبہات پر مجلس نے دوبارہ غور کیا لیکن غور و تحقیق کے بعد اس مسئلہ میں مجلس کی رائے تبدیل نہیں ہوتی۔ (۱۲۶)

مولانا محمد تقی صاحب عثمانی کے اس بیان کے مطابق "مجلس تحقیق مسائل حاضرہ" کے علماء نے اپنے مؤقف پر دوبارہ غور کیا۔ اور پھر اسی پر اکتفاء نہیں بلکہ "مجلس تحقیق مسائل حاضرہ" نے تیسری بار بھی بعض علماء کرام کے خدشات کے پیش نظر اپنے مؤقف پر غور کیا۔ جس کے بارے میں مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ لکھتے ہیں۔

نظر ثالث: بعض علماء نے تحریر مذکورہ پر مفصل بحث ارسال فرمائی اس پر ۲۴ر محرم ۱۴۰۵ھ میں مجلس نے غور کر کے اپنے پہلے فیصلے کی پھر توثیق کی البتہ مجلس نے اپنی تحریر مذکور میں بعض مسامحات کو تسلیم کر لیا۔ اور انکی اصلاح کی ضرورت کا فیصلہ کیا۔ نتیجہ کے لحاظ سے ان اصلاحات کا مجلس کے سابق فیصلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ (۱۲۷)

حکومت کے اس فیصلے کے جو دُوررس اثرات تھے کہ وہ منفی ہوں گے۔ وہ مفتی صاحب کی بصیرت و فراست اور آپ کی دور اندیشی کی واضح مثال ہے۔ کیونکہ حکومت نے نہ تو زکوٰۃ کی وصولی کے نظام کو شرعی اصولوں کے مطابق بنایا اور نہ ہی عشر کی وصولی کو منظم کیا۔ حکومت نے اس سے ایک وقت فائدہ حاصل کرنا تھا۔ جو اس نے پروپیگنڈے کے زور پر حاصل کر لیا۔ ایک طرف زکوٰۃ وعشر کا نظام ہو اور دوسری طرف ٹیکس کا ظالمانہ نظام بھی چلے۔ اس طرح نہ تو وہ اسلامی اصولوں کو اپنا کر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مستحق بنا سکی اور نہ ہی عوام کی ہمدردیاں حاصل کر سکی اور یہ نظام بھی دیگر ان اقدامات کی طرح جو بد دلی سے اٹھائے گئے تھے اور جن پر لیبل اسلام کا لگایا گیا تھا، ناکامی سے دوچار ہوئے۔ یہ بات تو عام آدمی بھی محسوس کرتا تھا۔ کہ زکوٰۃ کی بینک کے ذریعہ وصولی صرف Saving Account سے کی جاتی تھی۔ گویا یہ سود کی شرح کو حکومت اور اکاؤنٹ ہولڈرز کے درمیان تقسیم کر دیا گیا۔ اور نام اس کو زکوٰۃ کا دیا گیا۔ اسی صدر

ضیاء الحق کے دور میں ایک اور کام یہ کر دیا گیا۔ جس کا تذکرہ ڈاکٹر محمود الحسن عارف نے کیا ہے۔ کہ مرحوم صدر ضیاء الحق کے گیارہ سالہ دور اقتدار میں اسلامائزیشن کے عمل کے دوران میں صرف یہ ہوا کہ بینکوں کے بچت کے کھاتوں (Saving Account) کا نام بدل کر، نفع و نقصان کا کھاتہ (Profit/ Loss Saving Account) رکھ دیا گیا گویا انہوں نے مردہ کو کفن پہنا کر، یہ سمجھ لیا کہ انہوں نے مسئلہ حل کر دیا ہے۔(۱۲۸)

جبکہ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے ماہنامہ "البلاغ" کراچی میں کئی مضامین میں یہ لکھا ہے کہ نام کی تبدیلی سے کسی چیز کی حقیقت بدل نہیں جاتی۔ بلکہ یہ اکاؤنٹ بھی بعینہ Saving Account ہی ہے۔ کیونکہ اس میں شریعت کے اصولوں کے مطابق نفع و نقصان کی بنیاد پر شراکت کے لئے ضروری شرائط کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔

بحیثیت قاری و مقری

علم قراءت و تجوید دو علیحدہ علیحدہ علوم ہیں۔ علم قراءت کے علماء اس علم کی تعریف یوں کرتے ہیں۔

علم قراءت اس علم کا نام ہے جس میں وہ الفاظ و مسائل بیان کئے جائیں جو نزول کے اعتبار سے نبی کریم ﷺ سے کئی کئی طرح آئے ہیں۔ بالفاظ دیگر علم قراءت وہ علم ہے جس میں اختلاف قراۃ متواترہ مشہورہ کے اعتبار سے صور نظم قرآنی پر بحث کی جائے۔

"اور اس علم کا موضوع قرآن پاک کے الفاظ ہیں کیونکہ اس علم میں انہی کے تلفظ کے حالات سے بحث کی جاتی ہے"۔(۱۲۹)

اور علم تجوید کا اصطلاحی معنی یہ ہے کہ وہ علم جس میں صحت تلفظ (یعنی ادائیگی) مخارج و صفات حروف اور ترتیل نظم (یعنی ادائیگی مد، قصر، وقف اور وصل وغیرہ) کی حیثیت

سے تلاوت قرآن کی عمدگی، حروف کو صحت اور خوبصورتی سے پڑھنے کے قواعد بیان کئے جائیں۔ اور اس علم کا موضوع "کیفیت تلفظ و تلاوت نظم و نسق" ہے۔(۱۳۰)

اور اس علم کا حکم فرض الکفایہ علماً و فرض العین عملاً ہے۔(۱۳۱)

یہ دونوں علوم اپنے مقاصد کے اعتبار سے بہت ضروری ہیں۔ اس لئے علماء کرام ان علوم کے حصول اور انکے قواعد و قوانین کے مطابق قرآن حکیم کی تلاوت کو مقاصد اصلیہ قرار دیتے ہیں۔ مولانا مفتی محمودؒ نے یہ علوم اپنے وقت کے مشہور اُستاد قراءت و تجوید مولانا قاری محمد عبداللہ صاحبؒ سے پڑھے۔ مولانا حامد میاں صاحب لکھتے ہیں۔ "جامعہ قاسمیہ (مراد آباد) میں حضرت مولانا قاری محمد عبداللہ صاحبؒ مدرس قراءت و تجوید تھے۔ ان سے حضرت مفتی صاحب نے قراءت سبعۃ و عشرۃ پڑھیں"۔(۱۳۲)

مقالہ نگار نے مفتی صاحب سے بذات خود ان کے حالات زندگی معلوم کئے تھے۔ اور آپ کی حیات مبارکہ میں وہ مضمون ترتیب دیا تھا۔ اس میں ہے۔ "قراءت سبعۃ و عشرۃ کی کتابیں اور مشق مراد آباد میں حضرت قاری محمد عبداللہ صاحب سے تکمیل فرما چکے تھے"۔(۱۳۳)

حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے بھی آپ کی قراءت میں مہارت کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "آپ سبعۃ قراءت کے ماہر قاری ہیں اور قرآن پاک سے خاص مناسبت رکھتے ہیں"۔(۱۳۴)

علم قراءت و تجوید کے ماہر ہونے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حسن صوت سے بھی نوازا تھا۔ آپ قرآن پاک کی تلاوت کرتے تو عجیب سماں بندھ جاتا۔ اس بارے میں سیّد عبدالستار ہمدانی لکھتے ہیں۔ "قرآن پڑھتے ہیں تو مصری قراء کی طرف تو نہیں مصری اساتذہ کی طرف خیال پلٹ جاتا ہے کہ جامعہ اَزہر کے اساتذہ اس طرح قرآن مجید پڑھتے ہوں گے"۔(۱۳۵)

اس سلسلے میں مولانا عبیداللہ انور صاحب لکھتے ہیں۔

جلسوں کے حوالہ سے شاہ صاحب (مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ) کے بعد جس شخص کی تلاوت کی سب سے زیادہ شہرت ہوئی وہ مفتی محمود تھے۔ یہ روایت حفص ہی کے نہیں بلکہ سبعۃ عشرۃ کے بھی مستند قاری تھے۔ حجازی لہجہ میں تلاوت کرتے تھے۔ تو مجمع ساکت وجامد ہو جاتا تھا۔ میرے اور ان کے تعلقات میں اضافہ کا سبب ان کی تلاوت تھی۔(١٣٦)

مقالہ نگار نے آپ کی حالات زندگی سے متعلق جو مضمون لکھا تھا۔ اس میں واضح کیا گیا ہے کہ "قراءت کے ابتدائی طالب علموں کے لئے انہوں نے ایک "رسالہ" بھی تحریر فرمایا تھا۔ جو ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا ہے۔ غالباً ان کے بڑے صاحبزادے کے پاس محفوظ ہے"۔(١٣٧)

مولانا مفتی محمود کا تصنیف کردہ یہ رسالہ جو کہ "التسهيل لاحكام الترتيل" کے نام سے ١٤٠٠ھ میں مولانا قاری فیاض الرحمٰن علوی صاحب نے شائع کیا ہے اصل کتاب عربی میں ہے۔ قاری فیاض الرحمٰن علوی صاحب نے اس کا اُردو ترجمہ کیا ہے۔ اور بعض مشکل مقامات کی تشریح کی ہے۔ مقالہ نگار نے مفتی محمود کی تصانیف کے تذکرہ میں ان کی اس کتاب کا تفصیل کے ساتھ مطالعاتی تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ کتاب مفتی صاحب نے دوران اعتکاف صرف چھ دنوں میں رمضان المبارک ١٣٦٣ھ میں لکھی ہے۔(١٣٨)

اس کتاب کے بارے میں قاری فیاض الرحمٰن علوی لکھتے ہیں۔ "یہ کتاب ایک نعمت غیر مترقبہ ہے اور انکی عربی زبان کی خوبیوں اور باریکیوں کو دیکھتے ہوئے یہ خیال ہوا کہ اس سے ہر خاص وعام کو مستفید ہونا چاہیئے"۔(١٣٩)

آپ کی تصنیف کردہ اس کتاب کے بارے میں مولانا ڈاکٹر محمد صدیق الازہری شیخ الحدیث جامعہ مرکزی دار القراء پشاور لکھتے ہیں۔

مع كل ذالك له ناحية خفية و مزية لم تظهر الى الان فهى دفية تحت كمالاته العديدة الا و هى فن القراءة و التجويد فقد الف فيه كتابًا جامعًا فريدًا جمع فيه قواعد ذالك الفن بعبارة مختصرة واضحة لا معة تشير الى يده الطولى و مهارته التامة فى ذالك الفن كانه امام القراء و مجتهد فى التجويد و القراءة (١٤٠)

"علم قراءت وتجوید کے اعتبار سے آپ بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے۔ اسی وجہ سے ایک دفعہ سعودی عرب کی حکومت کی طرف سے آپ "بین الاقوامی قراءت کانفرنس" میں ایک جج کی حیثیت سے مدعو کئے گئے تھے"۔(١٤١)

اس اہم واقعہ کی تفصیل مکّہ مکرمہ میں مقیم اور ناظم مدرسہ صولتیہ مکّہ معظمہ مولانا محمد مسعود شمیم صاحب نے بیان کی ہے وہ ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

یادوں اور حسرتوں کے سرمایہ میں جو متاع باقی رہ گئی ہے وہ ماہ جمادی الاوّل ١٣٩٩ھ (بمطابق اپریل ١٩٧٩ء) میں مفتی صاحب کی مکہ معظمہ آمد ہے۔ جو ایسی بابرکت اور شاندار تقریب کے سلسلے میں ہوئی جو مفتی صاحب کے شایانِ شان تھی۔ سعودی وزارت اوقاف نے تلاوت قرآن کریم اور حسن قراءت وتجوید کی جو تقریب منعقد کی اس میں تقریباً تمام ممالک سے حفّاظ وقراء کو مدعو کیا اور فیصلہ کی سربراہ کمیٹی میں بطور حکم حضرت مفتی صاحب کو پاکستان سے بُلایا۔ دینی اور علمی اعتبار سے میں سمجھتا ہوں کہ مفتی صاحب کے لئے یہ ایک اعزاز تھا جو ان کے شایان شان تھا۔(١٤٢)

تفسیری خدمات

اللہ تعالیٰ نے مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ کو دیگر علوم کے علاوہ تفسیر قرآن حکیم کا خاص ذوق اور خصوصی ملکہ عطا فرمایا تھا۔ آپ کی فقہی استدلالات میں جابجا قرآنی آیات اور ان کی تفسیر کے حوالے ملتے ہیں۔ عام بیان میں بھی آپ قرآن حکیم کی آیات اور اسکے مفہوم کو نہایت

دلنشین انداز میں بیان فرماتے تھے۔ آپ کی تفسیر و حدیث سے خصوصی شغف کی بناء پر مولانا محمد ایوب جان بنوری لکھتے ہیں۔ "بحیثیت مفسّر اور شیخ الحدیث ان کی ٹکر کے بہت کم لوگ دیکھنے میں آئے ہیں"۔

وہ آگے لکھتے ہیں۔

"مفتی محمود علمی حوالہ سے بہت بڑے آدمی تھے۔ ان کو خدا نے مجتہدانہ بصیرت عطا فرمائی تھی۔ وہ بیک وقت محدّث، مفسّر اور قومی رہنما تھے"۔(۱۴۳)

آپ نے ۱۹۷۶ء میں حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کی جامع مسجد واقع شیرانوالہ گیٹ لاہور میں اپنی دیگر مصروفیات کے ساتھ ساتھ جانشین حضرت لاہوریؒ مولانا عبید اللہ انور صاحب کی اصرار پر وہاں طلباء کو تفسیر پڑھائی۔ ڈیڑھ ماہ میں آپ نے روزانہ چھ چھ گھنٹے کے درس میں اس کو مکمل کیا۔ مولانا عبید اللہ انور صاحب لکھتے ہیں۔

ایک دفعہ لاہور کی جمعیۃ نے فیصلہ کیا کہ مفتی صاحبؒ سے لاہور میں مستقل یا کچھ عرصہ کے قیام کی درخواست کی جائے۔ ہم نے کہا تو انہوں نے رمضان کا قیام قبول فرمالیا۔ اس دوران انہوں نے شیرانوالہ میں دورۂ تفسیر کا آغاز کیا۔ انہوں نے ایسی جانفشانی، لگن، ذمہ داری اور غایت درجہ محنت کے ساتھ سینکڑوں علماء کو ڈیڑھ ماہ تک تفسیر پڑھائی کہ ہم سب حیران رہ گئے۔ آپ مسلسل چھ چھ گھنٹے درس دیتے۔(۱۴۴)

آپ کی تفسیر کے درس کی خصوصیات بارے میں پروفیسر امجد علی شاکر لکھتے ہیں۔

"آپ کے ہاں تفسیر میں قاضی بیضاوی کا انداز پایا جاتا ہے"۔(۱۴۵)

وہ مزید آپ کے دورۂ تفسیر کے خصوصیات قلمبند کرتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

"قرآن کی فصاحت و بلاغت، مفردات کی تشریح، علم کلام و مناظرہ، مفسرین کے اقوال اور ان میں راجح قول کا تعین، فقہ، ربط آیات، تاریخ و سیاست"۔

یہ وہ عام موضوعات تھیں جن پر آپ کے درس قرآن میں موقع و محل کی مناسبت سے بحث و مباحثہ ہوتا۔

آپ کا طریقہ تدریس تفسیر قرآن، منفرد حیثیت کا حامل ہوتا تھا۔ پروفیسر امجد علی شاکر صاحب اس ضمن میں لکھتے ہیں۔ "آپ کا عمومی طریقہ یہ تھا کہ آپ تلاوت قرآن پاک کے بعد بے تکلف انداز میں قرآن مجید کا ترجمہ بیان فرماتے پھر خلاصہ رکوع اور پھر اہم نکات بیان فرماتے"۔(۱۴۶)

اس سلسلے میں اسی دورۂ تفسیر قرآن میں شریک آپ کے شاگرد رشید مولانا محمد یوسف صاحب حال مفتی و مدرس جامعہ اشرفیہ لاہور رقمطراز ہیں۔

اس دورے کی خصوصیت یہ تھی کہ پہلی بار تفسیر قرآن کتابی انداز میں پڑھائی گئی۔ یہ تمام مفسرین سے مختلف انداز تھا۔ جو مفتی صاحب نے اختیار کیا۔

آگے وہ بتاتا ہے کہ کتابی اور تفسیری طریق تعلیم میں فرق کیا ہے وہ لکھتا ہے۔

تفسیری طرز تعلیم میں آیت کے ربط، شان نزول اور لغوی و معانی مباحث کو بیان کیا جاتا ہے جبکہ کتابی طرز تعلیم میں آیت کا مقصد اسکے تحت آنے والے مسائل زندگی اور مستنبط ہونے والے فقہی مسائل کو سمجھایا جاتا ہے۔ اور یہی چیز علم کے لئے ضروری ہے۔.................. یہ بات ہمیں پہلی بار مفتی صاحب سے دورۂ تفسیر پڑھ کر سمجھ آئی۔(۱۴۷)

مفتی صاحب کے درس تفسیر کو اکثر زیر درس طلباء تحریر میں لاتے تھے۔ جن میں دو طلباء مولانا محمد یوسف صاحب مدرس جامعہ اشرفیہ لاہور اور مولانا حفظ الرحمان صاحب مدنی مہتمم مدرسہ معراج العلوم بنوں کے "امالی" کو سامنے رکھ کر اس سے "تفسیر محمود" کو مرتب کیا گیا ہے۔ جس میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ ترجمہ حضرت لاہوریؒ کا ہے اور تفسیری افادات، "افادات محمود" کے عنوان سے مولانا مفتی محمود کی ہیں۔ اس درس کے لئے مفتی محمود

صاحب کس قدر تیاری کرتے۔ اور ان کے ہاں اس کا کیا اہتمام ہوتا تھا۔ اس کے بارے میں مولانا عبید اللہ انور لکھتے ہیں۔

> اس مقصد کی خاطر وہ لاہور تشریف لائے تو مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ لاہور کی عمارت میں قیام فرمایا مدرسہ کی عظیم الشان لائبریری کھلوائی۔ اور قرآن کریم کی جتنی قدیم تفاسیر اس میں تھیں وہ نکلوائیں۔ اس کے علاوہ جامعہ مدنیہ کے کتب خانے سے بعض تفاسیر منگوائیں۔ کچھ دوستوں اور عزیزوں سے ذاتی کتابیں حاصل کیں......
>
> ....ان میں عربی، اور اُردو کے علاوہ ایسے لوگوں کی تفاسیر بھی تھیں جو عام طور پر دینی اور علمی حلقوں میں پسندیدہ نہیں سمجھی جاتیں۔ (۱۴۸)

عام طور پر دینی اور علمی حلقوں میں پسند نہ کی جانے والی تفسیروں میں مولانا مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن بھی ہے۔ جو آپ کے زیر مطالعہ رہی اور اُمت مسلمہ کے اجماعی مؤقف سے ہٹ کر جن بنیادی مسائل میں مولانا مودودی نے اپنا موقف اپنایا ہے۔ مفتی محمود صاحب نے خصوصاً ان کی مدلّل تردید کی ہے۔

ایک دفعہ ملک عبد الحفیظ سے اس بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے مفتی صاحب نے فرمایا۔ ''اس رمضان شریف میں مسجد شیرانوالہ لاہور میں جو میرا دورۂ تفسیر ہوا اس کی تقاریر کئی حضرات نے لکھ بھی رکھی ہیں میں نے تفہیم القرآن میں ایک ایک غلطی کی مدلّل تردید کی ہے''۔ (۱۴۹)

مفتی صاحب نے تفہیم القرآن میں بیان کردہ جن بنیادی مسائل کی نشاندہی کی ہے اور پھر مدلّل انداز میں اس کی تردید کی ہے ان میں چند ایک یہ ہیں۔

☆ انبیاء علیہم السلام سے متعلق مودودی صاحب کا قول۔ تفسیر محمود ج اوّل ص ۱۳۲

☆ حالت اضطرار میں متعہ کا جائز قرار دینا۔ تفسیر محمود ج اوّل ص ۳۱۰

☆ ایلاء کے لئے قسم کھانے کی شرط نہیں ہے۔ تفسیر محمود ج اوّل ص ۳۴۰

☆ اس کے اس قول کا ابطال کہ دجّال کے بارے اندیشہ غلط ہے۔ تفسیر محمود ج اوّل ص ۴۷۹

☆ حد سرقہ کے متعلق پرویز اور مودودی صاحب کی رائے۔ تفسیر محمود ج اوّل ص ۵۵۹

☆ مسئلہ عصمت انبیاء اور مودودی صاحب۔ تفسیر محمود ج اوّل ص ۲۹، ۴۵

☆ عورت کے سربراہ مملکت کے بارے میں مودودی کے قول کی تردید۔ تفسیر محمود۔ ج اوّل ص ۳۱۷

اس کے ساتھ ساتھ مفتی صاحب نے جدید مسائل کو بھی اپنے درس کا موضوع بنایا ہے اور ان پر کھل کر فقہی اور کلامی انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ جس کی وجہ سے آپ کی تفسیر کو ایک منفرد اور خصوصی اہمیت حاصل ہوگئی۔ (آپ کی تصانیف و تالیفات کے عنوان کے تحت راقم الحروف نے اس کا تعارف اور مطالعاتی جائزہ علیحدہ پیش کیا ہے)۔

آپ کی تفسیر ''تفسیر محمود'' کے بارے میں مولانا سعید احمد جلال پوری کی رائے بہت ہی جچی تلی اور حقیقت کے بہت قریب ہے وہ لکھتے ہیں۔ ''تفسیر محمود کیا ہے؟ حضرت مفتی محمود قدس سرہ کی عظیم علمی اور عبقری شخصیت کی زندگی بھر کی تفسیری تحقیقات کا نچوڑ ہے''۔ (۱۵۰)

بحیثیت ادیب و خطیب آپ کی صفات و خدمات

مولانا مفتی محمود کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار اعلیٰ صفات و کمالات سے نوازا تھا۔ بے شمار علمی خوبیوں کے ساتھ آپ ایک بے مثال خطیب و مقرر بھی تھے۔ آپ کا انداز بیاں نہایت دلوں پر اثر کرنے والا، دلائل سے لبریز، جس نے آپ کی مقبولیت میں بے حد اضافہ کیا تھا۔ مخالف سے مخالف بھی آپ کے دلنشین انداز گفتگو سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا۔ آپ عربی، فارسی، اُردو زبانوں پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ جبکہ پشتو آپ کی مادری زبان تھی۔ اور ایک لحاظ سے اسی زبان

دانی نے آپ کو نہ صرف پاکستان، ہندوستان و بنگلہ دیش میں مقبول رہنما بنا دیا تھا۔ بلکہ عرب ممالک کے رہنے والے علماء و فضلاء بھی آپ کی عربی سے بے حد متاثر ہوتے تھے۔ اور یہی بات مولانا محمد ایوب جان صاحب بنوریؒ نے لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> مفتی صاحب کو قدرت نے اس دولت سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔ وہ عربی، اُردو فارسی اور پشتو میں اظہار خیال پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ گفتگو میں سنجیدگی، متانت، مٹھاس اور قوت استدلال کا عنصر غالب تھا۔ وہ باتوں ہی باتوں میں بڑے بڑے مسائل حل کر دیتے تھے۔ مختلف زبانوں پر قادر ہونے سے بھی ان کی شہرت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ پشتو نے انہیں سرحد و بلوچستان میں متعارف کرایا، تو اُردو نے پاکستان میں نمایاں کیا۔ اور عربی نے سرزمین حجاز میں ان کی مقبولیت بڑھائی۔ ان کی علمی برتری صرف سرحد اور بلوچستان تک ہی محدود نہ رہی پورے ملک بلکہ پوری دنیا میں اس کی دھوم مچی۔ عرب ممالک میں ان کی علمی ثقاہت کو بلند پایہ علماء بھی تسلیم کرتے تھے۔ علماء ازہر اور علماء مصر تمنا رکھتے تھے کہ مفتی محمود تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی کام کریں۔ لیکن ان کے پاس وقت کی کمی تھی۔ (۱۵۱)

آپ کے طرز خطابت کے بارے میں عالم اسلام کے مشہور خطیب مولانا سیّد عبدالمجید ندیم صاحب لکھتے ہیں۔

> حضرت مفتی صاحب کی خطابت چند طے شدہ جملوں یا خوبصورت الفاظ کی محتاج نہ تھی۔ اور نہ ہی وہ خطابت کرتے وقت مروجہ استعاروں یا محاوروں کی تلاش کرتے۔ وہ صحیح معنوں میں " ضمیر کا خطیب " تھے۔ ان کی تقریر سنجیدہ، مدلل اور دوٹوک ہوا کرتی تھی۔ عام جلسے ہوں، جماعتی اجلاس ہو یا اسمبلی ہال انہوں نے جہاں بھی گفتگو کی۔ یہی خصوصیات کار فرما ہیں۔ (۱۵۲)

مفتی صاحب کی خطابت میں تبحّر علمی کے ساتھ شائستگی ہوتی تھی۔ کسی پر تنقید کرتے یا تنقید کا جواب دیتے وقت آپ کبھی بھی شرافت کا دامن نہ چھوڑتے۔ اس بارے میں مولانا سیّد عبدالمجید ندیم صاحب لکھتے ہیں۔

> وہ سطحیت اور جذباتیت سے ہمیشہ گریزاں رہے۔ انہوں نے اپنے حریف کو کبھی گرے ہوئے الفاظ سے یاد نہیں کیا وہ مرض کے دُشمن مگر مریض کے ہمدرد تھے۔ وہ اپنے مخاطب کی عزّت نفس کو مجروح نہیں ہونے دیتے تھے۔ مفتی صاحب کا بیشتر حصہ حزب اختلاف میں گزرا ہے۔ ہر دور میں حکومت کے غلط فیصلوں پر انہوں نے تنقید کی۔ مگر ان کی تنقید میں شائستگی، متانت اور دلائل کا رنگ غالب رہا۔ انداز و بیان کبھی بھی پایہ ثقاہت و شرافت سے نہیں گرا۔ ان کے حاسدین نے مختلف محاذوں پر انہیں بدگوئی کا نشانہ بنایا۔ مگر مفتی صاحب نے ہمیشہ ان کے زہریلے الزامات کا شریفانہ مگر مسکت جواب دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سیاسی مخالفین کے دل میں بھی ہمیشہ مفتی صاحب کا احترام رہا۔ (۱۵۳)

مفتی صاحب کی تقریریں، عوام میں بہت مقبول ہوئیں۔ اس کی وجہ یہی تھی۔ کہ ان کی تقاریر میں سچائی اور اخلاص ہوتا تھا اور تصنّع و بناوٹ سے پاک ہوتی تھیں۔ مولانا سیّد عبدالمجید ندیم صاحب لکھتے ہیں۔

> حضرت مفتی صاحب کی تقریریں سیاسی بازیگروں کے پُر فریب بیانات کے مقابلہ میں اسی وجہ سے عوام میں مقبول ہوئیں کہ مفتی صاحب کی تقریر سچائی، اخلاص، درد اور نصب العین کے تشخص کی آئینہ دار ہوا کرتی تھی۔ انہوں نے تحریکوں کے ریلے میں روزانہ مختلف اجتماعات سے گھنٹوں خطاب کیا۔ مگر وہ جب بھی بولے دل کی گہرائیوں سے بولے۔ ان کے ہاں تصنع و بناوٹ نام کو نہ تھی۔ (۱۵۴)

آپ کے ماہر لسانیات ہونے کے بارے میں مولانا سخی داد صاحب ایک تفصیلی مضمون میں لکھتے ہیں۔

لسانیات میں مفتی صاحب کو ایسی مہارت حاصل تھی کہ پانچ زبانوں میں آپ بغیر تکلف کے مافی الضمیر کا اظہار کر سکتے تھے۔ خصوصاً عربی و اُردو میں جب بیان کرتے تو کسی کے وہم میں بھی نہ گزرتا کہ یہ ان کی مادری زبان نہیں۔(۱۵۵)

مولانا لطافت الرحمان صاحب عربی ادب کے بہت بڑے ماہر اور عربی زبان کے مشہور شاعر ہیں۔ آپ کے عربی قصائد اکثر جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ وہ مولانا مفتی محمود صاحب کی عربی زبان وادب میں مہارت کے متعلق لکھتے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب مرحوم جہاں محدّث عظیم تھے۔ تو ساتھ ہی زبردست عربی ادیب بھی تھے............ حضرت مرحوم، عام علوم وفنون کے علاوہ عربی ادب کے بھی ماہر تھے۔ اور عربی زبان کے استعمال اور عربی گفتگو پر ان کو امتیازی قابو اور عبور حاصل تھا۔ اور مصر و حجاز کے علماء تک ان کی عربی دانی اور عربی تحریر و تقریر کی روانی اور صحت و فصاحت کا اعتراف کرتے رہے۔ حالانکہ بعض علماء عرب، علماء عجم کے فضل و کمال کا اعتراف نہیں کرتے ہیں۔(۱۵۶)

اس ضمن میں مولانا عبدالخالق، مفتی صاحب کے بارے میں لکھی گئی اپنی کتاب "عوام کے بے تاج بادشاہ" میں لکھتے ہیں۔

کثرت معلومات، استحضار اور وسیع النظر ہونے کے اعتبار سے ایک عظیم علمی خزانے کی مثال رکھتے تھے۔ جامع المعقول والمنقول تھے اپنے علم و فضل کے باعث عرب ممالک میں قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ آپ مدرس و مفتی کے ساتھ عظیم خطیب بھی تھے۔ اور نہایت فصیح و بلیغ تقریر فرماتے تھے۔ آپ اُردو، پشتو کے علاوہ فارسی و عربی میں بھی نہایت جامع کلام فرماتے آپ نے عربی میں کئی قصائد بھی لکھے ہیں۔ جن میں سے چند شائع ہو چکے ہیں اور کچھ غیر مطبوعہ ہیں۔(۱۵۷)

عرب کے علماء آپ کی عربی تقاریر سنتے تو اس بات کا برملا اعتراف کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو علم میں سے وافر حصہ عطا فرمایا ہے۔ مولانا شیر علی شاہ صاحب حال شیخ الحدیث

دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، جو کہ کافی عرصہ مدینہ منورہ میں بغرض تحصیل علم مقیم رہے ہیں۔ وہ اپنے قیام مدینہ منورہ کے دور کا واقعہ لکھتے ہیں۔

حضرت (مفتی محمود) نے جب جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں تقریباً ایک گھنٹہ فصیح عربی زبان میں جامع مانع تقریر فرمائی تو مشائخ جامعہ کئی دن تک مفتی صاحب کی علمی گہرائیوں اور نکتہ سنجیوں، عربی زبان پر مکمل دسترس کو سراہتے رہے، بلکہ بڑے بڑے علماء نے تو کہا تھا "الشيخ مفتي محمود عبقري عملاق ذو بسطة في العلم و الجسم" (158)

مولانا محمد اجمل خان صاحب لکھتے ہیں "عربی اس فصاحت و روانی کے ساتھ بولتے تھے کہ اہل زبان ہونے کا گمان گزرتا تھا"۔(۱۵۹)

حرمین شریفین میں مقیم اور مفتی صاحب کے میزبان جناب ملک عبدالحفیظ صاحب آپ کی عربی زبان بولنے پر قدرت کاملہ اور عرب مشائخ کی طرف سے آپ کی عربی پر عبور سے متأثر ہونے کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

ان کی عربی زبان بولنے پر قدرت کاملہ نے بھی اس سیاہ کار ہی کو نہیں بلکہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں جب وہاں کے مشائخ کبار اور طلبہ نے پہلی بار ان کی تقریر سنی تو صرف متاثر ہی نہیں بلکہ معتقد بنا دیا۔ اور میرے خیال میں سعودی عرب و امارات وغیرہ کے بالعموم مشائخ اور اعیان نے جو بے نظیر اکرام و اجلال کا معاملہ حضرت مفتی صاحب کے آخری سفروں میں کیا۔ اُسی میں عربی میں مافی الضمیر ادا کرنے کو بہت دخل تھا۔ مفتی صاحب ایسی شاندار عربی بولتے تھے کہ میرے خیال میں پورے پاک و ہند میں سوائے حضرت مولانا علی میاں کے اس میں اور کوئی ان کے ہم پلّہ نہیں ہو گا۔(۱۶۰)

اس سلسلے میں مولانا محمد اسحاق خان رکن اسلامی نظریاتی کونسل آزاد کشمیر لکھتے ہیں۔

راقم نے دیکھا کہ دو سال قبل جب مفتی صاحب مرحوم اپنے عرب ممالک کے دورہ کے دوران متحدہ عرب امارات پہنچے تو وہاں اسلامی بینک کی افتتاحی تقریب میں عرب و عجم

مختلف اسلامی ملکوں سے آئے ہوئے علماء و مشائخ حضرت مفتی صاحب مرحوم سے خاص عزت و عظمت اور عقیدت و محبت سے ملتے۔ مختلف سوالات کرتے۔ ملک کی سیاسی اور دینی صورت حال کے بارے میں پوچھتے اور آپ فی البدیہہ عربی زبان میں ان کو تسلی بخش جوابات سے نوازتے۔ اسی طرح ہم نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب مرحوم برصغیر پاک و ہند کے سرکردہ اور صف اوّل کے رہنماؤں میں وہ پہلے اور واحد رہنما تھے۔ جو اس طرح بے تکلف طریقے سے عربی زبان میں بات چیت کر رہے تھے۔ (۱۶۱)

دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ آپ کی اُردو دانی بہت صاف، بامحاورہ تھی۔ آپ کا لہجہ خالص ہندوستانی ہوتا تھا۔ آپ جب اُردو میں بیان کرتے یا کوئی تحریر لکھتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ یہ ان کی مادری زبان ہے۔ مولانا محمد ضیاء القاسمی صاحب جو کہ مفتی صاحب کے مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں دورِ اوّل کے شاگرد، اور اپنے دور کے مشہور خطیب ہیں۔ لکھتے ہیں۔

مفتی صاحب کی زندگی کے جس پہلو پر بھی نظر ڈالی جائے۔ وہ صدا بہار ہوگا۔ آپ باغ و بہار شخصیت تھے۔ محدثوں میں محدث، مفسّروں میں مفسّر، مجاہدین میں مجاہد، رہنماؤں میں ایک دردمند رہنما، خطیبوں میں ایک منفرد خطیب، مجھے آپ کے بعض خطیبانہ جملے سن کر وجد آجاتا تو بعض اوقات سوال کرتا۔ کہ حضرت آپ تو قبائلی علاقے میں رہے اور وہیں پروان چڑھے۔ آپ اس قدر فصاحت اور سلالت سے اُردو بولتے ہیں کہ کبھی گمان بھی نہیں ہوتا کہ آپ پٹھان ہیں بلکہ اُردو کے لہجہ میں بہت تمکنت اور صفائی ہے۔ تو مسکراتے ہوئے فرماتے کہ میں نے تعلیم کے دوران کافی وقت یوپی میں گزارا جس سے میری اُردو بہت مصفّا ہوگئی۔ بعض اوقات تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اُردو میری مادری زبان ہے۔ اور صاحب زبان میرے لہجہ اور تلفّظ کی ادائیگی میں غلطی نہیں پکڑ سکتا۔ (۱۶۲)

دراصل وہی شخصیت ملک و ملت کی قیادت صحیح طریقے سے کرسکتی ہے جو علم کے ساتھ ساتھ بیان کی قدرت بھی رکھتی ہو اور وہ اظہار مافی الضمیر سے دوسروں کو متاثر کرنے کا فن جانتی ہو۔ مفتی صاحب سے متعلق عالم اسلام کے مشہور خطیب اور جادو بیان مقرر مولانا سیّد عبدالمجید ندیم لکھتے ہیں۔

ایک قائد کے لئے جہاں عظمت کردار، شخصی وجاہت، علمی تبحر، سوز دروں اور بلندی نظر ضروری ہے وہاں اظہار مافی الضمیر کے لئے خطابتی حسن بھی ناگزیر ہے خطابت الفاظ کی موزونیت اور فقروں کی ترتیب ہی کا نام ہی نہیں یہ تو سب اضافی خوبیاں ہیں خطابت دراصل دل سے نکلنے والی اسی حقیقت کا نام ہے کہ وہ جس زبان اور جس انداز میں بھی ادا ہوئے سامعین کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ مگر جب ہنگامی زندگی کے بھرپور شب و روز کا آغاز ہوا اور دارالحدیث میں بیٹھے ہوئے ایک محدث سے قدرت نے مثالی قائد کا کام لینا چاہا تو شخصیت کے ساتھ ساتھ زبان میں نکھار اور ادبی نفاست پیدا ہوتی گئی اور نہ صرف اُردو بلکہ عربی، فارسی، پشتو اور پنجابی میں بھی آپ بڑی فصاحت سے سامعین کے دل کی گہرائیوں میں بات اُتار دیتے تھے۔ (۱۶۳)

مولانا ضیاء القاسمی صاحب نے مفتی صاحب کی تحریر اور رسم الخط کے بارے میں یہ لکھا ہے۔

اسی طرح آپ کی تحریر بہت ہی صاف اور شگفتہ تھی۔ رسم الخط بہت ہی خوبصورت اور حسین تھا۔ دل چاہتا کہ آپ کی اس پیاری خوشنما تحریر کو دیکھتے چلے جائیں۔ جماعت کی اکثر قرار دادیں آپ ہی کے قلم کا کرشمہ ہوا کرتی تھیں۔ کبھی تحریر میں الفاظ کی افراط و تفریط معلوم نہیں ہوتی تھی۔.................. تقریر و تحریر میں آپ نے ایک خاص طرز ایجاد کیا تھا جو آپ ہی کا حصہ تھا۔ (۱۶۴)

آپ زبان دانی اور تقریر کے ملکہ کے علاوہ تحریر میں بھی خاص طرز کے مالک تھے۔

مولانا عبیداللہ انور صاحب رقمطراز ہیں۔ ”مفتی صاحب کی مثال مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی سے

دی جاسکتی ہے۔ وہ جمعیۃ علماء ہند کا قلم وزبان تھے آپ بھی زبان کی فصاحت کے ساتھ ساتھ قلم کا ملکہ بھی رکھتے تھے نہایت سلیس اور شُستہ تحریر آپ کا امتیاز تھی"۔(۱۶۵)

آپ نے اُردو زبان اور اس کا لہجہ، یوپی میں اور دوران تعلیم سیکھا۔ اسی طرح آپ نے تحریر کی مشق بھی مولانا محمد میاں صاحبؒ ناظم جمعیۃ علماء ہند جو متعدد شاہکار کتابوں کے مصنف اور مدرسہ شاہی مراد آباد میں آپ کے استاد رہے ہیں کی مجالس میں بیٹھ بیٹھ کر سیکھی۔

مولانا محمد میاں صاحبؒ کے صاحبزادے بانی و سابقہ مہتمم جامعہ مدینہ لاہور اور حضرت مفتی صاحب کے دور طالبعلمی کے شاگرد مولانا حامد میاں صاحب لکھتے ہیں۔ "حضرت مفتی صاحب نے بتلایا کہ جس زمانہ میں والد صاحب (مولانا محمد میاں صاحب) "شاندار ماضی" لکھ رہے تھے تو ایسا بھی ہوتا رہا ہے کہ انہوں نے اس کے مسوّدہ کو صاف کر کے لکھا ہے"۔(۱۶۶)

یہی بات صاحبزادہ محمود صاحب نے بھی لکھی ہے کہ "مدرسہ شاہی مراد آباد میں تعلیم کے دوران مفتی صاحب، مولانا محمد میاں صاحب سے بہت متاثر تھے۔ فارغ وقت میں ان کی مجلس میں بیٹھتے اور تحریری کام میں ان کی معاونت کرتے"۔(۱۶۷)

> مفتی صاحب نہ صرف عربی زبان کے بولنے اور لکھنے پر کامل دسترس رکھتے تھے۔ بلکہ آپ کے عربی قصیدے بھی آپ کی عربی زبان پر عبور اور شعری ذوق کی آئینہ دار ہیں۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کی وفات پر آپ نے دوران جیل ۱۹۵۳ء میں ایک مرثیہ لکھا جو "انین الحزین" کے عنوان سے روزنامہ "الجمعیۃ" دہلی کے مولانا مفتی کفایت اللہ نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔(۱۶۸)

اسی مضمون میں مولانا موسیٰ روحانی بازی صاحب لکھتے ہیں۔ " ان کو شعر گوئی کا بہت شوق تھا مگر اس طرف توجہ دینے کا بہت کم موقع ملا۔ انہوں نے ۵۳ء میں ایام اسارت میں میرے اشعار کے جواب میں عربی کے اشعار لکھ کر بھیجے"۔(۱۶۹)

اس طرح دوران قید آپ کا ایک اور عربی قصیدہ بھی ہے جو مولانا لطافت الرحمٰن صاحب نے اپنے مضمون "عربی زبان پر عبور اور ادیبانہ حیثیت" میں انہوں نے سارا قصیدہ نقل کیا ہے۔(۱۷۰) یہ قصیدہ "ترجمان اسلام" کے "مفتی محمود نمبر" میں بھی "نداء الاسیر" کے عنوان سے چھپا ہے۔(۱۷۱)

عربی کے علاوہ فارسی زبان میں بھی آپ کی ایک نظم ہے جو دوران قید آپ نے لکھی۔ اس میں انہوں نے اس وقت عالم اسلام اور مسلمانوں کی زبوں حالی پر نہایت افسوس ظاہر کیا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور نے "مفتی محمود نمبر" میں "مسلمانوں کی خستہ حالی پر فریاد" کے عنوان سے اس نظم کو شامل اشاعت کیا ہے۔(۱۷۲)

عربی و فارسی زبان و ادب اور شعر گوئی کے ساتھ آپ ایک اچھے اور معیاری صحافی اور قلمکار بھی تھے۔ اس ضمن میں مولانا سخی داد صاحب لکھتے ہیں۔ "غرض یہ کہ معیاری صحافت کے لئے جن اسباب کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب مفتی صاحب میں بدرجۂ اتم موجود تھے"۔

اور صرف یہ نہیں کہ آپ میں صحافت کے تمام اسباب موجود تھے۔ بلکہ آپ کی تحریر نہایت مؤثر اور عنوان پر مکمل گرفت رکھتی تھی۔ سخی داد صاحب مزید لکھتے ہیں۔ "اس لئے آپ کی تحریر دلچسپ ہوتی تھی جس سے قاری مطمئن ہو جاتا تھا۔ جو لوگ دل میں خدشات کا سمندر رکھتے تھے وہ بھی جب آپ کا بیان پڑھتے تو سارے خدشات زائل ہو کر تشفی ہوتی"۔(۱۷۳)

مولانا مفتی محمود ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور کے تقریباً ۳ سال تک مدیر رہے۔ اس کے اداریئے آپ ہی تحریر کرتے تھے۔ وہ اداریئے کس نوعیت کے ہوتے تھے۔ اس کے بارے میں مولانا سخی داد صاحب لکھتے ہیں۔

> مفتی صاحب نے ۱۳۹۳ھ سے ۱۳۹۶ھ تک ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور میں رئیس التحریر کی حیثیت سے بہت سے اداریئے تحریر فرمائے۔ جو اس وقت عالمی

مسائل کے حل پر مشتمل ہوتے اور حکومت وقت کی پالیسیوں پر بے لاگ تبصرہ کے ساتھ ساتھ آنے والی نسلوں کی دائمی مفاد اور رہنمائی کے لئے بھی مشعل راہ ہیں۔

............اداریوں کے اس فہرست سے مفتی صاحب کے جذبات، خیالات اور ان کے صحافتی مقام کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔(۱۷۴)

تالیفات وتصنیفات

جیسے کسی معلم، استاد اور مدرس کا اپنے مطالعہ اور تجربہ کی بنیاد پر تعلیم وتدریس کا عمل اور اسکی بنیاد پر اپنے طلباء کو تربیت فراہم کرنا ایک بہت بڑا کارنامہ، قومی وملی خدمت اور ایک مستقل صدقہ جاریہ ہے۔ اسی طرح کسی مصنف ومؤلف کا کسی علمی وفنی کتاب کی تصنیف وتالیف بھی ایک عظیم کارنامہ اور باعث اجر وثواب ہے۔

مولانا مفتی محمودؒ جو کہ عالم اسلام کی ایک علمی ودینی سیاسی شخصیت تھی۔ علم وتفسیر و حدیث اور فقہ وافتاء پر ان کی گہری نظر تھی۔ جو پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کے حل کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ایک مدرّس ومعلّم کی حیثیت سے ہزاروں طلباء کو تفسیر وحدیث اور فقہ کی تعلیم دی جس کو ان کے شاگردوں نے آگے بڑھایا۔

اگرچہ عوام میں آپ کی شہرت ایک سیاسی رہنما کی تھی۔ مگر علماء کا طبقہ آج بھی ان کی علمیت وفقاہت اور دینی وعلمی بصیرت کا معترف ہے۔ ان کو اگرچہ گوناگوں مصروفیات کے باعث تصنیف وتالیف کا زیادہ موقعہ نہ مل سکا۔ پھر بھی انہوں نے چار ایسی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں جن کی افادیت مسلمہ ہے۔ ان میں سے دو "زُبدة المقال فی رؤیة الهلال" اور "المتنبی القادیانی من هو؟" تو آپ کی حیات میں طبع ہو چکی تھیں۔ جبکہ دو "التسهیل لاحکام الترتیل" اور "زادالمنتهی شرح سنن الترمذی" آپ کی وفات کے بعد زیور طبع سے

آراستہ ہوئیں۔ یہ چاروں تصانیف فصیح عربی میں ہیں۔ مزید دو تصانیف "فتاویٰ مفتی محمود" اور "تفسیر محمود" حال ہی میں شائع ہوئی ہیں۔ آپ کی تالیفات وتصنیفات کا تعارف اور ان کا مطالعاتی جائزہ درج ذیل ہے۔

نام کتاب: التسهيل لاحكام الترتيل

مترجم (اُردو): مولانا قاری فیاض الرحمٰن علوی

ناشر: مکتبۃ العلویۃ مرکزی دارالقراء نمک منڈی پشاور پاکستان

ضخامت وسن اشاعت: ۵۰ صفحات، ۲۰۰۱ء طبع اوّل

تالیف ہذا مولانا مفتی محمودؒ کی سب سے پہلی تالیف ہے۔ جس کا موضوع "علم قراءت وتجوید" ہے۔ فصیح عربی زبان میں لکھی گئی اس تالیف میں اس ارفع واعلیٰ علم کے مبادی واصول سے بحث کی گئی ہے۔ مؤلف نے یہ مختصر کتاب مروّجہ علوم سے فارغ التحصیل ہونے کے فوراً بعد مرتب کی ہے۔ آپ نے ۱۳۶۱ھ میں درسِ نظامی سے فراغت پائی۔(۱۷۵) اور ۱۳۶۳ھ (بمطابق ۱۹۴۴ء) میں انہوں نے تالیف ہذا صرف چھ دنوں میں دوران اعتکاف مکمل کی۔(۱۷۶)

تالیف ہذا درج ذیل ابواب پر مشتمل ہے۔

(۱) باب المخارج

(۲) باب الصفات

(۳) باب فی احکام النون الساکنة والتنوین

(۴) باب الادغام

(۵) باب الوقف

اس مؤقر تالیف کے آخر میں مؤلف نے مشہور قرآء، ان کے راویوں کے نام، مراتب القرآء، الحان اور تحسین الصوت کا حکم، اور بعض شبہات اور ان کے جوابات ذکر کئے ہیں۔

اوائل میں یہ تالیفی کاوش مخطوطہ کی صورت میں تھی۔ جسے عبدل خیل کے قیام کے زمانے میں فاضل مؤلف نے بعض منتہی طلباء کو پڑھائی اور لکھوائی تھی۔ جن میں مولانا مفتی محمد عیسیٰ کے چچازاد بھائی مولانا قادر داد بھی تھے۔ جن کے پاس یہ مخطوطہ موجود تھا۔ اور قاری فیاض الرحمٰن علوی کو انہیں سے ملا۔(۱۷۷) یہ تالیف ۲۰۰۱ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ قاری فیاض الرحمٰن علوی نے تالیف ہذا کو عربی متن، اُردو ترجمہ اور مزید تحقیق کے ساتھ شائع کیا ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مولانا مفتی محمودؒ دیگر علوم کے ساتھ ساتھ علم قراءت و تجوید کے بھی بہترین عالم تھے۔ بنابریں علم قراءت و تجوید کے جید علماء اور اس کے مشاہیر اساتذہ نے آپ کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مفتی جمیل خان شہید لکھتے ہیں۔ "فن قراءت و تجوید میں جب ہم مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مقام کی جستجو کرتے ہیں۔ تو استاذ القرآء قاری رحیم بخش پانی پتی اور استاذ القرآء قاری محمد طاہر رحیمی، مفتی محمود صاحب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔(۱۷۸)

"آپ نے علم قراءت و تجوید اس وقت برصغیر کے مشہور قاری، قاری عبد اللہ مراد آبادی سے قیام مراد آباد کے دوران حاصل کیا تھا"۔(۱۷۹)

جس کے متعلق مولانا حامد میاں صاحب مہتمم و بانی جامعہ مدنیہ لاہور رقمطراز ہیں۔

جامعہ قاسمیہ (مراد آباد) میں حضرت مولانا قاری عبد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرس قراءت و تجوید تھے۔ ان سے حضرت مفتی محمود صاحب نے قراءت سبعۃ و عشرۃ پڑھیں۔ مولانا قاری محمد عبد اللہ صاحبؒ تھانہ بھون کے رہنے والے تھے۔ علم قراءت

میں کمال درجہ کا عبور حاصل تھا۔ حضرت اقدس مولانا تھانویؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ

مجھے عرصہ سے مسئلہ " ضاد " میں اشکال تھا جو کسی سے حل نہ ہوتا تھا حتیٰ کہ عزیزی قاری عبد اللہ نے یہ اشکال رفع کر دیا۔(۱۸۰)

۵۰ صفحات پر مشتمل اس تالیف کی افادیت کے متعلق قاری فیاض الرحمٰن علوی لکھتے ہیں۔ " یہ کتاب ایک نعمت غیر مترقبہ ہے اور اس کی عربی زبان کی خوبیوں اور باریکیوں کو دیکھتے ہوئے یہ خیال ہوا کہ اس سے ہر خاص و عام کو مستفید ہونا چاہیئے"۔(۱۸۱)

مولانا مفتی محمودؒ نے اس تالیف کے دیباچہ میں جہاں علم قراءت و تجوید کی اہمیت و ضرورت سے مختصر بحث کی ہے۔ وہاں اس افسوس کا اظہار بھی کیا ہے کہ آج کل طالب علم "حکمت یونانیہ" کی تحصیل میں تو اپنے قیمتی اوقات ضائع کرتے ہیں۔ مگر اس اہم ضروری علم سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔(۱۸۲)

اس کتاب کی تالیف سے مؤلف کے سامنے جہاں اس علم کی اہمیت و فرضیت کا اجاگر کرنا مقصود تھا۔ وہاں بعض قرآء کی بعض غلطیوں کی نشاندہی اور ان کی اصلاح کا مقصد بھی پیش نظر تھا۔ جیسا کہ ایک جگہ " غنّہ " سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

والمیم المدغمة فی کلمة نحو المزمّل و فی کلمتین نحو مَا لهم مِّن اللّه وكم مِّن فئة و هی فی النون او المیم المشددتین بالتشدید الوضعی اقوی ماتكون فی غیرهاو العجب من بعض افاضل دیارنا حیث انکر الغنة فیهما و اعترض علی فی فعلی و نازعنی فی ذُلك لیت شعری (۱۸۳)

ترجمہ: اور میم مدغمہ کی ایک کلمہ مثال المزّمل اور دو کلموں کی مثال مالهم من الله و كم من فئة۔ اور غنہ نون مشددتین میں وضعی تشدید کے ساتھ دوسری حالتوں کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہوتا ہے۔ اور تعجب ہے ہمارے وطن کے بعض فضلاء پر کہ وہ

(وضعِ تشدید) میں غنہ کا انکار کرتے ہیں۔ اور میرے غنہ کرنے پر اعتراض کرتے ہیں۔ اور جھگڑتے ہیں کاش کہ ان کو صحیح بات کا علم ہوتا۔

یہی انداز وہ اپنی اس تالیف میں دو اور جگہ پر بھی اختیار کرتے ہیں اور بعض حروف اور ان کے صفات کے بارے میں قرآء کی اصلاح فرماتے ہیں۔ مؤلف، مشہور قرآء اور ان کے راویوں کے درمیان مخارج کی تعداد کے اختلاف کو نہایت خوش اسلوبی سے حل کرتے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔ "لکن النزاع بینهم لیس بنزاع معنوی و حقیقی" (۱۸۴) کہ ان کے درمیان نزاع معنوی اور حقیقی نہیں (بلکہ تعبیر کا اختلاف ہے) وہ اس سلسلے میں خلیلؒ کے مذہب کو اختیار کرتے ہیں اور اس کی وجہ بھی وہ لکھتے ہیں۔

و انی اتبع مذهب الخلیل لانه هو المختار عند الجمهور فاعدها سبعة عشر مخرجًا (۱۸۵)

ترجمہ: میں مذہب خلیل کی پیروی کرتا ہوں کیونکہ جمہور کے نزدیک وہی مختار ہے اس نے اس کو سترہ مخرج بتائے ہیں۔

فاضل مؤلف نے تالیف ہذا میں اکثر جگہ روایت حفص عن عاصم کو ترجیح دی ہے۔ اور اسکی وجہ وہ یہ لکھتے ہیں۔

لکن اذکر هنا راویة حفص عن عاصم احد القراء السبعة لانها هی المشهور فی دیارنا (۱۸۶)

ترجمہ: مگر میں روایت حفص عن عاصم جو قرآء سبعہ میں سے ہیں، کے مطابق یہاں مسائل قراءت ذکر کرونگا۔ کیونکہ ہمارے ہاں وہی زیادہ مشہور ہے۔

اس بارے میں مزید وجہ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اقتصر فیه ایضًا علی روایة حفص عن عاصم لشدة الاعتناد بها(۱۸۷)

ترجمہ: یہاں بھی میں حفص عن عاصم کی روایت پر اکتفاء کروں گا۔ کیونکہ اسی پر زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے۔

مولانا مفتی محمودؒ کی سعی و کاوش پر مشتمل یہ تالیف علم قراءت و تجوید کے معلمین و متعلمین کے لئے نہایت مفید کتاب ہے۔ باوجود اختصار کے اس کا فائدہ بہت عظیم ہے۔ آپ نے اس کتاب میں ماہرین قراءت و تجوید کی معتبر کتابوں کے حوالوں سے بحث کی ہے۔ مؤلف نے زیادہ تر محمد المرعشی، ابن الجزری، ملا علی قاری، المکی (مصنف الرعایة)، الوافی، الانباری اور علامہ شاطبی کے حوالے دیئے ہیں۔

قاری فیاض الرحمٰن علوی نے اس کا اُردو ترجمہ کرکے اس کی طباعت و اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔ اور بعض جگہ مفید اضافے کئے ہیں۔ جس سے اس تالیف کی افادیت مزید اجاگر ہوئی ہے۔

نام کتاب: زُبدة المقال فی رؤیة الهلال

ناشر: مدرسہ عربیہ قاسم العلوم، کچہری روڈ، ملتان شہر

ضخامت و سن اشاعت: ۱۵ صفحات۔ ۱۹۵۴ء

رمضان المبارک اور عیدین کے چاند کے دیکھے جانے کے ثبوت کے ساتھ نہایت اہم دینی عبادات کی ادائیگی کا تعلق ہے۔ تمام مسلمان ان کی آمد کا شدت سے انتظار کرتے ہیں اور ان کی آمد پر ان سے متعلق فرائض کی بجاآوری کا نہایت اہتمام کرتے ہیں۔ جبکہ ان کا ثبوت لاعلمی، غفلت اور لاپرواہی کی وجہ سے ہمیشہ وجہ نزاع بن جاتا ہے، یا بنا دیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی جدید دور میں سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کی صورت میں جدید سائنسی آلات اور ابلاغیات کے جدید ذرائع ٹیلیفون، ریڈیو اور ٹی وی کی ایجاد سے شرعی مسائل کی نئی صورتیں سامنے آگئی ہیں۔ علماء و مفتیین جو کہ ہر دور میں امت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں۔ ان جدید سائنسی آلات نے ان کو

اس طرف بھی متوجہ کر دیا کہ وہ ان کا حکم دریافت کر کے عامۃ الناس کی رہنمائی کریں۔ ساتھ ہی اس وقت کے پاکستان کے حکمرانوں نے رمضان المبارک اور عیدین کے چاند کے ثبوت کے سلسلے میں شرعی تقاضوں سے لاپرواہی برتی جس سے کافی تشویش ناک صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ حکومت رؤیت ہلال کمیٹی کی تو تشکیل کر دیتی تھی۔ لیکن اس میں شرعی ماہرین اور مفتیین کے علاوہ بیوروکریسی کو فیصلہ کرنے کا اختیار ہوتا۔ جس پر علماء اور عامۃ الناس کا اعتماد نہ ہوتا۔ یوں اس مسئلہ نے پریشان کن صورت اختیار کر لی تھی۔

اُمت کی رہنمائی کے مقصد کے پیش نظر مولانا مفتی محمود کے بے چین دل و دماغ اور حساس طبیعت نے اس مسئلہ کے ٹھوس حل کے لئے اقدام کا فیصلہ کیا۔ اور اس کے لئے آپ نے اہمیت اور اولیت اس بات کو دی کہ علماء و مفتیین کی طرف سے ایک فیصلہ آنا چاہیئے جس پر تمام مکاتب فکر کے علماء و مفتیین کا اتفاق ہو، اطلاعات و ابلاغیات کے جدید آلات سے استفادہ کی ایسی صورتیں شرعی نقطۂ نظر سے پیش کی جائیں جس سے عام علماء اور عامۃ الناس کے لئے متعلقہ مسائل پر عمل کرنا آسان ہو۔ اور شریعت مطہرہ کا مقصد عظیم بھی حاصل ہو۔ رؤیت کے مسئلہ میں اختلاف مطالع بھی اہم مسئلہ ہے اس کے لئے بھی متفقہ مؤقف سامنے لایا جائے۔ چونکہ اس وقت تک مولانا مفتی محمود کے نام سے علماء زیادہ واقف نہیں تھے۔ اس لئے انہوں نے اس اہم کام کے لئے مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے مہتمم مولانا مفتی محمد شفیع کو آمادہ کیا۔ (۱۸۸) اور ان کی طرف سے بارہ سوالات مرتب کر کے پاکستان کے مشہور مدارس، مفتیین اور چند دیگر علماء جو فقہی مسائل میں خاص دسترس رکھتے تھے، کے پاس بھیجے۔ ان کی طرف سے جوابات آنے پر جب یہ دیکھا گیا کہ ان میں بعض علماء و مفتیین کی رائے میں اختلاف پایا جاتا ہے تو رفع اختلاف کے لئے اور ایک متفقہ مؤقف اختیار کرنے کے لئے مولانا مفتی محمد شفیع کی دعوت پر ۱۶/ ستمبر ۱۹۵۴ء کو مدرسہ

قاسم العلوم ملتان ہی میں پاکستان کے چوٹی کے علماء اور مفتیین حضرات کا ایک اجتماع کرایا۔ (۱۸۹) دو دن مکمل بحث جاری رہی۔ (۱۹۰) پھر اس پر اکتفاء نہیں کیا گیا۔ بلکہ ہندوستان کے علماء اور پاکستان کے وہ علماء و مفتیین جو کسی عذر کی وجہ سے ملتان کے اجتماع میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ ان کی رائے بذریعہ ڈاک حاصل کی گئی۔ (۱۹۱) اور یوں پاکستان کے تمام مکاتب فکر کے جید علماء و مفتیین کے علاوہ مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) اور ہندوستان کے علماء و مفتیین کی تصدیقات بھی حاصل کی گئیں۔ (۱۹۲)

جن علماء و مفتی حضرات کا اختلاف مطالع کے مسئلہ اور ریڈیو پر اعلان کے حدود کے بارے میں کچھ اختلاف تھا۔ ان کے اختلافی نوٹ کو بھی اس مختصر سی کتاب میں مع جوابات کے "متفقہ فیصلہ علماء متعلقہ رؤیت ہلال" کے نام سے ابتداء میں "زُبدة المقال فی رؤية الهلال" کے ساتھ شائع کیا گیا۔

"زُبدة المقال فی رؤية الهلال" ان بارہ سوالات کے جو جوابات مولانا مفتی محمود نے مرتب کئے ہیں۔ ان پر مشتمل ہے۔ جو کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ اس کی افادیت کے بارے میں مولانا نور محمد صاحب لکھتے ہیں۔ "یہ حجم کے لحاظ سے اگرچہ مختصر ہے لیکن ایسے ٹھوس اور جامع دلائل پر مشتمل ہے۔ کہ اس کو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ رؤیت ہلال کا مسئلہ اور متعلقہ امور و مباحث رؤیۃ البدر کی طرح واضح ہو جاتے ہیں"۔ (۱۹۳)

علماء و مفتیین کے طویل بحث و مباحثہ اور گفت و شنید کے بعد جو فیصلہ ہوا مولانا نور محمد کے بقول وہ حضرت مفتی صاحبؒ کے مقالہ کے عین مطابق تھا"۔ (۱۹۴)

علماء ومفتیین سے متفقہ فیصلہ لینے کا ایک مقصد جہاں رؤیۃ الہلال کے مسئلہ میں عامۃ الناس کی رہنمائی تھا۔ وہاں یہ مقصد بھی تھا کہ حکومت کو یہ باور کرایا جائے کہ علماء ومفتیین اس فیصلے پر متفق ہیں اور اس متفقہ فیصلے کی روشنی میں اب وہ ایک ایسی " مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی " تشکیل دے۔ جو علماء وماہرین پر مشتمل ہو۔ بااختیار ہو۔ اس کے فیصلے میں بیوروکریسی اور حکومت کے کارندوں کا کوئی عمل دخل نہ ہو۔ تاکہ ساری قوم کو اس تشویش ناک صورت حال سے نجات ملے۔ اور رمضان المبارک اور عیدین کے مسئلہ پر ساری قوم متفق ومتحد رہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع مہتمم قاسم العلوم ملتان نے "متفقہ فیصلہ علماء متعلقہ رؤیۃ الہلال" میں دو جگہ اس بات کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں۔ "اتفاق وتصدیق کے بعد جو بات حکومت سے متعلق ہے اس کی منظوری کی استدعا حکومت سے کی جائیگی"۔(۱۹۵) اور ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں۔ "حکومت سے اس بارہ میں گفتگو کی جارہی ہے"۔(۱۹۶)

مولانا مفتی محمودؒ اور ان کی جماعت نے بار بار حکومت کے ذمہ داروں سے اس بارے میں بات چیت کا سلسلہ چلایا۔ کہ وہ علماء ومفتیین کے متفقہ فیصلے کی روشنی میں طے شدہ شرائط اور طریقہ کار کے مطابق علماء وماہرین کی مرکزی سطح پر ایک کمیٹی تشکیل دے۔ لیکن اس گفت وشنید اور بار بار مطالبات کے باوجود اس کا خاطر خواہ نتیجہ نہ نکل سکا۔ حتی کہ جب ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں مفتی محمودؒ سمیت مختلف مکاتب فکر کی علماء کی ایک معقول تعداد قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبر منتخب ہوئی۔ اور ملک کے لئے نئے آئین کی تدوین کا مرحلہ آیا۔ تو مفتی صاحب نے تمام علماء کی حمایت وتعاون سے رؤیت ہلال کے مسئلہ پر زور دیا۔ اور وہ اس جدوجہد میں کافی حد تک کامیاب رہے۔ اور ریڈیو پر روزہ اور عیدین کے اعلان کو شرعی قیود کا پابند بنایا گیا۔ اس سلسلے میں مولانا نور محمد صاحب لکھتے ہیں۔ "حضرت مفتی محمود صاحب کی کوششوں سے حکومت نے ہلال کمیٹی کو

ازسرنو علماء کی تجاویز کے مطابق تشکیل دیا۔ جس میں مختلف مکاتب فکر کے جید علماء شامل کئے گئے۔ اور ریڈیو پر روزہ اور عیدین کے اعلان کو شرعی قیود کا پابند بنادیا گیا۔(۱۹۷)

مگر کچھ عرصہ بعد صوبہ سرحد کے بعض اضلاع میں مقامی علماء نے اپنی اپنی کمیٹیاں بناکر مسئلہ کو ایک دفعہ پھر نزاعی بنادیا ہے۔

مسئلہ رؤیت ہلال اور اس کے لئے جدید سائنسی آلات سے مدد لینے کے بارے میں متعلقہ شرعی حکم کے سلسلے میں مولانا مفتی محمودؒ کی یہ کوشش اور "زُبدۃ المقال فی رؤیۃ الہلال" کی تصنیف آپ کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اور قوم وملت پر عظیم احسان ہے۔ چونکہ اس وقت کمپیوٹر اور انٹرنیٹ وغیرہ موجود نہیں تھے۔ لہٰذا اب ضرورت ہے کہ مفتی صاحب کے اس کام کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے علماء ومفتیین اور مسلمان ماہرین سائنس وٹیکنالوجی ان جدید آلات کی دریافت کی وجہ سے درپیش شرعی مسائل میں عامۃ الناس اور علماء کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیں۔

نام کتاب: المتنبی القادیانی من هو؟

ناشر: ناظم نشرواشاعت مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان۔ ملتان

ضخامت وسن اشاعت: ۲۲ صفحات۔ سنہ ۱۹۶۶ء

فتنۂ قادیانیت کے خلاف اب تک جتنی کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں مؤلف کی اس مختصر مگر جامع تالیف کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ یہ اسکی انفرادیت ہے کہ یہ عربی زبان میں ہے۔ اور اس ضرورت کے پیش نظر اس کو مرتب کیا گیا تھا تاکہ عرب دنیا کو عموماً اور وہاں کے علماء کرام کو خصوصاً اس ناپاک فتنہ اور اُمت مسلمہ کے خلاف سازشوں سے آگاہ کیا جاسکے۔

چونکہ مولانا مفتی محمودؒ کا عرب علماء کے ہاں بڑا علمی مقام تھا۔ مصر کے مشہور عالم جامعہ الازہر کے زیر اہتمام "مجمع البحوث الاسلامية" کے سالانہ اجلاسوں میں ان کے علمی مباحث کی وجہ سے ان کی علمی رسوخ اور عالم اسلام کے فقہی، دینی اور سیاسی مسائل پر ان کی گہری نظر کے وہ سب معترف اور قدردان تھے۔ اس لئے مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان کے اس وقت کے امیر محترم مولانا محمد علی جالندھری کے حکم پر مفتی صاحب نے یہ کتاب مرتب کی۔ وہ لکھتے ہیں۔

رئيس هذه الجماعة الخطيب الشهير و المجاهد الكبير مولانا محمد علی جالندهری امرنی بتسويد هذه الاوراق (۱۹۸)

مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان نے ۱۹۶۶ء میں اس کو پہلی بار شائع کیا تھا۔ اور پھر بار بار اس کی اشاعت کا اہتمام کرتا رہا۔ آج کل ترکی میں عالمی شہرت کا حامل عظیم اشاعتی ادارہ "المكتبة الاخلاص (وقف)" کی طرف سے اس کو شائع کیا جاتا ہے۔

مؤلف نے "كلمة" کے عنوان سے سات ابواب قائم کئے ہیں۔ ان ابواب سے کتاب کی افادیت کا پتہ چلتا ہے۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

الكلمة الاولى فى بدء هذه الفتنة

الكلمة الثانيه فى الغائه الجهاد و تائيد الحكومة الانجليزية

الكلمة الثالثة فى هذأته و سلاطة لسانه

الكلمة الرابعة فى سبّه و شتمه النبى الصادق المعصوم سيّدنا عيسىٰ عليه الصلوة و السلام و اُمّه الصديقة

الكلمة الخامسة فى الانموذج من تفاسيره

الكلمة السادسة فى الانموذج من استدلالاته

الكلمة السابعة فى ان الطائفة القاديانية طائفة سياسية لها مؤمّرات خفية

مولانا مفتی محمودؒ نے مرزا غلام احمد قادیانی کی جو عبارات نقل کی ہیں۔ ان کا مکمل حوالہ درج کیا ہے۔ یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے مگر پڑھنے والے کے سامنے اس ناپاک فتنے کا پورا پس منظر، ناپاک عزائم اور مسلمانوں کے ازلی دشمن انگریز کے خود کاشتہ پودا کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کرتی ہے۔ موجودہ اسرائیل سے نہ صرف قادیانیوں کے مراسم ہیں۔ بلکہ اسلام، مسلمان اور عرب دشمنی کے لئے قادیانیت کا وہاں باقاعدہ ایک مرکز قائم ہے جہاں سے وہ آج کل جدید ذرائع ابلاغ کے ذریعے سے اپنی غلیظ مہم چلا رہے ہیں۔ اس وقت کے اعتبار سے عرب دنیا کو اس فتنہ کے ناپاک عزائم سے باخبر رکھنے کے لئے مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان نے بروقت اس ضرورت کو محسوس کیا اس سلسلے میں مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان نے اپنی مجلس شوریٰ کے رکن مولانا مفتی محمودؒ کی خدمات حاصل کیں جس کی علمیت کی شہرت عرب دنیا تک پہنچ چکی تھی۔

نام کتاب: زاد المنتهى شرح سنن الترمذى (جلد اوّل)

ناشر: مکتبۃ الجہاد اکوڑہ خٹک۔ ضلع نوشہرہ

ضخامت و سن اشاعت: ۴۸۸ صفحات۔ ۱۴۲۱ھ / ۲۰۰۱ء

امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی (۲۷۹ھ) کی کتاب "سنن الترمذی" کو صحاح ستہ میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ حسن ترتیب، اختصار اور جامعیت کے لحاظ سے حدیث کی بہترین تصنیف ہے۔ ہر ایک موقعہ پر صحابہ و تابعین اور مشہور ائمہ مجتہدین کے اقوال و آراء کی تصریح کی ہے۔ اس لحاظ سے محدثین کرام اور حدیث کے طلباء کو سنن الترمذی کے مباحث سے خاص شغف رہا ہے۔ متعدد محدثین کرام نے اس کی شروح لکھی ہیں۔ اور حدیث کے طلباء اور حدیث کے مطالعہ کا ذوق رکھنے والوں کے لئے مباحث کو مزید آسان اور مفصل بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے بہت سے شیوخ الحدیث نے بھی اس کی شرحیں لکھی ہیں۔

مولانا مفتی محمودؒ عرصہ دراز تک مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں شیخ الحدیث کے منصب جلیلہ پر فائز رہے۔ آپ علم فقہ کے بھی ماہر عالم تھے۔ عرصہ سے "مفتی" رہے جو کہ آپ کے نام کا ایک لازمی حصہ بن گیا تھا۔ فقہ، اصول فقہ اور فتاویٰ کی کتابوں پر آپ کی گہری نظر تھی۔ "علم اسماء الرجال" اور" جرح و تعدیل" میں آپ کو خاص درک و ملکہ حاصل تھا۔ اپنے وقت کے تمام جید علماء آپ کی علمیت و فقاہت اور وسعت مطالعہ نیز قوت استدلال کے قائل تھے۔

"زاد المنتہی" آپ کے درس ترمذی کی تقاریر کا وہ مجموعہ ہے۔ جو آپ کے طلباء دوران درس ضبط تحریر میں لاتے تھے۔ جن کو آپ نے ماخذ و مراجع کی طرف رجوع کر کے از سر نو مرتب کیا۔ اس کا کچھ حصہ آپ نے دوران رمضان المبارک سوات میں قیام کے دوران، کچھ حصے قید و بند کے زمانے میں اور بعض حصے دوسری فرصت کے اوقات میں تالیف فرمائے۔ یہ سنن الترمذی کی مکمل شرح ہے مگر ابھی تک اس کی پہلی جلد شائع ہو چکی ہے۔ باقی جلدوں پر کام جاری ہے۔ عنقریب وہ بھی منظر عام پر آجائینگی۔

مؤلف نے اس تالیف میں اختصار کے پہلو کو بہت زیادہ مد نظر رکھا ہے۔ ہاں بعض اختلافی مسائل کو نہایت بسط و تفصیل اور دلائل کے ساتھ سپرد قلم کیا ہے۔

مؤلف الفاظ کے انتخاب اور جملوں کی تراکیب میں بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں اور عربی ذوق رکھنے والوں کو پتہ چلتا ہے کہ مؤلف عبارت کی تراکیب اور بلیغ تعبیر میں اپنے بیان پر کتنی قدرت رکھتے ہیں اس شرح کی اشاعت کا اہتمام جناب ڈاکٹر مولانا شیر علی شاہ صاحب شیخ الحدیث دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کی نگرانی میں ان کی محنت شاقہ سے ہوا۔ اس شرح میں مذکورہ آیات قرآنی کے سورتوں اور آیات کے نمبروں کی نشاندہی، احادیث کا استخراج اور شرح کی

فہرست کی تیاری میں انہوں نے بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ اس شرح کی افادیت کے بارے میں مولانا شیر علی شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

و شرحه شرح نفيس، جليل القدر، كثير النفع محتو على المباحث الفقهية القيمة، زاخر بالنفائس الذهبية و الثروات العلمية حيث تدارك مؤلفه جميع الجوانب للمسائل الضرورية و سرد أدلّة الأئمة فى القضايا الخلافية، بعبارات متينة باللغة العربية الفصحٰى (۱۹۹)

ترجمہ: کہ یہ شرح ایک نفیس، جلیل القدر، بہت زیادہ نفع آور فقہی مباحث پر مشتمل بہت سی علمی دولت سے مالا مال ہے۔ اس کے مؤلف نے تمام مسائل ضروریہ کا احاطہ کیا ہے۔ اور اختلافی مسائل میں ائمہ مجتہدین کے دلائل کو فصیح عربی زبان میں انتہائی خوبصورت عبارات کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

اس شرح کے مقدمہ میں صفحہ ۶ سے صفحہ ۲۲ تک مولانا شیر علی شاہ صاحب نے مؤلف کے حالات زندگی کے بارے میں فصیح عربی زبان میں بحث کی ہے۔ اس کے بعد تقریباً ۴۱ صفحات پر مؤلف مذکور نے "علوم الحدیث" کو جامع انداز سے بیان کیا ہے۔ جس سے بہت ضروری مباحث سامنے لائے گئے ہیں۔ پہلی جلد "باب ماجاء فی قرآءة العشاء" تک ہے۔ یہ بات بہت افسوس کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس تالیف کی اشاعت میں بہت سی کوتاہیاں ہوئی ہیں۔ اگر دوسری اشاعت میں اسکا ازالہ کر دیا جائے تو یہ تالیف کمپوزنگ کی غلطیوں، اشاعت میں بعض کوتاہیوں کی تلافی کی صورت میں ایک نہایت قابل قدر نعمت سے کم نہ ہوگی۔ اشاعت کے ذمہ داران سے یہ بھی توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس کی مزید جلدوں کی اشاعت کا اہتمام جلد کریں گے تاکہ استفادہ کرنے والوں کو افادہ کا موقع ملے۔

نام کتاب: فتاویٰ مفتی محمود

ناشر: محمد ریاض درانی۔ جمعیۃ پبلیکیشنز وحدت روڈ لاہور

ضخامت وسن اشاعت: ۱۱ جلد، کل صفحات تقریباً ۶۴۰۰ جلد اوّل ۲۰۰۱ء جلد یازدہم ۲۰۰۸ء

اللہ تعالیٰ نے مولانا مفتی محمودؒ کو جہاں علم حدیث اور اس کے متعلقہ علوم میں پوری مہارت عطا فرمائی تھی۔ وہاں علم فقہ میں بھی ان کو ایک خاص مقام عطا فرمایا تھا۔ فقہی جزئیات میں ان کو کمال درجہ کا رسوخ اور استحضار حاصل تھا۔ تمام فقہی مسالک کے اصول ان کی نگاہ میں ہوتے تھے۔ بعض فقہی کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا۔ اور ان پر ان کو اس درجہ عبور حاصل تھا کہ ان کو ان کے تمام مباحث مع صفحہ نمبر یاد ہوتے تھے۔ ان کی عبارات تک ان کے حافظے میں ہوتی تھیں۔ اس بارے میں ان کے مطالعہ کے ذوق وشوق میں ان کی زندگی کے ابتدائی ماحول کا بھی بڑا دخل ہے۔ جس میں انہوں نے پرورش پائی تھی۔ وہ ایک خانقاہی ماحول تھا۔ جس میں اصلاح باطن پر زور دیا جاتا تھا۔ ذکر الٰہی کے حلقے لگتے اور اس کے ساتھ ساتھ فقہی مباحث اکثر اوقات زیر غور لائے جاتے۔ ان مباحث میں جید فقہاء حصہ لیتے۔ فقہی کتابوں کے تذکرے ہوتے۔ ان کے حوالے دیئے جاتے۔ مفتی صاحب کے مزاج اور ان کے فقہی رجحان پر اس ماحول کا بڑا اثر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مفتی صاحب کی مجالس میں اکثر فقہی مسائل زیر بحث رہتے۔ آپ کی زندگی کے آخری لمحات بھی فقہی بحث کرتے ہوئے گزرے۔ اور ابھی اپنی بات مکمل نہیں کر پائے تھے کہ روح پرواز کر گئی۔ زندگی کی اس آخری علمی مجلس میں بقول مولانا مفتی محمد یوسف خان، آپ نے فرمایا۔ کہ "فقہی مسائل نہ میرے ہیں اور نہ آپ کے یہ مسائل ہم نے کتاب و سنت اور فقہاء کرام کی آراء کے مطابق حل کرنے ہیں"۔ (۲۰۰)

مولانا مفتی محمودؒ کے فتاوی کو ایک انفرادیت حاصل تھی۔ اس سلسلے میں مولانا محمد یوسف خان لکھتے ہیں۔

> فتویٰ زبانی ہو یا تحریری دونوں میں احتیاط ملحوظ رکھتے تھے۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے فتاویٰ میں ایک انفرادیت بھی پائی جاتی تھی۔ اور وہ تھی فتویٰ دینے میں اعتدال کی راہ۔ چنانچہ حضرت مفتی صاحب فتویٰ دیتے ہوئے اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ مسئلہ کے اثبات یا نفی میں دلائل لکھتے ہوئے مبالغہ اور افراط و تفریط سے کام نہ لیا جائے۔ (۲۰۱)

کسی عالم، فقیہ اور مفتی کے بارے میں ہم عصر علماء کی رائے کو بڑا وزنی سمجھا جاتا ہے۔ یہی حال مولانا مفتی محمودؒ کا تھا۔ کہ سیاسی اختلاف کے باوجود ان کی علمیت، فقاہت، استحضار علمی اور قوت استدلال کے سب معترف تھے۔ مولانا مفتی ولی حسن صاحب ٹونکیؒ، مفتی صاحبؒ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں۔ "حضرت مفتی محمودؒ صاحب علماء دیوبند کی ان نسبتوں کے حامل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے موصوف کو فقہ وحدیث میں کمال کے ساتھ ساتھ سیاست ملکی میں بصارت و بصیرت دونوں سے نوازا تھا"۔ (۲۰۲)

اسی مضمون میں مفتی ولی حسن صاحب مفتی محمودؒ کی علم فقہ میں کمال کے بارے میں اپنی اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی رائے ذکر کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

> فقہ کی بارے میں راقم اس قدر جانتا ہے کہ حضرت مفتی صاحب (مولانا مفتی محمود) بہت ہی کامیاب اور دقیقہ سنج مفتی تھے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے ایک مرتبہ راقم کے سامنے حضرت مفتی صاحب کے تفقہ اور فقہ میں اصابت رائے کی تعریف کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب کو فقاہت نفس سے سرفراز فرمایا تھا۔ (۲۰۳)

"فتاویٰ مفتی محمود" ان فتاویٰ پر مشتمل ہے۔ جو انہوں نے سائلین کے جواب میں خود یا ان کے معاون مفتیین نے مرتب کئے ہیں۔ ان کے ابواب کی ترتیب فقہی ابواب کے مطابق ہے۔ ان میں عصر حاضر کے بہت سے مسائل سے فقہی انداز میں تفصیل کے ساتھ کتاب و سنت اور ائمہ مجتہدین کی آراء کی روشنی میں بحث کی ہے۔ ان مسائل میں سے چند ایک یہ ہیں۔

مزارعت کا مسئلہ، انفرادی وشخصی ملکیت پر بغیر رضامندی کے قبضہ کرنے کی ممانعت کا مسئلہ، احیاء اموات کا مسئلہ، نوٹ پر زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم، مشینی ذبیحہ، رؤیت ہلال کا مسئلہ، رجم کا

مسئلہ، بینک کے ذریعہ زکوٰۃ کی کٹوتی، عائلی قوانین پر چاروں مسالک کے ساتھ ساتھ شیعہ مسلک کے حوالہ سے ایک جامع عالمانہ تبصرہ۔ ان کے علاوہ اور بھی عصر حاضر کے مسائل کو تفصیل کے ساتھ بحث کا موضوع بنایا ہے۔ مولانا مفتی محمودؒ نے اپنی نگرانی میں کتنے فتاویٰ جاری کئے ہیں؟ اس کے بارے میں وثوق سے صحیح تعداد کا تعین تو نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ ہی "فتاویٰ مفتی محمود" کے مرتبین نے اس کا پورا اہتمام کیا ہے۔ بعض جلدوں میں فتاویٰ کا نمبر شمار دیا ہے۔ جبکہ بعض میں نہیں ہے۔ البتہ مولانا عبد البرّ محمد قاسم، سابق مہتمم جامعہ قاسم العلوم ملتان کے نائب مہتمم نے ۲۵ سال کے عرصہ (۱۳۷۰ھ سے ۱۳۹۵ھ تک) میں دس ہزار فتاویٰ کی تعداد لکھی ہے۔ جو مدرسہ کے دار الافتاء سے جاری ہوئے ہیں لیکن یہ اعداد و شمار بھی حتمی نہیں ہے۔ کیونکہ بعض مسائل و جواب نقل کرنے سے رہ جاتے تھے۔ اس لئے ایک روایت کے مطابق مدرسہ قاسم العلوم ملتان کی دار الافتاء سے جاری ہونے والے فتاویٰ کی تعداد بیس ہزار تک ہے۔ علماء، مدرسین اور مفتیین کی طرف سے "فتاویٰ مفتی محمود" کی اشاعت کا مطالبہ نہایت زور پکڑ رہا تھا۔ اور ان کا اصرار دن بدن شدید ہوتا جارہا تھا۔ دوسری طرف یہ کام نہایت محنت طلب تھا۔ اور وہ بھرپور توجہ اور انہماک کا متقاضی تھا۔ مفتی صاحب کے بڑے صاحبزادے مولانا فضل الرحمٰن نے کئی جید مفتیین سے اس فتاویٰ پر کام کرنے اور شائع کرنے کی درخواست کی۔ مگر وہ اس طویل توجہ طلب کام کے لئے آمادہ نہ ہوئے۔ آخر کار مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ نے اس اہم کام کا بیڑا اُٹھایا۔ انہوں نے ایک نہایت مخلص، ذمہ دار ساتھی محمد ریاض درانی کو اس کام کے لئے آمادہ کیا۔ انہوں نے علماء و مفتیین کی نگرانی میں اس کام کی ذمہ داری سنبھالی۔ اور نہایت محنت شاقہ کے بعد اس کی اشاعت میں کامیاب ہوئے نیز اس کو علماء و مفتیین اور عوام الناس کے استفادہ کے قابل بنادیا۔

یہ کام جتنا اہم تھا۔ اتنا ہی نازک بھی تھا اور نہایت حزم و احتیاط کا متقاضی تھا۔ لیکن اس سب کے باوجود یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ "اوّلین کوشش ہے آخرین نہیں"۔ اب بھی اس پر مزید کام کی ضرورت ہے۔ قرآن و سنت اور فقہ و افتاء کی کتب کے حوالوں کے استخراج پر صحیح کام نہیں ہوا ہے۔ عناوین قائم کرنے میں بعض جگہ کوتاہی ہوئی ہے۔ بعض سوالات و جوابات میں تکرار ہے۔ جو بے فائدہ ہے۔

شائع کرنے والے ادارہ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اگلی اشاعت میں ان کو مزید تحقیق کے ذریعے بہتر بنانے اور شائع کرنے کی کوشش کریں گے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس فتاویٰ کو مولانا مفتی محمودؒ، معاون مفتیین اور اس کے شائع کرنے والوں کے لئے ذخیرۂ آخرت اور پڑھنے والوں کے لئے علمی استفادہ کا باعث بنائے۔ آمین۔

نام کتاب: تفسیر محمود

ناشر: محمد ریاض درانی مدیر جمعیۃ پبلیکیشنز وحدت روڈ۔ لاہور

ضخامت و سن اشاعت: مکمل تین جلد۔ ۱۶۱۸ صفحات۔ ۲۰۰۶ء

مولانا مفتی محمود نے جہاں ہزاروں فتاویٰ جاری کئے ہیں۔ اور اس سلسلے میں عامۃ الناس کی رہنمائی کی ہے۔ وہاں آپ حدیث کے بھی بلند پایہ استاد رہے ہیں۔ وہ فقہی بصیرت اور محدثانہ ذوق کے حامل تھے۔ علمی لحاظ سے بھی آپ عالم اسلام میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اسی لئے ۱۹۷۶ء میں مولانا عبید اللہ انورؒ کے شدید اصرار پر آپ نے جامع مسجد شیرانوالہ دروازہ لاہور قرآن مجید کی تفسیر پڑھانے کا کارنامہ سرانجام دیا۔ اس کا دورانیہ تقریباً ڈیڑھ ماہ رہا۔

آپ کے درس تفسیر کی خصوصیات یہ تھیں کہ آپ قرآن حکیم کے مفردات کی تشریح کرتے اور اس سلسلے میں بہت سے نئے نکات سامنے لاتے۔ قرآن حکیم کی فصاحت و

بلاغت کو دلائل و براہین سے واضح کرتے۔ اور آیات قرآنی کے رموز و اسرار و حکم پر تفصیل سے گفتگو کرتے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے حکیمانہ ذہن عطا فرمایا تھا۔ مذاہب باطلہ اور جدید گمراہ کن خیالات کی تردید نہایت خوبصورتی سے کرتے۔ آپ کی نگاہ تمام تفاسیر پر ہوتی۔ تمام متداولہ تفاسیر آپ کے مطالعہ میں رہتیں۔ آپ کی نظر و مطالعہ بہت وسیع تھا۔ آپ نہایت دقت نظر سے مسائل و حکم سے بحث کرتے اور مفسرین کے اقوال میں سے راجح قول کا تعین کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فقہی بصیرت میں کمال عطا فرمایا تھا۔ قرآن حکیم میں کے احکام کی آیات کی آپ خوب وضاحت کے ساتھ تشریح کرتے اور موجودہ دور کے مسائل کو بھی تفصیل کے ساتھ بیان کرتے۔ اگرچہ ربط سور و آیات کا آپ ہر جگہ اہتمام نہ کرتے لیکن یہ بھی آپ کے درس کی خصوصیات میں ہے کہ آپ اکثر سورتوں اور ربط آیات کی طرف توجہ دیتے۔

تفسیر محمود، مؤلف کے درس تفسیر کی افادات ہیں۔ جو ان کے دو شاگردوں مولانا مفتی محمد یوسف خان مدرّس جامعہ اشرفیہ لاہور اور مولانا حفیظ الرحمٰن حال مہتمم مدرسہ معراج العلوم بنوں نے دوران درس تحریر کی ہیں۔ پھر اس پر جید علماء نے تحقیقی کام کیا ہے۔ اور اس کو علماء وطلباء نیز عامۃ الناس کے لئے مفید بنانے کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ "تفسیر محمود" کی اشاعت کرنے والوں نے اس بات کا اہتمام کیا ہے۔ کہ قرآن حکیم کا ترجمہ حضرت مولانا احمد علی لاہوری کا ہے۔ جبکہ مؤلف کی تفسیر کو افادات محمود کے عنوان کے تحت درج کیا ہے۔ یہ تفسیر تین جلدوں پر مشتمل ہے۔

اس میں جن جدید مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ان میں چند یہ ہیں۔ کیا قصاص کے لئے مقتول کا قول حجت ہے؟ رجم میں پتھروں کی جگہ گولی کے استعمال کی تردید، ربوٰ سے متعلق تفصیلی بحث، سائنس دانوں کا چاند پر جانا، آئین میں مسلمان کی تعریف، پاکستان میں اقلیتوں سے متعلق تفصیلی بحث، کلیدی عہدوں پر غیر مسلم کی تقرری سے متعلق ایک عالمگیر اور

حقائق پر مبنی ضابطہ، پاکستانی قانون میں پوتے کی وراثت اور دلائل عقلیہ و نقلیہ سے اس کا ابطال، مشینی ذبیحہ، خاندانی منصوبہ بندی، عورت کی حکمرانی، لاؤڈ سپیکر کے استعمال کی شرعی حیثیت، تعدد ازواج پر مستشرقین کا شبہ اور اس کا جواب، رویت ہلال میں اختلاف مطالع کا مسئلہ، رویت ہلال کمیٹی کی شرعی حیثیت وغیرہ۔

"تفسیر محمود" میں فقہی رنگ غالب ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ موجودہ دور کے فتنوں کے ابطال پر خاص زور دیا گیا ہے۔

اس اعتبار سے اس کا مطالعہ ہر عالم، فاضل اور عوام الناس کے لئے بہت ہی مفید ہے۔

خلاصہ بحث

مقالہ کے باب ہٰذا میں آپ کی علمی خدمات سے بحث کی گئی ہے۔ آپ کا علمی مقام کیا تھا۔ اس باب میں آپ کے ہم عصر علماء وفضلاء کی آراء وخیالات کو زیادہ جگہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ خصوصاً وہ علماء جو نہ تو آپ کے فقہی مسلک سے متفق تھے اور نہ ہی آپ سے سیاسی وابستگی رکھتے تھے۔ آپ کے بارے میں ان کے کیا خیالات تھے؟ آپ ایک کامیاب مدرّس رہے۔ آپ کا انداز تدریس کیا تھا؟ اور یہ کہ آپ نہ صرف معلّم تھے بلکہ مربیّ بھی تھے۔ طلباء کے مزاج شناس بھی تھے۔ اوران کے مزاج کو پیش نظر رکھ کر ان کی اصلاح وتربیت فرماتے تھے۔ افتاء میں آپ بلند مقام کے مالک تھے۔ آپ کے فتاویٰ کو ملک بھر میں علماء ومفتیین کا اعتماد حاصل تھا۔ آپ فتویٰ میں اعتدال کے پہلو کو مد نظر رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کو مفتیٔ اعظم پاکستان کا خطاب ملا۔ جو آپ پر سجتا بھی تھا۔ اس باب میں مفتی صاحب کے ان فتاویٰ کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے جو جدید مسائل کے ضمن میں آتے ہیں۔ خاص کر وہ فتاویٰ جو جنرل ضیاء الحق کے بینک کے ذریعہ زکوٰۃ کی وصولی کے حکم کے خلاف ہے۔ اور جو آپ کے فقہی استدلال کا عظیم شاہکار ہے۔ شیخ الحدیث کے عظیم منصب پر فائز ہوئے تو حدیث کے طلبہ کا آپ کی طرف کثرت سے رجوع نے یہ بات ثابت کر دی۔ کہ علم حدیث میں آپ کو کامل رسوخ حاصل ہے۔ علم اسماء الرجال اور حدیث کے جرح وتعدیل اور روایت حدیث کے ساتھ ساتھ درایت حدیث میں بھی آپ کو کامل ملکہ حاصل تھا۔ آپ مفسر قرآن حکیم بھی تھے۔ آپ کی تفسیر "تفسیر محمود" اس کی شاہد عدل ہے۔ آپ ایک بے مثال خطیب تھے۔ لاکھوں کے مجمع کو آپ مٹھی میں رکھتے تھے۔ آپ کی تالیفات وتصنیفات اگرچہ تعداد میں قلیل ہیں مگر فوائد کے اعتبار سے کثیر ہیں۔ آپ کے ان تمام کمالات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

باب ہٰذا میں بتایا گیا ہے کہ آپ کی علمی شان بہت بلند تھی۔ اور اسی علمی کمالات کی وجہ سے آپ کو دینی وسیاسی خدمات کو انجام دینے کا موقع ملا۔ اور ملک وقوم میں ان کو پذیرائی ملی۔ اس باب میں آپ کی علمی شان کو نمایاں کر کے آپ کی علمی خدمات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حوالہ جات

(1) حامد میاں، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۸۶۔ ج ۲۳۔ ش ۱۶، ۱۷ (۱۷ تا ۳۰ اپریل ۱۹۸۱ء)۔ مرکزی دفتر جمعیۃ علماء اسلام پاکستان، چوک رنگ محل لاہور۔

(2) روحانی بازی، موسیٰ، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۲۳۵۔ ج ۲۳۔ ش ۱۶، ۱۷۔

(3) بنوری، محمد ایوب جان، مولانا۔ روزنامہ "وفاق" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۹۔ ت ن۔

(4) عبدالقیوم خان، سردار۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۹۶۔ ج ۳۔ ش ۹۔ (فروری ۱۹۸۱ء)

(5) عثمانی، محمد تقی، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۷۷۔ ج ۲۳۔ ش ۱۶، ۱۷۔

(6) کشمیری، امیر الزمان، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۶۵۔

(7) بنوری، محمد ایوب جان، مولانا۔ روزنامہ "وفاق" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۹۔

(8) بنوری، محمد ایوب، مولانا ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۱۶

(9) محمد طیب، قاری، مولانا۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند۔ ص ۸۳۔ دارالاشاعت مولوی مسافر خانہ کراچی نمبر ۱۔ ۱۹۷۲ء

(10) محمد اجمل، قاری، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۲۴۔

(11) تاج محمود، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۵۴

(12) اشرف، عبدالرحیم، حکیم۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۳۴۔

(13) سکندر، عبدالرزاق، مولانا، ڈاکٹر۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ج ۱۔ ص ۲۹۔ الجمعیۃ پبلیکیشنز وحدت روڈ لاہور۔

(14) سکندر، عبدالرزاق۔ مولانا، ڈاکٹر۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ج ۱۔ ص ۲۹۔

(15) صفدر، سرفراز خان، مولانا۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ج ۱۔ ص ۳۱۔

(16) ظہیر، احسان الٰہی، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" (مفتی محمود نمبر) ص ۱۳۹۔

(17) عبید اللہ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۴۵۔

(18) اشرفی، عبدالرحمٰن، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۶۱، ۱۶۲۔

(19) بنوری، محمد ایوب جان، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۱۷

(20) بنوری، محمد ایوب جان، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۱۶

(21) بنوری، محمد ایوب جان، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۱۶

(22) اسفندیار، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۵۲

(23) سکندر، عبدالرزاق، ڈاکٹر، مولانا۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ج ۱۔ ص ۲۹

(24) مظاہری، گلزار احمد، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۶۰

(25) فیض احمد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۶۸

(26) محمد جمیل خان شہید، مولانا، مفتی۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ج ۱۔ ص ۱۱۴

(27) محمد جمیل خان شہید، مولانا، مفتی۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ج ۱۔ ص ۱۲۲

(28) فضل الرحمٰن، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۶۳

(29) عثمانی، محمد تقی، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۷۴۴۔

(30) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ج ۲۳۔ ش ۱ (۲ جنوری تا ۸ جنوری ۱۹۸۱ء)

(31) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ج ۲۳۔ ش ۱۔ (۲ جنوری تا ۸ جنوری ۱۹۸۱ء)

(32) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ج ۲۳۔ ش ۱ (۲ جنوری تا ۸ جنوری ۱۹۸۱ء)

(33) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ج ۲۳۔ ش ۱ (۲ جنوری تا ۸ جنوری ۱۹۸۱ء)

(34) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ج ۲۳۔ ش ۱ (۲ جنوری تا ۸ جنوری ۱۹۸۱ء)

(35) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ج ۲۳۔ ش ۱ (۲ جنوری تا ۸ جنوری ۱۹۸۱ء)

(36) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ج ۲۳۔ ش ۱ (۲ جنوری تا ۸ جنوری ۱۹۸۱ء)

(37) اشرف، عبدالرحیم، حکیم۔ روزنامہ "وفاق" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۲۵

(38) علوی، سعید الرحمٰن، مولانا۔ روزنامہ "وفاق" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۴۰

(39) ضیاء القاسمی، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۹۲

(40) آزاد، عبد القادر، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۹۰

(41) ضیاء القاسمی، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۹۲

(42) محمد یوسف، مولانا، مفتی۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۲۰۱

(43) صفدر، محمد سرفراز خان، مولانا۔ فتاویٰ مفتی محمود ج ۱۔ ص ۳۱

(44) روحانی بازی، محمد موسیٰ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۸۴

(45) محمد یوسف، مولانا، مفتی۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۲۰۱

(46) حامد میاں، سیّد، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۶۸

(47) روحانی بازی، محمد موسیٰ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۸۶

(48) حقانی، عبد القیوم، مولانا۔ سوانح قائد ملت۔ ص ۴۷۔ القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ خالق آباد نوشہرہ۔ اشاعت دوم ۲۰۰۳ء

(49) انور، عبید اللہ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۲۱

(50) محمد یوسف، مولانا، مفتی۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۲۰۱

(51) محمد یوسف، مولانا، مفتی۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۲۰۱

(52) فضل الرحمٰن، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۶۲، ۶۳

(53) اکبری، عبد الحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ج ۲۳۔ ش ۱ (۲ جنوری تا ۸ جنوری ۱۹۸۱ء)

(54) فیض احمد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۶۷

(55) اشرف، عبد الرحیم، حکیم۔ روزنامہ "وفاق" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۲۵

(56) نور الہدیٰ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۵۰

(57) فیض احمد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۶۷

(58) عثمانی، محمد تقی، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۷۷

(59) فیض احمد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۶۷

(60) فیض احمد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۶۷، ۶۸

(61) اکبری، عبد الحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص ۸۔ ج ۲۳۔ ش ۱ (۲ جنوری تا ۸ جنوری ۱۹۸۱ء)

(62) روحانی بازی، موسیٰ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۸۴

(63) احمد الرحمٰن، مفتی، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۳۲

(64) حامد میاں، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۶۸

(65) خان محمد، خواجہ، مولانا۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ج ۱۔ ص ۳۳

(66) فضل الرحمٰن، مولانا۔ فتاویٰ مفتی محمود ج ۱۔ ص ۴۱

(67) جمیل خان شہید، مولانا، مفتی۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ج ۱۔ ص ۱۱۹

(68) سعید الرحمٰن، مولانا، قاری۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۷۳

(69) فیض احمد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۶۷

(70) ٹونکی، ولی حسن، مفتی، مولانا۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ج ۶۔ ص ۳۸

(71) ٹونکی، ولی حسن، مفتی، مولانا۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ج ۶۔ ص ۳۸

(72) مظاہری، گلزار احمد، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۶۰

(73) صدر الشہید، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۲۲

(74) صدر الشہید، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۲۳

(75) صدر الشہید، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۲۳، ۱۲۴

(76) محمد اجمل، قاری، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۲۴

(77) محمد جمیل خان شہید، مولانا، مفتی۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ج ۱۔ ص ۱۱۹

(78) نور محمد، مولانا۔ تذکار محمود۔ ص ۱۰۹۔ مفتی محمود اکیڈمی کراچی۔ ۲۰۰۵ء

(79) محمد اجمل، قاری، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۲۶

(80) مفتی محمود، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ج ۱۱۔ ش ۸ (۱۶ فروری ۱۹۶۸ء)

(81) جمیل خان شہید، مفتی، مولانا۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ج ۱۔ ص ۱۲۰، ۱۲۱

(82) جمیل خان شہید، مفتی، مولانا۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ج ۱۔ ص ۱۲۰، ۱۲۱

(83) کلاچوی، عبد الکریم، مولانا، قاضی۔ ماہنامہ "تبصرہ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ج ۱۱، ش ۳ (جنوری ۱۹۷۰ء)

(84) قاسمی، مجاہد الاسلام، مولانا۔ جدید فقہی مسائل (تقدیم)۔ ص ۸۔ پروگریسیو بکس یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ لاہور۔ ۱۴۱۱ھ

(85) مفتی محمود، مولانا۔ ہفت روزہ "شہاب" لاہور۔ ج ۱۱۔ ش ۱۸ (۹ر مئی ۱۹۶۵ء)

(86) مفتی محمود، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ج ۱۹۔ ش ۳۵ (۲۷ر اگست ۱۹۷۲ء)

(87) مفتی محمود، مولانا۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ج ۳۔ ص ۴۴۵

(88) مفتی محمود، مولانا۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ج ۳۔ ص ۴۴۵

(89) مفتی محمود، مولانا۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ج ۳۔ ص ۴۱۴

(90) مفتی محمود، مولانا۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ج ۳۔ ص ۴۳۰

(91) مفتی محمود، مولانا۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ج ۳۔ ص ۴۱۶

(92) نور محمد، مولانا۔ ایضاح المقال فی رؤیۃ الہلال۔ ص ۱۵۔ جامعہ دارالعلوم وانہ، جنوبی وزیرستان۔

(93) مفتی محمود، مولانا۔ تفسیر محمود۔ ج ۳۔ ص ۱۵۷، ۱۵۸۔ الجمعیۃ پبلیکیشنز وحدت روڈ لاہور۔ ۲۰۰۶ء

(94) محمد اجمل، قاری، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۲۶

(95) مفتی محمود، مولانا۔ ماہنامہ "بینات" کراچی (صفر ۱۳۸۵ھ)۔ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی۔

(96) مفتی محمود، مولانا۔ ماہنامہ "بینات" کراچی (صفر ۱۳۸۵ھ)

(97) مفتی محمود، مولانا۔ ماہنامہ "بینات" کراچی (صفر ۱۳۸۵ھ)

(98) مفتی محمود، مولانا۔ ماہنامہ "بینات" کراچی (صفر ۱۳۸۵ھ)

(99) مفتی محمود، مولانا۔ ماہنامہ "بینات" کراچی (صفر ۱۳۸۵ھ)

(100) مفتی محمود، مولانا۔ ماہنامہ "بینات" کراچی (صفر ۱۳۸۵ھ)

(101) ٹونکی، ولی حسن، مفتی، مولانا۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ج ۶۔ ص ۳۸

(102) بنوری، محمد ایوب جان، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۹۹

(103) غلام مرتضیٰ، مفتی، مولانا۔ روزنامہ "وفاق" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔

(104) ہزاروی، غلام غوث، مولانا۔ ماہنامہ "تبصرہ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ج ۱۱ ش ۳ (جنوری ۱۹۷۰ء)

(105) رحمانی، خالد سیف اللہ، مولانا۔ جدید فقہی مسائل۔ ج ۱۔ ص ۱۳۳۔ پروگریسیو بکس یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ لاہور۔ پانچواں ایڈیشن ۱۴۱۱ھ

(106) رحمانی، خالد سیف اللہ، مولانا۔ جدید فقہی مسائل۔ ج ۱۔ ص ۱۳۴۔

(107) رحمانی، خالد سیف اللہ، مولانا۔ جدید فقہی مسائل۔ ج ۱۔ ص ۱۳۳۔

(108) لدھیانوی، رشید احمد، مولانا مفتی۔ احسن الفتاویٰ۔ ج ۷۔ ص ۴۲۶۔ ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی۔ طبع چہارم ۱۴۹۱ھ

(109) لدھیانوی، رشید احمد، مولانا مفتی۔ احسن الفتاویٰ۔ ج ۷۔ ص ۴۲۶۔

(110) لدھیانوی، رشید احمد، مولانا مفتی۔ احسن الفتاویٰ۔ ج ۷۔ ص ۴۲۷، ۴۲۸

(111) لدھیانوی، رشید احمد، مولانا مفتی۔ احسن الفتاویٰ۔ ج ۷۔ ص ۴۳۸

(112) بنوری، محمد ایوب جان، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۲۰۰

(113) مفتی محمود، مولانا۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ج ۳۔ ص ۲۲۶

(114) مفتی محمود، مولانا۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ج ۳۔ ص ۱۹۷

(115) کراروی، علی غضنفر (ع، غ) علامہ۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۴۳

(116) عبیداللہ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۴۴

(117) عبیداللہ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۵۴۱

(118) عبیداللہ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۴۵

(119) عبیداللہ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۴۵

(120) مفتی محمود، مولانا ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ج ۱۰۔ ش ۳۲ (۲۹ر دسمبر ۱۹۶۷ء)

(121) مفتی محمود، مولانا۔ تفسیر محمود۔ ج ۱۔ ص ۱۱۸، ۱۱۹

(122) مفتی محمود، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۴۳

(123) مفتی محمود، مولانا۔ ہفت روزہ "چٹان" لاہور (۷ر جولائی ۱۹۸۰ء)

(124) جمیل خان شہید، مفتی، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۳۶۶

(125) عثمانی، محمد تقی، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۷۳، ۱۷۴

(126) عثمانی، محمد تقی، مولانا۔ احسن الفتاویٰ۔ ج ۴۔ ص ۳۱۲

(127) لدھیانوی، رشید احمد، مفتی، مولانا۔ احسن الفتاویٰ۔ ج ۴۔ ص ۳۳۴

(128) عارف، محمود الحسن، ڈاکٹر۔ سہ ماہی "منہاج" لاہور۔ ج ۱۰۔ ش ۱، ۲۔ مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور (جنوری۔ اپریل ۱۹۹۲ء)

(129) گنگوہی، محمد حنیف مولانا۔ قرۃ العیون فی تذکرۃ الفنون۔ ص ۴۰۔ دارالاشاعت اُردو بازار ایم۔اے جناح روڈ کراچی۔ ۲۰۰۰ء

(130) گنگوہی، محمد حنیف مولانا۔ قرۃ العیون فی تذکرۃ الفنون۔ ص ۴۸

(131) مفتی محمود، مولانا۔ التسہیل لاحکام الترتیل۔ ص ۲۲۔ مکتبہ علویہ مرکزی دارالقرآء نمک منڈی پشاور۔ ۲۰۰۱ء

(132) حامد میاں، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۸۵

(133) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور ج ۲۳۔ ش ۱ (۲ جنوری تا ۸ جنوری ۱۹۸۱ء)

(134) ہزاروی، غلام غوث، مولانا۔ ماہنامہ "تبصرہ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۸۶۔ ج ۱۱۔ ش ۳۔

(135) ہمدانی، عبدالستار، سیّد۔ ماہنامہ "تبصرہ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۳۵۔ ج ۱۱۔ ش ۳

(136) انور، عبید اللہ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۱۸

(137) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ج ۲۳۔ ش ۱

(138) مفتی محمود، مولانا۔ التسہیل لاحکام الترتیل۔ ص ۱۷

(139) علوی، فیاض الرحمٰن، قاری۔ التسہیل لاحکام الترتیل۔ ص ۷۸

(140) الازہری، محمد صدیق، ڈاکٹر، مولانا۔ التسہیل لاحکام الترتیل۔ ص ۸

(141) مکی، محمد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۳۴۱

(142) مسعود شمیم، محمد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۰۱، ۱۰۲

(143) بنوری، محمد ایوب، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۱۷

(144) انور، عبید اللہ، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۳۷۹

(145) شاکر، امجد علی، پروفیسر۔ تفسیر محمود۔ (حرفے چند)۔ ج ۱۔ ص ۳۰

(146) شاکر، امجد علی، پروفیسر۔ تفسیر محمود۔ (حرفے چند)۔ ج ۱۔ ص ۳۵

(147) محمد یوسف، مفتی، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۲۰۲

(148) انور، عبید اللہ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۲۱

(149) مکی، عبدالحفیظ، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۵۱

(150) جلال پوری، سعید احمد، مولانا۔ تفسیر محمود ج ۱۔ ص ۳۵ (پیش لفظ)

(151) بنوری، محمد ایوب جان، سیّد، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور۔ (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۱۶

(152) ندیم، عبدالمجید، سیّد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۷۹

(153) ندیم، عبدالمجید، سیّد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۸۰

(154) ندیم، عبدالمجید، سیّد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۸۲

(155) خوستی، سخی داد، مولانا۔ تذکار محمود۔ ص ۲۵۷

(156) لطافت الرحمٰن، مولانا۔ تذکار محمود۔ ص ۲۳۵

(157) عبدالخالق، مولانا۔ عوام کا بے تاج بادشاہ۔ ص ۱۸۔ شعبہ تصنیف و تالیف جامعہ کاشف العلوم فقیر والی ضلع بہاولنگر۔ ۲۰۰۴ء

(158) شیر علی شاہ، سیّد، ڈاکٹر، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۳۱

(159) محمد اجمل، قاری، مولانا۔ روزنامہ "وفاق" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۷

(160) مکی، عبدالحفیظ، ملک۔ روزنامہ "وفاق" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۵۱، ۵۲

(161) محمد اسحاق، مولانا۔ روزنامہ "وفاق" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۵۹

(162) ضیاء القاسمی، محمد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۲۴، ۱۲۵

(163) ندیم، عبدالمجید، سیّد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۷۹

(164) ضیاء القاسمی، محمد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۲۵

(165) انور، عبید اللہ، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۳۸۰

(166) حامد میاں، سیّد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۸۶

(167) محمود، صاحبزادہ، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۴۲

(168) روحانی بازی، محمد موسیٰ، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۲۳۷

(169) روحانی بازی، محمد موسیٰ، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۲۳۷

(170) لطافت الرحمٰن، مولانا۔ تذکار محمود۔ ص ۲۳۶

(171) مفتی محمود، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۲۳

(172) مفتی محمود، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۲۱

(173) خوستی، سخی داد، مولانا۔ تذکار محمود۔ ص ۲۵۷

(174) خوستی، سخی داد، مولانا۔ تذکار محمود۔ ص ۲۶۴

(175) قریشی، محمد فاروق۔ "مفتی محمود۔ ایک قومی رہنما"۔ ص ۲۵۔ الجمعیۃ پبلیکیشنز متصل مسجد پائلٹ سکول وحدت روڈ لاہور۔ ۲۰۰۰ء

(176) مفتی محمود، مولانا۔ التسہیل لاحکام الترتیل۔ ص ۷۷

(177) علوی، فیاض الرحمٰن، قاری۔ التسہیل لاحکام الترتیل۔ ص ۷۷

(178) محمد جمیل خان شہید، مولانا، مفتی۔ فتاویٰ مفتی محمود (مقدمہ)۔ ج ۱۔ ص ۱۳۸

(179) علوی، فیاض الرحمٰن، قاری۔ التسہیل لاحکام الترتیل۔ ص ۱۳

(180) حامد میاں، سیّد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۸۵

(181) علوی، فیاض الرحمٰن، قاری۔ التسہیل لاحکام الترتیل۔ ص ۷۸

(182) مفتی محمود، مولانا۔ التسہیل لاحکام الترتیل۔ ص ۲۱، ۲۲

(183) مفتی محمود، مولانا۔ التسہیل لاحکام الترتیل۔ ص ۳۴، ۳۵

(184) مفتی محمود، مولانا۔ التسہیل لاحکام الترتیل۔ ص ۲۴

(185) مفتی محمود، مولانا۔ التسہیل لاحکام الترتیل۔ ص ۲۵

(186) مفتی محمود، مولانا۔ التسہیل لاحکام الترتیل۔ ص ۵۱

(187) مفتی محمود، مولانا۔ التسہیل لاحکام الترتیل۔ ص ۵۲

(188) نور محمد، مولانا۔ ایضاح المقال فی رؤیۃ الہلال۔ ص ۳۱۔

(189) ملتانی، محمد شفیع، مولانا، مفتی۔ فیصلۂ علماء متفقہ متعلقہ رؤیت الہلال۔ ص ۲۔ ناشر مدرسہ قاسم العلوم ملتان۔ ۱۹۵۴ء

(190) ملتانی، محمد شفیع، مولانا، مفتی۔ فیصلۂ علماء متفقہ متعلقہ رؤیت الہلال۔ ص ۲۔

(191) ملتانی، محمد شفیع، مولانا، مفتی۔ فیصلۂ علماء متفقہ متعلقہ رؤیت الہلال۔ ص ۲۔

(192) ملتانی، محمد شفیع، مولانا، مفتی۔ فیصلۂ علماء متفقہ متعلقہ رؤیت الہلال۔ ص ۲۔

(193) نور محمد، مولانا۔ ایضاح المقال فی رؤیۃ الہلال۔ ص ۱۳

(194) نور محمد، مولانا۔ ایضاح المقال فی رؤیۃ الہلال۔ ص ۱۳

(195) ملتانی، محمد شفیع، مولانا، مفتی۔ فیصلۂ علماء متفقہ متعلقہ رؤیت الہلال۔ ص ۳۔

(196) ملتانی، محمد شفیع، مولانا، مفتی۔ فیصلۂ علماء متفقہ متعلقہ رؤیت الہلال۔ ص ۳۔

(197) نور محمد، مولانا۔ ایضاح المقال فی رؤیۃ الہلال۔ ص ۱۵

(198) مفتی محمود، مولانا۔ المتنبّی القادیانی من هو؟۔ ص ۲۰، ۲۱۔ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان۔ ۱۹۶۶ء

(199) مفتی محمود، مولانا۔ زاد المنتہی شرح سنن الترمذی۔ ص ۵ (مقدمہ)۔ ج ۱۔ مکتبۃ الجہاد اکوڑہ خٹک نوشہرہ۔ ت ن

(200) محمد یوسف خان، مولانا، مفتی۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ص ۳۲ (مقدمہ)۔ ج ۵

(201) محمد یوسف خان، مولانا، مفتی۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ص ۳۸ (مقدمہ)۔ ج ۶

(202) ٹونکی، ولی حسن، مفتی، مولانا۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ج ۶۔ ص ۳۸

(۲۰۳) ٹونکی، ولی حسن، مفتی، مولانا۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ج ۶۔ ص ۳۸

باب سوم

دینی خدمات

مقام

آپ کی تمام تر جدوجہد اور ہر قسم کی محنت ومشقت صرف اللہ کی رضاجوئی، دین الٰہی کا ب، دین اسلام کی ترویج واشاعت اور ہر مسلمان کی زندگی میں دین کو ترجیح دینے کے لئے تھی۔ یاوی اعتبار سے آپ کو بڑے بڑے مواقع ملے۔ ہر حکومتی عہدہ آپ کے لئے ایک دو قدم کے صلہ پر رہا۔ مگر آپ نے فقر کی زندگی اختیار کی۔ اور فقیرانہ بودوباش رکھا اور اسی میں اپنے لئے ور اپنے اہل خانہ کے لئے سکون واطمینان پایا۔

آپ کی دینی خدمات کے بارے میں مولانا نورالہدیٰ صاحب تحریر کرتے ہیں۔

مولانا مفتی محمود زندگی بھر دین کی خدمت میں مصروف رہے کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب آپ کی فکر اور ذہن سے دینی خدمت کا جذبہ اُترا ہو۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اگر آرام کرتا ہوں تو اس زندگی کا کیا فائدہ؟ اللہ تعالیٰ نے یہ زندگی، دین کی خدمت کے لئے عطا کی ہے۔ اور اس کا حق یہی ہے کہ اس کی خدمت میں صرف کی جائے۔ بے لوثی کا یہ عالم کہ پوری زندگی (مدرسہ قاسم العلوم ملتان) کی معمولی سی تنخواہ پر گزار دی۔ حالانکہ اگر چاہتے تو بلڈنگز کھڑی کر سکتے تھے۔ مولانا مفتی محمود نے زندگی بھر دین کو اہمیت دی ان کی خواہش تھی کہ کسی طرح ملک میں اسلامی نظام آجائے۔(۱)

مفتی صاحب کی زندگی اور اس کی تمام سرگرمیوں کا مقصد یہ تھا کہ اس ملک میں دین اسلام کو عروج حاصل ہو اور اسلامیان پاکستان کی زندگیاں، اسلامی تعلیمات کے مطابق ہوں تاکہ وہ اس کی برکت سے مفید ثمرات سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اسی مقصد کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب رقمطراز ہیں۔

مفتی صاحب کو میں نے ہر حال اور ہر رنگ میں دیکھا اور بہت قریب سے دیکھا ہے میں نے انہیں ہر موقع اور ہر مقام پر اسلام کا سچا نمائندہ، مخلص جان نثار اور نڈر سپاہی پایا

ہے۔ ان کی زندگی اسلام کے لئے وقف تھی، اور وہ قُرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی اعلیٰ روایات کے حامل اور امین تھے۔(۲)

اس سلسلے میں مولانا نورالہدیٰ لکھتے ہیں۔ ''ایک دفعہ آپ نے کہا کہ میرے نزدیک پوری دُنیا کی بادشاہی سے بہتر وہ جگہ ہے چاہے وہ چند گز کا ٹکڑا کیوں نہ ہو، جہاں پر اسلامی نظام مکمل طور پر موجود ہو۔ اس چند گز جگہ کے لئے بھی قربانی دیں گے''۔(۳)

دین کی خدمت کے حوالہ سے آپ کی خدمات اظہر من الشمس ہیں۔ آپ نے بے سرو سامانی اور تہی دستی کے باوجود اس حوالہ سے جو خدمات انجام دی ہیں۔ ہم عصر علماء اور دانشوروں نے ہمیشہ آپ کو اچھے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ حتیٰ کہ آپ سے سیاسی وابستگی نہ رکھنے والے اصحاب نے بھی آپ کو اسی لحاظ سے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ حضرت مولانا احسان الٰہی ظہیر، علماء اہل حدیث میں سے ہیں۔ مفتی صاحب سے ان کی کوئی جماعتی یا مسلکی تعلق نہیں ہے لیکن وہ آپ کو کن ادیبانہ اور خطیبانہ جملوں سے خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

مستقبل میں جب کبھی حریت فکر کی بات ہوگی، کبھی اعلاء کلمۃ اللہ کا سبق دہرایا جائے گا۔ جب کبھی حق وباطل میں معرکہ آرائی ہوگی جب کبھی خیر وشر کی کشمکش ہوگی جب کبھی روشنی وتاریکی کی جنگ ہوگی۔ جب کبھی سر فروش سروں کی فصل لے کر اُٹھیں گے، جب کبھی شہیدوں کا تذکرہ ہوگا، جب کبھی اسیروں کی کہانی سنائی جائے گی، جب کبھی زخمیوں، معذوروں، اپاہجوں اور حق کے نام پر جسم کی قربانی دینے والوں کا ذکر ہوگا، مفتی محمود ضرور یاد آئیں گے۔ کیونکہ وہ ان شہیدوں، غازیوں، مجاہدوں اور سر فروشوں کے قافلہ سالار تھے۔ ان کی عظمت و دانائی اور انکے علم وحلم کا تذکرہ قیامت تک زندہ رہے گا''۔(۴)

مفتی صاحب اپنی زندگی کا مقصد '' اسلام اور اسلامی تعلیمات '' متعین کر چکے تھے۔ اسی پر خود بھی دل وجان سے عمل پیرا تھے اور اپنے جماعتی کارکنوں اور اپنے شاگردوں اور ملنے

والوں کو بھی اسی بات کی تلقین فرماتے تھے۔ وہ اس سلسلے میں ہر رکاوٹ اور ہر عداوت کو ٹھکرانے کے لئے تیار رہتے تھے۔ مولانا اسفندیار اس سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہیں۔

مولانا مفتی محمود کی پوری زندگی اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ تھی۔ ان کی سب سے بڑی خواہش اور کوشش یہی تھی کہ پورے پاکستان، بلکہ پورے عالم اسلام میں اسلام کو عملی طور پر رائج ونافذ کر دیا جائے۔ ان کے نزدیک سب سے بڑی اہمیت اسلام اور اسلامی تعلیمات کو حاصل تھی۔ اور وہ اس سلسلے میں کسی قسم کی سودے بازی برداشت نہیں کرتے تھے۔ اپنے کارکنوں کو اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کا حکم دیتے اور پھر ان سے ان پر عمل نہ کرنے کی صورت میں باز پرس بھی کرتے تھے۔ ایک بار فرمایا کہ اگر یہ مدارس اور خانقاہیں اسلامی نظام کے نفاذ کی راہ میں رکاوٹ بنیں گی تو ہم ان کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔(۵)

آپ کا سیاست میں حصہ لینا بھی اسی غرض ومنشاء کے تحت تھا۔ اور اسی کے لئے آپ نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ مولانا محمد ایوب جان صاحب ؒ لکھتے ہیں۔

در حقیقت آپ قول وفعل کے سچے، اعلاء کلمۃ اللہ کے داعی اور اسلام کے حقیقی جان نثار اور سر فروش تھے۔ اور علم وعمل میں اسلاف کا نمونہ تھے۔ آپ ستھری سیاست اور با مقصد جمہوریت کے قائل تھے۔ اور آپ کی سیاست اسلام کی تبلیغ تھی۔ آپ کی زندگی اس کے لئے وقف تھی۔ وہ فرماتے ہیں۔ اس وطن عزیز میں اسلام کی عملداری اور پاسبانی چاہیئے۔ اور کتنے دکھ کی بات ہے کہ جو ملک اسلام کے نام پر معرض وجود میں آیا۔ آج تک اس میں انگریز کے کالے قوانین کی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ کب اس حسین خطہ میں نظام مصطفےٰ کا نفاذ ہوگا؟ اور کب خلفاء راشدین کی یاد تازہ ہوگی احکام الٰہی اور سنت نبوی کا بول بالا ہوگا؟ اسی تڑپ اور کرب میں مرد مؤمن نے زندگی کے دن پورے کئے۔(۶)

اس عنوان کے تحت آخر میں مفتی صاحب کی تقریر کا ایک اقتباس دیا جاتا ہے جو انہوں نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جمعیۃ علماء اسلام کے سربراہ کی حیثیت سے ۲۹/ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو ریڈیو پاکستان پر کی۔ اور جس میں انہوں نے جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کا منشور قوم کے سامنے رکھا۔ اور یہی انکی اور ان کی جماعت کی پالیسی، حکمت عملی اور لائحہ عمل تھا۔ آپ نے فرمایا۔

محترم برادران ملت! میری ان گزارشات سے آپ نے اچھی طرح سمجھ لیا ہو گا کہ میری جماعت کل پاکستان جمعیۃ علماء اسلام کا مقصود و منزل کیا ہے؟ ہم اس ملک میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا نظام حکمرانی قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جس کی رُو سے ملک کا ہر شعبہ بے دینی کے اثرات اور حرام و ناجائز باتوں کی شمولیت سے پاک ہو جائے جس کی رُو سے ملک کے تمام مسلمان بھائیوں کی طرح زندگی بسر کرنے کے قابل بن جائیں۔ جس کی رُو سے ملک کا کسان، مزدور اور غریب بھی اسی طرح سر اُٹھا کر چل سکے جس طرح ملک کا ایک بڑے سے بڑا آدمی چل سکتا ہے۔ جس کی رُو سے ملک کی عدالتیں صرف اسلامی احکام کے مطابق فیصلہ کریں۔ جس کی رُو سے ہر گوشہ میں حق و انصاف کا بول بالا ہو۔ جس کی رُو سے کسی کو کسی پر سیاسی جبر کا موقع حاصل نہ ہو۔ جس کی رُو سے پاکستان کے مسلمان ایک متحدہ قومیت بن کر سربلند ہو سکیں۔ جمعیۃ علماء اسلام نے ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے ایک طریقہ کار اختیار کیا ہے جس کے ذریعہ نہ تو اسلام کے نام کو خود غرضانہ مفادات کے تحفظ کے لئے استعمال کیا جا سکے اور نہ ملک کے مختلف حلقوں اور گروہوں کے درمیان نام نہاد کفر و اسلام کی کشمکش سر اُٹھا سکے۔ نہ ملک اور عوام کا اتحاد پارہ پارہ ہو سکے۔ اور نہ ملک کے غریب عوام، کسان، مزدور وغیرہ اس غلط فہمی میں مبتلاء ہو سکیں۔ کہ ان کے مسائل کا حل اسلام میں موجود نہیں ہے۔ داخلی امن و امان اور ملکی استحکام کو برقرار رکھتے ہوئے صرف اسلام کی اساس پر ایسی تبدیلیاں لائی جائیں۔ جن سے ملک کے تمام سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل حل ہو جائیں۔ (۷)

تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں حصہ اور قید و بند کے مراحل

مولانا مفتی محمودؒ نے ۱۹۵۱ء میں مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں درس و افتاء کے کام کا آغاز کیا۔ اور اسی سال مرزائیوں کی حکومت وقت کی سرپرستی میں سرگرمیوں میں تیزی آئی۔ دوسری طرف حکومت وقت نے مرزائیت کے خلاف لکھی گئی بعض کتابوں کو ضبط کیا جس میں علامہ شبیر احمد عثمانی کی کتاب "الشہاب الثاقب" بھی شامل تھی۔ ڈاکٹر احمد حسین کمال نے اس وقت کے حالات کے بارے میں لکھا ہے۔

پاکستان بنتے ہی مرزائی فرقے نے اپنی تبلیغی سرگرمیاں تیز کر دی تھیں۔ اس نے بعض سیاسی دعوے بھی کر ڈالے تھے۔ بلوچستان کے بارے میں کہا گیا کہ یہ ہماری جماعت کے مستقبل کا اچھا میدان ثابت ہو سکتا ہے۔ سرکاری سروسوں میں اس فرقہ کے اثر و رسوخ کی باتیں پھیلنے لگیں۔ اور یہ شبہ ابھر کر سامنے آنے لگا کہ پاکستان میں جہاں سُنی اور شیعہ اکثریت ختم نبوّت پر یقین و عقیدہ رکھتی ہے۔ اب اس عقیدہ کے علی الرغم مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کا اظہار علانیہ کیا جایا کرے گا اور مرزائیت کی تبلیغ کھلے بندوں ہوا کرے گی۔ اس دوران مرزائیت کے خلاف لکھی گئی بعض کتابیں بھی ضبط کی گئی جن میں علامہ شبیر احمد عثمانی مرحوم پاکستان کے شیخ الاسلام کی کتاب " الشہاب الثاقب" کی ضبطی بھی شامل تھی۔ (۸)

اس دوران مرزائیوں کے مذموم عزائم بھی کھل کر سامنے آ گئے انہوں نے اپنے پریس کے ذریعہ اشتعال انگیز بیانات دینے شروع کئے۔ جانباز مرزا صاحب نے ان کے چند بیانات کا حوالہ دیا ہے۔

احمدیت کے مخالف عنقریب مرزا صاحب یا ان کے کسی جانشین کے سامنے مجرموں کی طرح پیش ہوں گے۔ (الفضل ۳/ جنوری ۱۹۵۲ء)

احمدیوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ فوجی محکموں کی طرح گورنمنٹ کے دوسرے محکموں میں بھرتی ہونے کی کوشش کریں۔ تاکہ تبلیغی پروگرام کو تقویت پہنچے۔ (الفضل ۱۱ رجنوری ۱۹۵۲ء)

نیز مرزائیوں کو ہدایت کی گئی کہ ایسے حالات پیدا کردو کہ ۱۹۵۲ء گزرنے سے پہلے پہلے دشمن احمدیت کے آغوش میں گرنے پر مجبور ہو جائیں۔ (الفضل ۷رجنوری ۱۹۵۲ء) (۹)

مرزائیوں کے ان اشتعال انگیز بیانات کی وجہ سے علماء اور عام مسلمانوں کی طرف سے سخت ردِّ عمل سامنے آیا۔ علماء نے مرزائیت کی تردید میں اپنی تبلیغی سرگرمیاں اور مزید بڑھادیں۔ بعض حضرات مرزائی عقائد کی تردید کی وجہ سے گرفتار کر دیئے گئے۔ چنانچہ علماء نے ۲۲ اسلامی نکات میں ایک اور نکتہ کا اضافہ کر دیا کہ مرزائی فرقہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور پھر اس کو تسلیم کرانے کے لئے مطالبات کا آغاز ہو گیا نیز سر ظفر اللہ خان کی وزارت سے علیحدگی کا مطالبہ بھی زور پکڑنے لگا۔ (۱۰)

انہی دنوں کوئٹہ میں ایک اجلاس میں قادیانیوں کے نام نہاد خلیفہ مرزا محمود نے اعلان کیا کہ ہم ۱۹۵۲ء میں تمام بلوچستان کو احمدی صوبہ بنادیں گے۔ (۱۱)

ان حالات میں علماء کرام نے اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے عزت و ناموس رسالت کی خاطر اُمت مسلمہ کی رہنمائی کے لئے اور اس فتنہ کے سر کچلنے کے لئے آپس میں رابطے شروع کر دیئے۔ اور اس سلسلے کا پہلا کنونشن منعقد کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ جانباز مرزا صاحب اس کنونشن کے بارے میں لکھتے ہیں۔

۹رمئی ۱۹۵۱ء کو برکت علی ہال لاہور میں ایک کنونشن بلایا گیا جس میں امیر شریعت (مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری) بھی شریک ہوئے۔ اس اجلاس کے اختتام پر مرزائیت کے خلاف سارے مغربی پاکستان میں تحریک کا آغاز ہوا۔ لیکن حکومت کے

سامنے مطالبات رکھنے کے لئے کنونشن کے مختلف اجلاس لاہور اور کراچی میں ہوئے۔

(۱۲)

ان کنونشنز کے علاوہ مذہبی اجتماعات میں علماء کرام نے عموماً اور سیّد عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ نے خصوصاً عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کے لئے قوم میں کافی بیداری پیدا کر دی۔ لیکن اس کے باوجود حالات ایسے نہ تھے کہ ان کے بگڑنے کا امکان ہو یا وہ قابو سے نکلنے والے ہوں۔ کہ کراچی کے جہانگیر پارک میں حکومت نے مرزائیوں کو اپنے سالانہ اجتماع کرنے کی اجازت دیدی۔ اور چوہدری سر ظفر اللہ خان وزیر خارجہ پاکستان نے اس اجتماع میں وزیر اعظم پاکستان کے منع کرنے کے باوجود اس میں تقریر کی۔ جس نے حالات کو اور زیادہ خراب کر دیا۔

۱۸ جولائی کو ملتان میں ایک احتجاجی جلوس نکلا جس پر پولیس نے لاٹھی چارج کیا۔ عوام نے تھانہ کے سامنے جمع ہو کر اس پر احتجاج کیا۔ تو مجمع پر تھانے سے گولی چلائی گئی۔ جس کے نتیجے میں چھ مسلمان شہید ہوئے جبکہ زخمیوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ اس خونی واردات کے خلاف سارے ملک میں یوم احتجاج منایا گیا۔ (۱۴)

اس پر جانباز مرزا صاحب نے ملتان کے غیور مسلمانوں کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

ملتان کے غیّور اور صاحب ایمان مسلمانوں نے بھی اس دورِ پُر آشوب میں جبکہ کفر و ارتداد کی سیاہ گھٹاؤں نے ایمان ویقین کو پریشان کر رکھا ہے۔ اسلام کی لاج رکھ لی۔ اور اپنے جگر گوشوں کو شمع رسالت پر پروانہ وار نثار کر کے ثابت کر دیا کہ مسلمان آج بھی فخر دو عالم ﷺ کی عزّت و ناموس کی خاطر گولیوں کی بوچھاڑ میں مسکرا سکتا ہے۔

خدا کی نعمتیں نچھاور ہوں تم ....

شہید ان ناموس رسالت پر، سلام ہو تم پر اے ختم المرسلین کی عزت و آبرو پر قربان ہونے والو، مبارک ہیں ان کے والدین کہ ان کے نذرانے سرکار رسالت مآب میں شرفِ قبولیت حاصل کر گئے۔ (۱۵)

یہ وہ حالات تھے جنہوں نے پاکستان کے علماء اور عوام کو مرزائیت کے فتنہ کو روکنے کے لئے سوچنے اور اس کے نتیجے میں راست اقدام کرنے کا سبب بنے لہٰذا انہوں نے ایمان اور ختم المرسلین سے محبت وعقیدت کے اظہار کے لئے سب کچھ قربان کرنے کی ٹھان لی۔ مرزا جانباز صاحب لکھتے ہیں۔

ایسے حالات میں مرزائیوں کی بڑھتی ہوئی ریشہ دوانیوں نے عوام کو موقع دیا کہ وہ حکومت سے مرزائیوں کو مسلمانوں سے الگ غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کریں۔ جہانگیر پار ظفر اللہ خان کی تقریر کے بعد کراچی میں ۲/ جون ۱۹۵۲ء کو آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن طلب کیا گیا جس میں دو دن مسلسل بحث کے بعد حسب ذیل قرار داد تشکیل ہوئی۔

(۱) مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔

چوہدری ظفر اللہ وزیر خارجہ کو اس کے عہدے سے الگ کر دیا جائے۔

(۳) مرزائیوں کو تمام کلیدی آسامیوں سے ہٹا دیا جائے۔

ان مطالبات کی تصدیق کے لئے ۱۳/ جولائی ۱۹۵۲ء کو لاہور برکت علی ہال میں آل مسلم پارٹیز کنونشن کا پھر اجلاس ہوا۔ جس میں حسب ذیل حضرات کی ایک مجلس عمل مرتب کی گئی۔ (...)

وہ مزید لکھتے ہیں۔

مجلس عمل نے ۲۳/ جنوری ۱۹۵۳ء کو وزیر اعظم پاکستان سے مل کر انہیں اپنے مطالبات پیش کئے اور ایک ماہ کا نوٹس دے دیا کہ اگر ۲۲/ فروری ۱۹۵۳ء تک مجلس عمل کے متذکرہ مطالبات منظور نہ کئے گئے تو مجلس اپنے مطالبات منوانے کے لئے راست اقدام کرنے پر مجبور ہوگی۔(۱۷)

اس ایک ماہ میں حالات نے کیا رُخ اختیار کیا۔ اس کے بارے میں جانباز مرزا صاحب لکھتے ہیں۔

۲۳/ جنوری ۱۹۵۳ء سے ۲۲/ فروری ۱۹۵۳ء تک واقعات نے کئی کروٹیں لیں۔ صوبائی اور مرکزی حکام نے مجلس عمل کے رہنماؤں کو دھمکایا بھی اور اکثر کارکنوں پر مقدمات بھی دائر کئے۔ اخبارات پر قدغن لگائی گئی۔ لیکن مرزائیت کے خلاف عوام کا غصہ ابلتے ہوئے لاوے کی طرح تیز تر ہوتا چلا گیا تا آنکہ ۲۲ فروری کا سورج طلوع ہوا۔(۱۸)

یہ تو حکومتی اقدامات تھے مجلس عمل نے آگے کے لئے کیا لائحہ عمل طے کیا۔ اس کے بارے میں جانباز مرزا لکھتے ہیں۔

۲۶/ فروری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں ایک اجلاس منعقد کیا جس کی صدارت مولانا ابوالحسنات نے کی۔ اور اس اجلاس میں ایک قرار داد کے ذریعہ کراچی میں وزیر اعظم پاکستان کی کوٹھی تک ایک منظم جلوس کی صورت میں جاکر مطالبات پیش کرنے کا فیصلہ ہوا۔ جس میں صرف پانچ رضاکار جھنڈا اُٹھائے ہوئے ہوں گے۔ جن پر مطالبات ثبت ہوں گے۔ ۲۶ فروری کو آرام باغ میں مجلس عمل کا اجتماع ہوا۔ جس میں راست اقدام کمیٹی کے منتخب ارکان کے علاوہ حضرت امیر شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ صاحب نے تقریر کی۔(۱۹)

رات کو مجلس عمل کے رہنما دفتر تحفظ ختم نبوت (بندر روڈ کراچی) میں آرام کرنے کے لئے چلے گئے ابھی کچھ ہی دیر میں گزری تھی کہ پولیس کی بھاری جمعیت نے تمام عمارت کو اپنے محاصرے میں لے لیا۔ اور تمام رہنماؤں کو جو اس وقت دفتر میں موجود تھے گرفتار کر لیا۔ یہ ۲۷ فروری صبح چار بجے کا واقعہ ہے۔(۲۰)

مجلس عمل کے رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد سارے ملک میں احتجاج شروع ہوا۔ جس میں عوام کے تمام ... نے کردار ادا کیا۔ جانباز مرزا صاحب لکھتے ہیں۔

...یر شریعت کی گرفتاری کے بعد مغربی پاکستان سے سینکڑوں افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ سارے ملک نے بغاوت کی شکل اختیار کرلی۔ ہر شہر میں حکام وعوام کے درمیان تصادم ہوا۔ منڈیاں بند ہو گئیں۔ شہروں میں ہڑتال کر دی گئی۔ سرکاری عمارات کو نقصان

پہنچایا گیا۔ ریل کی پٹڑیاں اکھاڑ دی گئیں۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے ۶؍مارچ ۱۹۵۳ء کو لاہور شہر فوج کے حوالہ کر دیا گیا۔(۲۱)

یہ وہ حالات تھے جو ۱۹۵۳ء کے تحریک ختم نبوت سے قبل ملک میں نمودار ہوئے۔

مفتی محمود صاحب ان حالات سے کیسے بے خبر رہ سکتے تھے۔ آپ کے حساس دل نے آپ کو اس خالصتاً مذہبی و دینی تحریک میں اگلے صف کے رہنماؤں میں شامل ہو کر اس میں فعال کردار ادا کرنے کی ترغیب دی۔ اس تحریک میں آپ کے کردار کے بارے میں قاضی عبد اللطیف صاحب لکھتے ہیں۔

> فروری ۱۹۵۳ء تحریک ختم نبوت، شعلہ جوالا بن کر ابھری اور دیکھتے ہی دیکھتے مغربی پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مجلس تحفظ ختم نبوت، مجلس احرار، جمعیۃ علماء اسلام کے معزز رہنماؤں اور کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ مختلف المیعاد سزائیں دی گئیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ بھی اس قافلہ کے سرخیلوں میں سے تھے۔(۲۲)

نیز ڈاکٹر احمد حسین کمال صاحب لکھتے ہیں۔

> اس مرحلہ پر ملتان میں مفتی محمود شیخ الحدیث اور مفتی کی حیثیت سے سامنے آئے اور تحفظ ختم نبوت کی تحریک میں اُن اکابر علماء کے ساتھ شریک سفر ہو گئے۔ جو یادگار سلف تھے مثلاً مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مو '' احمد علی لاہوریؒ، مولانا محمد علی جالندھریؒ، مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ، مولانا نصیر الدین غور غشتیؒ وغیرہ وغیرہ۔ علماء اس جدوجہد میں سرخرو ہو کر نکلے اور مولانا مفتی محمود اب اکابر علماء کی صف میں آگئے۔(۲۳)

اللہ تعالیٰ نے مولانا مفتی محمود صاحب کو ابتداء عمر سے قائدانہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ آپ کی علمی شان، قوت استدلال اور فضل و تقویٰ نے آپ کو اپنے اکابر کا محبوب بنا دیا تھا۔ مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان کے اہم رہنما اور ہفت روزہ "لولاک" فیصل آباد کے مدیر جناب مولانا تاج

ود صاحب لکھتے ہیں۔ "مسئلہ ختم نبوت کے حوالہ سے ہمارے لئے وہ جماعتی رہنما کا درجہ رکھتے تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں وہ ہمارے عظیم قائدین کے ہمراہ قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہوئے"۔(۲۴)

اور صرف یہی نہیں کہ آپ نے اس تحریک میں قائدانہ کردار ادا کیا تھا بلکہ مختلف نظریات کے حامل جماعتوں کو اس تحریک میں شمولیت کے لئے آپ ہی نے آمادہ کیا تھا۔ مولانا عبید اللہ مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور لکھتے ہیں۔ "مفتی صاحب نے ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے دوران مختلف نظریات کی حامل جماعتوں کو قریب لانے میں بہت عظیم کردار ادا کیا تھا"۔(۲۵)

مولانا محمد اکبر صاحب رقمطراز ہیں۔ "حضرت مفتی صاحب نے اس تحریک میں ختم نبوت کے شیدائیوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ اور اس تحریک کی کامیابی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اور قادیانیت پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ پھر اسے سر اُٹھانے کی جرأت نہیں ہوئی۔(۲۶)

۱۹۵۳ء کی تحریک میں آپ کے قائدانہ کردار کے بارے میں جناب اکرام القادری صاحب لکھتے ہیں۔

> پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد مفتی محمود نے سب سے پہلے جس دینی تحریک میں حصہ لیا وہ تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء ہے۔ اس مقدّس تحریک میں ہزاروں علماء و مشائخ اور لاکھوں عوام کے شانہ بشانہ ہمہ قسم کے آلام و مصائب کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے مفتی صاحب نے قائدانہ کردار ادا کیا۔ آپ نے ناموس رسالت مآب ﷺ کے تحفظ کی خاطر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ لیکن آپ کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔(۲۷)

اس تحریک میں مفتی صاحب کو ایک سال قید کی سزا ملی آپ کو ملتان کے جیل میں رکھا گیا۔ تقریباً سات ماہ آپ جیل میں رہے۔(۲۸)

ملتان جیل میں اس تحریک کے سلسلے میں جو اکابر علماء و قائدین گرفتار تھے ان کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ جیل کے اندر درس و تدریس، وعظ و نصیحت اور دیگر ذمہ داریاں انہوں نے آپس میں تقسیم کر دی تھیں۔ جبکہ امامت و خطابت کے فرائض مولانا مفتی محمود صاحب انجام دیتے رہے۔ مولانا ظفر احمد قاسم لکھتے ہیں۔ "ملتان جیل میں ہراوّل دستے میں حضرت مفتی صاحب گرفتار ہو کر جیل گئے۔ تو وہاں جیل میں بھی امامت و خطابت کے فرائض سر انجام دیتے رہے"۔ (۲۹)

مسئلہ رؤیت ہلال کے حل میں کلیدی کردار

ہر مسلمان کی یہ دلی آرزو ہے کہ ملک بھر میں رمضان اور عیدین ایک ہی دن منائے جائیں۔ لیکن کچھ تو پاکستانی حکومتیں ایسے اقدامات سے دانستہ گریز کر رہی تھیں جن سے یہ مسئلہ شائستہ انداز میں حل ہوتا۔ کچھ ناسمجھ علماء نے اس مسئلہ کو مزید پیچیدہ بنا دیا تھا جس سے عام دیندار مسلمان ہر سال ایسے مبارک موقعوں پر پریشان کن صورت حال سے دوچار ہو جاتے تھے۔ بیوروکریسی کی مداخلت اس پر مستزاد ہوتی۔ مرکزی سطح پر رؤیت ہلال کمیٹی امیر البحریہ (نیوی چیف) کی سربراہی میں بنتی اور فوج کے دیگر اداروں کے سنیئر افسران اور کچھ افسر شاہی کے سنیئر کارندے اس کے ممبر مقرر کئے جاتے۔ جس کی وجہ سے ان کے فیصلے عام مسلمانوں کے لئے اطمینان بخش نہ ہوتے۔ ملک میں کہیں روزہ ہوتا تھا۔ کہیں عید منائی جاتی تھی۔ پھر ہر جگہ مسلسل کئی ہفتوں تک یہ بحث مباحثے چل پڑتے تھے۔ علماء ایک دوسرے کے فیصلے کو غلط قرار دیتے تھے۔ حکومت بھی اس کے فیصلے سے مخالفت کرنے والوں کو قید میں ڈال دیتی تھی۔ ایسے حالات کا اثر عام مسلمانوں پر ضرور پڑتا تھا۔

جیسے کہ اس سے قبل "تالیفات و تصنیفات" میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

مولانا مفتی محمود نے رؤیت ہلال کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اور علماء دین کی طرف سے متفقہ مؤقف اختیار کرنے کے لئے آگے بڑھ کر اقدام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ جدید ذرائع ابلاغ مثلاً ریڈیو، ٹیلیفون، ٹیلی گرام اور ٹی وی کی ایجاد سے نئی صورتیں سامنے آ گئی تھیں۔ علماء کا رؤیت ہلال کے مسئلہ میں ان جدید آلات کے بارے میں کیا مؤقف ہونا چاہیئے؟ اس کے بارے میں کوئی متفقہ فیصلہ سامنے لانے کی کوشش کی جائے۔ اس مسئلہ میں اختلاف مطالع کا مسئلہ بھی نہایت اہم رہا ہے اس کے بارے میں بھی علماء کا مؤقف معلوم کیا جائے۔

"ان تمام پیچیدہ مگر حل طلب مسائل کے حل کے لئے مولانا مفتی محمود صاحب نے مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے مہتمم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کو اس کام کے لئے آمادہ کیا"۔ (۳۰) اور انکی طرف سے ایک سوالنامہ مرتب کر کے پاکستان کے مشہور مدارس، مفتیین اور ان دیگر علماء کے پاس جو فقہی مسائل میں خاص دسترس رکھتے تھے بھیجا۔ (۳۱)

مفتی محمود نے از خود اس سوالنامہ میں درج سوالوں کے جوابات لکھے اور اس کو "زبدۃ المقال فی رؤیۃ الہلال" کے نام سے کتابی صورت میں چھپوایا۔ یہ کتاب عربی میں ہے۔ (۳۲)

علماء اور مفتیین کی طرف سے جوابات آنے کے بعد جب دیکھا گیا کہ ان میں بعض علماء و مفتیین کے بعض جوابات میں اختلاف پایا جاتا ہے تو رفع اختلاف اور ایک متفقہ مؤقف اختیار کرنے کے لئے مولانا مفتی محمد شفیع کی دعوت پر ۱۵، ۱۶/ ستمبر ۱۹۵۴ء کو مدرسہ قاسم العلوم ملتان ہی میں پاکستان کے چوٹی کے علماء اور مفتیین حضرات کا اجتماع کرایا۔ (۳۳) دو دن مکمل بحث جاری رہی۔ (۳۴) پھر اس پر اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ جو علماء کسی عذر کی وجہ سے اجلاس میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ نیز ہندوستان اور مشرقی پاکستان کے علماء و مفتیین کی تصدیقات بذریعہ ڈاک حاصل کی گئیں۔ (۳۵)

اس سلسلے میں حکومت وقت سے بھی گفت وشنید کا سلسلہ جاری رہا۔ مفتی محمود صاحب کی کوششوں اور رابطوں سے یہ ممکن ہوا۔ ایک جگہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں۔

"حکومت سے اس بارہ میں گفتگو بھی جاری رہی ہے"۔ (۳۶)

مفتی محمود کی کوشش یہ تھی کہ حکومت علماء کے متفقہ فیصلہ کی روشنی میں طے شدہ شرائط اور طریقہ کار کے مطابق علماء وماہرین کی مرکزی سطح پر ایک کمیٹی تشکیل دے۔

مفتی محمود صاحب ایک فتویٰ کی تصویب کرتے ہوئے اپنی کوششوں اور رابطوں کا ذکر کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

> الجواب صحیح۔ واضح ہو کہ احقر خود مرکزی وزیر داخلہ سے اس سلسلے میں تفصیلی گفتگو کر چکا ہے۔ وہ خود معترف ہیں کہ ہم سے ذمہ داری نبھانے میں کوتاہی ہوئی ہے آئندہ کے لئے انہوں نے صحیح شرعی نظام سے شہادت لینے اور اعلان ہلال کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ مجھ سے کچھ ضروری مشورے بھی لئے گئے ہیں۔ خداوند کریم انہیں توفیق دے۔ (۳۷)

"اس فتویٰ میں مفتی صاحب نے واضح کر دیا ہے۔ کہ جب تک علماء کے متفقہ فیصلے کی روشنی میں حکومت ان میں بیان کردہ شرائط کا اعتبار نہیں کرے گی۔ تو ان کا فیصلہ اور اعلان واجب العمل نہ ہو گا"۔ (۳۸) لیکن بار بار مطالبات اور رابطوں کے باوجود حکومت نے اس مسئلے کے حل کے لئے کوئی پیش رفت نہیں کی۔

جب ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے نتیجے میں علماء کی ایک اچھی خاصی تعداد قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں پہنچی۔ اور ملک کے لئے نئے آئین کی تشکیل کا مسئلہ آیا۔ تو مفتی صاحب نے ممبران اسمبلی میں سے علماء ممبران کی حمایت وتعاون سے رؤیت ہلال کے مسئلہ کے حل پر زور دیا۔ اور اس میں کافی کامیاب رہے اور حکومت نے وہ تمام شرائط مان لیں جو علماء و مفتیین نے

ء میں اس سلسلے میں طے کر دی تھیں۔ اس سلسلے میں مولانا نور محمد صاحب لکھتے ہیں۔

رت مفتی محمود صاحب کی کوششوں سے حکومت نے ہلال کمیٹی کو از سر نو علماء کی تجاویز کے ابق تشکیل دیا۔ جس میں مختلف مکاتب فکر کے جید علماء شامل کئے گئے اور ریڈیو پر روزہ اور عید کے اعلان کو شرعی قیود کا پابند بنا دیا گیا"۔ (۳۹)

مفتی محمود کی یہ مساعی بار آور ثابت ہوئیں۔ ملک کے علماء وعوام نے اطمینان کا سانس لیا مگر کچھ عرصہ سے ملک کے تین صوبوں (پنجاب، سندھ، بلوچستان) کے مقابلہ میں جہاں مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی ہی کے فیصلے کے مطابق روزہ اور عید منائی جاتی ہے۔ صوبہ سرحد میں اس مسئلہ کو پھر نزاعی بنا دیا گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت اور علماء مل کر اس مسئلہ کا "علماء کے متفقہ فیصلہ" کی روشنی میں اس کا کوئی حل ڈھونڈیں۔ اور اس "متفقہ فیصلہ" کی روشنی میں ان پر واضح کر دیں کہ حکومت کی طرف سے مرکزی کمیٹی کے مقابلہ میں کسی پرائیویٹ کمیٹی کو یہ اختیار نہیں کہ وہ از خود فیصلہ کر کے عوام کو راہ راست سے ہٹانے کی کوشش کریں۔

بہر حال یہ مفتی محمود کا ایک عظیم کارنامہ ہے کہ انہوں نے حالات کے مطابق اس اہم مسئلہ میں علماء و مفتیین حضرات سے متفقہ فیصلہ حاصل کر کے اُمت کی رہنمائی کا اہم فریضہ انجام دیا۔ اور حکومت وقت سے متعدد مراحل میں گفت وشنید کر کے ان کو مسئلہ رؤیت ہلال کے حل کے لئے آمادہ کیا۔ اور یوں مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کی تشکیل ملتان میں "علماء کے متفقہ فیصلہ" کی روشنی میں تمام شرائط وقیود کے ساتھ ہوئی۔ جو اپنے فرائض احسن طریقے سے انجام دے رہی ہے۔

جمعیۃ علماء اسلام کے احیاء میں کردار

جمعیۃ علماء اسلام پاکستان ایک مذہبی اور سیاسی جماعت ہے۔ جو پاکستان میں شریعت اسلامیہ کے نفاذ کی علمبردار ہے۔ اور جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اس کی قیادت و سیادت علماء کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے تمام امور مجلس شوریٰ کے مشوروں سے طے ہوتے ہیں۔ جس میں غالب اکثریت علماء کی ہوتی ہے۔ یہ وہ جماعت ہے جو ۱۹۴۵ء میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے اس کی تشکیل کی تھی۔ اور وہی اس کے بانی ہیں۔ تقسیم برصغیر سے قبل آزادی برصغیر کی علمبردار جماعت "علماءِ دیوبند" دو گروپوں میں تقسیم تھی۔ ایک جمعیۃ علماء ہند کی قیادت (جو ۲۲ر نومبر ۱۹۱۹ء میں بنی تھی) میں آزادی برصغیر کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر رکھتی تھی۔ اور آزادی کے لئے اس کا اپنا فارمولا تھا۔ جس فارمولے کو کانگریس نے بھی منظور کیا تھا۔ اور دوسرا گروپ مولانا شبیر احمد عثمانی کی سرکردگی میں جمعیۃ علماء اسلام کے نام سے کام کر رہی تھی۔ جو ۲۶۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۴۵ء میں کلکتہ میں بنی تھی۔ اور جو مسلم لیگ کی ہمنوا تھی۔ اور تحریک پاکستان میں ان کا عظیم کردار رہا ہے۔ جس کا اعتراف مسلم لیگی قیادت بھی کرتی ہے۔

پاکستان کے قیام کے بعد ان دونوں گروپوں کی قیادت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے ہاتھ میں تھی۔ شروع میں تو آپ کی تمام سرگرمیاں اس حد تک محدود رہیں کہ قائد اعظم محمد علی جناح اور دیگر مسلم لیگی قائدین کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ تحریک پاکستان کے دوران کئے گئے اعلان کے مطابق پاکستان میں اسلام کے اصولوں کے مطابق یہاں آئین و قانون کی پاسداری کو یقینی بنائیں۔ اور ملک میں اسلامی آئین و قانون کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے اس کا نفاذ کریں۔ اور بالآخر ۱۲ر مارچ ۱۹۴۹ء کو وہ "قرار دادِ مقاصد" کو دستور ساز اسمبلی سے منظور کرانے میں کامیاب تو ہوئے۔ مگر قرار دادِ مقاصد کی روشنی میں دستور سازی میں مسلم لیگی قیادت نے اس

وائی نہیں کی۔ جس کی وجہ سے علامہ شبیر احمد عثمانی مسلم لیگی قیادت سے نالاں رہے۔ وہ ان مایوس ہوگئے کیونکہ مسلم لیگی قیادت نے قیام پاکستان کے بعد وہ تمام سیاسی فارمولے، وتے طاق نسیان کے حوالہ کر دئے۔ جو قیام پاکستان سے قبل اس وقت کے حالات کے پیش رکئے تھے۔ چونکہ علماء حق علماء دیوبند کی جماعت اپنی دینی و مذہبی ذمہ داریوں کے اعتبار سے ر ہو چکی تھی۔ اور اس بات کی فکر مند تھی کہ ملک کی بقاء، استحکام اور ترقی کے کاموں میں بڑھ ڑھ کر اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی سعی کرے۔ اور لادینی عناصر اور خاص کر مرزائیوں کو لی من مانیوں کے لئے کھلا نہ چھوڑا جائے۔

ان حالات کے پیش نظر مولانا شبیر احمد عثمانی کی شدید خواہش تھی کہ جمعیۃ علماء اسلام کو دوبارہ منظم کیا جائے۔ اور علماء دیوبند کے دونوں جماعتوں کے ہمنواؤں کو شریک سفر کیا جائے۔ اس غرض کے لئے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے ۱۹۴۹ء میں ملتان میں علماء کا کنونشن بلایا۔ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اس اجلاس میں مفتی صاحب نے بھی شرکت کی۔ جناب ریاض بٹالوی صاحب جو روزنامہ مشرق کے مشہور فیچر نگار رہے ہیں، نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ "قیام پاکستان کے بعد شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی دعوت پر انہوں (مفتی محمود) نے جمعیت علماء اسلام میں شمولیت اختیار کی"۔(۴۰)

یہ بات کہاں تک قرین حقیقت ہے۔ اور ریاض بٹالوی صاحب نے کہاں سے معلوم کی ہے۔ ابھی تک ایسا حوالہ سامنے نہیں آیا ہے۔ مگر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ۱۹۴۹ء میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ صاحب کے ملتان میں منعقد کردہ علماء کنونشن میں مفتی محمود صاحب نے سرگرم حصہ لیا تھا۔ قطب الدین عابد لکھتے ہیں۔

علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب کی دعوت پر جمعیت میں شمولیت کا واقعہ میری نظر سے کہیں بھی نہیں گزرا اور نہ ہی میں نے کہیں سنا ہے البتہ ۱۹۴۹ء میں جب علامہ نے علماء کنونشن ملتان میں بلائی تو اس میں مفتی صاحب نے سرگرم حصہ لیا تھا۔

یہ بات مولانا قطب الدین عابد نے کہاں سے دریافت کی ہے کہ مفتی محمود نے ۱۹۴۹ء میں ملتان میں علماء کنونشن میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ اب تک مقالہ نگار کی نظر سے نہیں گزرا ہے۔

پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کی سرتوڑ کوششوں اور علماء کو ایک سیاسی پلیٹ فارم پر متحد کرنے کی جدوجہد کے بعد بالآخر دسمبر ۱۹۴۹ء کو علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپ ریاست بہاولپور کے امیر کی دعوت پر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے افتتاح کے لئے بہاولپور میں تھے کہ پیغام اجل آپہنچا۔ آپ کے جسد خاکی کو کراچی لایا گیا۔ اور کراچی میں آپ کی تدفین ہوئی۔ (۴۲)

علامہ شبیر احمد عثمانی کی حیات میں جمعیۃ علماء اسلام کی احیاء کی ابتدائی کوششیں تو ہوئیں۔ اس سلسلے میں ۱۹۴۹ء ہی میں ملتان میں کنونشن بھی منعقد ہوا۔ مگر جماعت کو فعال نہیں بنایا جاسکا تھا۔ کہ علامہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔

اس وقت جمعیت علماء اسلام کی تنظیم کا کیا حال تھا۔ اور وہ کیا وجوہات تھیں کہ جماعت کی باقاعدہ تنظیم نہ ہو سکی تھی۔ وہ خود مفتی محمود صاحب کی زبانی سنیئے۔

قیام پاکستان کے بعد کا زمانہ جمعیت علماء اسلام کے رہنماؤں کے لئے بہت سخت تھا۔ خاص طور پر صوبہ سرحد میں ان کے لئے رہنا دوبھر ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں چوبیس گھنٹے ہماری سخت نگرانی کی جاتی تھی۔ ہمارا چلنا پھرنا، اور رہنا سہنا ہر کام نگرانی میں ہوا کرتا تھا۔ حکومت کی ان سختیوں کی وجہ سے جمعیۃ علماء اسلام پورے سات سال تک منظم نہ ہو سکی۔ گو مولانا شبیر احمد عثمانی نے ملتان میں علماء کرام کا ایک اجلاس طلب کر کے جمعیت کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ لیکن جماعت کا باقاعدہ کنونشن دو برس بعد ہو سکا۔ یہ

کنونشن مولانا شبیر احمد عثمانی کی زیر قیادت ۱۹۴۹ء میں طلب کیا گیا۔ لیکن جمعیت کی تنظیم ممکن نہ ہو سکی۔(۴۳)

اس کے بعد جماعت کا کیا حال ہوا۔ اور اس کی تنظیم کے بارے میں کیا اقدامات ہوئے۔ اس بارے میں مولانا محمد اکبر رقمطراز ہیں۔ "کچھ عرصہ بعد ۱۹۵۲ء میں مولانا احتشام الحق تھانوی کراچی سے ملتان تشریف لائے۔ انہوں نے مدرسہ خیر المدارس ملتان میں ایک اجلاس میں اس خواہش کا اظہار کیا کہ جمعیۃ علماء اسلام کا احیاء ہونا چاہیئے"۔(۴۴)

مولانا احتشام الحق تھانوی کی اس خواہش کی تکمیل کے لئے مولانا مفتی محمود صاحب نے جنہیں ملتان آئے دوسرا سال تھا۔ اور کوئی خاص شہرت حاصل نہیں تھی۔ آپ نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ اور بقول مولانا محمد اکبر۔

حضرت مفتی صاحب نے ملک بھر کا دورہ کیا اور خصوصاً صوبہ سرحد کے مختلف دور دراز دشوار گزار علاقوں میں بنفس نفیس پہنچ کر علماء کو آئندہ منعقد ہونے والے اجلاس میں شرکت کی دعوت و ترغیب دی۔ چنانچہ حضرت مفتی صاحب کی کوششیں رنگ لائیں۔ اور پاکستان کے چاروں صوبوں سے جید اور فرض شناس علماء کا ایک بڑا نمائندہ اجلاس ہوا۔ جس میں حضرت مفتی صاحب نے اپنی سیاسی بصیرت اور عاقبت اندیشی سے جمعیت کی صدارت کے لئے شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری اور نظامت اعلیٰ کے لئے مولانا احتشام الحق تھانوی کا نام تجویز کیا۔ چنانچہ ہاؤس نے اس کی توثیق و تصویب کر دی۔(۴۵

)

جمعیۃ علماء اسلام کا یہ اجلاس دسمبر ۱۹۵۲ء میں منعقد ہوا تھا۔ اس کے ٹھیک دو مہینے بعد ختم نبوت کی تحریک فروری ۱۹۵۳ء میں شروع ہوئی۔ جس میں بقول حضرت خواجہ خان محمد صاحب امیر عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے "بلاشبہ یہ برصغیر کی عظیم ترین تحریک تھی جس میں

دس ہزار مسلمانوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ ایک لاکھ مسلمانوں نے قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں اور دس لاکھ مسلمان اس تحریک سے متاثر ہوئے"۔(۴۶)

اس تحریک نے سارے ملک کی چولہیں ہلا دیں۔ علماء کا طبقہ اس سے بہت زیادہ متاثر ہوا اگرچہ اس تحریک کی قربانیاں بیس سال بعد ۱۹۷۴ء میں رنگ لائیں۔ مگر اس وقت فوری طور پر بظاہر یہ تحریک ناکام ہوئی۔ اس تحریک سے جمعیت علماء اسلام کی نو تشکیل شدہ جماعتی تنظیم بھی متاثر ہوئی اور اس کا شیرازہ بکھر گیا۔ مفتی محمود صاحب ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں۔

> آخر دسمبر ۱۹۵۲ء میں ہم نے جمعیۃ کا ایک کنونشن ملتان میں طلب کیا جس میں سارے پاکستان سے علماء دین اکٹھے ہوئے۔ اس کنونشن میں جمعیت کی از سر نو تنظیم کی گئی۔ اور مولانا احمد علی لاہوریؒ جمعیۃ کے صدر مولانا احتشام الحق تھانوی جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ لیکن اس کے محض دو ماہ بعد جب فروری ۱۹۵۳ء میں تحریک ختم نبوت شروع ہوئی تو جمعیت کا شیرازہ بکھر گیا۔ مجھے تحریک میں حصہ لینے کی پاداش میں ایک سال کی سزا ہوئی۔ اور جب ہم لوگ جیلوں سے واپس آئے تو پوری جماعت مضمحل ہو چکی تھی۔ مولانا احتشام الحق تھانوی تحریک ختم نبوت سے اختلاف کی بناء پر ہم سے علیحدہ ہو گئے تھے۔(۴۷)

تحریک ختم نبوت کی وجہ سے چونکہ جمعیت علماء اسلام کا تنظیمی ڈھانچہ ختم ہو چکا تھا۔ اور اس کا وجود اب برقرار نہیں رہا تھا۔ لیکن مفتی محمود صاحب نے پھر سے جماعت کے احیاء کی کوششیں شروع کر دیں۔ وہ خود ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں۔

> آخر دو سال کی تگ و دو کے بعد جب ہم نے ۱۹۵۴ء میں خود کو دوبارہ منظم کیا تو مفتی محمد حسن صاحب (بانی و مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور) کو جمعیت کا صدر منتخب کیا گیا۔ مفتی صاحب بیمار و معذور تھے اس لئے انہوں نے مفتی محمد شفیع صاحب کو قائم مقام صدر نامزد کیا۔(۴۸)

جماعت کی تنظیم و تشکیل تو کر دی گئی۔ مگر اس کو فعال نہ بنایا جا سکا۔ اور اس کی وجہ بھی مفتی محمود نے بتائی ہے وہ کہتے ہیں۔ "لیکن قیادت کی کمزوری کی وجہ سے ہم لوگ جواب آگے بڑھ کر کام کرنا چاہتے تھے ایسا نہ کر سکے"۔(۴۹)

جماعت ایک دفعہ پھر مشکل کا شکار ہوئی۔ ادھر ملکی حالات کا تقاضا تھا کہ علماء ایک منظم تنظیم میں فعال کردار ادا کرنے کے لئے آگے بڑھیں۔ یہی وہ دن تھے جب ملک کے لئے پہلا دستور مرتب کرنے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ علماء کے لئے دینی ذمہ داریوں سے ایک دقیقہ کے لئے بھی غفلت ملک کو لادینی عناصر کے ہاتھوں میں لے جانے کا باعث بن سکتی تھی۔ ان حالات میں مولانا مفتی محمود نے ایک بار پھر جمعیۃ علماء اسلام کو منظم کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ اور اس کے لئے ملک بھر کے دورے کئے۔ اس سلسلے میں مولانا محمد اسماعیل شجاع آبادی لکھتے ہیں۔

"چنانچہ ۱۹۵۶ء میں اسلامی اقدار کے اُجاگر کرنے اور جملہ علمی و اسلامی شخصیات کو ایک پلیٹ پر جمع کرنے کے لئے ملتان میں پہلا کنونشن منعقد کرانے والے مفتی محمود ہی تھے"۔(۵۰)

مولانا محمد ایوب جان بنوری صاحبؒ، مفتی صاحب کی صوبہ سرحد میں جمعیۃ کے احیاء کے بارے میں علماء کرام سے ملاقاتوں کا تذکرہ یوں کرتے ہیں۔ "وہ میرے پاس آئے یہ ۱۹۵۵ء کی بات ہے۔ اور اپنا تعارف کرایا۔ اور آنے کا مقصد بتایا"۔

وہ انہیں کے الفاظ لکھتے ہیں۔

> میرا نام محمود ہے مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں مدرس ہوں۔ افتاء کا کام بھی میرے ذمہ ہے۔ آج کل بزرگوں نے جمعیت کی تنظیم نو کے سلسلے میں مجھے احباب سے ملاقات پر مامور کیا ہے۔ تاکہ انہیں دینی اور قومی کاموں کی انجام دہی کے لئے آمادہ کروں۔ پشاور میں سب سے پہلے آپ کے پاس آیا ہوں۔ اس کے بعد چارسدہ جاؤں گا۔ بعد ازاں دوسرے مدارس کا رخ کروں گا۔ آج نماز عشاء کے بعد آپ کے مدرسہ کے طلباء سے

خطاب کا ارادہ ہے کل دوسرے مقامات کے پروگرام ترتیب دوں گا۔ ان تمام کاموں میں مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ (۵۱)

مولانا ایوب جان بنوریؒ صاحب اس سے قبل اس وقت کے جماعت کے حالات اور اس کے احیاء کے بارے میں مفتی محمود صاحب کی جدوجہد کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

جس وقت وہ جمعیت کے کام پر مامور ہو کر میرے پاس آئے اس وقت میں یہاں جمعیت کا ناظم اور مولانا گل بادشاہ امیر تھے۔ مفتی محمد حسن صاحب مغربی پاکستان کے امیر تھے۔ جمعیت کا وہ وجود ختم ہو چکا تھا۔ جو مولانا شبیر احمد عثمانی کے دور میں تھا۔ مفتی محمود اب اس دور کو واپس لانا چاہتے تھے ہمارے نزدیک یہ کام مشکل ہی نہیں بظاہر ناممکن بھی تھا۔ لیکن مفتی محمود پر گویا جنون سوار تھا۔ وہ دن رات اسی کام میں مصروف تھے۔ بالآخر مقصد کی لگن انہیں کامیابی سے ہمکنار کر کے رہ گئی۔ (۵۲)

بنوری صاحب مفتی محمود کی شخصیت اور ان میں موجود صلاحیتوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

وہ جمعیت میں میرے اور میرے رفقاء کار کے بعد آئے لیکن اپنی صلاحیتوں کی بدولت مجھ سے اور میرے رفقاء سے بہت آگے نکل گئے۔ اتنے آگے کہ جو مقتدیٰ تھے وہ مقتدِی بن گئے۔ اور مقتدیٰ کا منصب ان کے لئے خالی کر دیا گیا۔ بلکہ خالی ہو گیا۔ قیادت خود بخود اُن کے پاس چلی گئی۔ گویا قیادت کو انہوں نے اختیار نہیں کیا خود قیادت نے ان کا انتخاب کیا۔ منصب کو انہوں نے طلب نہیں کیا خود منصب نے انہیں اپنی حفاظت کے لئے چُن لیا اور قیادت و منصب کے لئے اس کا وجود کا انتخاب واقعی لاجواب تھا۔ (۵۳)

مولانا بنوری صاحب، مفتی صاحب کی قائدانہ صلاحیتوں کا برملا اعتراف اپنے الفاظ میں یوں کرتے ہیں۔

ان کی سیدھی، سادی عام فہم باتوں نے عوام کے دل موہ لئے تھے۔ یہاں روز بروز ان کی مقبولیت بڑھتی رہی اور جو علماء پہلے اس میدان میں انفرادی طور پر کام کرتے تھے وہ مفتی محمود کی قیادت میں اکھٹے ہو کر کام کرنے لگے۔ خوش قسمتی سے یہاں ان کی ٹانگ کھینچنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ وجہ یہ نہیں کہ کوئی ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا سبب یہ ہے کہ کوئی ایسا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ رقابت کے لئے ضروری ہے کہ رقیب کے پاس لڑنے کے لئے وہی سامان جنگ ہو جو اس کے حریف کے پاس ہے۔ اس نقطۂ نظر سے مفتی محمود کی دو حیثیتیں سامنے آتی ہیں۔ علمی اور سیاسی۔ ان دونوں حیثیتوں میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ (۵۴)

۱۹۵۶ء کے جمعیت کے ملتان کنونشن میں جمعیت کی امارت کے عہدے کے لئے حضرت شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری کو مفتی صاحب نے آمادہ کیا اور جمعیت کی تنظیم کا سہرا بھی مفتی محمود کے سر رہا۔ اس بارے میں مولانا عبید اللہ انور لکھتے ہیں۔

یہ ایک طویل بات ہے کہ جمعیت کے انتخابات کیسے ہوئے؟ کون کون سے حضرات عہدیدار بنے؟ لیکن جمعیت کے کام کا آغاز یہیں سے ہوا۔ اور حضرت لاہوری جیسے آدمی کو جمعیت کی امارت قبول کرنے پر مفتی محمود صاحب ہی نے آمادہ کیا۔ اس طرح تنظیم کا یہ سہرا بھی انہیں کے سر پر سجتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ کوشش کر کے حضرت کو آمادہ نہ کرتے تو جمعیت کی تنظیم نو ہوتی اور نہ جمعیت کا کام آگے بڑھتا۔ تنظیم نو کے کام کو مفتی صاحب نے آگے بڑھانے اور کارکنوں کی نفری میں اضافہ کرنے کے لئے شب و روز ایک کر دیئے۔ (۵۵)

جمعیت کی تنظیم و تشکیل نو میں مولانا مفتی محمود کے کردار کے بارے میں مولانا حامد میاں صاحب بانی و مہتمم جامعہ مدنیہ لاہور رقمطراز ہیں۔

حضرت مفتی محمود صاحب کا تعلق اکابر جمعیۃ علماء ہند سے تھا وہ سب حضرات مذکورہ بالا اوصاف کے حامل تھے۔ قیام پاکستان کے بعد اس جماعت سے تعلق رکھنے والے بزرگ

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری "مغربی پاکستان کے "قلب" لاہور میں تشریف فرماتھے۔ مولانا محمد نعیم لدھیانوی، مولانا عبدالحنان ہزاروی، اسی جمعیت کے پرانے ارکان وعہدہ داران رہ چکے تھے۔ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نے ان حضرات کو ملتان میں جمع کیا۔ ان کے ساتھ پورے ملک کے چیدہ چیدہ علماء کو بھی مدعو کیا۔ اراکین جمعیۃ علماء اسلام (جن کے قائد علامہ شبیر احمد عثمانیؒ رہ چکے تھے) کو بھی مدعو کیا۔ یہ ۱۹۵۶ء کی بات ہے یہ اجلاس حاجی باران خان کی زیر تکمیل کوٹھی میں ہوا۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوری کو امیر منتخب کیا گیا۔ اور دیگر عہدہ داران کا بھی انتخاب ہوا۔ اجلاس میں شریک مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب کو ناظم منتخب کیا گیا۔ یہ سب کاروائی مفتی محمود صاحب نے کی تھی۔ جو وقت اور ضرورت کے عین مطابق تھی۔ کام کرنے والے سب علماء مجتمع ہوگئے۔ خداوند کریم نے مفتی صاحب کی اس کوشش کو بارآور فرمایا۔ علماء ان حضرات کی سرکردگی میں دینی اور سیاسی خدمات انجام دیتے رہے۔ مفتی صاحب کی اپنی جماعت یہی تھی۔ اور ہے اور ان شآءاللہ رہے گی۔ یہ جماعت ان کی باقیات صالحات میں سے ہے اور ان کے لئے صدقہ جاریہ۔ رحمہ اللہ۔ (۵۶)

اس کنونشن کے لئے استقبالیہ کی تشکیل ہوئی۔ جس کی صدارت حضرت لاہوری نے منظور فرمائی۔ اور نظامت کی ذمہ داری آپ (مفتی محمود) کو سونپی گئی۔ حضرت لاہوری اور آپ کی طرف سے دعوت نامہ جاری ہوا۔ کنونشن ۷،۸،۹/ اکتوبر ۱۹۵۶ء مطابق ۲، ۳، ۴/ ربیع الاول ۱۳۷۶ھ کو ملتان میں منعقد ہوا۔ جس میں مغربی پاکستان کے پانچ سو (۵۰۰) علماء نے شرکت کی۔ امیر حضرت لاہوری، نائب امیر مفتی محمود اور ناظم اعلیٰ حضرت غلام غوث ہزاروی منتخب ہوئے۔

قیام پاکستان کے بعد جمعیۃ علماء اسلام کے احیاء کے لئے جتنی بار بھی کوششیں ہوئیں۔ ان میں مرکزی کردار مولانا مفتی محمود صاحب کا رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس سے پہلے مرکزی سطح پر آپ نے کوئی عہدہ قبول نہیں کیا ہے۔ مولانا قاضی عبدالکریم آف کلاچی نے اپنے ایک

مضمون میں اس بات کا تذکرہ ہوئے بتایا ہے۔ کہ یہی بات آپ کے جذبہ صادقہ ہونے کی دلیل ہے۔ وہ رقمطراز ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ احیاء جمعیت کے بعد داعی ہونے کے باوجود آپ نے سالہاسال تک رسمی طور پر کوئی مرکزی ذمہ داری قبول نہیں کی۔ صرف گزشتہ سال ہی کے .... جماعتی انتخاب میں آپ کو مرکزی ناظم اعلیٰ چُنا گیا۔ لیکن اپنی خداداد قابلیت، اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جذبہ صادقہ اور بسطۃ فی العلم والجسم کے مصداق ہونے کے باعث قوم نے خودبخود آپ کو قائد جمعیۃ اور مفکر اسلام کی حیثیت سے پہچانا۔

صدر ہر جا کہ نشیند صدر است۔ (۵۸)

شیخ طریقت، امیر عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت حضرت مولانا خواجہ خان محمد صاحب نے مولانا مفتی محمود صاحب کے جو تین اہم کارنامے اپنے ایک مضمون میں ذکر کئے ہیں۔ اُن میں سب سے پہلے انہوں نے جمعیت علماء اسلام کے احیاء کے لئے ان کی کوششوں اور تگ ودو کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کو آپ کی عظیم خدمات میں سے شمار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

۱۹۵۳ء میں جب تحریک ختم نبوت چلی، تو دوسرے علماء کے ساتھ جیل چلے گئے۔ جیل سے رہا ہوئے تو ایک سال پہلے جس دینی جماعت کو تھوڑا بہت منظم کیا تھا۔ اب اس کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ ۱۹۵۴ء میں حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب کو اس کا امیر بنا کر اس کے مُردہ جسم میں رُوح ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن وہ اپنی معذوری کی وجہ سے جماعتی اور تنظیمی دورے نہیں کرسکتے تھے۔ اس لئے جماعت زندہ نہ رہ سکی۔ قائم مقام صدر مفتی محمد شفیع صاحب تھے۔ لیکن وہ بھی اپنے وسیع علمی کام کے باعث ملکی دورے نہیں کرسکتے تھے۔ ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۵۷ء تک مفتی محمود نے جماعتی تنظیم کے لئے ملک گیر دورے کرکے اس تن مُردہ میں جان ڈال دی۔ پھر جب ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کے ذریعہ تمام جماعتیں کالعدم قرار پائیں تو ان میں جمعیت بھی شامل تھی۔ میرے نزدیک مفتی صاحب کا سب سے پہلا کارنامہ جمعیت کی تنظیم نو تھی۔ اس میں کوئی شبہ

نہیں کہ یہ کارنامہ تنہا ان کا نہیں تھا دوسرے اکابر علماء کی خدمات بھی اس میں شامل تھیں۔ لیکن مفتی صاحب کی خدمات مجموعی طور پر زیادہ تھیں۔(۵۹)

حضرت مولانا احمد علی لاہوری کے جانشین، حضرت مولانا عبید اللہ انور صاحب نے جمعیۃ علماء اسلام کی تنظیم کا سہرا مفتی محمود کے سر پر سجنے کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> حضرت لاہوری جیسے آدمی کو جمعیت کی امارت قبول کرنے پر مفتی محمود ہی نے آمادہ کیا۔ اس طرح تنظیم کا یہ سہرا بھی انہیں کے سر سجتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ کوشش کر کے حضرت کو آمادہ نہ کرتے تو جمعیت کی تنظیم نو ہوتی اور نہ جمعیت کا کام آگے بڑھتا۔ تنظیم نو کے کام کو مفتی محمود نے آگے بڑھانے اور کارکنوں کی نفری میں اضافہ کرنے کے لئے شب و روز ایک کر دیئے۔........ اس سال حضرت پہلی بار حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ جاتے وقت انہوں نے مفتی محمود صاحب کو اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ مفتی صاحب کی قائم مقام امیر کے طور پر تقرری گویا ان کی کارکردگی کی سند اور خدمات کا اعتراف تھا۔(۶۰)

جمعیت علماء اسلام نے اپنے قیام و تشکیل کے بعد اپنی تمام دینی، مذہبی اور سیاسی سرگرمیاں ہر دور میں جاری رکھیں۔ ہر قسم کے مشکلات کے باوجود اپنے عظیم رہنماؤں اور مخلص کارکنوں کی بدولت یہ تنظیم زندہ اور فعال رہی۔ جب جنرل ایوب خان کے دور میں پہلا مارشل لاء، نافذ ہوا تو بھی جمعیت علماء اسلام کے اکابرین اپنی ذمہ داریوں سے غافل نہیں رہے۔ تمام سیاسی جماعتوں اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندیوں کے باوجود اس جماعت نے "نظام العلماء" کے نام سے اپنا کام اور مشن جاری رکھا۔ بعد کے مارشل لاء ادوار میں بھی جب بھی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگی۔ جمعیت نے "نظام العلماء" کے نام سے اپنی دینی، مذہبی اور سیاسی ذمہ داریاں پوری کیں ہیں۔ نظام العلماء کے نام سے جماعت کی تشکیل میں بھی سب سے فعّال کردار مفتی محمود کا رہا ہے۔ گل نایاب خان چترالی لکھتے ہیں۔

> ۱۹۵۸ء میں جب مارشل لاء لگا تو تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی۔ ان حالات میں علماء کرام کے پاس اسلامی نظام کے احیاء کی جدوجہد کے لئے کوئی پلیٹ فارم نہ تھا۔ کیونکہ جمعیت علماء اسلام بھی پابندی کی زد میں تھی۔ اس موقع پر (مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے سالانہ جلسہ) پر مولانا مفتی محمود نے ملتان میں علماء کا ایک ملک گیر کنونشن منعقد کروایا۔ جس میں "نظام العلماء" کے نام سے ایک جماعت تشکیل دی گئی۔ جس کا دستور اور لائحہ عمل بھی مفتی صاحب نے ہی مرتب کیا۔ نظام العلماء نے سیاسی تعطل اور سکوت کو توڑا اور ملک کی سیاسی فضا میں پہلی گونج پیدا کی۔(۶۱)

یہی بات ڈاکٹر احمد حسین کمال نے بھی لکھی ہے۔

> مئی ۱۹۵۹ء کو اسی مقصد کے تحت جمعیۃ کے سالانہ اجلاس منعقدہ قاسم العلوم ملتان میں ایک کنونشن بُلایا گیا اور ایک نئی تنظیم "نظام العلماء" کے نام سے قائم کی گئی۔ ۲۳ر جون ۱۹۵۹ء مولانا احمد علی لاہوریؒ کی قیادت میں لاہور میں ایک کامیاب کنونشن منعقد ہوا۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ بالاتفاق نظام العلماء کے امیر منتخب ہوئے۔ ناظم اعلیٰ مولانا ہزارویؒ کو مقرر کیا گیا۔ اور مولانا مفتی محمودؒ کی سرکردگی میں ایک کمیٹی نے نظام العلماء کا دستور مرتب کر کے کنونشن کے سامنے پیش کیا۔ جسے بعض ترمیمات کے ساتھ منظور کر لیا گیا۔ اور اس تنظیم کے منشور کے مطابق علماء نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔[(تاریخ جمعیۃ علماء اسلام) ص ۸۱۔ مکّی دار الکتب لاہور]

> ۱۵ر ستمبر ۱۹۶۱ء کو حضرت لاہوریؒ امیر نظام العلماء نے حکومت کی طرف سے پابندی کی بناء پر مولانا مفتی محمود کو قائم مقام امیر مقرر کیا۔ اور جب ۲۳ر فروری ۱۹۶۲ء کو حضرت لاہوریؒ کا انتقال ہوا۔ تو بھی حضرت مفتی صاحب کو نظام العلماء کا قائم مقام امیر مقرر کیا گیا تا آنکہ ۲۱ر مارچ ۱۹۶۲ء کو مرکزی اجلاس منعقدہ لاہور میں حضرت مولانا محمد عبد اللہ صاحب درخواستی کو امیر مقرر کیا گیا جس کی بعد میں مرکزی مجلس عمومی سے توثیق حاصل کی گئی۔ ۱۴ر جولائی ۱۹۶۲ء کو قومی اسمبلی نے سیاسی جماعتوں کی تشکیل

کا قانون منظور کیا۔ اس فیصلے کے ساتھ "جمعیۃ علماء اسلام" کو دوبارہ فعال کیا گیا۔ حضرت مفتی صاحب نے تمام شاخوں اور تنظیموں کو بحال کیا۔

جمعیۃ علماء اسلام نے ۳، ۴ اور ۵ / مئی ۱۹۶۸ء کو بیرون موچی دروازہ ایک عظیم الشان کانفرنس بلائی۔ پاکستان بھر سے جمعیۃ کے کارکنوں نے نہایت پر جوش مگر منظم طریقے سے اس کانفرنس کو مثالی اور معیاری بنایا۔ پانچ ہزار سے زائد علماء نے اس میں شرکت کی۔ آخری دن ایک عظیم الشان جلوس نکالا گیا۔ جس نے لاہور کے سڑکوں پر مارچ کیا۔ کانفرنس کے آخر میں جمعیۃ علماء اسلام کی مجلس عمومی کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں اس کے دستور میں بعض ضروری ترامیم کی منظوری لی گئی۔ اور مرکزی انتخاب عمل میں آیا جس کی رُو سے مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ امیر اور مولانا مفتی محمودؒ ناظم عمومی منتخب ہوئے۔ یاد رہے کہ اس سے قبل جمعیۃ علماء اسلام کی تنظیم اور عہدداران کا انتخاب مغربی پاکستان کی سطح پر ہوتا تھا۔ یہ پہلی دفعہ تھی کہ اس کی تنظیم کو مشرقی پاکستان تک وسعت دی گئی۔ اور یہ انتخاب کل پاکستان کی سطح پر ہوا تھا۔

۱۹۵۶ء کا دستور۔ تنقیدات و ترمیمات

ملک خداداد پاکستان کو پہلا دستور / آئین آزادی کے نو سال بعد ۱۹۵۶ء میں ملا۔ اس آئین کے بارے میں حکومتی ذرائع ابلاغ کے ساتھ ساتھ بعض دینی، مذہبی حلقوں سے متعلق افراد اور اداروں نے زور شور سے یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ یہ ہر لحاظ سے اسلامی آئین ہے اور دین اسلام کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اور اس میں کوئی ایک شق بھی قرآن وسنت کے خلاف نہیں۔ لیکن حقیقت کے اعتبار سے اس میں ایسی کئی خامیاں تھیں جو قرآن وسنت کی تعلیمات کی روح کے خلاف تھیں۔ اس سلسلے میں جناب اکرام القادری صاحب لکھتے ہیں۔

> ۱۹۵۶ء میں جب حکومت پاکستان نے ایک آئین تشکیل دے کر اسے پروپیگنڈے کی پوری قوت کے ساتھ اسلامی آئین مشہور کیا تو علماء اور دینی حلقوں میں اضطراب پیدا

ہو گیا اس لئے کہ ۱۹۵۶ء کا آئین الحاد پرستوں اور لادینی عنصر کے مقابلہ میں اسلام کی فتح تھی۔ لیکن اس میں کچھ ایسی خامیاں رہ گئی تھیں جو قرآن وسنت کی روح کی منافی تھیں۔ اور جس کی وجہ سے ارتداد کا دروازہ کھلنے کا شدید اندیشہ تھا۔ (۶۲)

یہی بات مشہور عالم دین جناب مولانا زاہد الراشدی صاحب نے بھی لکھی ہے۔ "۱۹۵۶ء کا آئین جب نافذ ہوا تو اسلام کے بعض نام نہاد علمبرداروں نے یہ فتویٰ دے دیا کہ آئین بالکل اسلام کے مطابق ہے اور اسلام کا مستقبل اب اس آئین کے ساتھ ہی وابستہ ہو گیا ہے"۔ (۶۳)

مولانا محمد اکبر صاحب نے ۱۹۵۶ء کے دستور کو یورپین ممالک کے دساتیر کا چربہ قرار دیا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ اس دستور کے ذریعہ بیوروکریسی نے اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش تھی۔ وہ لکھتے ہیں۔

> یہ آئین گورنر جنرل غلام محمد کی قائم کردہ دستور ساز اسمبلی کے ذریعہ سکندر مرزا نے نافذ کیا تھا۔ گزشتہ آٹھ سال کے بعد یہ پہلا آئین تھا جو نافذ ہوا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اُسے یورپین ممالک کے دساتیر کا چربہ بنا دیا گیا تھا۔ جس کے ذریعہ افسر شاہی نے پاکستان پر اپنا ناجائز تسلط قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس آئین میں اسلام کا ذکر بطور دیباچہ کے کیا گیا تھا۔ جس سے مقصد ارباب اقتدار کا اسلام کے نام پر غیر اسلامی قوانین نافذ کرنے تھے۔ (۶۴)

نعیم آسی نے "مفتی محمود" نامی کتاب میں ۱۹۵۶ء کے آئین کو قوم کو اسلام کے نام پر دھوکہ دینے کی کوشش قرار دیا ہے۔ اور اس کو اسلام کے ساتھ تضحیک بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> اس دوران میں ۵۶ء کا آئین نافذ ہوا۔ اس دستور کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے "رہنمایانِ قوم" کس طرح اسلام کے نام پر قوم کی آنکھوں میں دھول جھونکتے رہے۔ اس دستور کی تمہید میں اگرچہ پاکستان کو اسلامی مملکت اور "قرارداد مقاصد" کو رہنما اُصول کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے مگر ساتھ ہی یہ لکھ کر کہ "(یہ) تمہید دستور کا

جزو لاینفک نہیں بلکہ محض ایک دیباچہ ہے جس کی کوئی قانونی اہمیت نہیں"۔(۶۵)

اسلام کا مذاق اُڑایا گیا۔(۶۶)

مولانا مفتی محمودؒ نے اپنی ایک تقریر میں جو ماہنامہ "تبصرہ" لاہور نے ۱۹۷۰ء میں "مولانا مفتی محمود نمبر" میں شائع کیا ہے۔ آپ نے ۵۶ء کے دستور کا جائزہ پیش کیا ہے اور اس پر تنقید کی ہے۔ اور اس میں اسلام سے متعلق چیدہ چیدہ خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔ آپ کہتے ہیں۔

اس آئین میں اسلام کی کوئی قابل ذکر حیثیت نہیں ہے۔ مسلمان کی تعریف پر یہ آئین خاموش ہے۔ اسلام کی تعبیر پر اس میں ایسا ایک لفظ نہیں جس سے یہ متعین ہوسکے کہ پاکستان میں کن نظریات و عقائد پر مبنی اسلام غالب ہوگا۔ اسلامی قوانین اور احکام حرام و حلال کے نفاذ کے بارے میں وہ کوئی مثبت رویہ اختیار نہیں کرتا اب صرف اس لئے تو اسے اسلامی قرار نہیں دیا جاسکتا کہ اس میں چند مقامات پر اسلام کا نام اور اسلام کے نام سے چند سفارشات آگئی ہیں۔ اسلام کے قیام کے لئے اس میں واضح اور مثبت ترمیموں کی ضرورت ہے۔ ورنہ بصورت دیگر موجودہ دستور مسلمانوں میں ارتداد کا دروازہ کھلا رہنے دیتا ہے۔ اور اسلام کے نام سے ان گروہوں کو غالب آنے کا موقع فراہم کرتا ہے جو محض برطانوی حکومت کی سرپرستی کی وجہ زبردستی مسلمانوں میں شامل رہے ہیں۔ ورنہ وہ اُمت کے اجماعی فیصلے کی رُو سے اسلام سے خارج ہیں۔ علاوہ ازیں اس دستور کو مشرقی پاکستان بھی رد کر رہا ہے اور مغربی پاکستان کے چھوٹے علاقوں کے رہنے والے بھی نیز اس میں نمائندگی اور طریق انتخاب کا مسئلہ بھی واضح نہیں۔(۶۷)

روزنامہ "مشرق" لاہور کے مشہور فیچر نگار جناب ریاض بٹالوی صاحب نے ۱۵ مارچ ۱۹۷۱ء کے شمارہ میں مولانا مفتی محمود صاحب کا ایک تفصیلی انٹرویو شائع کیا ہے۔ جس کے سوال و جواب سے ۱۹۵۶ء کے آئین میں مولانا مفتی محمود صاحب اور ان کی جماعت جمعیۃ علماء اسلام

پاکستان کا مؤقف سامنے آتا ہے۔ اور اس میں ان پر جو اعتراضات اُٹھائے جاتے تھے۔ ان کا تفصیل اور تسلی بخش جواب سامنے آیا ہے۔ وہ سوال و جواب یہ ہیں۔

سوال: آپ نے ایک خط میں ۱۹۵۶ء کے آئین کو "اسلام کی فتح" قرار دیا تھا۔ اب اس آئین کی بحالی کی مخالفت کیوں کر رہے ہیں؟

جواب: اکتوبر ۱۹۵۶ء میں ملتان میں جمعیۃ علماء اسلام کا کنونشن بلایا گیا تھا۔ اس کنونشن کے دعوت نامہ پر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اور میں نے صدر استقبالیہ اور ناظم استقبالیہ کی حیثیت سے دستخط کئے تھے۔ یہ دعوت اس پس منظر میں دی گئی تھی کہ پاکستان میں گزشتہ نو سال سے آئین کی ترتیب کا مسئلہ اُلجھا ہوا تھا۔ بعض طاقتور سیاسی شخصیتیں یہ چاہتی تھیں۔ کہ اس ملک میں لادینی دستور نافذ ہو اور یہ سیکولر اسٹیٹ بنے۔ اس مطالبے کے جواب میں ہم نے اسلامی دستور کے نفاذ کا نعرہ لگایا۔ ہماری کوششیں رنگ لائیں اور ملک میں اسلام ہی کے نام سے ایک دستور نافذ ہوا۔ اور مملکت خداداد کو جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کا نام دیا گیا۔ اس آئین کے نفاذ سے اگرچہ اب ملک میں "کفر جہار" کے نفاذ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی لیکن لادینی طاقتیں اسلام کے نام سے کفر کو پروان چڑھانے کی سازش کریں گی۔ اور "کفریات" پر اسلام کا لیبل چسپاں کر دیا جائے گا۔ لہذا اس چور دروازے کو بند کرنے کے لئے ہمیں باہم بیٹھ کر کوئی تدبیر سوچنی چاہیے۔ اس دعوت نامے میں ۱۹۵۶ء کے آئین کے مندرجات پر بحث نہیں کی گئی تھی صرف آئین کا نام اور مزاج پیش نظر تھا۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ میں نے ۱۹۵۶ء کے آئین کو اسلام کی فتح قرار دیا تھا۔ میں نے اس کامیابی کو اسلام کی فتح سے تعبیر کیا تھا جو دستور کے مسئلہ پر سیکولرازم کے مقابلے میں اسلام کے حامیوں کو حاصل ہوئی تھی۔(۶۸)

۱۹۵۶ء کے آئین میں کئی ایسی دفعات تھیں جو علماء کی نظر میں قرآن و سنت کی روح کی منافی تھیں۔ ان میں ایک دفعہ یہ تھا۔

(۱) ملک کا ہر باشندہ جو بھی عقیدہ اختیار کرے کر سکتا ہے۔

(۲) ملک میں ہر باشندہ بلا امتیاز مذہب حکومت کا ہر عہدہ باستثناء صدارت مملکت پر فائز ہو سکے گا۔

پہلے شق میں ارتداد کی کھلی اجازت دی گئی تھی۔ جبکہ دوسرے دفعہ میں وزیر اعظم، بشمول دیگر کلیدی عہدوں پر غیر مسلموں کی تقرری کی کھلی اجازت دی گئی تھی۔ لہٰذا اس صورت حال کے پیش نظر امیر جمعیت مولانا احمد علی لاہوریؒ نے ۲، ۳ر دسمبر ۱۹۵۶ سنہء کو جمعیت کی مجلس عاملہ کا اجلاس بُلایا۔ اس اجلاس میں ۱۹۵۶ء کے دستور سے خلاف اسلام دفعات کو تبدیل کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ جس کے سربراہ مولانا مفتی محمود تھے۔ دوسرے اراکین میں مولانا شمس الحق افغانی، علامہ خالد محمود تھے جبکہ شیخ حسام الدین قانونی مشیر مقرر کئے گئے۔ چنانچہ اس کمیٹی کا اجلاس مردان میں منعقد ہوا۔ اور ایک مفصل تبصرہ اس پر شائع ہوا۔ (۶۹)

اس سلسلے میں ڈاکٹر احمد حسین کمال نے لکھا ہے۔ "کمیٹی نے مولانا مفتی محمود کو رپورٹ تیار کرنے کا اختیار دیدیا۔ چنانچہ مفتی صاحب نے ۱۹۵۶ء کے دستور پر ایک فاضلانہ رپورٹ مرتب کی جو کتابی صورت میں "تنقیدات و ترمیمات" کے نام سے شائع ہوئی"۔ (۷۰)

مفتی صاحب کی اس رپورٹ کو آپ کی علمی، فکری اور آئینی معلامات کے سُوجھ بُوجھ کا ایک بہترین اظہار قرار دیا گیا۔ اور مختلف طبقات سے آپ نے اس پر خراج تحسین وصول کیا۔

خواجہ محمد زاہد صاحب لکھتے ہیں کہ "بہر حال کمیٹی نے دستور میں اسلامی، معاشی اور اقتصادی خامیوں کی نشاندہی کی اور اس پر اپنی تجاویز دیں۔ مفتی صاحب نے اس رپورٹ کی ترتیب و تدوین میں سب سے زیادہ کام کیا تھا۔ لہٰذا علمی حلقوں میں ان کی علمی، فکری اور سیاسی صلاحیتوں کا ایک اور مظاہرہ ہوا"۔ (۷۱)

ڈاکٹر احمد حسین کمال صاحب نے اس کا تذکرہ یوں کیا ہے۔ "یہ رپورٹ جمعیت کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس رپورٹ سے ہی مفتی محمود کی شخصیت کے مفکرانہ اور قائدانہ جوہر کھل کر سامنے آئے ہیں"۔ (۷۲)

جہاد کانفرنس کا انعقاد

مولانا مفتی محمود، قافلہ شاہ ولی اللٰہی کے ایک عظیم فرد تھے۔ بر صغیر میں "آزادی ہند" کے لئے جتنی بھی تحریکیں اُٹھیں ان سب سے آپ کا تعلق رہا ہے۔ اپنے اکابرین "علماءِ دیوبند" کے واسطے سے آپ قافلہ حریت کے ایک سپاہی رہے تھے۔ جن کا مقصد بر صغیر کی آزادی اور قرآن وسنت کی ترویج واشاعت تھی۔ شہداء بالاکوٹ اور ان کی عظیم تحریک جہاد کے آپ نہ صرف حامی تھے بلکہ ان کے معتقدین و محبین میں اپنے آپ کو شمار کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

اسی طرح ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس میں حصہ لینے والوں سے آپ کو گہری عقیدت تھی۔ اور اس تحریک کو بر صغیر کی آزادی کے لئے سنگ میل قرار دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے سو سال مکمل ہونے پر آپ ہی کی تحریک و تجویز پر اور آپ ہی کے زیر اہتمام جمعیۃ علماء اسلام مغربی پاکستان نے ان کی یاد میں ایک عظیم الشان کانفرنس ملتان میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں جناب ڈاکٹر احمد حسین کمال صاحب لکھتے ہیں۔ "مفتی محمود اور ان کے رفقاء کار نے ۲۸، ۲۹ اور ۳۰ر جون ۱۹۵۷ء کو ملتان میں ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت کی یادگار کے طور پر ایک عظیم الشان کانفرنس "جہاد کانفرنس" کے عنوان سے منعقد کرنے کا اہتمام کیا"۔ (۷۳)

کانفرنس کا مقصد جہادِ آزادی کے مجاہدین کو خراج تحسین پیش کرنا اور نوجوان نسل کو ان کی قربانیوں اور فداکاریوں سے روشناس کرانا تھا۔ تاکہ نسل نو کا اپنے اکابرین سے تعلق، ناطہ برقرار رہے۔ اور تاکہ وہ اپنے بزرگوں کے کارناموں پر فخر کر سکیں۔ اور یہ کہ جدید نسل کے

دلوں میں آزادی کی قدر و منزلت کو جاگزیں کیا جا سکے۔ کہ آزادی صرف خواہشات اور نعروں سے نہیں ملتی بلکہ جان و مال کی قربانیوں کے جذبے سے قوموں کو دنیا میں باوقار مقام ملتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے اکابرین کے کارنامے لازوال ہیں۔

"فیملی لاز" کو خلاف اسلام ثابت کرنے کی مساعی

۱۹۵۶ء کا آئین وہ پہلا آئین تھا جو ملک کو دیا گیا۔ یہ آئین ابھی صرف دو سال پورے کر چکا تھا۔ کہ ملکی سیاست میں شدید بحران اور زندگی کے تمام شعبہ جات میں ابتری، اقتصادی زبوں حالی، مہنگائی اور افلاس نے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس میں سب سے بڑا ہاتھ پاکستان کے گورنر جنرل سے صدر مملکت بننے والے سکندر مرزا کا تھا۔ اُس نے ان حالات میں اپنی صدارت کو بچانے اور آئین سے ماوراا ختیارات کے حصول کی خاطر آئینی اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے ۱۹۵۶ء کے آئین کو منسوخ کر دیا۔ اور ملک میں پاکستان کا سب سے پہلا مارشل لاء نافذ کر دیا۔ یوں پاکستان کو سرزمین بے آئین کر کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے اختیارات سنبھال لئے۔ لیکن وہ اپنے منصوبہ میں ناکام رہا۔ وہ ابھی اپنی گرفت مضبوط نہ کر سکا تھا۔ کہ بری فوج کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان نے اسلحہ کی نوک پر سکندر مرزا سے استعفیٰ لے لیا اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے سربراہ مملکت کے اختیارات بھی خود سنبھال لئے۔ ان کے دورِ اقتدار میں فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ پاکستان میں پارلیمانی نظام ناکام ہو چکا ہے۔ اس لئے آئندہ کے لئے ملک میں صدارتی نظام کے طرز کا آئین بنایا جائے گا۔

۷ر فروری ۱۹۶۰ء کو جنرل محمد ایوب خان، پاکستان کا صدر بنا۔ دوسرے دن انہوں نے صدر پاکستان کے طور پر حلف اُٹھایا۔

دراصل ۵۶ء میں حکومت پاکستان نے ایک کمیشن قائم کیا تھا۔ اور اس کا مقصد یہ قرار گیا تھا کہ قانون رائج الوقت میں عورتوں کو وہ حقوق نہیں دیئے گئے ہیں جن سے ان کی ومیت کا ازالہ ہو سکے۔ اس کمیشن کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ عورتوں کے مسائل کے سلسلہ میں نی سفارشات پر مشتمل رپورٹ مرتب کرے۔ بقول مفتی محمود صاحب کے۔

> بد قسمتی سے اس کمیشن کے ارکان ایسے نہ تھے جو کتاب و سنت کے براہ راست عالم ہوں یا قرآن و سنت اور ارشادات نبوی ﷺ کے منشاء سے واقف ہوں۔ جو صحابہ کرامؓ اور فقہاء مجتہدین اُمت کے علوم کے حامل ہوں۔ غرضیکہ اس کمیشن کے سارے اراکین میں سے سوائے ایک مولانا احتشام الحق تھانوی کے کوئی بھی عالم دین نہ تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب کمیشن نے اپنی رپورٹ حکومت کے سامنے پیش کی تو اس عالم دین رکن نے اس رپورٹ سے اختلاف کرتے ہوئے ایک اختلافی نوٹ لکھا ہوا تھا۔ (۷۴)

عائلی قوانین سے متعلق یہ سفارشات چونکہ قرآن و سنت کے خلاف تھیں اس لئے لک بھر کے علماء اور دیندار مسلمانوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ اس کے متعلق مولانا مفتی محمود فرماتے ہیں۔

> عوام کے اس ردّ عمل سے اس وقت کے آئینی حکومت کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اس رپورٹ پر عمل کرنے کے لئے کوئی اقدام کرتی لہٰذا وہ رپورٹ معرض التواء میں ڈال دی گئی اور اس پر عمل درآمد کرنے کے لئے اس کے بعد بدقسمتی سے ہمارے ملک میں آئینی حکومت ختم ہوئی اور کوئی صورت نہ کی جا سکی۔ (۷۵)

فروری ۶۰ء میں اس کے لئے جسٹس شہاب الدین کی سربراہی میں ایک آئینی کمیشن بنایا گیا جس نے ۶ مئی ۶۱ء کو اپنی سفارشات حکومت کو پیش کر دیں۔ یکم مارچ ۶۲ء کو مارشل لاء کے خاتمہ کا اعلان کر کے ۱۹۶۲ء کا دستور نافذ کیا گیا۔ اپریل ۶۲ء میں بی۔ ڈی سسٹم کے ذریعہ قومی اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ مولانا مفتی محمود نے ڈیرہ اسماعیل خان کی واحد نشست سے اس میں

حصہ لیا۔ اور آپ قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ مفتی محمود نے قومی اسمبلی میں عائلی قوانین جس کو محمد ایوب خان کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے ایک آرڈیننس کے ذریعہ اس سے پہلے ملک میں نافذ کر دیا تھا۔ اور اب اس کو ۶۲ء کے آئین کا حصہ بنایا گیا تھا۔ آرڈی ننس کی صورت میں نافذ کرنے کے بعد جمعیۃ علماء اسلام جس نے مارشل لاء کی وجہ سے سیاسی پارٹیوں پر پابندی کی وجہ سے اب اپنا کام نظام العلماء کے نام سے جاری رکھا تھا۔ کے مجلس شوریٰ نے اس آرڈیننس کے ایک ایک دفعہ کا ایک سب کمیٹی کے ذریعہ جائزہ لیا اور ان کو خلاف "قرآن و سنت" قرار دیا۔ اس کے ضمن میں مفتی محمود صاحب لکھتے ہیں۔

> مجلس شوریٰ نظام العلماء، مغربی پاکستان نے مسلم فیملی لاز آرڈیننس کے بارے میں تجویز تو پاس کر دی مگر اس آرڈیننس کی دفعات پر علمی روشنی میں تبصرہ کرنے کے لئے جید علماء کی ایک سب کمیٹی مرتب کی۔ جس کے لئے حضرت اقدس مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مہتمم مدرسہ سراج العلوم سرگودھا، حضرت اقدس مولانا سیّد میرک شاہ صاحب اندرابی شیخ الحدیث جامعہ مدنیہ لاہور، حضرت مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی خطیب جامع مسجد منڈی بہاؤالدین ضلع گجرات، حضرت مولانا قاضی عبد الکریم صاحب مہتمم مدرسہ نجم المدارس کلاچی ضلع ڈیرہ اسماعیل خان، حضرت مولانا ضیاء الحق صاحب سابق مدرس جامعہ اشرفیہ لاہور کے اسماء گرامی تجویز ہوئے اور ناظم حضرت مولانا مفتی محمود صاحب صدر مدرّس مدرسہ قاسم العلوم ملتان قرار پائے۔(۷۶)

اس کمیٹی نے جو رپورٹ مرتب کی۔ اس میں فیملی لاز آرڈیننس کے ایک ایک دفعہ کو زیر غور لا کر اس کو قرآن و سنت کے خلاف قرار دیا۔ اور حکومت سے درخواست کی کہ وہ اس کو نافذ کر کے پاکستان کے نو کروڑ مسلمانوں کے جذبات مجروح کر رہی ہے لہٰذا اس کو فوراً واپس لے۔ اسی رپورٹ میں ہے۔

> نظام العلماء مغربی پاکستان کے بیسیوں علماء نے قبل از وقت ان سے درخواست کی کہ ایسی غلطی نو کروڑ مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کر دے گی۔ مگر افسوس کہ انہوں نے کوئی پرواہ نہ کی اور آج مجلس شوریٰ نظام العلماء مغربی پاکستان کے اکیاسی ارکان اور مندوبین حکومت کی خدمت میں اس کے خلاف تجویز پیش کرنے پر مجبور ہوئے۔
> صدر محترم پاکستان کے جاری کردہ آرڈی نینس مسلم فیملی لاز آرڈیننس کی دفعات پر ترتیب وار تبصرہ کر کے یہ اجلاس نہایت نیک نیتی اور خیر خواہی کے جذبات سے ان پر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ یہ شریعت کے خلاف ہے اور اس کو منسوخ کرنے ہی میں ہماری سعادت ہے۔(۷۷)

ایک طرف نظام العماء مغربی پاکستان نے عائلی قوانین کو خلاف قرآن و سنت ثابت کر کے حکومت وقت سے اس کی منسوخی کا مطالبہ کیا تو دوسری طرف نظام العلماء کی ہدایات پر ان قوانین کے خلاف ملک گیر احتجاجی مہم شروع کر دی گئی۔ ردّ عمل کے طور پر جون ۱۹۶۱ء امیر نظام العلماء حضرت لاہوریؒ پر حکومت نے چھ ماہ کی پابندی لگا دی۔ ۱۵ر ستمبر ۱۹۶۱ء کو نظام العلماء کے امیر، مولانا احمد علی لاہوریؒ کے ایک اعلان کے مطابق حکومت کی طرف سے پابندی کی بنا پر مولانا مفتی محمودؒ کو اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ تیسری طرف مولانا مفتی محمود صاحب نے قومی اسمبلی کو ان قوانین کی منسوخی کی تجویز کا نوٹس دے دیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر احمد حسین کمال لکھتے ہیں۔

> مفتی محمود صاحب نے ۸ مارچ ڈھاکہ میں منعقد ہونے والے قومی اسمبلی کے اجلاس میں عائلی قوانین کو منسوخ کرانے کی تجویز کا نوٹس دیا۔ اور اس مقصد کے لئے ملک بھر میں احتجاجی مہم جاری کی گئی۔ چنانچہ سارے ملک میں بڑے بڑے جلسے جمعیۃ علماء اسلام کے زیر اہتمام منعقد ہوئے۔ صدر، اسپیکر اور ارکان اسمبلی کو محضر نامے بھیجے گئے۔(۷۸)

مفتی محمود صاحب نے قومی اسمبلی کے ایوان میں اپنی عالمانہ اور فاضلانہ تقریر میں عائلی قوانین کے خلاف اسلام دفعات کو قرآن وحدیث اور ائمہ اربعہ اور فقہ جعفریہ کی کتب کے حوالوں سے خلاف اسلام ثابت کیا۔ آپ کی اس تقریر کے بارے میں نعیم آسی رقمطراز ہیں۔

> مفتی صاب نے اس موقع پر ایک معرکۃ الآراء تقریر کی جو ایک گھنٹہ دس منٹ تک جاری رہی جس میں اسلام کے عائلی نظام کا ایک ایک گوشہ زیر بحث آیا۔ تمام ایوان اس ایمان افروز تقریر کی زد میں بہہ رہا تھا۔ اس مسئلہ پر حکومت کی شکست یقینی ہوگئی۔ مگر اقتدار کے فرمانبردار ڈپٹی اسپیکر نے کمال ہنرمندی سے کام لے کر رائے شماری کو اگلے وقت پر ڈال دیا۔ (۷۹)

مفتی محمود کی قومی اسمبلی کی اس تقریر سے حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ آیا اور حکومت حد درجہ پریشان ہوئی ایوب خان کی شہرت کو نقصان پہنچا۔ ادھر جمعیۃ علماء اسلام کے علماء کی اسلامی نظام کے نفاذ کی مخلصانہ جدوجہد کا اعتراف عوام وخواص سب نے کیا۔ نعیم آسی لکھتے ہیں۔

> اس دوران حکومت اگرچہ "ضمیر فروش نمائندگان قوم" کا ضمیر خرید کر اس "لعنت" کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوگئی۔ لیکن عوامی سطح پر ایوب خان کی شہرت کو جو نقصان پہنچا۔ خود ایوب خان نے اپنی خود نوشت میں دو جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ (۸۰)

مفتی محمود کا وفاق المدارس العربیہ کے قیام وتنظیم میں کلیدی کردار

دینی مدارس، قرآن وحدیث، فقہ اور دیگر دینی علوم کی اشاعت کے اہم مراکز ہیں۔ نہایت بے سروسامانی، اور مادی اسباب کی کمیابی کے باوجود ان مدارس نے اُمت مسلمہ کی رہنمائی کا فریضہ بہرحال انجام دیا ہے۔ مسلمان بچوں، بچیوں کی تعلیم وتربیت، شرعی وفقہی معاملات میں قوم کی رہنمائی اور دینی شعائر کی حفاظت ونگہداشت یہ ان کے قیام کے مقاصد میں شامل ہیں۔ اور وہ کبھی ان ذمہ داریوں سے غافل نہیں رہی ہیں۔ کسی حکومتی سرپرستی اور امداد وتعاون کے بغیر

رف اہل خیر کی مالی مدد سے یہ مدارس تعلیم وتربیت کا فرض ادا کررہی ہیں۔ ہر دور کے حکمرانوں نے ان مدارس سے خوف محسوس کیا ہے۔ اور اپنے اقتدار کے لئے ان کو خطرہ شمار کیا ہے اور رس اور ان کے منتظمین ومتعلقین کے لئے مشکلات کا باعث بنے ہیں۔ اس کے علاوہ وقت کے ضوں اور جدید عصری علوم کی مفید ہونے کی صورت میں تمام مدارس میں یکساں نصاب اور اس میں ضروری ردّوبدل بھی لازمی امر بن چکا تھا۔ لیکن ان کا باقاعدہ تنظیم نہ ہونے کی وجہ سے یہ اپنے دفاع اور اپنے مقاصد میں خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں کرپارہے تھے۔ اب تک ان کے مفادات کی حفاظت اور حکومتی اداروں کی طرف سے مخالفت کا مقابلہ بساط بھر جمعیۃ علماء اسلام (اور مارشل لاء کی پابندیوں کی صورت میں "نظام العلماء") کرتی رہی۔

اب ضرورت تھی کہ ان کو ایک تنظیم میں منظم کیا جائے۔ جس کے لئے درج ذیل اہم مقاصد قرار دیئے گئے۔ بقول مولانا مفتی محمودؒ کے۔

(اُ) یہ وفاق مندرجہ ذیل درجات کے لئے ایک جامع نصاب مرتب کرے گا۔ (۱) ابتدائی (۲) وسطانی (۳) فوقانی (۴) درجہ تکمیل

(ب) مروّجہ نصاب تعلیم میں جدید تقاضوں کے مطابق مناسب وموزوں تصرف کرے گا۔ اور بوقت ضرورت مناسب کتابیں طبع کرائے گا۔

(ج) یہ وفاق ابتدائی، وسطانی اور فوقانی مدارس میں باہمی اتحاد اور ربط پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور اُن میں کاملاً تنظیم کرے گا۔

(د) وہ مدارس جو اس وفاق سے الحاق کریں گے۔ ان میں نصاب تعلیم، نظام تعلیم اور امتحانات میں یکجہتی، باقاعدگی اور ہم آہنگی پیدا کریگا۔

(ہ) جدید عصری تقاضوں کے مطابق تعلیمات اسلامیہ کی ترویج ونشر واشاعت کرے گا۔ اور اہم موضوعات پر مستند اور تحقیقی کتابیں، تصنیف وتالیف کرے گا۔

و) یہ وفاق مدارس دینیہ کے احیاء، بقاء اور ترقی کے لئے صحیح اور موثر ذرائع اختیار کرے گا۔ (۸۱)

ابتداء میں یہ تنظیم کن مراحل سے گزری اور اس کی تنظیم کو کس طرح مختلف مراحل میں منظم کیا گیا۔ مولانا مفتی محمود صاحب اس سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہیں۔

ان مقاصد کے پیش نظر مدارس دینیہ کی شیرازہ بندی اور تنظیم کی ضرورت نہ صرف محسوس کی جارہی تھی بلکہ ان کی شیرازہ بندی اور تنظیم جدید کو وقت کا اہم مسئلہ تسلیم کیا گیا اور ۲۰ر شعبان ۱۳۷۸ھ (یکم مارچ ۱۹۵۹ء) کو خیر المدارس ملتان کی مجلس شوریٰ کے سالانہ اجلاس میں مولانا شمس الحق افغانی کی تحریک پر حصول مقصد کی خاطر عملی اقدامات کے لئے ۱۵ اراکین پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی۔ اور مولانا خیر محمد صاحب کی تحریک پر اس کمیٹی کا کنوینر مولانا احتشام الحق تھانوی کو مقرر کیا گیا۔ (۸۲)

مولانا مفتی محمود نے یہ تمام تفصیل اپنے ایک مضمون بعنوان "وفاق کی ضرورت اور اس کا پس منظر" میں لکھی ہے۔ جس کو ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور نے ج ۶، شمارہ ۴۸ (۲۱ر شوال المکرم ۱۳۸۰ھ مطابق ۷ر اپریل ۱۹۶۱ء) میں شائع کیا ہے۔ مفتی محمود صاحب مزید رقمطراز ہیں۔

متذکرہ بالا کمیٹی کے کنوینر کی حیثیت سے جو ذمہ داریاں مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی پر عائد ہوئی تھیں۔ انہی کے پیش نظر مولانا نے ۲۲، ۲۳، ۲۴ر شوال ۱۳۷۸ھ (مطابق یکم، ۲، ۳ر مئی ۱۹۵۹ء) کو دارالعلوم الاسلامیہ (اشرف آباد) ٹنڈو اللہ یار میں مشرقی و مغربی پاکستان کے مشاہیر علماء و صلحاء اُمت کی ایک نمائندہ تعلیمی و تنظیمی کانفرنس منعقد کی اس کانفرنس میں مسلسل دو دن تک ان تمام مسائل پر تبادلہ خیال ہوا۔ جن کا تعلق مدارس دینیہ کے نظم و نسق، درس و تدریس، نصاب و تربیت سے تھا۔

بالآخر بہ اتفاق آراء یہ طے پایا کہ آغاز کار کے لئے حسب ذیل چھ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل عمل میں لائی جائے جس کا نام "مجلس تنظیم مدارس عربیہ" ہو۔
(۱) مولانا خیر محمد صاحب جالندھری۔ ملتان (۲) مولانا شمس الحق افغانی۔ پشاور (۳) مولانا احمد علی صاحب۔ لاہور (۴) مولانا محمد ادریس کاندھلوی۔ لاہور (۵) مولانا محمد صادق۔ بہاولپور (۶) مولانا احتشام الحق۔ کراچی۔
اس کمیٹی کا صدر مولانا خیر محمد صاحب کو منتخب کیا گیا۔ اور صدر کو اس بات کا کلی استحقاق دیا گیا ہے کہ وہ اپنی صوابدید پر کمیٹی کے اراکین کی موجودہ تعداد میں مناسب و موزوں اضافہ کریں۔ (چنانچہ مزید سات اراکین کا اضافہ کیا گیا)۔ (۸۳)

مفتی صاحب مزید لکھتے ہیں۔

ان اراکین پر مشتمل کمیٹی کا پہلا اجلاس ۲۵، ۲۶ر مئی ۱۹۵۹ء اور دوسرا اجلاس ۲۴، ۲۵ر جون ۱۹۵۹ء کو مدرسہ خیر المدارس ملتان میں منعقد ہوا۔ اور مجلس کے لئے ۱۸، ۱۹ر اکتوبر ۱۹۵۹ء کی تاریخ طے کر دی گئی۔ احقر (مولانا مفتی صاحب) نے ان اجلاسوں میں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے نمائندہ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ بعد ازاں ۱۴، ۱۵ر ربیع الثانی ۱۳۷۹ھ مطابق ۱۸، ۱۹ر اکتوبر ۱۹۵۹ء تمام مدارس ملحقہ کے نمائندگان کی مجلس شوریٰ بلائی گئی۔ جس میں دستور وفاق کی منظوری کے ساتھ ساتھ تین سال کے لئے عہدیداران کا انتخاب بھی عمل میں لایا گیا۔ حضرت مولانا شمس الحق صاحب کو صدر، حضرت مولانا خیر محمد صاحب ملتان اور حضرت مولانا سیّد یوسف بنوری کو نائب صدر اور احقر محمود عفا اللہ عنہ کو ناظم منتخب کیا گیا۔ (۸۴)

وفاق المدارس العربیہ کی تشکیل کے بارے میں جناب ڈاکٹر احمد حسین کمال کی رائے یہ ہے کہ یہ کارنامہ بھی نظام العلماء نے انجام دیا ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں۔

ایوبی مارشل لاء کی صورت میں جب سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی تو جمعیۃ کے اکابرین نے اپنے دینی و مذہبی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے نظام العلماء کے نام سے اپنا کام جاری رکھا۔

آپ مزید لکھتے ہیں۔

ایوب خان کے مارشل لاء کا دور ایسا تھا کہ سیاسی جماعتوں کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگادی گئی جس کی زد میں جمعیۃ علماء اسلام بھی آگئی۔ اکثر سیاستدانوں کو پابند سلاسل کر دیا گیا۔ چونکہ جمعیت علماء اسلام کا کاز بنیادی طور پر اسلام تھا۔ اور اس مقصد کے لئے اُسے بہر حال کسی نہ کسی طور پر کام کرنا تھا۔ پرانے حالات کی نسبت نئے حکمرانوں سے اسلام کے بارہ میں زیادہ خطرہ بھی لاحق ہو سکتا تھا۔............ چنانچہ اس احساس نے ہی ایک بار پھر ملتان کے علماء کو پاکستان کے موجودہ حالات پر سنجیدگی سے غور کرنے پر آمادہ کیا۔ مئی ۱۹۵۹ء کے اوائل میں مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے سالانہ جلسہ کے موقعہ پر مفتی محمود کی دعوت وایماء سے اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم سرگودھا کی صدارت میں علماء کا ایک مشاورتی اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں طے کیا گیا کہ "نظام العلماء" کے نام سے فوراً ایک جماعت تشکیل دی جائے۔(۸۵)

یہ تو ڈاکٹر کی رائے میں نظام العلماء کی تنظیم کی بات تھی کہ وہ کن حالات میں ہوئی اب آگے وہ وفاق المدارس العربیہ کی تشکیل کی وجہ بتاتے ہیں۔ نظام العلماء کے عہدیداروں کے انتخاب کے لئے حضرت مولانا احمد علی لاہوری کی دعوت پر ۲۳رجون ۱۹۵۹ء کو لاہور میں اجلاس طلب کیا گیا۔ اس میں عہدیداروں کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ اور مولانا مفتی محمود کی سرکردگی میں ایک کمیٹی نے نظام العلماء کا دستور اجلاس میں پیش کیا۔ بعض ترمیمات کے ساتھ اس کی منظوری دی گئی۔ اس کے بعد ڈاکٹر احمد حسین کمال لکھتے ہیں۔

"نظام العلماء" نے دو کاموں کی طرف فوراً توجہ کی ایک تو مدارس دینیہ کو ایک مرکز پر جمع کرنا تا کہ اسلام کے یہ قدیم اور بنیادی قلعے جدید حالات کا شکار نہ بن جائیں اس مقصد کے لئے "وفاق المدارس" کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد رکھی۔ دوسرے مارشل لاء حکومت پر عوامی دباؤ ڈالنا کہ وہ مجوّزہ آئین اسلامی خطوط پر بنائے۔(۸۶)

"مولانا مفتی محمود صاحب اس کے اوّلین ناظم اعلیٰ رہے اور مولانا محمد یوسف بنوری کے انتقال کے بعد تادم واپسیں وہ اس کے صدر رہے"۔(۸۷)

اسی طرح جناب محمد نعیم آسی صاحب نے وفاق المدارس کی تنظیم کو مولانا مفتی محمود کا کارنامہ بتایا ہے۔ نیز اس نے لکھا ہے کہ وفاق المدارس العربیہ کی تنظیم سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مدارس کے نظام تعلیم اور نصاب تعلیم میں جو ضُعف اور انحطاط آ چکا ہے اس کی اصلاح ہو۔ اور اس تنظیم کی طرف سے ابتداء میں مدارس کو ایسی تجاویز دی جائیں کہ وہ نظام اور نصاب دونوں کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر لیں۔ تا کہ طلباء کی ذہنی استعداد کو مزید بڑھایا جا سکے۔ اس سلسلے میں محمد نعیم آسی صاحب لکھتے ہیں۔

انگریز نے علماء کا وقار ختم کرنے کے لئے جو چالیں چلیں اور اُن سے جو نقصان ہوا وہ ہندوستان کی سیاسی و دینی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ یہ دین مصطفےٰ ﷺ کی صداقت کی دلیل ہے۔ کہ انگریز کی تمام ترکوششوں کے باوجود بفضلہٖ تعالیٰ پورے برصغیر میں جابجا مدرسے اور مسجدیں آج بھی انہی علماء کے دم قدم سے آباد ہیں۔ مگر مدارس دینیہ کے نصاب و نظام تعلیم میں جو ضعف و انحطاط پیدا ہو چکا ہے۔ اس کو نظر انداز کرنا اور اسکی اصلاح نہ کرنا دلیل دانائی نہیں۔ کوئی دانا و بینا شخص جسے دین کے ساتھ کچھ بھی ہمدردی ہے وہ اس صورت حال کو جوں کا توں رکھنے کے لئے تیار نہ ہو گا۔ مولانا مفتی محمود کو قدرت نے حساس دل اور ہر لحظہ متحرک جسم سے نوازا ہے۔ انہوں نے اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی اور ۱۹۵۸ء میں مغربی پاکستان کے اُن تمام مدارس دینیہ کا جن کا فکری رشتہ مادر علمی دارالعلوم دیوبند سے وابستہ تھا ملتان میں ایک اجلاس بلایا۔ مغربی پاکستان کے سرکردہ علماء نے مدارس کی اصلاح وترقی کے لئے "وفاق المدارس العربیہ" کے نام سے ایک تنظیم کی داغ بیل ڈالی۔ جسے ایک طرح کی دینی یونیورسٹی کہنا چاہیئے۔ مولانا مفتی محمود یوم تاسیس سے اب تک اس کے جنرل سیکرٹری چلے آرہے ہیں۔(۸۸)

وفاق المدارس العربیہ کے مقاصد میں یہ بھی تھا کہ دینی مدارس میں پڑھایا جانے والا نصاب اور اس سے متعلقہ کتابیں جو قدیم عرصہ سے زیر تدریس رہی ہیں۔ اور خاص کر حکمت و فلسفہ کی وہ کتابیں جو جدید تحقیق کی رُو سے ان کے نظریات کو باطل قرار دیا گیا ہے۔ اور جدید دور کے تقاضوں کے مطابق ان کی تعلیمات اب فرسودہ ہو چکی ہیں۔ اس لحاظ سے درس نظامی کے نصاب میں اصلاح بہت ضروری ہو گئی تھی۔ وفاق المدارس العربیہ نے کافی حد تک اس میں پیش رفت کی ہے۔ اور یہ سب مفتی صاحب کی دلچسپی سے ممکن ہوا ہے۔ مدرسہ صولتیہ مکّہ مکرمہ کے جناب مولانا محمد مسعود شمیم صاحب لکھتے ہیں کہ

> (مفتی محمود نے) مدرسہ صولتیہ کے حالات، تاریخی پس منظر، امتحانات، نصاب تعلیم اور طلبہ کی ذہنی وروحانی تربیت واستعداد کے متعلق بے حد دلچسپی اور تعمق کے ساتھ استفسارات فرمائے۔ خاص طور پر مدرسہ صولتیہ میں نحو، صرف، بلاغت، ادب اور عربی زبان سے متعلق داخل کتب کے متعلق متعدد بار بہت تفصیل سے معلوم کیا اور مجھے حکم دیا کہ یہ سب کتابیں جمع کر کے ان کو دکھاؤں........ ....اور (انہوں نے) تمام کتابوں کو صاحب فن اور اُستاد علم کی نظر سے دیکھا۔ بعض کتابوں کے نسخے ساتھ لیجانے کے لئے فرمایا مجھے خوب یاد ہے۔ کہ مفتی صاحب نے فرمایا کہ ہم پاکستان میں وفاق المدارس العربیہ قائم کر رہے ہیں۔ اور اس کے لئے بے حد جامع اور مفید نصاب تعلیم کا مسئلہ زیر غور ہے۔ نحو، صرف، بلاغت، ادب اور عربی زبان کی جو کتابیں مدرسہ صولتیہ میں زیر تدریس ہیں۔ وہ واقعی قابل استفادہ ہیں۔ ہم بھی ان کو نصاب میں لانے کی کوشش کریں گے۔ (۸۹)

مولانا محمد مسعود شمیم صاحب نے یہ لکھا ہے کہ مفتی صاحب کی خواہش تھی کہ فارغ التحصیل طلبہ کو "اظہار الحق" کتاب پڑھائی جائے۔ بقول مولانا محمد مسعود شمیم صاحب مفتی صاحب نے اس موقعہ پر فرمایا۔

> عجیب پریشان کن صورت حال ہے کہ ہر جگہ عیسائی مشنری اور مسیحی کار فرمائیاں اور پادریوں کا زیر زمین اثر ورسوخ کام کر رہا ہے۔ اگر یہی صورت حال باقی رہی تو نہ معلوم چند سال کے بعد حالات کیا رُخ اختیار کر جائیں ایسے حالات میں میری اور میرے رفقاء کی متفقہ رائے ہے۔ کہ وفاق المدارس العربیہ کے نصاب میں فارغ التحصیل طلباء کو حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ بانی مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کی ردّ عیسائیت اور ابطال نصرانیت میں عظیم کتاب "اظہار الحق" پڑھائی جائے۔ چونکہ یہ کتاب اپنے موضوع پر ہی منفرد نہیں بلکہ اسلام اور دین کے بنیادی عقائد کا بھی تحفظ ودفاع کرتی ہے۔ جو ان حالات میں بے حد ضروری ہے۔ (۹۰)

مولانا مفتی محمود، وفاق المدارس کے پلیٹ فارم سے ایسی تجاویز پیش کرنا چاہتے تھے کہ عصری درسگاہوں میں دینی علوم کو شامل کیا جائے۔ اس بارے میں مولانا اسفندیار صاحب کراچی نے لکھا ہے۔

> اسلامی تعلیمات اور علوم کے فروغ کے لئے ان کی (مولانا مفتی محمود) خواہش تھی کہ عصری درسگاہوں کے نصاب میں ان علوم کو بھی شامل کیا جائے تا کہ قوم کے بچے صحیح معنوں میں مسلمان بن سکیں۔ لیکن دینی درس گاہوں میں وہ عصری تعلیم کے خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ دینی مدارس سے محدّث، مفسّر، مفتی اور خطیب پیدا ہوں۔ اور اس کے لئے انہوں نے کوششیں بھی کیں۔ دینی مدارس کے معیار کو بلند کرنے کے لئے انہوں نے ایک بورڈ "وفاق المدارس العربیہ" قائم کیا تھا۔ اور چاہتے تھے کہ ہر مدرسہ اس بورڈ میں شامل ہو جائے۔ اس بورڈ میں اس وقت پانچ سو مدارس ہیں۔

"اس تنظیم کا ایک مقصد یہ بھی تھا۔ کہ تمام رجسٹرڈ مدارس کے طلباء کے لئے اس کی حیثیت ایک امتحانی بورڈ کی ہو گی۔ اس غرض کے لئے وفاق المدارس العربیہ نے ۱۹۶۰ء میں درس نظامی کی سند کا باقاعدہ اجراء کیا"۔ (۹۲)

روزنامہ جنگ کے نمائندہ خصوصی جناب محمود شام کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے مفتی محمود صاحب نے فرمایا۔ "وفاق میں ۲۰۰ مدارس ہیں پرائمری حصہ نکال کر نصاب آٹھ سال کا ہے۔ فائنل امتحان کے بعد "سند الفراغ من العلوم من المدارس العربية الاسلامية" دی جاتی ہے"۔(۹۳)

پھر مفتی صاحب نے اس پر بس نہیں کیا بلکہ اس سند کو ایم۔اے (عربی، اسلامیات) کے مساوی قرار دینے کے لئے حکومت سے رابطے شروع کئے۔ قومی اسمبلی میں قرار داد کی صورت میں اس مسئلہ کو زیر بحث لائے۔ وہ خود اسی انٹرویو میں تفصیل سے بتاتے ہیں۔

وفاق المدارس کی سند کو یونیورسٹی کے ایم۔اے عربی اور اسلامیات کا درجہ دیا جائے۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ ہمارے مدارس کے فاضل عربی اور اسلامیات، یونیورسٹی کے ایم۔اے عربی یا اسلامیات سے زیادہ لائق وفائق ہوتا ہے۔ اور وہ کامیاب مدرس کی حیثیت سے فرائض انجام دے سکتا ہے۔ تو اس سند کو کیوں نہ ایم۔اے کا درجہ دیا جائے۔(۹۴)

مفتی صاحب بتا رہے تھے۔

ہم نے قومی اسمبلی میں یہ قرار داد پیش کی کہ وفاق کے فارغ افراد کو ایم۔اے کا درجہ دیا جائے۔ ایک سال تک یہ قرار داد چلتی رہی مختلف رپورٹیں مانگی گئیں۔ یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں نے بھی رپورٹ دی۔ اب یہ سفارش کی گئی کہ ایسی صورت میں بی۔اے انگریزی مضامین پاس کرنا ضروری ہونے چاہئیں۔(۹۵)

مفتی صاحب اور قومی اسمبلی کے دیگر جماعتی ممبروں کی کاوشیں بہت بعد جنرل ضیاء الحق کے دور میں کامیاب ہوئیں۔ اور اس وقت کے ایک قومی و سرکاری ادارے "یونیورسٹی گرانٹس کمیشن آف پاکستان" نے باقاعدہ اس کا نوٹیفیکیشن جاری کیا اور دینی مدارس کے اسناد کو "شهادة العالمية" کا نام دے کر وفاق المدارس العربیہ سمیت دینی مدارس کے مختلف مسالک

متعلق امتحانی بورڈ سے جاری اسناد کو ایم۔اے عربی و اسلامیات کے مساوی قرار دیا۔ عربی و اسلامیات کی ٹیچنگ کے لئے اور اس میں ایم۔فل، پی ایچ۔ڈی کے لئے تو کسی اضافی تعلیمی قابلیت کی شرط نہیں لگائی مگر دیگر اداروں اور مضامین میں ملازمت کے لئے بی۔اے کے دو ایڈیشنل مضامین کے پاس کرنے کو لازمی قرار دیا گیا۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب کی پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت میں جب مدارس کو سرکاری تحویل میں لئے جانے کی باتیں شروع ہوئیں۔ تو اس کی مزاحمت بھی وفاق المدارس کے پلیٹ فارم سے ہوئی۔ اور مفتی صاحب نے ناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ کی حیثیت سے دیگر علما کو ایک تنظیم میں شامل ہونے اور اور حکومتی کوششوں کے خلاف مزاحمت کی دعوت دی۔

ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور نے مفتی صاحب کے ایک پریس کانفرنس کے حوالہ سے لکھا ہے۔ "چنانچہ اتحاد المدارس العربیہ کے نام سے ایک تنظیم قائم کر دی گئی تھی جس میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث مسالک کے مہتمم اور ذمہ دار لوگ موجود تھے انہوں نے ایک قرارداد کے ذریعہ حکومت کو متنبہ کیا تھا کہ اگر ایسی کوئی کوشش کی گئی تو اس کی مزاحمت کی جائے گی"۔(۹۶) "اور اپنے طور پر بھی آپ نے حکومتی ذمہ داروں سے بات کی۔ حتیٰ کہ ایک دفعہ اسی موضوع پر وزیر اعظم پاکستان جاب ذوالفقار علی بھٹو سے بھی ملے۔ اور جب تک ان سے یہ یقین دہانی حاصل نہ کر لی۔ کہ حکومت کا کوئی ایسا ارادہ و پروگرام نہیں ہے۔ کہ وہ دینی مدارس کو حکومتی تحویل میں لے مفتی صاحب چین سے نہیں بیٹھے"۔(۹۷)

تحفظ دینی مدارس کے سلسلے میں مشہور اہل حدیث عالم مولانا معین الدین لکھوی، مفتی صاحب کو یوں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

دینی مدارس کو حکومت کی دستبرد سے بچانے کے لئے اس تحریک کے بانی مفتی صاحب مرحوم ہی تھے۔ اور ہم ان کے دست وبازو اور رفقائے کار۔ چنانچہ حکومت کو اپنا ارادہ

تبدیل کرنا پڑا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مفتی صاحب مرحوم کی پوری ملت کو ایک پلیٹ فارم پر مجتمع کرنے کی یہ پہلی کوشش تھی جو کامیاب رہی اور صیانت و حفاظت علم کا مبارک کارنامہ مفتی محمود مرحوم کے ہاتھوں انجام پایا۔(۹۸)

دینی مدارس کو ایک ملک گیر تنظیم کی صورت میں منظم کرنا۔ امتحانات کا ایک باقا[عدہ] اور یکساں نظم قائم کرنا، دینی مدارس کے نظام و نصاب میں جدید دور کے تقاضوں کے مطابق اضافہ و ترمیم اور حکومتی دستبرد سے مدارس کی حفاظت یہ سب مفتی صاحب کے عظیم کارنامے ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا قاضی عبدالکریم صاحب آف کلاچی آپ کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

ملک میں اپنی نوعیت کی واحد تنظیم وفاق المدارس العربیہ کی نظامت عُلیا کے لئے آپ کا انتخاب اور اسی عہدہ پر سالہا سال تک برقراری اکابر علماء پاکستان کی جانب سے آپ کی تنظیمی اور تعلیمی صلاحیتوں کا کُھلا اعتراف ہے۔ سالہا سال تک آزاد عربی مدارس کا اخلاقی ربط وضبط حتی کہ دورۂ حدیث میں یونیورسٹی کے طرز پر امتحانات کی یگانگت جو کہ آزاد عربی مدارس کی تاریخ میں ایک عجوبہ رُوزگار سے کم نہیں۔ یقیناً آپ کی علمی اور انتظامی استعداد کا ایک شاہکار ہے۔ مرکزی درسگاہوں اور اکابر علماء کے تعاون کے بغیر بلاشبہ یہ اہم کام انجام نہیں پاسکتا تھا۔ لیکن مختلف المسالک اکابرین کا اعتماد حاصل کر لینا یقیناً ایک ایسی خوش نصیبی ہے جس پر مفتی صاحب کو ناز کرنے کا حق ہے۔(۹۹)

آپ کو اللہ تعالیٰ نے بہترین انتظامی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ آپ نے اس تنظیم کو بڑی حد تک ملکی سطح پر منظم کیا۔ ہزاروں مدارس کو اس کا رکن بنایا۔ درس نظامی کے نصاب میں جدید عصری علوم کو جگہ دی۔ امتحانی نظام کو کافی حد تک شفاف بنایا۔ مدارس کے خلاف اُٹھنے والی آوازوں کا منہ توڑ جواب دیا۔ وقتاً فوقتاً ایسی حکومتی کوششوں کے لئے دیگر مدارس کے وفاقوں کو بھی ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے حکومتی کوششوں کے خلاف مزاحمت میں قائدانہ کردار ادا کیا۔

ب وہ مدارس حکومتوں کی مداخلت سے محفوظ ہیں۔ اور اللہ کرے کہ وہ محفوظ رہ کر دینی علوم دینی شعائر کی حفاظت کی خدمات انجام دیتی رہیں۔ آمین

البحوث الاسلامیہ جامعہ ازہر مصر کے اجلاسوں میں شرکت

مولانا مفتی محمود، ایک عالمگیر علمی شہرت کے مالک تھے۔ آپ کی دینی، علمی خدمات ایک عالم کو متاثر کر دیا تھا۔ اور آپ کی حق گوئی و بے باکی نے علمی دُنیا کو بہت حد تک معتقد بنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۶۴ء میں پہلی بار حکومت مصر کی دعوت پر آپ دیگر دو عالم ساتھیوں مولانا محمد یوسف صاحب بنوری اور مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب کے ہمراہ مصر تشریف لے گئے۔ اور وہاں اجلاسوں میں بحث مباحثہ میں حصہ لیکر مفتی صاحب اور آپ کے ساتھیوں نے نمائندگی کا حق ادا کر دیا۔

محمد نعیم آسی لکھتا ہے۔

اس اجتماع میں مختلف موضوعات و مباحث پر تحقیقی مقالے پڑھے گئے۔ اور ان مقالوں پر پوری آزادی سے جرح و تنقید اور بحث و تشریح کا سب ارکان کو موقع دیا گیا۔ اس سلسلے میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ "موجودہ دور میں کن وجوہات کے باعث اسلام کی اشاعت کمزور پڑ گئی ہے"۔ ایک مغرب زدہ سوڈانی عالم نے اس کا جواب دیتے ہوئے اپنے مقالے میں دو وجہیں بیان کیں۔

(۱) اسلام نے غلامی کو جائز رکھا ہے جس کی وجہ سے دنیائے کفر کو اسلام سے عداوت اور نفرت پیدا ہو چکی ہے۔

(۲) اسلام تعدد ازواج کی اجازت دیتا ہے اس کے باعث بھی یورپ اسلام سے بدظن ہو گیا ہے۔

سوڈانی عالم کے بیان کردہ نام نہاد وجوہ کے رد کا شرف پاکستانی علماء کو حاصل ہوا۔ مولانا مفتی محمود نے تعدد ازدواج اور مولانا غلام غوث ہزاروی نے غلامی والے حصہ پر بحث کی۔ ان دنوں علماء نے جس طرح وہاں اسلام کا حق نمائندگی ادا کیا علماء اسلام آج تک اس کو یاد کرتے ہیں۔(۱۰۰)

یہ کانفرنس اٹھارہ دن تک جاری رہی۔

مولانا مفتی محمود کے مصر کے اس پہلے دورہ کے بارے میں ڈاکٹر احمد حسین کمال نے جو تاثرات بیان کئے ہیں وہ یہ ہیں۔

جنوری ۱۹۶۴ء میں جامعہ ازہر کے ریکٹر کی طرف سے مولانا غلام غوث ہزاری اور حضرت مولانا مفتی محمود کو ازہر میں قائم ہونے والے ایک جدید اسلامی شعبہ کی تقریبات میں شرکت کی دعوت موصول ہوئی۔ ۵ مارچ کو یہ دونوں حضرات اور ان کے ساتھ مولانا محمد یوسف بنوری، قاہرہ تشریف لے گئے۔ اس دورہ میں مشرقی پاکستان کے مولانا تاج الاسلام بھی شریک تھے۔ مصر و حجاز کے اس دورہ نے جمعیۃ علماء اسلام کی آواز کو پاکستان سے باہر ملکوں تک پہنچایا۔ قائدین جمعیۃ کے اس دورہ کے اثرات بہت دور رس اور گہرے نکلے اور مستقبل کے واقعات پر اس کا اچھا اثر پڑا۔ بالخصوص عرب ملکوں کی پالیسی پاکستان کے بارے میں تبدیل ہونے لگی۔ جس میں اب تک پاکستان کی حکومتیں اور سیاسی پارٹیاں ناکام رہی تھیں۔(۱۰۱)

مولانا مفتی محمود کا مصر کا دوسرا دورہ بھی مجمع البحوث الاسلامیہ کے اجلاسوں میں اور اس کے بحث و مباحثہ میں شرکت کے پروگرام کے تحت ہوا۔ اس دورہ کی دعوت بھی حکومت مصر نے دی تھی۔ ڈاکٹر احمد حسین کمال، مفتی صاحب کے مصر کے دورہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

حکومت مصر کے زیر اہتمام جامعہ ازہر قاہرہ نے علماء اسلام کی ایک بین الاقوامی کانفرنس بلائی جس کے انعقاد کی تاریخیں مئی ۱۹۶۵ء میں مقرر کی گئی تھیں۔ اس کانفرنس میں حصہ لینے کی دعوت حضرت مفتی محمود اور مولانا غلام غوث ہزاروی کو بھی

موصول ہوئی۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات اس دعوت پر قاہرہ تشریف لے گئے۔ دنیا بھر کے جید علماء کرام کے درمیان وقت کے دینی، سیاسی اور سماجی مسائل پر اسلامی نقطہ نگاہ، تبادلہ خیال کا سب سے بڑا مرکز تھی۔ علماء کے اتنے اہم اجتماع میں مولانا مفتی محمود اور مولانا غلام غوث ہزاروی نے جن افکار اور خیالات کا اظہار کیا۔ اس سے پاکستان اور پاکستان کے علماء کا عرب علماء کی نظروں میں بہت زیادہ وقار بڑھ گیا۔ جمعیۃ کے دونوں قائدین کانفرنس کی مصروفیتوں سے فارغ ہو کر دیار حبیب کی زیارت کے لئے گئے۔ اور جون ۱۹۶۵ء میں یہ دونوں حضرات وطن واپس تشریف لے آئے۔(۱۰۲)

مجمع البحوث الاسلامیہ کی دوسری سالانہ کانفرنس کی وہ قرارداد جو "خاندانی منصوبہ بندی" کے خلاف پاس ہوئی اور جس کے پیش کرنے میں مولانا مفتی محمود نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس کو "ترجمان اسلام" نے نقل کیا ہے۔ اس قرارداد کی چالیس ملکوں کے سو سے زائد علماء نے اتفاق رائے منظوری دی تھی۔ قرارداد کے الفاظ یہ ہیں۔

ان الاسلام رغب فی زیادة النسل تقوی الأمة الاسلامية اجتماعيا و اقتصاديا و حربيا و تزيدها عزة و منعة لا يصح شرعا وضع قوانين تجبر الناس على تحديد النسل بأى وجه من الوجوه (۱۰۳)

ترجمہ: یعنی اسلام نے اولاد و نسل کی زیادتی اور کثرت کی ترغیب دی ہے کیونکہ کثرت نسلی سے امت اسلامیہ اجتماعی، اقتصادی اور جنگی لحاظ سے مضبوط ہوگی۔ اور اس کی عزو وقار میں اضافہ ہوگا۔ ایسے قوانین بنانا شرعی طور پر صحیح نہیں جس میں لوگوں کو برتھ کنٹرول پر کسی نہ کسی طرح سے مجبور کیا جائے۔

تیسری دفعہ آپ نے ۱۹۶۶ء میں مصر کا دورہ کیا۔ ترجمان اسلام میں ہے۔

قائد جمعیۃ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری حکومت مصر کی دعوت پر ۲۹ر ستمبر ۱۹۶۶ء کو قاہرہ تشریف لے گئے آپ وہاں مجمع البحوث الاسلامیہ کے سالانہ اجلاس اور دوسری تقریبات میں شرکت فرمائینگے۔ جامعہ

ازہر کے اساتذہ اور دوسرے شیوخ سے بھی موجودہ زمانہ میں نئے پیدا شدہ اسلامی مسائل کے بارہ میں بات چیت کریں گے۔(۱۰۴)

مفتی صاحب مصر کے چوتھے دورہ پر جولائی ۱۹۷۱ء میں گئے۔ وہاں پر آپ نے جامعہ ازہر کے زیر اہتمام اجلاسوں میں شرکت کی۔ مصر کی آزادی کی سال گرہ میں مصری حکومت کی خصوصی دعوت پر شریک ہوئے۔ اور اسکندریہ میں وزیر اوقاف حکومت مصر کی دعوت پر ۴۷ ملکوں کے طلبہ سے خطاب کیا۔ لیبیا بھی گئے۔ اور سعودی عرب میں دس دن قیام کیا۔ آپ کے چوتھے دورہ مصر کے بارے میں جناب محمود شام صاحب لکھتے ہیں۔

۱۲؍جولائی ۱۹۷۱ء کو مصری حکومت کی دعوت پر قاہرہ گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے خرچ پر لیبیا اور سعودی عرب کا دورہ کیا اور عمرہ بھی ادا کیا۔

مفتی صاحب کی وہاں کیا مصروفیات رہیں۔ اس کے بارے میں محمود شام صاحب رقمطراز ہیں۔

اس دورہ کی دعوت انہیں جامعہ ازہر کی سپریم کونسل برائے اسلامی امور کے ڈائریکٹر نے دی تھی۔ وہ ۱۲؍جولائی ۱۹۷۱ء کو قاہرہ پہنچے۔ مصر میں وہ اٹھارہ روز رہے۔ جب مصر اپنی آزادی کی سالگرہ منا رہا تھا۔ یوم آزادی کی تقریب میں دونوں حضرات (مولانا مفتی محمود، مولانا ہزاروی) کو خصوصی دعوت دی گئی۔ صدر سادات نے اڑھائی گھنٹے تک ایک نہایت اہم اور تاریخی تقریر کی۔ مفتی صاحب نے بتایا کہ قاہرہ میں مختلف علاقوں اور بہت کچھ دیکھنے کے بعد وہ اسکندریہ گئے۔ جہاں وزیر اوقاف ڈاکٹر توفیق عویض کی صدارت میں مصر میں زیر تعلیم ۴۷ ملکوں کے طلبہ کا اجتماع منعقد ہو رہا تھا۔ اس اجتماع میں مفتی صاحب کو بھی تقریر کی دعوت دی گئی۔ ایک ہفتہ لیبیا میں قیام کیا۔ سعودی عرب میں انہوں نے دس روز تک قیام کیا۔(۱۰۵)

۱۹۷۱ء کا سال پاکستان کی تاریخ کا بہت ہنگامہ خیز سال تھا۔ ۱۹۷۰ء کے الیکشن کے بعد ملکی صورت حال بہت پیچیدہ ہو چکی تھی۔ مشرقی پاکستان میں علیحدگی کے رُجحانات کافی حد تک اثر

انداز ہو چکے تھے۔ وہاں کے سیاسی رہنما مغربی پاکستان کے زیادتیوں کو بہانہ بنا کر علیحدگی کی تحریک چلا رہے تھے۔ انڈیا کی حکومت ان کی پشت پناہی کر رہی تھی۔ اور وہ پاکستان کو کمزور کرنے کے درپے تھی۔ اس اعتبار سے یہ سال پاکستان اور پاکستانیوں کے لئے بہت ہی کٹھن تھا۔ باہر کی دنیا میں عموماً اور مسلمان ممالک میں خصوصاً اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ ان کو اصلی صورت حال سے آگاہ کیا جائے۔ مفتی صاحب اور ان کے ساتھیوں نے حب الوطنی کے جذبہ کے تحت مصر اور لیبیا کے علاوہ دیگر ممالک کا دورہ بھی کیا۔ اس سلسلے میں جناب محمود شام صاحب رقمطراز ہیں۔

۱۲؍جولائی ۱۹۷۱ء کو مولانا مفتی محمود جمعیۃ علماء اسلام کی طرف سے دورُکنی وفد لے کر مشرق وسطیٰ کے دورہ پر گئے۔ وفد میں مولانا مفتی محمود کے علاوہ مولانا غلام غوث ہزاروی اور حاجی غلام محمد شامل تھے۔ حکومت کی طرف سے اس وفد کو کوئی سہولت مہیا نہیں کی گئی۔ اس وفد کا مقصد بھارتی پروپیگنڈے کا جواب، مشرقی پاکستان کی صحیح صورت حال کا بیان اور مسلم ممالک کے اتحاد کی کوشش تھا۔ اس پروگرام میں مصر، لیبیا، سوڈان، شام، لبنان، سعودی عرب اور کویت کا دورہ شامل تھا۔ اس وفد نے عربوں کو مشرقی پاکستان کی صحیح صورت حال سے آگاہ کیا۔(۱۰۶)

مولانا مفتی محمود صاحب ایک جیّد عالم دین کے ساتھ ساتھ ایک بابصیرت سیاستدان بھی تھے۔ عرب دنیا سے تعلقات کو آپ نے وہاں دینی خیالات کی اشاعت کا ذریعہ بنایا۔ اور پاکستان کے بارے میں ہندوستان کے زور دار پروپیگنڈے کی وجہ سے وہاں جو منفی تاثر پایا جاتا تھا۔ اس کے اثرات کو مٹانے اور پاکستان کے تشخص کو اجاگر کرنے کی بساط بھر کوشش کی۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے گمراہ کن نظریات کی مخالفت میں قائدانہ کردار

مولانا مفتی محمودؒ کی ساری تگ و دو اور جدوجہد کے بارے میں مولانا زاہد الراشدی جو تجزیہ کرتے ہیں وہ یہ ہے۔

مولانا مفتی محمود کی جدوجہد میں سب سے نمایاں اور روشن پہلو ان کی دینی حمیت و غیرت ہے کیونکہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان، جید عالم دین اور اکابر علماء دیوبند کی فکری و عملی وراثت کا امین ہونے کی وجہ سے ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اسلام کی سربلندی، پاکستان میں اسلامی نظام کی عملداری اور غیر اسلامی قوانین، روایات اور اقدار کی بیخ کنی رہا۔ ان کی عمر بھر کی محنت اور تگ ودو کا مرکزی نقطہ یہی تھا کہ انہوں نے پاکستان میں مروّجہ فرنگی قوانین کی تنسیخ اور اسلامی قوانین کی عملداری کی جدوجہد میں جمعیۃ علماء اسلام متحدہ جمہوری محاذ، پاکستان قومی اتحاد اور نظام العلماء، پاکستان کے پلیٹ فارم پر قائدانہ کردار ادا کیا۔(۱۰۷)

مولانا مفتی محمود کی زندگی کی تمام جدوجہد اور تگ و تاز کا اگر تفصیل کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو مولانا زاہد الراشدی صاحب کا تجزیہ بالکل حقیقت ہے۔ مفتی صاحب نے اپنی دینی غیرت وحمیت کا مظاہرہ بار بار کیا ہے خاص کر جناب محمد ایوب خان صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان کی صدارت کے دور میں اور اسکے قائم کردہ اداروں کی طرف سے غیر اسلامی قوانین کے اجراء کی کوششوں کی مخالفت میں آپ نے قائدانہ کردار ادا کیا ہے۔ اور اُس وقت تک نہ خود چین سے بیٹھے اور نہ ہی حکومت وقت کو چین سے بیٹھنے دیا۔ جب تک حکومت کے تمام مخالف اسلام منصوبوں کو خاک میں نہیں ملایا۔ جب دورِ ایوبی میں "عائلی قوانین" کا نفاذ کر دیا گیا۔ تو مفتی صاحب نے اسمبلی کے فلور پر چاروں ائمہ اور فقہ جعفریہ کی رو سے ان کے کتابوں کے حوالہ دے دے کر خلاف اسلام ثابت کیا۔ عوامی اجتماعات میں بھی اس کی بھرپور مخالفت کی۔ ایسا ہی ایک اور واقعہ مولانا عبد القادر آزاد نے لکھا ہے۔

> ۱۹۶۶ء میں "جشن قرآن" کے نام سے وزارت قانون حکومت پاکستان نے ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ جس میں اس دور کے سینئر وزیر خواجہ شہاب الدین نے اسلامی اقدار کے خلاف ایک "ترقی پسندانہ" تقریر کی اس وقت ملک میں ایوب

> خان کے بعد وہ دوسرا درجہ رکھتے تھے۔ مفتی محمود نے ان کو اس تقریب میں آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کی تقریر کے خلاف اتنی مؤثر اور ہلا دینے والی تقریر کی کہ ان کو سٹیج پر اپنے الفاظ واپس لینے پڑے۔ وہ علم کے غنی اور استدلال کے دھنی انسان تھے۔ ان اوصاف کے ساتھ ساتھ جرأت اور استقلال کی نعمت سے بھی مالا مال تھے۔ اس لئے جہاں دلائل اور جرأت کا معرکہ ہوتا وہاں وہ سب سے پہلی صف میں نظر آتے۔ اور معرکہ کے بعد دیکھا جاتا تو وہ فاتح نظر آتے۔(108)

جناب محمد ایوب خان کے دور صدارت میں اسلام اور اس کی تعلیمات واحکامات کو نئے سانچے میں ڈھالنے کے لئے جو اقدامات کئے گئے۔ ان میں ایک ایسے ادارہ کا قیام بھی تھا۔ جس کے ذریعہ سے یہ مذموم مقصد پورا ہو۔ اس کے لئے انہوں نے "ادارہ تحقیقات اسلامیہ" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اور دوسرا اقدام یہ کیا کہ اس ادارہ کی سرپرستی ایسے شخص کی سپرد کر دی جو ان کے ناپاک عزائم کی تکمیل ان کی خواہش کے مطابق کر سکتا تھا۔ اس نے دین کے مسلّمہ اصولوں اور متفقہ مسائل کو جس طرح متنازعہ بنانے کی کوشش کی۔ اس سے متعلق مولانا سعید الرحمٰن علوی رقمطراز ہیں۔

> قیام ملک کے بعد برسراقتدار طبقہ نے جس طرح اپنی نوازشات سے اسلام کو نوازا ہے۔ وہ اس نظریاتی مملکت کے بسنے والے مسلمانوں کے لئے ایک المیہ سے کم نہیں ہے۔ لیکن انقلابی حکومت (دور ایوبی) نے تو حد کر دی اور رہی سہی کسر پوری کر ڈالی۔ اس حکومت نے جہاں دیگر "کارہائے نمایاں" سرانجام دئے وہاں اس کا ایک بہت بڑا کارنامہ "اسلامی تحقیقاتی ادارہ" کا قیام ہے۔ اس ادارہ کا مقصد یہ ظاہر کیا گیا کہ نئے تقاضوں کے پیش نظر اسلام کو ڈھالا جائے گا۔ گو خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں۔ اس دارے کی سرپرستی جناب ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کے سپرد کی گئی۔ موصوف اپنے زمانہ تعلیم سے ہی مذہب کے متعلق اچھے نظریات نہ رکھتے تھے۔ آخر یہودی اساتذہ کے منظور نظر ہو گئے۔ وہ انہیں بیرون ملک لے گئے پوری طرح تیار کر کے واپس بھیج دیا۔ واپسی پر

حکمرانوں کے "زمرہ خواص" میں شامل ہوگئے۔ اب وہ آئے دن ملّت اسلامیہ کے نازک مذہبی جذبات سے اس طرح کھیلتے رہتے ہیں کہ توبہ بھلی۔ شراب وسود کی حلت، ایک مرد کے مقابلہ میں ایک عورت کی شہادت کا جواز، زکوۃ عبادت نہیں ٹیکس ہے۔ معراج افسانہ ہے۔ مشینی ذبیحہ کا جواز۔ وقس علیٰ ہٰذا۔ (۱۰۹)

"ادارہ تحقیقات اسلامی" کے کیا عزائم تھے۔ ان میں بعض کا ذکر تو جناب علوی صاحب نے کر دیا ہے۔ ان کے دیگر خلاف اسلام عزائم کے بارے میں جناب عبد الکریم عابد تحریر کرتے ہیں۔ کہ

> اس وقت حکومت اسلام کا ایک "ماڈرن ایڈیشن" تیار کرنے کی کوشش میں تھی۔ اور اس سلسلے میں ایک " ادارۂ تحقیقات اسلامی" قائم کیا گیا تھا۔ اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ "ادارۂ تحقیقات اسلامی" نے سود کے جواز میں ۵۲ صفحات پر مشتمل کتابچہ شائع کیا۔ اور یہ فتویٰ جاری کیا کہ مشینی آلات کے ذریعہ ذبح کئے جانے والے جانور حلال ہیں۔ اور ذبح کرتے وقت بسم اللہ اللہ اکبر پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں اور ذبیحہ کسی مسلم یا غیر مسلم کا ہو جائز ہے۔ اس ادارہ نے رسالت، نبوت امامت، خلافت، اجتہاد، استنباط اور نماز، روزہ، حج زکوٰۃ، کے بارے میں نئے فتویٰ جاری کئے۔ اور نیا اسلام پیش کیا جس میں کہا گیا تھا۔ کہ قرآن میں صرف تین وقت کی نماز کا ذکر ہے۔ باقی دو وقت کی نمازیں بعد میں شامل کی گئی ہیں۔ اور زکوۃ ایک ٹیکس ہے عبادت نہیں۔ (۱۱۰)

اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لئے ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے "ادارہ تحقیقات اسلامی" کے زیر اہتمام ایک "بین الاقوامی کانفرنس" ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳ر فروری ۱۹۶۸ء کو راولپنڈی کے "انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل" میں طلب کی۔ جس میں مصر، شام، فلسطین، سوڈان، تیونس، یمن، ایران اور تاشقند کے علماء تشریف لائے تھے۔ پاکستان کے علماء میں سے مولانا شمس الحق افغانی، مولانا مفتی محمود، مولانا مفتی محمد شفیع کراچی اور مولانا محمد یوسف بنوری مدعو تھے۔ اس کانفرنس کی مکمل

کاروائی کے بارے میں جناب مولانا سعید الرحمٰن علوی نے ایک مضمون لکھا ہے۔ اور مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے اس اجلاس کی مکمل روداد لکھی ہے۔ جو محرم الحرام ۱۳۸۸ھ کے "البلاغ" کے شمارہ میں چھپی ہے۔ مولانا سعید الرحمٰن علوی کا مضمون "ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور" میں شائع ہوا ہے۔ علوی کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے۔

> بحث ومباحثہ کے باضابطہ اجلاسوں میں سے پہلا اجلاس اسی دن ۱۰ فروری) شام 6 بجے سے 8:30 بجے تک ہوٹل کے ہال میں ہوا۔ صدر اجلاس مفتی اعظم فلسطین تھے۔ نائب صدر ایس اے رحمان نامزد چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان اور ڈاکٹر حسین نصر ایرانی تھے۔ اس اجلاس کا موضوع تھا "اسلام میں عقل کا مقام"۔ جعفر شاہ پھلواری کی شخصیت سے کون ناواقف ہے۔ مقالہ پڑھتے ہوئے انہوں نے حدود وقیود سے بے نیاز ہو کر سب کچھ کہہ دیا۔ انتہا یہ کہ انہوں نے کہا کہ جب حضرت عمرؓ نبی ﷺ کے فیصلے بدل سکتے ہیں تو ہم ان کے کیوں نہیں بدل سکتے؟ اس پر ہنگامہ ہوا۔ مولانا بنوری اور مولانا مفتی محمود نے مقالہ خواں کو ٹوکا۔ پیچھے سے کسی صاحب نے ان حضرات کو ٹوکا۔ تو مفتی محمود صاحب نے فرمایا ہم صدر اجلاس سے مخاطب ہیں۔ ان حضرات نے اصرار کیا کہ ہمیں جواب کا موقع دیا جائے۔ جسٹس رحمان صاحب نے ٹالنے کی کوشش کی۔ لیکن مفتی صاحب کے اصرار پر صدر اجلاس جناب مفتی امین الحسینی نے یقین دلایا۔ تب ہنگامہ ختم ہوا۔

مولانا علوی صاحب نے چشم دید گواہ کی حیثیت سے یہ ساری کاروائی حوالہ قلم وقرطاس کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> اس کے بعد سوڈان کے عالم مندوب جناب السیّد یوسف الخلیفہ ابو بکر نے ڈھاکہ مشرقی پاکستان کے ابو الہاشم صاحب، مصر کے الدکتور حب اللہ، اور پاکستان کے مولانا محمد یوسف بنوری سب نے اپنے اپنے مقالات میں جعفر شاہ پھلواری کے مقالہ میں ظاہر کئے گئے خیالات کی تردید تفصیل کے ساتھ قرآن وسنت اور ائمہ مجتہدین کے بیان کے

کردہ اصول کی روشنی میں کی۔ آخر میں صدر اجلاس نے جب مفتی محمود کو اپنے خیالات کے اظہار کی دعوت دی تو آپ نے فرمایا کہ چونکہ مقصد حل ہو چکا ہے اس لئے اب تقریر کی ضرورت نہیں۔ (۱۱۱)

اسی کانفرنس میں جناب معسود صاحب ناظم اوقاف مغربی پاکستان نے بھی مقالہ پڑھا جو اشتراکیت کی تبلیغ و تائید اور انفرادی ملکیت کے خلاف تھا۔ اور وہ اس کو عین اسلام کی تعلیمات کے مطابق قرار دے رہا تھا۔ اور بڑے جارحانہ انداز میں علماء کرام کو چیلنج کر رہا تھا کہ وہ ان کے دلائل کا جواب دیں۔ اس وقت بھی مولانا مفتی محمود صاحب ہی تھے جنہوں نے ان کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے ان کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اور اس کو ایسے مسکت جواب دیا کہ وہ لاجواب رہا۔ مولانا محمد تقی عثمانی نے اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں۔

> اس کانفرنس میں اس وقت کے ناظم اوقاف صاحب نے جو مقالہ پڑھا وہ اشتراکیت کی تبلیغ و تائید پر مشتمل تھا۔ اور اس میں بڑے جارحانہ انداز سے علماء کو چیلنج کیا گیا تھا کہ وہ ان دلائل کا جواب دیں۔ مقالہ چونکہ انگریزی زبان میں تھا۔ اس لئے بیشتر علماء اس کے مشتملات سے بے خبر تھے۔ اس موقع پر ضرورت تھی کہ علماء کی طرف سے کوئی مؤثر شخصیت حقیقت حال کو واضح کرے۔ حسن اتفاق سے اس وقت پاکستان کے معروف علماء میں سے حضرت مولانا مفتی محمود کے سواء کوئی ہال میں موجود نہیں تھا۔ احقر اور برادرم مولانا سمیع الحق صاحب اس موقع پر حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں گئے۔ اور انہیں مقالہ کے اہم اجزاء سے آگاہ کیا۔ حضرت مفتی صاحب یہ سنتے ہی کھڑے ہو گئے۔ اور مناقشہ کے لئے صدر سے وقت طلب کیا۔ چنانچہ انہیں وقت دیا گیا۔ اور انہوں نے ایسی برجستہ اور فاضلانہ تقریر فرمائی جس سے فضا بدل گئی اور شکوک و شبہات بڑی حد تک دور ہو گئے۔ (۱۱۲)

یہ بات نہایت قابل تحسین ہے کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور اس کے دیگر ہم خیال بزعم خویش دانشوروں کے خلاف اسلام نظریات کی مخالفت میں بہت علماء اور بزرگان دین نے اپنی

بھر کوششیں کیں۔ اور مسلمانوں کو ان کے مفسدانہ خیالات سے محفوظ کیا۔ اس کے ساتھ ہی جرائد و رسائل کا کردار بھی کسی پر مخفی نہیں۔ یہاں تک کہ حکومت نے بادل ناخواستہ ان کے مطالبہ کو مان لیا۔ اور فضل الرحمٰن کو ملک بدر کیا۔ لیکن ان سب کے باوجود اس سلسلے میں مولانا مفتی محمود صاحب نے قائدانہ کردار ادا کیا ہے۔ جناب اکرام القادری صاحب اس بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں کہ

> ایوبی دور میں ہی ادارہ تحقیقات اسلامی کے ڈائریکٹر ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے جب ملت اسلامیہ کے مسلم عقائد و نظریات کے برعکس اپنی طرف سے اسلام میں پیوند کاریاں اور موشگافیاں شروع کیں تو ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے خلاف اٹھنے والی تحریک میں مفتی محمود نے شاندار کردار کا مظاہرہ کیا انہوں نے علمی اور سیاسی دونوں محاذوں پر ڈاکٹر فضل الرحمٰن پر گرفت کی تا آنکہ حکومت کو جھکنا اور فضل الرحمٰن جیسے شاطر کو ملک بدر ہونا پڑا۔ (۱۱۳)

اور یوں ملک و ملت کو اس عظیم فتنہ سے محفوظ کر لیا گیا۔ اور یہ سب مانتے ہیں کہ اس فتنے کی سرکوبی میں قائدانہ کردار مولانا مفتی محمود صاحب اور انکی جماعت جمعیۃ علماء اسلام کے علماء اور کارکنوں نے ادا کیا۔ اور یہ بات بھی آپ کے عظیم کارناموں اور دینی خدمات کے سلسلے میں ایک عظیم کارنامہ اور عظیم خدمت شمار کی جاتی ہے۔ فجزاهم الله احسن الجزاء۔

جشن ملتان کے خلاف تحریک کی قیادت اور گرفتاری

مولانا مفتی محمود، تعلیم و تعلّم اور جماعتی و سیاسی مصروفیات کے علاوہ اخلاقی اور سماجی برائیوں کے خلاف بھی ہمیشہ برسرپیکار رہتے تھے۔ رقص و سرو اور ناچ گانے، عریانی و فحاشی اور اخلاق باختگی پر مشتمل حکومتی کوششوں کے خلاف آپ کی خدمات اور اس کے نتیجے میں قید و بند کی صعوبتیں بھی آپ کے عظیم کارناموں میں سے ہیں۔

نومبر ۶۶ء میں ملتان کی انتظامیہ نے حکومتی تعاون سے " جشن ملتان " کے نام رقص و سرود اور ناچ گانے کا پروگرام بنایا جس کے خلاف مفتی صاحب نے ملتان کی سطح پر احتجاجی تحریک شروع کرنے کا اعلان کیا۔ ملتان کے مختلف مسالک کے علماء اور دیندار طبقہ کو اس تحریک کے لئے آمادہ کیا۔ جمعہ کی اجتماعات میں اس کے خلاف قرار دادیں منظور کرائیں۔ احتجاجی جلوس نکالا۔ جس کے نتیجے میں مفتی صاحب کے ساتھ دس دیگر ساتھیوں کو حراست میں لیا گیا۔ اس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ملتان کی سطح پر احتجاجی تحریک نے ملکی سطح پر احتجاجی تحریک کی صورت اختیار کرلی۔ "ترجمان اسلام" میں ہے۔

قائد جمعیۃ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب اور ان کے رفقاء کی گرفتاری پر جمعہ کے روز لاہور اور دیگر شہروں کی قریباً تمام مساجد میں احتجاجی قرار دادیں پاس کی گئیں۔ اور حکومت کے اس رویہ پر نہایت غم و غصہ کا اظہار کیا گیا جو اس نے پاکستان کے عوام کے احتجاج کے باوجود جشن ملتان کی پشت پناہی کی ہے۔ (۱۱۴)

اس سلسلے میں مولانا عبد الکریم عابد اظہار خیال کرتے ہیں۔

ایوب خان کے زمانے میں ہماری مغرب زدہ بیوروکریسی ملک میں آرٹ اور کلچر کے نام پر عریانی اور فحاشی کو فروغ دینے کے لئے کوشاں تھی۔ مفتی صاحب نے اس کے خلاف بھی محاذ قائم کیا۔ حکومت کی جانب سے ایک "جشن ملتان" منانے کا اعلان ہوا تھا۔ اور اس جشن میں رقص و سرود، عریانی و فحاشی کا بازار گرم کیا گیا تھا۔ مفتی صاحب نے اس کے خلاف احتجاج کے لئے جلوس نکالا۔ پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا۔ اور اس گرفتاری پر ملک بھی میں غم و غصہ کا اظہار کیا گیا۔ (۱۱۵)

"مفتی صاحب اور ان کے دیگر دس ساتھیوں کو ۱۲ نومبر کو غیر مشروط پر رہا کر دیا گیا تھا۔ ان کے خلاف مقدمات واپس لے لئے گئے تھے۔ اس سے قبل انہوں نے ضمانت پر رہا ہونے سے انکار کر دیا تھا"۔ (۱۱۶)

جشن ملتان مقررہ تاریخوں کو منایا جاتا تھا۔ مگر مفتی صاحب اور دیگر علماء کی احتجاجی تحریک کی وجہ سے عوام نے اس میں بہت کم دلچسپی لی تھی۔ جس کی وجہ سے اوپر سے حکومتی مداخلت پر اس کو وقت سے قبل ختم کرنے کا اعلان کرنا پڑا تھا۔ ترجمان اسلام میں ہے "اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ حکومت نے ملتان انتظامیہ کی غلطی کو محسوس کر لیا"۔ (۱۱۷)

جناب اکرام القادری صاحب نے رقص و سرود اور ناچ گانے کے اس پروگرام کے خلاف مفتی صاحب کی کوششوں کو آپ کے کارہائے جلیلہ میں سے شمار کیا ہے۔ وہ ایک مضمون "دینی تحریکات اور مولانا مفتی محمود" میں رقمطراز ہیں کہ "اسی دور میں ملتان قلعہ پر رقص و سرود کی نمائش کے اہتمام کا خاتمہ بھی مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کارہائے جلیلہ میں شامل ہے"۔ (۱۱۸)

مولانا مفتی محمود کا دینی و مذہبی جماعتوں کے اتحاد میں فعال کردار

مولانا مفتی محمود " اتحاد بین المسلمین " کے علمبردار تھے۔ فرقہ وارانہ تعصب سے دور اور مذہبی، جماعتی بنیادوں پر تفریق و امتیاز کے سخت خلاف تھے۔ آپ کے بیانات ہمیشہ ایسے مباحث سے پاک ہوتے تھے۔ جو اختلافی ہوں۔ یا جس سے کسی کی دل آزاری ہوتی ہو۔ آپ ہمیشہ اس کوشش میں ہوتے تھے کہ بعض مسائل میں اختلاف کے باوجود جن مسائل پر ان جماعتوں میں اتفاق ہے ملک و ملت کے مفاد کے پیش نظر کم از کم نکات پر آپس میں اتحاد و اتفاق کا مظاہرہ ہو۔ خاص کر مذہبی تنظیموں کو آپ اس ضمن میں بار بار دعوت دیتے رہتے تھے۔ ملکی مسائل کے پیش نظر آپ کئی دفعہ اس میں کامیاب بھی ہوتے تھے۔ بعض متفقہ مسائل پر ان تنظیموں کو آپس میں بٹھا کر ان میں اتحاد کی صورت پیدا فرمادیتے تھے۔ اس ضمن میں مولانا تاج محمود صاحب رقمطراز ہیں۔

ویسے توان کے اور بھی بہت سے قابل فخر کارنامے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک ان کا سب سے بڑا زیادہ قابل تحسین کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس گئے گزرے دور میں بھی علماء، طلباء اور ملک کی دینی طاقتوں کو متحد کیا اور پھر اس جلسے میں رُوح پھونک کر اُسے زندہ حقیقت بنادیا۔(۱۱۹)

آپ مذہبی اختلافات، اختلافی مباحث کو نہیں چھیڑتے تھے۔ اور اپنے کارکنوں کو بھی اس بات کی ہدایت کرتے۔ کہ وہ اپنے اعلیٰ مقاصد کے حصول کی جدوجہد کو ان لاحاصل مباحث میں صرف نہ کریں۔ مولانا قاری سعید الرحمٰن تحریر فرماہیں۔

تعصب سے نفرت تھی۔ سیاسی میدان میں انہوں نے کبھی فرقہ وارانہ اختلافات کو اہمیت نہیں دی۔ مذہبی اختلافات کو وہ ملک و قوم کے لئے نہایت خطرناک سمجھتے تھے۔ اس لئے اپنی تقریروں میں کبھی بھی اختلافی مباحث کو نہیں چھیڑتے تھے۔ اور اپنے عقیدت مندوں کو بھی اس کی تلقین کرتے۔ جو لوگ ملک میں مذہبی منافرت پھیلانے کی کوشش کرتے ان کے لئے فرماتے "یہ اُن کی کوتاہ نظری ہے۔ پاکستان جب بنایا گیا تھا تو مسلمانوں میں کوئی مذہبی تفریق نہیں تھی۔ اور تحریک پاکستان میں ہر مکتب فکر کے لوگ شریک تھے۔ اگر مذہبی اختلافات سامنے آتے تو پاکستان کبھی بھی نہ بن سکتا۔

مولانا قاری سعید الرحمٰن صاحب نے آگے چل کر لکھا ہے۔

ہمیشہ کے لئے جب بھی ملک پر کڑا وقت آیا تو قوم کے وسیع تر اتحاد کے ذریعہ سے مسائل کا حل ڈھونڈا گیا۔ اور اب بھی ملک کے ترقی کی شاہراہ پر گامزن کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ "اتحاد بین المسالک" کی ضرورت واہمیت کو سمجھا جائے۔

وہ لکھتے ہیں۔

آپ فرماتے۔ ملک پر جب بھی کڑا وقت آیا تو قوم کے وسیع تر اتحاد کے ذریعہ سے مسائل کا حل ہوا۔ تحریک ختم نبوت اور تحریک نظام مصطفےٰ اس کی واضح مثالیں ہیں۔

جب تک مذہبی تفریق یا مسلکی اختلافات کو بالائے طاق نہیں رکھا جائے گا۔ ملک ترقی نہیں کر سکے گا۔

مولانا سعید الرحمٰن صاحب، مفتی صاحب کے بارے میں سردار عبدالقیوم خان سابق صدر وزیر اعظم آزاد کشمیر کے وہ الفاظ لکھتے ہیں۔ جو انہوں نے "اتحاد بین المسلمین" کے علمبردار کی حیثیت سے ان کو خراج تحسین کے طور پر پیش کئے ہیں۔ قاری صاحب تحریر فرماہیں۔

مفتی صاحب کے اس بلند کردار کے بارے میں مجھے سردار عبدالقیوم خان صاحب کے یہ الفاظ یاد آتے ہیں۔ ہم مفتی صاحب کی اس لئے عزت نہیں کرتے کہ وہ ڈیرہ اسماعیل خان کے رہنے والے ہیں یا صوبہ سرحد کے رہنے والے ہیں۔ یا ایک جماعت کے سربراہ ہیں۔ یا یہ کہ وہ دیوبندی ہیں۔ بلکہ اس لئے عزت کرتے ہیں کہ وہ ایک غیر متعصب اور "اتحاد بین المسلمین" کے علمبردار عالم دین ہیں۔(۱۲۰)

وہ تعصب سے نفرت کرتے تھے۔ وہ تنگ نظر اور محدود سوچ و فکر والے نہیں تھے۔ بلکہ برداشت والے اور وسیع النظر تھے۔ اس ضمن میں قاری نورالحق قریشی ایڈوکیٹ صاحب لکھتے ہیں کہ

وہ اپنے مذہبی وسیاسی خیالات میں کسی تعصب تنگ نظری اور محدود سوچ کے قائل نہیں تھے۔ مذہبی نظریات کے لحاظ سے وہ ایشیاء کے عظیم دینی درسگاہ، دارالعلوم دیوبند کے خوشہ چینوں میں سے تھے۔ مگر بایں ہمہ وہ کسی دوسرے مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے کو بُرا بھلا نہیں کہتے تھے اور نہ ہی فتویٰ بازی سے کسی کو مطعون کرتے تھے وہ نہایت حوصلہ مندی، تدبّر، رواداری اور متانت سے گفتگو کے عادی تھے۔ وہ مسلمانوں میں مروّجہ مناقشت سے کوسوں دور تھے۔(۱۲۱)

مفتی صاحب کی ذات دین وسیاست کا ایک حسین امتزاج تھی۔ آپ اتحاد و یکجہتی کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ آپ کے بارے، مولانا سمیع الحق صاحب رقمطراز ہیں۔

ان کا وجود ایک ایسا خضرِ راہ تھا جو ہر نازک دور میں قوم کو رہنمائی کا پیغام دیتا تھا۔ ان کی ذات ایک ایسی رُوشن قندیل تھی۔ جو تاریک ترلمحات میں روشنی کا مینار ثابت ہوتی تھی۔ دینی طاقتوں کے لئے ان کی شخصیت مرکزِ ثقل کی حیثیت رکھتی تھی۔ جہاں تک تمام ملکی قوتیں کھنچی ہوئی چلی آتی تھیں۔ ان کی دلآویز شخصیت دین وسیاست کا ایک حسین امتزاج تھی جسے پاکستان کے تمام علاقوں میں قومی اتحاد و یکجہتی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ ان کی ذات میں قدرت نے ایسی بے بہا صفات جمع کر دی تھیں جنہوں نے ان کو عہد حاضر کی تاریخ ساز شخصیت بنادیا تھا۔(۱۲۲)

مولانا سمیع الحق صاحب کے الفاظ ہیں کہ (مفتی صاحب) پاکستان کے تمام علاقوں میں قومی اتحاد اور یکجہتی کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ یہ بعینہٖ حقیقت ہے۔ اس اعتبار سے اس میں ذرا برابر شک نہیں ہے کہ آپ ہمیشہ مختلف سیاسی اور دینی تنظیموں کے وسیع تر اتحاد کے ہمیشہ داعی اور علمبردار رہے ہیں۔ مشہور سیاستدان، بابائے جمہوریت نوابزادہ نصر اللہ خان نے آپ کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے۔

مفتی صاحب کا تعلق اگرچہ مسلمانوں کے ایک مکتب فکر سے تھا لیکن ان میں فرقہ وارانہ تعصب قطعاً نہیں تھا۔ ہر مرحلے پر ان کی کوشش رہی کہ قومی اور ملی مقاصد کی تکمیل کے لئے مسلمانوں کی مختلف سیاسی اور دینی تنظیموں کا وسیع تر اتحاد ہونا چاہیئے۔(۱۲۳)

جناب پروفیسر غفور احمد صاحب نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان وسابق ممبر قومی اسمبلی کراچی، جو بھٹو کے ساتھ مذاکرات میں مفتی صاحب کے وفد کے ممبر تھے۔ مفتی صاحب کے غیر متعصبانہ روّیہ اور مزاج کے بارے میں لکھتے ہیں۔

فروعی اور فقہی اختلافات کو حد سے بڑھانے کے سخت خلاف تھے۔ کسی دوسرے فرقے سے تعلق رکھنے والے کے پیچھے انہیں نماز پڑھنے سے گریزاں نہیں دیکھا۔ اور تو اور ایک دن انہوں نے میری موجودگی میں مولانا نورانی صاحب سے کہ کہ ہمارے اور آپ کے درمیان کوئی بنیادی نوعیت کا اختلاف نہیں ہے۔ فقہی معاملات میں ہمارا اور

آپ کا موقف یکساں ہے۔ پھر کیوں نہ ہم ایک مشترکہ جماعت کی تشکیل کرلیں۔ .... مفتی صاحب یہ کہہ رہے تھے تو بالکل سنجیدہ تھے۔ لیکن انہیں کوئی مثبت جواب نہیں ملا.........یاداشت پر بے حد زور ڈالنے کے باوجود میں کوئی چیز ان کے خلاف نہیں ڈھونڈھ سکتا۔ انہیں کبھی ایک جماعت کے لیڈر کے طور پر بات کرتے نہ سنا۔ وہ ہمیشہ سب کے رہے سب ہی کے نظر آئے۔ انہیں حلیف سیاسی جماعتیں مشترکہ متاع سمجھتی تھیں اور لاریب وہ تھے بھی۔(۱۲۴)

اس سلسلے میں پاکستان کے مشہور عالم دین، مولانا نور الہدیٰ صاحب آپ کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

مولانا مفتی محمود، اتحاد کے معاملے میں خاصے فراخ دل واقع ہوئے ہیں۔ اور اس معاملے میں انہوں نے بعض دفعہ اپنے احباب کی ناراضی کی بھی پرواہ نہیں کی۔ مولانا غلام غوث ہزاروی وغیرہ جو ان سے علیحدہ ہوئے اسکی وجہ بھی یہی اتحاد تھا۔ مگر آپ نے اتحاد کے لئے انفرادی مفادات کو اکثر قربان کیا۔(۱۲۵)

کسی دوسرے کی خوبیوں کا اعتراف ایک عمدہ کمال ہے۔ اور یہ اعتراف کرنے والے کی شخصیت کی وسعت قلبی اور فراخ دلی کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ مفتی صاحب کی خوبیوں اور کمالات کا اعتراف جہاں آپ کے ہم مسلک وہم مشرب کرتے ہیں۔ وہاں ایسے حضرات بھی کرتے ہیں۔ جو نہ تو سیاسی طور پر آپ کے ہم جماعت ہیں۔ اور نہ مسلکی اعتبار سے آپ سے متفق ہیں۔ حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب مشہور اہل حدیث رہنما ہیں۔ اور ایک دانشور کی حیثیت سے ایک اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ مفتی صاحب کے بارے میں وہ معترف ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ مولانا مفتی محمود عرف عام میں حنفی المسلک تھے۔ لیکن یہ نسبت نہ صرف یہ کہ تعصب اور معروف حدبندی سے پاک تھی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کا دل ایک اہل حدیث کے لئے اتنا ہی گہوارہ محبت تھا جتنا حنفی کے لئے۔ اور وہ در حقیقت مسلک ولی اللہ کے مطابق اس قسم کی امتیازات کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔(۱۲۶)

مشہور شیعہ عالم اور سیاسی رہنما جناب علامہ ع۔غ کراروی صاحب مفتی صاحب کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

> مفتی صاحب سے (میرے تعلقات کا) تحریک ختم نبوت کے دوران آغاز ہوا۔ "تعلقات" کا لفظ اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ ان کے ساتھ رسمی لگاؤ نہیں تھا۔ دلی قُرب تھا۔ ان کے ساتھ میری دلی قربت کا سبب ان کی وسعت نظری اور وسعت قلبی تھی۔ وہ عقائد کے اختلافات کو عقائد کی حد تک رکھتے تھے۔ ان اختلافات کو سیاسیات میں لانے کے قائل نہیں تھے۔ ان کا دل بہت بڑا تھا۔ اور اس دل میں اختلاف کے ساتھ رواداری بھی موجود تھی۔ ان کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں کے اختلافات کم ہوں اور ان کے درمیان زیادہ سے زیادہ محبت و رواداری کی فضا پیدا ہو۔

علامہ ع۔غ کراروی صاحب ایک اور مضمون میں انہی خیالات کا اظہار کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> یقیناً مرحوم مکتب دیوبند کے جید عالم دین تھے۔ ان کے مخالفین کا کہنا ہے کہ وہ مذہبی تعصّب کا شکار تھے۔ لیکن مجھے کئی بار مرحوم کی معیّت میں اٹھنے بیٹھنے اور سفر کا اتفاق ہوا۔ کسی لمحہ میں نے مغائرت محسوس نہیں کی۔ اور نہ ان کی زبان فیض ترجمان سے ایسا کوئی جملہ گوش گزار ہوا۔ جو دوسرے افراد مکاتب کے لئے دل آزار یا باعثِ تنفر ہو۔ (۱۲۸)

۱۹۷۶ء میں بعض مقامات پر فرقہ وارانہ کشیدگی کے کچھ روح فرسا واقعات ہوئے۔ تمام محب وطن حضرات نے اس پر تشویش کا اظہار کیا۔ اور اس کو پاکستان اور مسلمانوں کے لئے نہایت نقصان دہ قرار دیا۔ اور یہ نہ صرف پاکستان کی بدنامی کا باعث بنے بلکہ ملک میں امن و امان کی کوششوں کو بھی نقصان پہنچا۔ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب ان حالات کی وجہ سے بہت پریشان رہے۔ آپ نے اپنی تقریروں اور اخباری بیانات میں عوام الناس کو فرقہ وارانہ کشیدگی سے باز

کی بار بار اپیل کی۔ اور اپنی جماعت کے کارکنوں کے نام "خصوصی ہدایت" کے نام سے ات میں بیان شائع کرایا جو یہ ہے۔

> ملک کے مختلف حصوں سے فرقہ وارانہ اختلافات کی بنیاد پر جھگڑا اور مناظرہ بازی کی جو خبریں موصول ہو رہی ہیں۔ وہ افسوسناک ہیں۔ اور میں پورے ملک میں جمعیۃ علماء اسلام کے تمام ارکان کو سختی کے ساتھ ہدایت کرتا ہوں کہ وہ اس فرقہ وارانہ جنگ میں کسی جگہ فریق نہ بنیں اور نہ کسی قسم کا حصہ لیں۔ بلکہ جہاں تک ممکن ہو اس نوعیت کی کشیدگی کو روکنے کی سعی کریں۔ مفتی صاحب نے کہا کہ ملک میں اتحاد و یگانگت کی فضا کو قائم رکھنا، ملک وملت کے مفاد کے پیش نظر انتہائی ضروری ہے۔ اور جمعیۃ علماء اسلام اس سلسلے میں اپنے فرائض کی بجاآوری میں کوئی کوتاہی نہیں کرے گی۔ (۱۲۹)

آپ نے "خصوصی ہدایت" میں جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کی مرکزی مجلس شوریٰ کے فیصلہ کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی جماعت کے ارکان کو یہ بھی بتایا ہے کہ مجلس شوریٰ نے تمام ے شہروں میں علماء پر مشتمل کمیٹیاں بنادی ہیں۔ اور ان کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے اپنے شہر دیوبندی، بریلوی، اہل، حدیث اور دیگر فرقوں کے علماء کرام سے گفت و شنید کرکے جلد از جلد اس کی رپورٹ مرکزی دفتر کو بھیج دیں تاکہ آئندہ کا لائحہ عمل ان رپورٹوں کی روشنی میں طے یا جاسکے۔

اس جذبہ کے پیش نظر آپ نے ایک بار ۱۹۶۶ء میں دینی جماعتوں اور تنظیموں کو متحدہ اسلامی محاذ" کی تنظیم میں جمع کیا تھا۔ جس میں آپ نے فعال کردار ادا کیا تھا۔ اس کا پہلا نونشن ۲۸، ۲۹ر مئی ۱۹۶۶ء کو لاہور میں ہوا تھا۔ متحدہ اسلامی محاذ میں جمعیۃ علماء اسلام، مجلس احرار، مجلس تحفظ ختم نبوّت، جمعیۃ اہل حدیث، تنظیم اہل سنت، جمعیۃ اتحاد القراء اور مولانا کوثر نیازی کی "انجمن تحفظ پاکستان" شامل تھیں۔

شیخ حسام الدین امیر مجلس احرار اسلام پاکستان اس کے صدر منتخب ہوئے اور مولانا غلام غوث ہزاروی اس کے ناظم بنے جبکہ اس کے داعی مولانا مفتی محمود تھے۔(۱۳۰)

۱۹۷۰ء میں کل پاکستان جمعیۃ علماء اسلام کی دعوت پر انہیں جماعتوں اور ممتاز افراد اُمت کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں فیصلہ کیا گیا۔ کہ "متحدہ دینی محاذ" قائم کر کے اسلامی اقدار کی حفاظت اور مخالف اسلام سرگرمیوں کے سدّباب کے لئے مشترکہ جدوجہد کی جائے۔ مولانا مفتی محمود صاحب کو اس محاذ کا صدر اور جمعیۃ علماء پاکستان کے مولانا سیّد محمود شاہ گجراتی کو اس کا ناظم اعلیٰ منتخب کیا گیا۔ تحریک تحفظ ختم نبوت ۱۹۷۴ء میں آپ ہی کا قائدانہ کردار سب سے نمایاں رہا۔ تمام دینی جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے مرزائیت کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ نہ صرف شہروں، قصبوں تک بلکہ چھوٹے چھوٹے دیہاتوں تک اس مطالبہ پر متفق کرنا اور قومی اسمبلی سے باہر اور اندر فعال کردار ادا کرنا آپ کا ایک عظیم تاریخ ساز کارنامہ ہے۔ اسمبلی کے اندر آپ نے اُمت مسلمہ کے ترجمان کا کردار ادا کیا۔ اور قومی اسمبلی سے یہ منوالیا۔ کہ مرزائیت خلاف اسلام فرقہ ہے۔ اسلام اور مسلمانوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور یہ کہ وہ پاکستان میں ایک اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جناب اکرام القادری صاحب آپ کی تحریک میں قائدانہ کردار کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ۷۴ء میں تحریک ختم نبوت چلی تو آپ پیش پیش تھے۔ اس تحریک کی قیادت کا سہرا تو مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے سر تھا۔ مگر قومی اسمبلی میں ختم نبوت کا معرکہ مولانا مفتی محمود لڑ رہے تھے۔ ناموسِ سرکارِ عالم ﷺ کے لئے دن کا چین اور رات کا آرام تج کر رکھ دیا تھا۔ وہ عوام سے رابطہ رکھتے لاکھوں کے اجتماعات سے خطاب کرتے۔ علماء اور قانون دانوں سے مشورہ کرتے۔ اور دوسری طرف قومی اسمبلی میں قادیانیوں کے موجودہ امام مرزا ناصر پر گرفت کرتے۔ بالآخر وہ اس تحریک میں کامیاب و سرفراز ہوئے۔(۱۳۱)

اسی طرح بھٹو حکومت کی طرف سے عام انتخابات میں دھاندلی کے خلاف جو تحریک چلی جو بعد میں "تحریک نظام مصطفیٰ" کے نام سے مشہور ہوگئی۔ جس کی قیادت مذہبی جماعتوں کے پاس رہی اور جس میں اکثر قربانیاں بھی دینی جماعت کے کارکنوں نے پیش کی۔ اس تحریک کے صدر اور روح رواں بھی مولانا مفتی محمود تھے۔ ملک کی تمام دینی جماعتوں اور سیاسی تنظیموں کو ایک مقصد کی خاطر متحد رکھنے کی وجہ بھی تمام جماعتوں کا آپ کی قیادت پر بھرپور اعتماد تھا۔ اس سلسلے میں جناب اکرام القادری صاحب یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

> بھٹو حکومت کی طرف سے عام انتخابات میں تاریخی دھاندلی کے خلاف اور جمہوریت کی بحالی کے لئے جو تحریک اٹھی آخر کار وہ "نظام مصطفیٰ تحریک" میں بدل گئی۔ اور اس کی قیادت کی سعادت مولانا مفتی محمود کے حصہ میں آئی اس دور میں مولانا مفتی محمود نظام مصطفیٰ کے نفاذ کی علامت اور عامۃ المسلمین کے دلوں کی دھڑکن بن کر اُبھرے۔ آپ کی ایک ایک خوبی تحریک نظامِ مصطفیٰ کے افق پر آفتاب نیم روز بن کر مستنیر و فروزاں ہوئی اور آپ کی جرأت، اولوالعزمی، شجاعت، بسالت، فراست و حقیقت رسی اور قوت فیصلہ و معاملہ فہمی کی دھاک خاص و عام کے دلوں پر بیٹھ گئی۔ تحریک نظام مصطفیٰ میں مختلف اتار چڑھاؤ، نشیب و فراز اور مدوجزر آتے رہے مگر آپ نے جس دور اندیشی سے قوم کی رہنمائی کی وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔(۱۳۲)

جناب اکرام القادری کے ان الفاظ کے مطابق کہ تحریک نظام مصطفیٰ میں بہت اتار چڑھاؤ، نشیب و فراز اور مدوجزر آئے حضرت مفتی صاحب نے نہایت تدبر، اصابت رائے اور اتحاد کے جذبہ کے ساتھ ان حالات میں قوم کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ حتیٰ کہ جب بعض رہنماؤں کی غلط اندیشی کی وجہ سے انہوں نے اپنے روّیہ سے "قومی اتحاد" کو نقصان دینا چاہا۔ تو بھی مفتی صاحب اتحاد کے داعی و علمبردار رہے۔ بلکہ ان کی منت و سماجت کرتے رہے کہ وہ ان حالات میں قوم میں انتشار کا باعث نہ بنیں۔ ڈاکٹر محمد یاسین کلسی جڑانوالہ لکھتے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب فیصل آباد میں مولانا مفتی محمود کو استقبالیہ دیا گیا تو مفتی صاحب نے اپنی ساری تقریر میں اتحاد اور اتفاق پر زور دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر آج ہم میں اتحاد نہ رہا۔ تو ہم نظام مصطفےٰ کی منزل سے بہت دور ہو جائینگے۔ میں قومی اتحاد سے الگ ہو جانے والی جماعتوں سے اپیل کرتا ہوں۔ کہ وہ اپنے سربراہوں کو اتحاد کے لئے مجبور کریں۔ اگر مجھے ان کے رویے میں کچھ لچک معلوم ہوئی تو میں خود منت ساجت کرنے کے لئے ان کے گھروں پر جانے کے لئے تیار ہوں۔(۱۳۳)

مولانا مفتی محمود صاحب کی ہمیشہ یہ کوشش رہی تھی کہ عملی زندگی میں اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر دینی جماعتوں اور تنظیموں کو اتحاد کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔ اور اس اتحاد کے ہمیشہ داعی اور علمبردار رہے۔ اور اپنے کسی قول و عمل سے کبھی بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کہ اس کے رویہ سے اتحاد کو نقصان پہنچے۔ آپ کا اتحاد کا یہ جذبہ اور اس کے لئے دوسری جماعتوں کے رہنماؤں کی منت ساجت تک کرنے کا ارادہ صرف اس لئے تھا۔ کہ اس مملکت خداداد پاکستان میں دین اسلام کا مکمل نفاذ ہو۔ تاکہ پاکستان کے مسلمان اپنی آزادی کے مقاصد سے بہرہ ور ہوں۔ اور ملک میں امن و امان اور حقوق انسانی کا پورا پورا تحفظ ہو۔ اسلام کے نفاذ کے معاملہ میں آپ یہاں تک بھی فرماتے تھے کہ پاکستان میں ۹۰ فی صد آبادی حنفی المسلک ہیں۔ لیکن اگر ارباب حکومت یہاں مذاہب اربعہ میں سے کسی فقہ کو بھی نافذ کر دے ہمیں قبول ہے۔ مولانا نور محمد صاحب نے مفتی محمود صاحب کی "وسعت نظری" کے عنوان کے تحت یہ لکھا ہے۔

ایک مجلس میں حضرت مفتی صاحب نے پاکستان میں نفاذ اسلام کے حوالہ سے فرمایا "میں نے ارباب حکومت پر واضح کیا کہ تم لوگ عوام کو گمراہ کرنے کے لئے جو کہتے ہو کہ ہم کس فرقہ اور مسلک والوں کا اسلام نافذ کر دیں۔ ہم تو اسلام نافذ کرنا چاہتے ہیں مگر یہ مولوی لوگ آپس میں متفق نہیں ہوتے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے انہیں بتایا کہ

مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک مذہب کے دائرہ کے اندر رہتے ہوئے اگر تم درجۂ اباحت تک کوئی قانون بنا دو تو بھی ہمیں قبول ہو گا"۔(۱۳۴)

اس سے متعلق آپ کا ایک اور قول ہے جس میں ایک طرف ملک پاکستان میں اسلام ے مکمل نظام کے نفاذ کی آپ کی شدید خواہش کی جھلک اس میں نمایاں ہے۔ دوسری طرف وجودہ انگریزی نظام سے نفرت کا اظہار ہے اور تیسری طرف آپ کی وسعت قلبی اور اتحاد کے ذبہ کا مظہر ہے۔ مولانا نور الہدیٰ صاحب اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

مولانا مفتی محمود نے زندگی بھر دین کو اہمیت دی۔ ان کی خواہش تھی کہ کسی طرح اس ملک میں اسلامی نظام آجائے۔ ایک دفعہ آپ نے کہا کہ میرے نزدیک پوری دنیا کی بادشاہی سے بہتر وہ جگہ ہے۔ چاہے وہ چند گز کا ٹکڑا کیوں نہ ہو جہاں پر اسلامی نظام مکمل طور پر موجود ہو۔ اس چند گز کے لئے بھی قربانی دیں گے۔ ایک بار کسی محفل میں کسی نے پوچھا کہ ملک میں فقہ حنفی نافذ ہو یا فقہ جعفری؟ آپ نے سوال کرنے والے کی طرف دیکھا اور کہا افسوس کی بات ہے۔ تم لوگ بتیس سال تک انگریزی نظام کے تحت چپ رہے۔ اب جب ذرا کچھ اسلامی نظام کی اُمید ہوئی ہے تو فقہ حنفیہ اور فقہ جعفریہ پر لڑائی کر رہے ہو۔ فقہ حنفی ہو یا فقہ جعفریہ کم از کم اس نظام سے تو بہتر ہو گا جو اس وقت انگریزی اور بے دینی نظام کی صورت میں یہاں رائج ہے۔ اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ سب لوگ اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے متحد ہو جائیں۔(۱۳۵)

ی و تعلیمی اصلاحات و قوانین کا اجراء

مولانا مفتی محمود نے یکم مئی ۱۹۷۲ء کو جمعیت علماء اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی کے درمیان معاہدہ کے نتیجے میں شمال مغربی سرحدی صوبہ (N.W.F.P) کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے حلف اٹھایا تھا جبکہ صوبہ کا گورنر نیشنل عوامی پارٹی کے رہنما جناب ارباب سکندر خان خلیل تھے۔ جنہوں نے مفتی صاحب سے حلف لیا تھا جمعیۃ نیپ معاہدہ کی رُو سے صوبہ بلوچستان میں

جمعیت علماء اسلام کے تعاون سے وہاں نیشنل عوامی پارٹی نے حکومت بنائی تھی۔ جبکہ اس وقت مرکز اور پنجاب وسندھ میں پیپلز پارٹی کی حکومتیں تھی۔ شروع میں یہ ایک سہ فریقی معاہدہ تھا۔ پیپلز پارٹی بھی اس کا حصہ تھی۔ لیکن صوبوں سے متعلق بعض شقوں پر اختلاف کی وجہ سے پیپلز پارٹی اس معاہدہ سے علیحدہ ہوئی تھی۔ جبکہ جمعیت نیپ کے معاہدہ کی رُو سے مرکز سے متعلق شقوں پر عملدرآمد پیپلز پارٹی کو بھی کرنی تھی۔

جمعیت نیپ کے آپس کی حکومت سازی میں تعاون، جمعیۃ علماء اسلام کی طرف سے پیش کردہ شرائط پر ہوئی تھی۔ دیگر امور کے علاوہ اس میں وفاق کی سطح پر دستور سازی کے مرحلہ میں اسلامی مطالبات کو دستور پاکستان کا حصہ بنانے اور صوبائی سطح پر اسلامی قوانین کے اجراء میں جمعیۃ علماء اسلام کے ساتھ تعاون وہمنوائی بھی شامل تھی۔ اس ضمن میں جناب مولانا زاہد الراشدی صاحب یوں اظہار خیال کرتے ہیں کہ

> مولانا مفتی محمود نے جمعیۃ علماء اسلام کے قائد کی حیثیت سے موقع کی نزاکت کا اچھی طرح اندازہ کر لیا۔ اور تعاون کے لئے جو شرائط عائد کیں۔ ان میں وفاق میں دستور ساز اسمبلی میں دستور پاکستان کی ترتیب وتدوین کے دوران اسلامی امور میں جمعیۃ سے تعاون اور صوبہ میں اسلامی قوانین واحکام کے نفاذ کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ (۱۳۶)

مولانا زاہد الراشدی کی اس تحریر میں جمعیۃ نیپ معاہدہ میں جمعیۃ کی طرف سے عائد شدہ شرائط اور نیپ کی طرف سے ان پر عملدرآمد میں بھرپور تعاون اور ہمنوائی کی یقین دہانی کا ذکر ہے۔ چونکہ جمعیۃ علماء اسلام نے ۱۹۷۰ء کا الیکشن ہی اسی نعرہ پر لڑا تھا۔ اور یہی بات یعنی اسلامی آئین وقوانین کا نفاذ ہی اس کے منشور کا بنیادی نکتہ تھا۔ اس لئے صوبہ سرحد میں مفتی صاحب نے حکومتی ذمہ داریاں سنبھالتے ہی اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے کچھ اہداف مقرر کئے۔ جس کے بارے میں مولانا محمد ضیاء القاسمی صاحب کچھ یوں رقمطراز ہیں۔

> مولانا مفتی محمود نے سرحد کی وزارت اعلیٰ قبول کر کے اپنے تین اہداف مقرر کئے۔
>
> (۱) سرحد کی فضا کو زیادہ سے زیادہ اسلامی بنانا اور معاشرتی برائیوں کو دُور کرنا۔
>
> (۲) پسماندہ علاقوں کو ترقی دینا اور ان کو ضروریات زندگی فراہم کرنے کی جدوجہد کرنا۔
>
> (۳) صوبہ کے عوام کے لئے وزیر اعلیٰ ہاؤس کا دروازہ کھلا رکھنا اور اس کے مسائل کو سننا اور حل کرنا۔ (۱۳۷)

مفتی محمود صاحب نے جمعیت نیپ معاہدہ کے شرائط اور اپنے مقرر کردہ اہداف کے حصول کے لئے جو جدوجہد کی وہ آپ کا آپ کی ساڑھے نوماہ کی مختصر سی مدت میں حکومتی اصلاحات کے اعتبار سے ایک تاریخ ساز کردار ہے۔ جناب نعیم آسی اس سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہیں۔

> حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے یکم مئی ۱۹۷۲ء کو صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے حلف اُٹھایا۔ پاکستان کی تاریخ میں اس اعتبار سے یہ پہلا خوشگوار تجربہ تھا کہ ایک صوبے کی حد تک سہی اقتدار ایک عالم دین کو ملا۔ اور اس عالم دین نے قوم کو مایوس نہ کیا۔ مولانا مفتی محمود نے اس خیال کو باطل ثابت کر دکھایا کہ علماء حکومت کی نہیں مسجد کی چیز ہیں۔ انہوں نے ساڑھے نوماہ کی مختصر مدت میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ انہوں نے نہایت تیزی کے ساتھ اپنے منشور پر عملدرآمد کیا۔ ان کے اصلاحات اس قدر مؤثر، تعمیری اور زوردار تھے کہ ملک بھر میں ان کی صدائے بازگشت سنی گئی اور قوم ان کے لئے سراپا تحسین بن گئی۔ (۱۳۸)

مفتی صاحب نے صوبائی حکومت کو حاصل آئینی اختیارات کے اندر رہتے ہوئے صوبائی قوانین میں شریعت اسلامیہ کے مطابق ترمیم واضافہ کے لئے جید علماء اور ماہر قانون دانوں پر مشتمل ایک بورڈ تشکیل دیا۔ جس کا اعلان وہ خود "ختم نبوت کانفرنس" لاہور میں ۴/جون ۱۹۷۲ء کو کرتے ہیں۔ وہ اپنے اس خطاب میں فرماتے ہیں۔

میں یقین دلاتا ہوں کہ صوبائی حکومت کی حیثیت سے آئین کی حدود میں جتنے اختیارات ہوں گے۔ ہم ان اختیارات کو سماجی برائیوں اور غیر اسلامی قدروں کو ختم کرنے کے لئے پورے طور پر استعمال کریں گے۔ اور میں آج آپ کے سامنے ایک "بورڈ" کا اعلان کرتا ہوں۔ پانچ رکنی بورڈ جس میں تین جید فقیہ النفس علماء اور دو ماہر قانون داں، اسلامی ذہن رکھنے والے پانچ آدمیوں کے بورڈ کا میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔(۱۳۹)

ویسے تو مولانا مفتی محمود نے یکم مئی ۱۹۷۲ء کو صوبہ سرحد کے وزارت اعلیٰ کا حلف اٹھانے کے بعد جو اہم اعلانات کئے۔ ان میں یہ بھی تھا۔ "صوبائی قوانین کو کتاب و سنت سے ہم آہنگ کرنے کے لئے علماء اور ماہر دینی قانون کا بورڈ قائم کیا جائے گا"۔ (۱۴۰)

۲۰ جولائی کو جید علماء اور ماہرین قانون پر مشتمل یہ بورڈ قائم کر دیا گیا۔ اس کے بارے میں روزنامہ "مشرق" پشاور نے جو خبر لگائی وہ یوں ہے۔

> حکومت صوبہ سرحد نے صوبہ میں رائج قوانین کا جائزہ لینے اور انہیں اسلامی تعلیمات قرآن کریم اور سنت نبوی کے مطابق ڈھالنے کی غرض سے پانچ ارکان پر مشتمل علماء بورڈ قائم کر دیا ہے آج یہاں صوبائی وزیر اعلیٰ مولانا مفتی محمود نے اعلان کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے اس سال جون میں اسمبلی کے اجلاس میں عوام سے جو وعدہ کیا تھا وہ انہوں نے پورا کر دیا ہے۔ مولانا مفتی محمود نے کہا کہ صوبہ کے تمام موجودہ قوانین کو اسلامی قوانین میں بدل دیا جائے گا۔ اور ایسا کرتے وقت یہ بورڈ اس امر کا انتہائی خیال رکھے گا۔ کہ اسلام کے مختلف فرقوں کے شخصی قوانین کو قطعاً نہ چھیڑا جائے بلکہ ان قوانین کو پورا تحفظ دیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ علماء کا یہ بورڈ اپنی رپورٹ حنفی مسلک کی بنیاد پر تیار کرے گا۔ لیکن جہاں کہیں بھی ضروری ہوا یہ بورڈ مالکی، شافعی اور حنبلی مذاہب سے بھی رجوع کرے گا۔ انہوں نے کہا کہ علماء کا یہ بورڈ مختلف قوانین کے بارے میں ایک ایک کر کے اپنی رپورٹ پیش کرے گا۔ جس کے بعد اسے ارکان کی منظوری کے لئے اسمبلی میں پیش کیا جائے گا۔ اس بورڈ کے

> ممبر اور وزیر اعلیٰ مولانا مفتی محمود ہوں گے۔ بورڈ کے دیگر ارکان میں شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ بہاولپور مولانا شمس الحق افغانی، شیخ الحدیث، بانی و مہتمم مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی مولانا محمد یوسف بنوری، بانی کورٹ بار ایسوسی ایشن پشاور کے صدر مسٹر عبد الغنی خٹک اور صوبہ سرحد کے قانونی اور پارلیمانی امور کے وزیر خان امیر زادہ خان ہیں۔ صوبائی محکمہ قانون کے سیکرٹری بورڈ کے سیکرٹری ہوں گے۔(۱۴۱)

اس بورڈ کے متعدد اجلاس ہوئے جن میں ایک اجلاس کی کاروائی کا راقم الحروف کو بھی حضرت مفتی محمود کے صاحبزادے مولانا فضل الرحمٰن (جب اس وقت ہم دونوں دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں زیر تعلیم تھے) کی معیت میں سننے کا اتفاق ہوا۔ اس اجلاس میں چوری کی مقدار، چوری کی سزا سے متعلق قوانین زیر غور تھے۔ بورڈ نے اپنا کام کافی حد تک مکمل کر لیا تھا۔ مگر ساڑھے نو ماہ بعد فروری ۱۹۷۳ء میں آپ کو بلوچستان حکومت کی برطرفی کے خلاف احتجاجاً اپنی وزارت سے مستعفی ہونا پڑا اور قوانین میں ترمیم کا کام مکمل نہ ہو سکا اور نہ ہی وہ منظوری کے لئے اسمبلی میں پیش کئے جا سکے۔

آپ نے اپنی وزارت کے دور میں جن دیگر اسلامی و دینی اصلاحات و قوانین کا اجراء کیا وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

شراب پر پابندی

یکم مئی ۱۹۷۲ء کو گورنر ہاؤس پشاور میں حلف اٹھاتے ہوئے آپ نے شراب پر مکمل پابندی کا اعلان کیا، آپ نے اعلان کیا۔

> آج سے شراب کی تیاری اس کی فروخت اور اس کا پینا ممنوع قرار دیا گیا ہے شراب کی فروخت کی تمام لائسنس آج سے منسوخ کر دیئے گئے ہیں۔ کسی بھی شخص کو شراب رکھنے اور استعمال کرنے کی کوئی اجازت نہیں ہوگی کسی ہوٹل یا کلب میں شراب نہیں

رکھی جائے گی۔ اس سلسلے میں صوبائی حکومت کو ایک قانون کی تیاری کا حکم دے دیا گیا ہے۔ جو جلد ہی نافذ کر دیا جائے گا۔ (۱۳۲)

"۵ مئی ۱۹۷۲ء کو امتناع شراب کا قانون صوبہ بھر میں نافذ کر دیا گیا"۔ (۱۳۳)

شراب پر پابندی کے اعلان کو نہ صرف پاکستانی عوام نے سراہا بلکہ بیرون ملک کے مسلمانوں کے رہنماؤں نے بھی اس پر آپ کو خراج تحسین پیش کیا۔ قیام پاکستان کے بعد یہ پہلا قدم تھا جو معاشرہ کی اصلاح کی نیت سے اٹھایا گیا تھا۔ ڈاکٹر احمد حسین کمال اس کا تذکرہ یوں کرتے ہیں کہ

> تاہم مفتی صاحب نے صوبہ سرحد میں حکومت کی زمام سنبھالتے ہی شراب پر پابندی عائد کر دی۔ ان کے اس اقدام کا پورے ملک میں زبردست خیر مقدم کیا گیا۔ بیرون ملک کے سرکردہ مسلمانوں نے بھی خراج تحسین پیش کیا۔ اور برطانوی اقتدار کے قیام کے وقت سے آزادی کے حصول کے ۲۵ سال گزر جانے کے بعد پاکستان کی حکومت کا یہ پہلا قدم تھا۔ جو اسلام کی طرف اٹھایا گیا تھا اور جو ایک زبردست معاشرتی اصلاح کا اقدام بھی تھا۔ (۱۳۴)

جوئے پر پابندی

جوا ایک نہایت قبیح فعل ہے۔ شراب کے ساتھ جوا بھی تمام برائیوں کی اصل ہے۔ تمام برائیاں ان دو برائیوں سے پھوٹتی ہیں۔ ان دونوں کی تباہ کاریوں نے کئی قوموں کو شکست و ریخت سے دوچار کیا ہے۔ اور اس بات پر تمام موافق و مخالف مورخ متفق ہیں۔ اور وہ اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام نے ایسی قباحتوں کے سدباب کے لئے جو اقدامات کئے ہیں اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔

نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے۔ کہ اسلام کے نام پر عظیم قربانیوں کے نتیجے میں معرض وجود میں آنے والے ملک پاکستان میں جہاں شراب کی کوئی ممانعت نہیں تھی وہاں جوا پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی۔ بلکہ ان دونوں کا کاروبار سرکاری سرپرستی میں ہوتا رہا۔ شراب پر پابندی کے فوراً بعد جوا پر پابندی بھی پاکستان کے ایک صوبہ میں ہی سب سے پہلے ایک عالم دین وزیر اعلیٰ مولانا مفتی محمود نے لگائی۔ جناب محمد نعیم آسی لکھتے ہیں کہ "یہ اعزاز بھی قدرت نے مولانا مفتی محمود ہی کی قسمت میں لکھا تھا۔ جنہوں نے "انگور کی بیٹی" کے ساتھ "ہوس کے بیٹے" کو بھی پابہ زنجیر کر دیا اور ہر نوع کا جوا صوبہ سرحد کی حد تک قانوناً جرم قرار پا گیا۔ (۱۳۵)

جوئے پر پابندی کا آرڈیننس یکم اگست ۱۹۷۲ء کو جاری کیا گیا۔ جوئے پر پابندی کے بارے میں روزنامہ "مشرق" پشاور نے اپنے ۲؍اگست ۱۹۷۲ء کے شمارہ میں مفتی صاحب کے حوالے سے یہ خبر شائع کی کہ "انہوں (مفتی محمود) نے کہا کہ آج ہی ایک اور آرڈیننس بھی جاری کیا گیا ہے جس کے تحت صوبہ سرحد میں ہر مقام پر ہر قسم کی قمار بازی ممنوع قرار دے دی گئی۔ اور اس سلسلے میں ہمیں نے جو وعدہ کیا تھا وہ بھی پورا کر دکھایا ہے"۔ (۱۳۶)

سود پر پابندی

اسلام نے سود کو حرام قرار دیا ہے۔ اور اس کے مضر اثرات کو تفصیل کے ساتھ بیان کر کے اس کی حرمت کی وجوہات بھی ذکر کر دی ہیں۔ قرآن حکیم نے اعلان کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال جبکہ سود کو حرام قرار دیا ہے۔

أَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔ (۱۳۷)

حلال کیا اللہ تعالیٰ نے خرید و فروخت کو اور حرام کیا سود کو۔

سود اور جوا دو ایسی معاشرتی قباحتیں ہیں جن کے برے اثرات میں افراد کے ساتھ پوری قوم بھی خیر و برکت سے محروم رہ جاتی ہے۔ مولانا حمید الحق کے الفاظ ہیں۔

دنیا کی تاریخ کھنگال ڈالئے۔ قوموں کے عروج و زوال کی داستان پڑھ لیجئے۔ ہر پیغمبر اور مصلح کی تعلیمات سامنے لائیے۔ دو باتوں کے بارے میں کامل اتفاق رائے اور اجماع ملے گا کہ جوئے کے باعث فرد حرکت سے اور سودی معیشت کے سبب قوم برکت سے محروم ہو جاتی ہے۔ جوئے سے فرد ذہنی اختلال اور سود سے قومی معیشت اضمحلال میں مبتلا رہتی ہے۔ (۱۴۸)

مولانا مفتی محمود صاحب نے صوبہ سرحد میں سودی لین دین پر پابندی لگادی۔ یہاں تک کہ حکومت زمینداروں کو جو تقاوی قرضے جاری کر کے اس پر ان سے سود لیتی تھی۔ ان پر سود کی معافی کا اعلان کر دیا۔ روزنامہ "مشرق" پشاور کے مطابق، "صوبہ سرحد میں سود ختم کر دیا گیا اور آئندہ مالی سال سے تقاوی اور دوسرے قرضوں پر سود نہیں لیا جائے گا"۔ (۱۴۹)

مفتی صاحب نے ملکی معیشت کو اسلامی خطوط کی راہ پر لگانے کے لئے صوبہ سرحد میں پچھلے تقاوی قرضوں پر سود معاف کر دیا۔ اور آئندہ بلا سود تقاوی قرضے جاری کرنے کا حکم دیا۔ اس اعلان سے صوبہ سرحد کے زمینداروں نے سکھ کا سانس لیا۔ کیونکہ تقاوی قرضوں پر دوگنے سود نے ان کی کمر توڑ دی تھی۔ (۱۵۰)

جہیز ایکٹ

جہیز کی رسم ایک معاشرتی ناسور ہے۔ جہیز کی عدم دستیابی کی وجہ بہت سی نوجوان لڑکیاں نکاح کرنے کے قابل نہیں سمجھی جاتی اور سسک سسک کر زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ جہیز کے بغیر کوئی ان کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔ مولانا مفتی محمود صاحب نے دیگر معاشرتی برائیوں کی طرح جہیز کی لعنت سے چھٹکارے کے لئے بھی قانون سازی کا سہارا لیا۔

مفتی محمود صاحب کے اس اقدام کو بہت سراہا گیا۔ اور اس وقت کے اخبارات نے اس اقدام پر آپ کو خراج تحسین پیش کیا۔ علماء اور دانشوروں نے مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ سرحد حکومت کی طرح جہیز پر پابندی لگائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرکزی حکومت نے بھی ایک آرڈیننس کے ذریعہ جہیز پر پابندی لگادی۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔

برصغیر کے مسلمانوں میں جہیز کی موجودہ رسم ہندوؤں کے رسم رواج سے در آمد ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے لاتعداد خاندانوں کو مصائب کا شکار بننا پڑتا ہے۔ اور بے شمار لڑکیاں معاشرہ میں اپنا مستقبل تباہ کر بیٹھتی ہیں۔ اس رسم نے اسلام کے سادہ رسم عقد کو ایک گھناؤنا کاروبار بنا دیا ہے۔ بلاشبہ حکومت سرحد کا یہ اقدام معاشرہ کی ایک اہم اصلاح کا حامل ہے اور ہمیں امید ہے کہ جلد ہی دوسرے صوبوں میں اس اقدام کی پیروی کی جائے گی۔ (۱۵۱)

"مولانا مفتی محمود صاحب کی یہ بھی دلی خواہش تھی کہ جہیز کو ایک مقررہ حد تک پابند کیا جائے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہ حق مہر کے لئے بھی ایک حد مقرر کی جائے"۔ (۱۵۲)

روزنامہ "مشرق" پشاور کے ۱۳ مئی ۱۹۷۲ء کے شمارہ میں اس سلسلے میں آپ کا بیان شائع ہوا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ " جہیز کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے حق مہر بھی اپنی مرضی سے مقرر کرنے کے غلط طریق کار کو ختم کیا جائے۔ اور ایک مقررہ حد سے زیادہ حق مہر مقرر کرنے پر پابندی لگادی جائے گی"۔ (۱۵۳)

۱۴ مئی ۱۹۷۲ء کے روزنامہ "مشرق" پشاور کے مطابق مولانا مفتی محمود نے اعلان کیا کہ " صوبہ سرحد میں مقررہ حد سے زیادہ جہیز دینے پر پابندی لگادی جائے گی۔ جبکہ ۲۳ جون ۱۹۷۲ء کو سرحد اسمبلی نے جہیز پر پابندی کا قانون منظور کیا"۔ (۱۵۴)

۱۱ر جون ۱۹۷۲ء کو گورنر صوبہ سرحد کے ایک آرڈیننس کے ذریعہ سے مقررہ حد سے زیادہ جہیز دینے پر پابندی لگادی ہے۔ جہیز کی نمائش بھی نہیں کی جاسکے گی۔ خلاف ورزی کرنے والے کے لئے دس ہزار روپے جرمانہ کی سزا رکھی گئی۔(۱۵۵)

احترام رمضان آرڈیننس

رمضان کا مہینہ ایک نہایت متبرک اور قابل احترام مہینہ ہے۔ مسلمان اس مہینے میں اللہ تعالیٰ کی خاص عبادت کانہایت اخلاص سے ادائیگی کا اہتمام کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بعض بدبخت کھلم کھلا اس مہینے کی بے حرمتی کاارتکاب کر کے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرتے ہیں۔ مفتی صاحب نے اپنے دور حکومت میں احترام رمضان کا آرڈیننس جاری کر کے ایسے لوگوں کی حوصلہ شکنی کے اسباب مہیا کئے جو رمضان المبارک کا احترام پامال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جناب اشفاق ہاشمی لکھتے ہیں۔

جمعیت کے جنرل سیکرٹری مولانا مفتی محمود نے صوبہ سرحد میں احترام رمضان کا آرڈیننس نافذ کر کے ربع صدی کی پاکستانی تاریخ میں ایک نئے اور روشن باب کا اضافہ کیا۔ مفتی صاحب نے صوبہ سرحد کے تمام ہوٹلوں کو ماہ رمضان کے متبرک دنوں میں بند رکھنے کا حکم جاری کیا۔ اس کی خلاف ورزی پر ایک ہزار روپے جرمانہ اور دو ماہ کی قید یا دونوں سزائیں ایک ہی وقت میں جاری کرنے کا اعلان کیا۔(۱۵۶)

اس سلسلے میں جناب گل نایاب چترالی رقمطراز ہیں۔

اگرچہ اسلام میں جبر نہیں لیکن جب مولانا مفتی محمود صاحب وزیر اعلیٰ بنے تو معاشرتی حالات کچھ ایسے تھے کہ لوگ باوجود مسلمان ہونے کے اسلامی احکامات کا احترام نہیں کرتے تھے۔ اور رمضان المبارک میں سرعام روزہ کھایا جاتا تھا۔

وہ آگے نعیم آسی کی عبارت کا حوالہ دیتے ہیں۔

مفتی صاحب نے ایک آرڈیننس نافذ کر کے رمضان المبارک کے احترام میں صوبہ سرحد کے تمام ہوٹل بند رکھنے کا حکم دیا۔ خلاف ورزی کی سزا ایک ہزار روپیہ جرمانہ دو ماہ کی قید یا ایک ہی وقت میں دونوں۔(۱۵۷)

رمضان المبارک میں کھلے عام کھانے پینے کے بارے میں مولانا مفتی محمود کی صوبائی گورنمنٹ نے ایک آرڈیننس جاری کیا۔ روزنامہ "مشرق" پشاور کے مطابق یہ آرڈیننس ۲۲ ستمبر ۱۹۷۲ء مطابق ۱۳ر شعبان المعظم کو جاری کیا گیا۔(۱۵۸)

پردۂ نسواں

اسلام نے عورت کو ایک بلند معاشرتی مقام عطا فرمایا ہے۔ اسلام سے قبل عورت کو جتنا نہایت ذلت کا حقدار ٹھہرایا جاتا تھا۔ ان کو مظالم کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اور اس کو نحوست وبدبختی کی علامت قرار دیا جاتا تھا۔ اسلام نے اس کو اتنا ہی اونچا مقام عطا کیا۔ اس کے حقوق کو متعین کر کے ان کی ادائیگی کو بھی ایسے ہی لازم قرار دیا۔ جس طرح عورت کے ذمہ مرد کے حقوق کی ادائیگی کو لازم بتایا ہے۔ اسلام نے اس کو عزت ووقار دیا ہے۔ اس کو گھر کی چار دیواری سے باہر کی ذمہ داریوں سے مستثنیٰ قرار دے کر گھر کی پاسبانی اور بچوں کی پرورش کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

مگر مغربی تہذیب کی اندھی تقلید نے جہاں دوسری اخلاقی، تہذیبی اور معاشرتی خرابیوں کو جنم دیا ہے وہاں عورت ومرد کے اختلاط، بے حجابی بھی عام ہوئی ہے۔ مشرقی عورت میں شرم وحیاء ہوتی تھی۔ اس مادی ترقی نے عورت سے شرم وحیاء، غیرت اور حمیت اسلامی کی چادر اس کے بدن سے اتار دی ہے۔ اور اس کو شمع محفل بنادیا ہے۔ یہ تمام صورت حال مولانا مفتی محمود کے سامنے تھی۔ اس لئے انہوں نے اپنے دور حکومت میں ایک اہم اقدام یہ کیا کہ عورتوں کے لئے پردے کو لازمی قرار دیا۔ جناب اشفاق ہاشمی صاحب کے بقول۔ "مفتی صاحب نے عورتوں

کے حقوق کے لئے اور مردوزن کے کھلے اختلاط اور عورتوں کی بے حجابی سے پرورش پانے والی خرابیوں کی روک تھام کے لئے صوبہ سرحد میں خواتین کے لئے پردہ لازم قرار دیا"۔(۱۵۹)

اس ضمن میں محمد نعیم آسی کی کتاب میں ہے کہ "مفتی صاحب کو خدا نے اقتدار دیا تو انہوں نے خواتین کے لئے پردے کا اہتمام ضروری قرار دیکر اپنی نیکیوں کی فہرست میں مزید اضافہ کر لیا"۔(۱۶۰)

جمعہ کی تعطیل کی سفارش

برصغیر میں انگریزی اقتدار نے جہاں مسلمانوں کے دیگر شعائر کو مٹانے کی کوشش کی ان میں جمعہ کی تعطیل کی جگہ اتوار کی تعطیل بھی شامل ہے۔ اتوار کا دن عیسائیوں کی عبادت کے لئے مخصوص دن ہے۔ اس دن وہ گرجا گھروں میں عبادت کے لئے جاتے ہیں۔ ملک کی آزادی کے بعد تقاضا یہ تھا کہ انگریزی اقتدار کی تمام علامات کو مٹا دیا جاتا۔ مگر بد قسمتی سے پاکستان کا اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں رہا جو انگریز کے پروردہ تھے۔ ان کو دین اسلام اور اس کے شعائر سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ انگریز کی پیروی کو وہ سب سے بڑا کمال اور ترقی کا زینہ سمجھے ہوئے تھے۔ مفتی صاحب صوبہ سرحد میں برسر اقتدار آئے تو اگرچہ ان کے اختیارات محدود تھے۔ ہفتہ وار تعطیل وفاقی مسئلہ تھا لیکن اس کے باوجود آپ نے جمعہ کی تعطیل کے لئے جدوجہد کی۔ اشفاق ہاشمی لکھتے ہیں کہ (مولانا مفتی محمود نے) "اپنی کابینہ میں یہ بل پاس کرایا تھا کہ صوبہ سرحد میں تعطیل اتوار کی بجائے جمعہ کو منانے میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے"۔(۱۶۱)

اردو کو سرکاری و دفتری زبان قرار دینا

پاکستان ایک کثیر اللسانی ملک ہے۔ اس لحاظ سے ملکی یکجہتی کے لئے کسی ایسی زبان کو سرکاری اور دفتری حیثیت دینا ضروری ہے جو ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہو۔ اسی حقیقت کے پیش نظر بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد سے ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ " اگر پاکستان کے مختلف حصوں کو باہم متحد ہو کر ترقی کی راہ پر گامزن ہونا ہے تو اس کی سرکاری زبان ایک ہی ہو سکتی ہے۔ اور وہ میری رائے میں اردو اور صرف اردو ہے"۔

مولانا مفتی محمود نے اسی ضرورت کے پیش نظر صوبہ سرحد کی سرکاری اور دفتری زبان اردو قرار دیا۔ ۱۰ مئی ۱۹۷۲ء کو آپ نے اعلان کیا کہ "صوبہ سرحد کی سرکاری زبان اردو ہوگی"۔(۱۶۲)

"جبکہ ۱۰ جون ۱۹۷۲ء کو صوبائی حکومت نے اس سلسلے میں آرڈیننس نافذ کیا"۔(۱۶۳)

مشہور کالم نویس جناب سید انور قدوائی لکھتے ہیں کہ " ایک اور اہم کارنامہ صوبہ سرحد میں اردو کو سرکاری زبان قرار دینا تھا۔ ایک حکم کے ذریعہ تمام سرکاری خط و کتابت اور دفتری کام اردو میں کر دیا گیا"۔(۱۶۴)

سرکاری لباس

انگریزی تہذیب و تمدن کے اثرات میں یہ تھا کہ ہماری قوم اپنی غلامانہ ذہنیت کی بدولت اپنی تہذیب سے برگشتہ اور انگریزوں کی تہذیب کی دلدادہ بنی۔ انگریزی لباس کو اپنے لئے فخر اور اپنے لباس سے متنفر رہی۔ جس نے بھی انگریزی زبان سیکھ لی انگریزی لباس میں نظر آنے

گئے جبکہ عام لوگ علاقائی لباس میں ملبوس ہوتے تھے۔ اس طرح ایک طبقہ احساس بالاتری اور دوسرا طبقہ احساس کمتری کا شکار رہا۔ جس سے طبقاتی تقسیم نے جنم لیا۔ اور دونوں میں ایک دوری، اجنبیت اور نفرت سی رہی۔ مولانا مفتی محمود صاحب نے شلوار قمیص کو سرکاری لباس قرار دیا۔ جس سے عام لوگوں اور بااختیار طبقے میں مساوات کی صورت پیدا ہوگئی اور بُعد کی جگہ قرب، نفرت کی جگہ دوستی و محبت نے لے لی۔ اور اس طرح مفتی صاحب نے غلامانہ ذہنیت پر ضرب کاری لگادی۔ آپ نے اس بارے میں جو حکم نامہ جاری کیا وہ یہ تھا کہ۔ "تمام گزیٹڈ و نان گزیٹڈ افسر شلوار قمیص پہنا کریں۔ اور یہی سرکاری لباس ہوگا"۔ (۱۶۵)

تعلیمی اصلاحات

مفتی صاحب کو بحیثیت وزیر اعلیٰ اگرچہ محدود اختیارات حاصل تھے۔ لیکن اس کے باوجود اپنی مختصر مدت دور حکومت میں آپ نے نوجوان نسل کو اسلامی تعلیم سے روشناس کرانے کے لئے جو اصلاحات کئے وہ صوبہ سرحد سے ناخواندگی کو دور کرنے میں اور تعلیم کو عام کرنے میں بہت مفید واقع ہوئے۔ اور تعلیمی ترقی ہی کسی ملک کی ترقی و استحکام کا باعث ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں مفتی صاحب نے جو اصلاحات کیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) یونیورسٹیوں اور کالجز میں داخلے کے لئے قرآن حکیم کا ناظرہ اور نماز باترجمہ کو شرط قرار دیا۔

(۲) ایک سال میں ایک سو اٹھارہ پرائمری سکول قائم کرنے کا اعلان کیا۔

(۳) ایک سو سے زائد پرائمری کو مڈل اور مڈل سے ہائی کا درجہ دیا۔

(۴) کلاچی اور کرک میں نیا انٹرمیڈیٹ کالج، ہری پور اور لکی مروت میں ڈگری کالج۔

(۵) کوہاٹ میں گرلز انٹر کالج کی منظوری۔

(۶) ڈیرہ اسماعیل خان کے ڈگری کالج میں پوسٹ گریجویٹ کی کلاسز کا اجراء اور یونیورسٹی کے قیام کی جدوجہد۔

(۷) پشاور میں جیالوجی کے مضمون پر ریسرچ کے لئے ایک تخصیص کا مرکز۔

(۸) ایک سال میں نادار ذہین طلباء کے لئے ۱۲۳ لاکھ کے وظائف کا اعلان۔

(۹) صوبہ سرحد کے ۱۹۱ مڈل، ہائی سکول میں عربی ٹیچر، دینیات ٹیچر اور قاری ٹیچر کی پوسٹوں پر علماء کی تقرری (۱۶۶)

یہ وہ اہم اقدامات ہیں جو آپ نے تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے کئے۔ اور صوبہ سرحد کے دور دراز علاقوں تک تعلیمی سہولتوں کو پہنچانے کا پروگرام بنایا۔

آپ نے اپنے مختصر سے دور حکومت میں دینی اسلامی اصلاحات اور قوانین کا نفاذ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ایک عالم دین کو اگر اقتدار حوالہ کیا جائے تو وہ بہتر طریقے سے یہ ذمہ داری انجام دے سکتا ہے۔

آئین کی تشکیل اور اسلامی دفعات شامل کرانے میں کامیاب کردار

۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو مملکت پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد یہ ملک ۱۹۵۶ء تک بغیر کسی آئین، دستور کے "سرزمین بے آئین" رہا۔ قائد اعظم محمد علی جناح کی وفات کے بعد ایسے طالع آزماؤں کے ہاتھ میں اس ملک کا زمام اقتدار رہا۔ جو صرف اپنے ذاتی اقتدار اور ذاتی اختیارات کو دوام دینے کی کوشش کرتے رہے۔ جن کو ملک وملت اور عوام کے مسائل ومشکلات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اور نہ ہی ملکی عزت ووقار ان کے پیش نظر تھا۔ آپس کی ریشہ دوانیوں نے ان کو اس قابل ہی نہ رہنے دیا کہ وہ ملک وملت کے مفاد اور عزت ووقار کے بارے میں کوئی اقدامات کرتے۔ اقتدار کی رسہ کشی اور اندرون خانہ سازشوں نے اس ملک کو ایک کھلونا بنادیا تھا۔

جو نااہلوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا تھا۔ ۱۹۵۶ء کا آئین اس اعتبار سے ایک نیک شگون تھا کہ ملک کو پہلا دستور ملا۔ جبکہ وہ بھی ملک پاکستان کے عزت و وقار اور ترقی و استحکام کا باعث نہ بن سکا۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۵۸ء میں جناب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے مارشل لاء نافذ کر کے اس آئین کو منسوخ کر دیا۔ اور کچھ عرصہ بعد جنرل ایوب خان نے ۱۹۶۲ء کا آئین نافذ کیا۔ علماء اور دیگر طبقے کو جیسے ۱۹۵۶ء کے آئین کے بارے میں تحفظات تھے۔ ایسے ہی ۱۹۶۲ء کا آئین بھی ان کی تائید حاصل نہ کر سکا کیونکہ اس میں بھی ایسی خامیاں رکھ دی گئی تھیں۔ جو دینی تقاضوں کو پورا نہیں کرتی تھیں۔ ۱۹۶۹ء میں ایوب خان کے مستعفی ہونے اور اقتدار و آرمی چیف جناب جنرل یحییٰ خان کے حوالہ کرنے کی صورت میں وہ آئین بھی منسوخ کر دیا گیا۔ جنرل یحییٰ خان نے اپنے وعدے کے مطابق عام الیکشن کرائے۔ لیکن ان کی اقتدار کی ہوس نے ملک پاکستان کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرانے اور بنگلہ دیش کے قیام کی صورت میں پاکستان سے اسکی علیحدگی کی صورت میں ملک کو یہ تحفہ دیا۔ اس کے بعد مغربی پاکستان کو پاکستان کا نام دیا گیا۔ عام الیکشن میں مغربی پاکستان میں اکثریت حاصل کرنے کی وجہ سے اس کی حکمرانی جناب ذوالفقار علی بھٹو کے حوالہ کی گئی۔ شروع میں انہوں نے ملک کو عبوری آئین دیا۔ جس کی رو سے وہ سول مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے صدر مملکت بنے اور مستقل آئین کے لئے انہوں نے کمیٹی بنا دی۔ اس کمیٹی کے دیگر ارکان کے علاوہ مولانا مفتی محمود بھی اس کے رکن نامزد ہوئے۔ مولانا مفتی محمود کے اس کمیٹی کے رکن ہونے سے اسلامی جماعتوں اور جمہوری قوتوں کو کافی اطمینان حاصل ہوا۔ اور یہ اعتماد رہا کہ مفتی محمود صاحب کی موجودگی میں کمیٹی کی سفارشات یقیناً اسلام، مسلمانوں اور ملک و ملت کے مفاد میں مرتب کی جائیں گی۔ ان دنوں لاہور سے "لیل و نہار" کے نام سے ایک ہفت روزہ شائع ہوتا تھا۔ جو سیکولر ذہنیت کا ترجمان ہوتا تھا۔ اس کی تگ و دو جمہوری اقدار کے احیاء کے لئے ہوتی تھی۔ اور اس لحاظ سے وہ بعض اوقات بعض مضامین میں بھٹو صاحب اور اس کی طرز حکمرانی پر تنقید بھی کرتا تھا۔

اس ہفت روزہ میں مولانا مفتی محمود کے دستور کی تشکیل میں کردار کے حوالہ سے درج ہے کہ

مولانا مفتی محمود نے نہ صرف اسلامی زاویہ نگاہ سے پاکستان کے دستور کی تشکیل میں گراں قدر حصہ لیا بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ جمہوری بنانے میں بھی مفتی محمود کا بڑا حصہ ہے"۔ (۱۶۷)

آپ کے اسی کردار کے بارے میں تمام اسلامی اور جمہوری طبقوں نے آپ کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ گل نایاب چترالی لکھتا ہے کہ " مولانا مفتی محمود نے حقیقی جمہوری دستور کے لئے نہ صرف قومی وسیاسی حلقوں کی توقعات کو پورا کیا بلکہ اپنا "پارٹ" اس خوبصورتی سے "پلے" کیا کہ اپنے پرائے سب ان کی صلاحیتوں کے معترف ہو گئے"۔ (۱۶۸)

یہی گل نایاب چترالی صاحب نے چند صفحے آگے چل کر ایک دفعہ پھر ۱۹۷۳ء کی آئین کی تشکیل میں فعالانہ کردار ادا کرنے کے سلسلے میں آپ کی خدمات کا تذکرہ کیا ہے وہ رقمطراز ہیں۔

۱۹۷۳ء کا آئین ایک اسلامی اور جمہوری آئین تصور کیا جاتا ہے اس کو اسلامی اور جمہوری بنانے میں مولانا مفتی محمود کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ جنہوں نے آئینی کمیٹی کے ایک رکن کی حیثیت سے اور اسمبلی کے اندر ایک پارلیمانی لیڈر ہونے کی حیثیت سے آئین سازی کے لئے قابل قدر خدمات سرانجام دیئے۔ آئین سازی کے سلسلے میں مولانا مفتی محمود کی خدمات تاریخ پاکستان میں ہمیشہ سنہری حروف سے لکھی جائینگی۔ (۱۶۹)

پاکستان کی آئین سازی کے اس مرحلہ میں آپ کو بڑے بڑے قانونی اور آئینی ماہرین نے بھی خراج تحسین پیش کیا ہے۔ جناب محمود علی قصوری صاحب جو کہ جنگ آزادی کے مشہور رہنما جناب مولوی عبد القادر قصوری کے صاحبزادے ہیں۔ پاکستانی سیاست میں فعال کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ زندگی کا اکثر حصہ جناب عبد الولی خان کی جماعت میں مرکزی عہدوں پر فائز رہے لیکن بعد میں جناب ذوالفقار علی بھٹو کی پارٹی میں شامل ہوئے۔ قومی اسمبلی کے ممبر منتخب

ہوئے۔ وفاقی وزیر قانون بنے۔ ملک کے چوٹی کے ماہر قانون و آئین تسلیم کئے جاتے تھے۔ آپ نے مفتی صاحب کو یوں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

پھر جب سیاست میں ان کے ساتھ چلنے کا اتفاق ہوا تو میں ان کی قابلیت کا دل سے معترف ہوتا چلا گیا۔ دوران بحث کوئی مسئلہ پیش آتا کوئی سی الجھن آن پڑتی تو ہمیشہ ان کا ناخن تدبیر ہی اس کا گرہ کشا ہوتا۔ ۱۹۷۳ء کا آئین بنا اور اس پر بحث کا مرحلہ آیا تو مفتی صاحب نے تقریباً دو گھنٹہ تک اس کے حسن و قبح پر ایسی مدلل تقریر کی کہ مخالفین نے بھی دانتوں میں انگلی دبالی۔ وہ قافلہ جمہوریت کے سرخیل تھے۔ وہ قانون کی بالادستی، بنیادی حقوق اور شہری آزادیوں کے بہت بڑے علمبردار تھے۔ (۱۷۰)

۱۹۷۳ء کے آئین میں اسلامی دفعات کی شمولیت میں سب سے مؤثر کردار آپ کا ہے اس کے لئے آپ نے عقلی دلائل و شواہد پیش کرنے کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ آپ نے پوری صلاحیتیں صرف کر کے دیگر ممبروں کو قائل کیا۔ اور حکمرانوں سے ان باتوں کو منوانے میں کامیاب رہے جو ایک دستور و آئین کو ایک اسلامی مملکت کے دستور و آئین کے لئے بنیادی دفعات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم یہ کہ اس ملک کا سرکاری مذہب اسلام ہے۔

ایک تقریر میں آپ فرماتے ہیں۔

اس ملک کے لئے طے ہے کہ اس ملک کا آئین اسلامی ہوگا اس ملک کا سرکاری مذہب اسلام ہوگا بلکہ اسلام ہے۔ اس وعدے سے گریز کیوں کیا جائے۔ عبوری آئین میں بھی اس دفعہ کو شامل کرنے پر ہم نے زور دیا تھا۔ لیکن عبوری آئین میں ہم نے اپنی وہ تمام صلاحیتیں صرف نہیں کی تھیں جنہیں ہم آج مستقل آئین کے لئے صرف کریں گے۔

وہ آگے فرماتے ہیں۔

میرے محترم دوستو! لیبیا کے دستور کو پڑھو۔ شام کے دستور میں دیکھو۔ مصر کے دستور میں دیکھو۔ یہ وہ ملک ہیں جن کو پاکستان میں بہت سے لوگوں نے کافر کہا تھا۔ لیکن ان ممالک کے دساتیر میں واضح طور پر لکھا ہے کہ ملک کا دین اسلام ہے۔ اور اگر

تمام دنیائے اسلام کے دساتیر میں اسی بات کا واضح اعتراف کیا جا سکتا ہے کہ مملکت کا سرکاری مذہب اسلام ہے تو پاکستان کے آئین میں بھی اسکا اعتراف کرنا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان، اسلام کے نام سے معرض وجود میں آیا ہے۔ مصر، شام، لیبیا، عراق اور سعودی عرب مسلمان ممالک ہیں انہوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ اور ہم نے اسلام کے نام پر ملک بنایا ہے اگر وہ دین و دولت ملک کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں۔ تو ہم کیوں نہیں کرتے؟ (۱۷۱)

اس وقت ہفت روزہ "چٹان" لاہور کے نمائندہ جناب نواز رضا کو انٹرویو دیتے ہوئے آپ نے فرمایا "دستور پاکستان بناتے وقت ہم نے کوشش کی تھی کہ پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام قرار دیا جائے۔ (۱۷۲)

مولانا مفتی محمود ایک عالم دین تھے ساتھ ساتھ اللہ تعالٰی نے آپ کو انکی فراست و بصیرت اور عقل و دانائی سے بھی نوازا تھا کہ آئینی و قانونی امور پر بھی آپ کو مکمل دسترس حاصل تھی ایسے ہی ملکی معاملات اور حکومتی امور کے لحاظ سے بھی آپ ایک بہترین حکمران ثابت ہوئے تھے۔ آپ خود ایک بیان میں فرماتے ہیں کہ "میں نے ساڑھے نو ماہ کی وزارت کے دوران کسی پابندی کے بغیر مثالی حکومت کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ایک عالم دین دوسرے سے بہتر حکومت کر سکتا ہے"۔ (۱۷۳)

۱۹۷۳ء کے آئین کی تشکیل میں آپ کے کردار اور اس میں اسلامی دفعات کی شمولیت کے بارے میں مولانا محمد اکبر شیخ الحدیث جامعہ قاسم العلوم ملتان مفتی صاحب کی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

علماء حق کے اس نمائندے نے اسلام کے کاز کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اگرچہ ایوان کے نزدیک مولوی سماج کا ایک حقیر عنصر ہے لیکن وہ ملکی معاملات چلانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب ان بے دین طاقتوں

کو جو پارلیمنٹ کے اندر الحاد و بے دینی کی علمبردار تھیں للکارتے ہوئے فرمایا کرتے تھے
"اسمبلی کے اندر میری موجودگی میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دین کے خلاف کوئی کارروائی، کوئی قانون سازی نہیں ہو سکے گی۔ میں حضرت صدیق اکبرؓ کے خطبے سے راہنمائی حاصل کرتا ہوں جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ " اینقص دین اللہ و انا حی "۔(۱۷۴)

مولانا زاہد الراشدی صاحب ۱۹۷۳ء کے آئین میں اسلامی دفعات کو شامل کرنے کے بارے میں مولانا مفتی محمود صاحب کی خدمات کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

۱۹۵۶ء کے آئین اور ۷۳ء کے آئین پر ایک نظر ڈالئے۔ دونوں کے درمیان جہاں جہاں فرق ہے اس پر نشان لگائیے اور پھر حقائق و واقعات کے حوالے سے اس امر کی چھان بین کیجئے کہ ۵۶ء کے آئین کو ۷۳ء کے قالب میں ڈھالنے میں سب سے زیادہ کس کی کوششوں کا دخل ہے.................................

مفتی صاحب مرحوم نے آئین میں مسلمان کی تعریف، صدر اور وزیر اعظم کے مسلمان ہونے کی شرط اور قرآن و سنت کے متصادم قوانین نہ بننے کی ضمانت کو ضروری قرار دیا تھا۔ اور وہ رائے عامہ کے محاذ پر مسلسل جدوجہد کے بعد بالآخر ان امور کو ۷۳ء کے آئین میں شامل کرانے میں کامیاب رہے۔(۱۷۵)

۱۹۷۳ء کے آئین میں صراحت کے ساتھ یہ موجود ہے کہ قرآن و سنت کے خلاف مروج قوانین کو سات سال کے اندر تبدیل کر کے ان کو قرآن و سنت کے مطابق کیا جائے گا۔ اس دفعہ کو آئین کا حصہ بنانے میں بھی مولانا مفتی محمود نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ ہفت روزہ "چٹان" کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے آپ نے کہا۔

دستور بناتے وقت یہ بھی فیصلہ ہوا کہ قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بن سکے گا۔ قرآن و سنت کے خلاف مروج قوانین کو سات سال کے اندر لازماً اسلام کے مطابق

بنانا ہو گا۔ جس کی شکل یہ ہو گی کہ اسلامی مشاورتی کونسل ہر سال ایک رپورٹ پیش کرے گی۔ اور اس رپورٹ کو اسمبلی میں زیر بحث لایا جائے گا۔(۱۷۶)

۱۹۷۳ء کے آئین کو مکمل اسلامی دستور تو نہیں کہا جا سکتا۔ مگر ایک تو اس آئین کی خوبی یہ ہے کہ یہ تمام سیاسی رہنماؤں کی اتفاق سے منظور کیا گیا تھا۔ دوسرا یہ کہ اس میں دیگر دساتیر کے مقابلے میں بہت سے اسلامی دفعات کو شامل کیا گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ اس میں یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ سات سال تک تمام خلاف قرآن و سنت دفعات کو اسلام کے مطابق بنائے جائیں گے۔ اور یہ کارنامہ بھی مولانا مفتی محمود کا تسلیم کیا جاتا ہے۔

تحریک ختم نبوت ۱۹۷۴ء میں قائدانہ کردار

مولانا مفتی محمود نے قادیانیت کے خلاف اور اس گمراہ فرقہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے میں قائدانہ کردار ادا کیا ہے۔ ۱۹۵۳ء کی قادیانیت کے خلاف تحریک میں آپ کو ایک سال قید کی سزا ہوئی تھی۔ آپ نے عربی میں "المتنبی القادیانی من ھو؟" کے نام سے ایک رسالہ بھی لکھا ہے جو کہ "عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت" کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔ انہوں نے یکم مئی ۱۹۷۲ء کو صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے حلف اٹھایا تو ان کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ مرزائیوں نے ایبٹ آباد میں "گرمائی ربوہ" بنانے کے لئے ایک وسیع و عریض رقبہ حاصل کر لیا ہے۔ مفتی صاحب نے گورنر صوبہ سرحد ارباب سکندر خلیل سے مشورہ کے بعد ایک آرڈیننس جاری کرایا کہ صوبائی حکومت کسی کی نجی ملکیت کو بحق سرکار ضبط کر سکتی ہے اس سے غرض یہ تھا کہ اس طریقے سے مرزائیوں کو وہاں سے بے دخل کر دیا جائے گا ابھی اس آرڈیننس کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ ان کی اپنی جماعت کے بعض ذمہ دار عہدہ داروں نے اس کو غیر شرعی حکم قرار دے کر اس کی واپسی کا مطالبہ کر دیا جو واپس لے لیا گیا لیکن اسکے بعد کیا ہوا اور

مرزائیوں کو کس طرح وہاں سے بے دخل کر دیا گیا قانون وہ کام نہ دکھا سکا جو ڈنڈے نے کر دکھایا۔ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے رہنما ہفت روزہ "لولاک" فیصل آباد کے مدیر مولانا تاج محمود ایک تفصیلی مضمون میں مفتی محمود کے "جرائم" گنواتے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

> پانچواں جرم۔ اور وہ یہ کہ ایبٹ آباد کے متصل بڑی عیاری اور مرزائی سرکاری افسروں کی ملی بھگت سے ایک وسیع و عریض رقبہ کرمانی ربوہ بنانے کے لئے حاصل کر لیا گیا تھا۔ پنجاب میں ربوہ کی بھرپور کامیابی اور کامرانی کے بعد اب صوبہ سرحد میں ربوہ بننے لگا تھا لیکن غیر ترقی یافتہ اور مذہبی جنون رکھنے والے پٹھانوں نے اسے خواہ مخواہ غیرت و حمیت کے خلاف سمجھ کر دن دھاڑے جلا ڈالا اور پنجابی نبوت پٹھانوں میں پر پرزے نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکی اس جرم کو بھی مفتی صاحب ہی کا جرم قرار دیا جاتا تھا۔ (مولانا تاج محمود۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام ۶ اپریل ۱۹۷۳ء)

۱۹۷۴ء کی تحریک میں بھی آپ نے قائدانہ کردار ادا کیا ہے۔ قومی اسمبلی میں آپ ہی نے امت مسلمہ کے ترجمان اور وکیل کی حیثیت سے مرزائیوں کے دونوں گروپوں (قادیانی، لاہوری) پر جرح کر کے قومی اسمبلی سے ان کے کفر کا فیصلہ حاصل کیا تھا۔ اور ان کو غیر مسلم اقلیت دلوایا تھا۔ اس سلسلے میں مبلغ ختم نبوت مولانا منظور احمد چنیوٹی رقمطراز ہیں۔

> ۱۹۷۴ء میں جب قادیانیوں کے خلاف ایک عوامی تحریک چلی جس کے نتیجے میں ایک مجلس عمل کی تشکیل ہوئی۔ جس کے سربراہ حضرت محمد یوسف بنوری تھے جب اس عوامی تحریک کے نتیجے میں یہ مسئلہ اسمبلی میں پہنچا تو اسمبلی میں علماء کی طرف سے قادیانی کیس میں مکمل اور کامیاب نمائندگی حضرت مفتی صاحب مرحوم نے فرمائی۔ اور مرزا ناصر پر ایسی جرح کی کہ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ آج بھی اپنی نجی محفلوں میں مفتی محمود صاحب کی مضبوط گرفت کا ذکر کرتا ہے مفتی محمود صاحب کی اسمبلی کے اندر کامیاب وکالت کے نتیجے میں قومی اسمبلی نے متفقہ طور پر قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت

> قرار دیا۔ اس تاریخ ساز فیصلہ میں مفتی صاحب کی خدمات تاریخ کے اوراق میں سنہری حروف سے لکھی جا چکی ہیں۔ (۱۷۷)

اس ضمن میں مقالہ نگار نے آپ کے بارے میں ایک مضمون میں قومی اسمبلی میں قادیانیت کے خلاف امت مسلمہ کے ترجمان کی حیثیت سے آپ کا انتخاب اور آپ کی طرف سے مرزا ناصر پر جرح اور پھر اس کے نتیجے میں مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانا آپ کا عظیم کارنامہ قرار دیا ہے۔ اور اس کارنامہ کو حضرت مفتی محمود صاحب آخرت کے بارے میں اطمینان کا باعث قرار دیتے ہیں۔

> ۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت میں بھی حضرت مفتی محمود صاحب نے سارے ملک میں اسمبلی کے اندر اور باہر امت مسلمہ کی خوب ترجمانی فرمائی۔ اسمبلی میں آپ کو سارے مسلمان ممبروں کی طرف سے ترجمان منتخب کیا گیا۔ انہوں نے مرزائیت کے نمائندوں کو لاجواب کر دیا۔ تمام ممبروں کو قوت استدلال سے مرزائیوں (قادیانی، لاہوری) کے کفر پر قائل کرایا۔ اور آئین میں مفتی صاحب کی کوشش اور شب و روز کی دوڑ دھوپ سے وہ تاریخی اضافہ ہوا جس کی وجہ سے اس عظیم فتنہ کی جڑیں ہل گئیں۔ حضرت مفتی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ مرزائیوں کو باقاعدہ حکومت سے غیر مسلم اقلیت تسلیم کروا کر آخرت کے بارے میں اطمینان ہو گیا ہے۔ (۱۷۸)

جناب پروفیسر غفور احمد کا بیان ہے۔ "تحریک تحفظ ختم نبوت کے دوران بھی قومی اسمبلی کے اندر اور باہر مفتی صاحب بڑے سرگرم رہے ان کی بصیرت نے، ان کے علم نے اور ان کی محنت نے ہمارا مسلسل ساتھ دیا"۔ (۱۷۹)

مولانا مفتی محمود نے اگر ایک طرف قومی اسمبلی کے ایوان میں اس فتنہ عظیمہ کے خلاف امت مسلمہ کے ترجمان اور وکیل کی حیثیت سے بھرپور کردار ادا کیا۔ تو دوسری طرف ملک بھر میں اس تحریک کو کامیابی کے ساتھ چلانے اور اس سلسلے میں عوامی بیداری کی مہم میں بھی

آپ نے موثر کردار ادا کیا۔ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے امیر حضرت مولانا خواجہ خان محمد صاحب دامت برکاتہم لکھتے ہیں۔

> لیکن پارلیمانی محاذ پر دشمنان ختم نبوت کی شکست مفتی صاحب کے بے پناہ علمی، سیاسی اور فکری کوششوں کا نتیجہ تھی۔ صرف یہی نہیں کہ وہ قومی اسمبلی میں قادیانیوں سے آئینی جنگ اور قادیانی جماعت کے سربراہ سے علمی مباحثوں میں مصروف رہے۔ قومی محاذ پر بھی وہ تقریر و خطابت کے ذریعے ملت اسلامیہ کے دلوں کو گرماتے اور جذبوں کو بیدار کرتے رہے۔ اس سلسلے میں ملک میں ہونے والے تمام بڑے اجلاسوں میں وہ بنفس نفیس شریک ہوتے۔ (۱۸۰)

مولانا سید عبدالمجید ندیم صاحب، مفتی صاحب کے ختم نبوت کی تحریک ۱۹۷۴ء میں کامیاب کردار کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔

> پھر تحریک ختم نبوت میں آپ کی قائدانہ خطابت نے تحریک میں جان ڈال دی۔ کہ پوری قوم سر بکفن ہو کر میدان میں آگئی۔ بالخصوص پارلیمنٹ میں مرزا ناصر نے کئی گھنٹے قادیانی نبوت کے حق میں دلائل دیئے تو حضرت مفتی صاحب نے جوابی تقریر میں دلائل و براہین سے اس کے جھوٹ کو بے نقاب کیا۔ اور چند منٹوں میں اسمبلی ہال تالیوں سے گونج اٹھا کیونکہ مفتی صاحب نے قرآن و سنت اجماع امت اور منطقی استدلال سے مرزا ناصر کا ایسا کامیاب تعاقب کیا تھا کہ اس کے لئے راہ فرار اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہا۔ بالآخر حکومت وقت کو مفتی صاحب کے دلائل کے سامنے جھکنا پڑا۔ اور فیصلہ ہو گیا کہ مرزا غلام احمد اور اس کے پیروکاروں کا مسلم برادری سے کوئی تعلق نہیں۔ (۱۸۱)

جناب اکرام القادری صاحب سابق مدیر ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور اپنے ایک مضمون بعنوان "مولانا مفتی محمود کی دینی تحریکات" میں آپ کے تحریک ختم نبوت میں کامیاب جدوجہد کو ان الفاظ سے خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

> ہوئے، میں تحریک ختم نبوت چلی تو آپ پیش پیش تھے۔ اس تحریک کی قیادت کا سہرا تو مولانا محمد یوسف بنوری کے سر تھا۔ مگر قومی اسمبلی میں ختم نبوت کا معرکہ مولانا مفتی محمود لڑ رہے تھے۔ ناموس سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دن کا چین اور رات کا آرام تج کر رکھ دیا تھا۔ وہ عوام سے رابطہ رکھتے۔ انکھوں کے اجتماعات سے خطاب کرتے۔ علماء اور قانون دانوں سے مشورہ کرتے اور دوسری طرف قومی اسمبلی میں قادیانیوں کے موجودہ امام مرزا ناصر پر گرفت کرتے۔ بالآخر وہ اس تحریک میں کامیاب و سرفراز ہوئے۔ اور مسلمانوں کے متفقہ مطالبات کو تسلیم کرتے ہوئے قادیانیوں کو آئینی طور پر غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا گیا۔ آنے والا مؤرخ ضرور بتائے گا کہ مفتی محمود کا اس تحریک کی کامیابی میں کتنا حصہ ہے۔ (۱۸۲)

مشہور شیعہ رہنما مولانا علی غضنفر کراروی (ع م غ کراروی) تحریک ختم نبوت میں آپ کی کامیاب مساعی کو ان الفاظ کے ساتھ خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

> ۱۹۷۴ء میں جب تحفظ ختم نبوت کی تحریک ابھری۔ دوران تحریک محترم مرحوم مظفر علی شمسی کی وساطت سے مولانا مفتی محمود کے قریب ہونے کا اتفاق ہوا۔ اس قربت سے مجھے ان کو سمجھنے کا موقعہ ملا۔ تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں مرحوم کی خدمات جلیلہ اور جدوجہد مخلصانہ و نیز قومی اسمبلی میں ملت مسلمہ کی نمائندگی ناقابل فراموش کارنامے ہیں۔ یہی وہ چند نقوش تھے۔ جنھوں نے میرے دل و دماغ کو متاثر کیا۔ (۱۸۳)

فتنہ قادیانیت کی سرکوبی میں مولانا مفتی محمود کا عظیم کردار رہا ہے۔ اس فتنہ کے تعاقب میں آپ نے اپنی علمی، فکری اور قائدانہ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ اسمبلی کے تمام ارکان کی رائے کو اپنے ساتھ شامل کر کے ان کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوایا۔ اور "عقیدہ ختم نبوت" کو آئینی تحفظ فراہم کیا۔ دینی خدمات کے اعتبار سے یہ کارنامہ جہاں آپ کی اخروی سعادت کا ذریعہ ہے وہاں یہ آپ کی قائدانہ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ بھی ہے۔

جہاد افغانستان میں کردار

پاکستان کے مغرب میں واقع ملک افغانستان کا پاکستان کے ساتھ کئی حیثیتوں سے بہت قریبی تعلق ہے۔ دونوں اسلامی ملک ہیں۔ دونوں مذہبی، نسلی ونسبی رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں یہاں تک کہ ایک ملک دوسرے ملک کے حالات سے لاتعلق نہیں رہ سکتا بدقسمتی یہ رہی ہے کہ دونوں طرف کے حکمرانوں نے زمینی حقائق کے برعکس ہمیشہ دونوں ملکوں میں اختلافات کو زیادہ ہوا دی ہے اور اتحاد واتفاق کے مواقع کو ہمیشہ ضائع کیا ہے دوسری طرف دونوں ملکوں کے عوام کے رشتے بہت مضبوط ہیں دونوں طرف سرحد سے ملنے والوں کے رہنے والوں کی زبان ایک ہے۔ ثقافت ایک ہے۔ روایات ایک ہیں حتی کہ مسائل ومشکلات بھی مشترکہ ہیں اس لئے قدرتی طور پر دونوں کا ایک دوسرے کے حالات سے متاثر ہونا ایک فطری امر ہے۔

افغانستان اپنے محل وقوع کے اعتبار سے ہمیشہ بڑی طاقتوں کی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے یہی وجہ ہے کہ جب جنرل داؤد کے اقتدار کا خاتمہ کرکے وہاں یکے بعد دیگرے حکمرانوں نے اقتدار پر قبضہ جمانے کی کوشش کی تو ہر حکمران کی پشت پر روس کی حکومت ہوتی تھی اور اسی کی مدد وتعاون سے اقتدار کی رسہ کشی جاری رہتی تھی۔ آپس میں ہزار اختلاف کے باوجود یہ حکمران ایک بات پر ان کا ہر حال میں اتفاق رہا تھا کہ افغانستان سے مذہبی قوتوں علماء، صلحاء اور دیندار لوگوں کا خاتمہ کردیا جائے کیونکہ روس اور افغانستان کے حکمران سب سے زیادہ خطرہ انہی سے محسوس کرتے تھے۔ روس کے اشارے اور اس کی خوشنودی کے لئے ہر حکمران نے مذہبی قوتوں پر عرصۂ حیات تنگ کردیا تھا۔ ان کو جیلوں میں ڈال دیا گیا تھا۔ ان کو وہاں سے اٹھا کر غائب کردیا جاتا تھا۔ زندہ درگور کردیا جاتا تھا۔ ان حالات میں بعض لوگ جانیں بچا کر پاکستان اور قبائلی علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے تھے جس کی وجہ تین قسم کے شرعی مسائل سامنے آئے افغان

حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا وہاں سے جان بچا کر یہاں پناہ لینے والے شرعی لحاظ سے مہاجر ہیں؟ پاکستانیوں اور قبائلیوں کا ان لوگوں کے ساتھ تعاون کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟ مفتی صاحب کا حساس دل ان حالات سے بہت پریشان تھا۔ افغانستان کے مسلمانوں کے بارے میں ان کی تشویش اور اندیشے بجا تھے۔ چنانچہ ان کے قریبی ساتھی اور سابق وفاقی وزیر جناب محمد خان اچکزئی مفتی صاحب کے اضطراب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> مفکر اسلام مولانا مفتی محمود ہمہ صفت شخصیت کے مالک تھے اور ان کی قربت کی سعادت نے زندگی کے مختلف ادوار میں متعدد پہلوؤں سے متاثر کیا لیکن جو آخری تاثر انہوں نے میرے ذہن پر نقش کیا وہ افغانستان کے مسلمانوں کے بارے میں ان کی تشویش اور اضطراب تھا..............................
>
> .... میری فراست میں ان کی زندگی کو مختصر کرنے میں افغانستان کے حالات کا بہت دخل تھا اور ممکن ہے کہ یہی سب سے بڑا سبب رہا ہو مفتی محمود صاحب کے دل ودماغ پر افغانستان اور پاکستان کے مسلمانوں کے اندیشے چھائے رہتے تھے۔ (۱۸۴)

اور خاص کر جب افغانستان پر روسی فوجوں نے یلغار کردی اور بے تحاشا دیندار لوگوں کو قتل کرنا، قید میں ڈالنا شروع کیا روسی فوجوں کی وہاں مداخلت جتنی افغانستان کے لئے خطرناک تھی وہاں پاکستان کی سالمیت اور خودمختاری کے لئے بھی شدید خطرہ تھی ان حالات میں مفتی صاحب کی پریشانی بہت افزوں رہی۔ چنانچہ خان محمد اشرف خان کے بقول۔

> افغانستان پر روسی حملے کے بعد بڑے بے چین رہتے تھے اور افغانی مجاہدین کے جہاد آزادی کو پاکستان کی تحفظ کی جنگ قرار دیتے تھے اور ایک مرد مجاہد کی طرح ہر بیرونی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے پوری قوم کو منظم کرکے افغان مجاہدین کے شانہ بشانہ جہاد کی شرکت کی تمنا رکھتے تھے۔ (۱۸۵)

مفتی صاحب کے تحریک قومی اتحاد کے سیاسی رفیق اور مشہور مسلم لیگی رہنما جناب چوہدری ظہور الٰہی نے لکھا ہے۔ "افغانستان کے بارے میں مفتی صاحب کی رائے دیگر تمام معاملات کی طرح واضح اور دوٹوک تھی وہ روس کو افغانستان میں جارحیت کا مرتکب سمجھتے تھے اور پاکستان کی سالمیت کے لئے خطرہ۔ ان کے اس موقف میں کسی لمحہ بھی تبدیلی نہیں آئی"۔ (۱۸۶)

روسی افواج کی افغانستان پر یلغار نے عام افغانیوں کے لئے عموماً اور وہاں کے علماء اور دیندار طبقے کے لئے خصوصاً جو پریشانیاں کھڑی کر دیں وہ انسانی سوچ سے بالاتر ہیں۔ شرعی لحاظ سے وہاں جو سوالات پیدا ہوئے، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ مفتی صاحب نے ان حالات میں غاصبوں، غاصبوں کے خلاف جنگ کو شرعی جہاد قرار دیا۔ اور یہ فتویٰ سب سے پہلے آپ نے دیا۔ وہاں سے فرار اختیار کر کے پاکستان اور قرب و جوار کے علاقوں کی طرف کوچ کرنے والوں کو مہاجر ٹھہرایا۔ اور مقامی لوگوں پر ان کی مدد و تعاون اور ان کو ٹھکانہ فراہم کرنا شرعی طور پر لازم ٹھہرایا۔

مفتی صاحب نے افغانیوں کی مدد کے لئے اس وقت پاکستانی قوم میں پوری بیداری پیدا کی اور ان کو افغان بھائیوں کی مدد کے لئے تیار کیا جبکہ اس وقت سرحد و بلوچستان میں قوم پرست رہنما جو کہ اس سے قبل مفتی صاحب کے سیاسی حلیف رہ چکے تھے برعکس موقف رکھتے تھے اور ان کی وجہ سے افغان مہاجرین کو بعض مقامات پر مشکلات سے بھی دوچار ہونا پڑا تھا۔ چنانچہ ان حالات کے بارے میں حمزہ ایم۔ اے، رقم طراز ہیں۔

افغانستان میں روسی فوجی مداخلت پر انہوں نے سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا افغان عوام سے دینی اور ملی رشتہ کی وجہ سے خصوصاً ان کے دکھ درد کو اپنا دکھ تصور کیا اور ان کی ہر حقیقی عملی امداد کے لئے ہر لحظہ کوشاں رہے۔ حالانکہ سرحد اور بلوچستان میں ان کے بعض دیرینہ سیاسی رفیق اس مسئلہ پر ان سے شدید اختلاف رکھتے تھے۔ (۱۸۷)

ان حالات پر تفصیلی روشنی جناب مولانا زاہد الراشدی نے ڈالی ہے۔

اور ملکی سالمیت کے لئے دوسرا نازک مرحلہ افغانستان پر روسی جارحیت کے بعد سے درپیش ہے۔ افغانستان پر روس کی چڑھائی اور مظلوم افغان عوام کی لاکھوں کی تعداد میں ہجرت کے بعد سرحد و بلوچستان کے بعض ایسے سیاسی عناصر کا رویہ منفی محسوس ہو رہا تھا جن کے ساتھ مولانا مفتی محمود اور ان کی جماعت کا رفاقت کا تعلق رہا ہے۔ لیکن مفتی محمود نے ان پرانے رفقاء کی پروا کئے بغیر نہ صرف روسی جارحیت کی کھلم کھلا مذمت کرتے ہوئے افغان مہاجرین کو خوش آمدید کہا بلکہ ان پرانے سیاسی رفقاء کو بھی احساس دلایا کہ ان کا رویہ پٹھانوں کی روایتی مہمان نوازی کے مطابق نہیں ہے اور یہ بات مورخ کو تسلیم کرنا پڑے گی کہ روس کو افغانستان میں مداخلت کے بعد سرحد اور بلوچستان سے جس خیر مقدم کی توقع تھی اس کے راستے میں مولانا مفتی محمود کی بھاری بھرکم شخصیت ناقابل عبور رکاوٹ بن گئی اور روس کو بروقت اندازہ ہو گیا کہ سرحد اور بلوچستان کے بارے میں اس کے اندازے اور اس کے مخبروں کی رپورٹیں حقائق پر مبنی نہ تھیں۔ (۱۸۸)

اس کے علاوہ مفتی صاحب نے روسی جارحیت کا راستہ روکنے کی تدابیر شروع کر دیں۔ ایک تو انہوں نے پاکستان کی تمام سیاسی، دینی اور جماعتوں کو اس عظیم خطرے کے پیش نظر منظم کرنے کی کوششیں شروع کر دیں دوسرا انہوں نے افغانستان میں موجود مجاہدین کی تنظیموں میں موجود اختلافات کو ختم کر کے ان کو متحد کر کے روسی جارحیت کا مقابلہ کرنے کی ان میں حوصلہ اور استعداد پیدا کر دی۔ چنانچہ پاکستان کے عظیم رہنما اور مفتی صاحب کے سیاسی رفیق جناب نوابزادہ نصر اللہ خان تحریر کرتے ہیں۔

جب روسی افواج افغانستان میں جارحیت کا ارتکاب کر کے وہاں داخل ہوئیں تو مفتی صاحب نے اپنی روایات کے مطابق اسلامیان پاکستان کی تمام سیاسی اور دینی تنظیموں کو اس عظیم خطرے کے پیش نظر متحد کرنے کی کوشش کی اس سلسلے میں کراچی، لاہور، راولپنڈی، پشاور، کوئٹہ، ملتان اور آزاد کشمیر کے شہروں میں اجتماعات منعقد کئے گئے۔

مفتی صاحب اپنی پیرانہ سالی اور بیماری کے باوجود ان سب اجتماعات میں شریک ہوتے۔ زندگی کی آخری سانس تک استقامت کے ساتھ ملی فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے رہے۔(۱۸۹)

افغانستان میں موجود مجاہدین کی تنظیموں میں اتحاد کی صورت پیدا کرنے کے بارے میں قاری سعید الرحمٰن نے لکھا ہے۔

افغانستان کے مسئلے میں مفتی صاحب کا نہایت واضح اور سخت موقف تھا وہ روسی تسلط کو انتہائی جارحانہ اور ظالمانہ اقدام قرار دیتے تھے۔ افغان مجاہدین کی حمایت کے لئے انہوں نے اندرون اور بیرون ملک دورے کئے انتہائی بیماری اور ضعف کے باوجود دور دراز علاقوں تک گئے۔ افغان مجاہدین کے لیڈروں میں اتحاد کے لئے کئی بار پشاور میں ان کے مراکز میں گئے اور انہیں اتحاد کے لئے قائل کیا۔ بالآخر ان کی یہ کوششیں نتیجہ خیز ثابت ہوئیں چاہے ظاہری طور پر اس اتحاد کا کریڈٹ کوئی اور لے لیکن اس اتحاد میں مفتی صاحب کی کوششوں کو بڑا دخل تھا۔(۱۹۰)

خلاصہ بحث

مولانا مفتی محمودؒ کی تمام تر جدوجہد کا مقصد یہ تھا کہ دین اسلام کی سربلندی، قوم کے ہر فرد کی انفرادی و اجتماعی زندگی اور ملک کے جملہ شعبوں میں دینی عوامل کی کارفرمائی اور دینی تعلیمات کو اولیت و غلبہ حاصل ہو۔

ملک میں دو دفعہ ۱۹۵۳ء اور ۱۹۷۴ء میں تحفظ ختم نبوت کی تحریکیں چلیں۔ آپ نے ان دونوں تحریکوں میں قائدانہ کردار ادا کیا تھا۔ جیل کی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کی ناکامی کے بعد جمعیۃ علماء اسلام کی تشکیل میں آپ کا نمایاں کردار رہا جس کی صورت میں آپ نے دیگر اکابرین کے ساتھ پاکستان بھر کے علماء کو ایک دینی، مذہبی اور سیاسی پلیٹ فارم پر جمع کر کے ان میں اتحاد کی قوت پیدا کر دی تھی۔ اس باب میں اس کو موضوع بنایا گیا ہے اتحاد عیدین ورمضان کے لئے رؤیت ہلال کے مسئلہ پر ملک بھر کے علماء کا اجتماع کرایا۔ اور تمام علماء کی طرف سے ایک متفقہ فیصلہ کا مرتب کرنا اور پھر حکومت وقت کے سامنے اس اہم مسئلہ کے حل کی صورت پیش کرنا۔ جب ملک کو ۱۹۵۶ء کا آئین ملا۔ تو یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ یہ آئین بالکل اسلام کے مطابق ہے اور اس میں کوئی شق کوئی دفعہ خلاف اسلام نہیں۔ مفتی صاحب نے ایک کمیٹی بنا کر اس کا شق وار، دفعہ وار جائزہ لیا۔ اور "۱۹۵۶ء کے آئین پر تنقیدات و ترمیمات" کے نام سے ایک کتابچہ لکھا۔ اور ان لوگوں کے پروپیگنڈے کا مسکت جواب دیا۔ ساتھ ساتھ اس میں ترمیمات بھی پیش کیں۔ کہ اگر ان ترامیم کو اس میں شامل کر دیا جائے تو یہ "اسلامی آئین" شمار ہو گا۔

آپ نے ملتان میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے سو سال پورے ہونے پر جہاد کانفرنس منعقد کی جس میں انہوں نے جنگ آزادی کے مجاہدین کو خراج تحسین پیش کیا۔ اور موجودہ نسل کو انہیں کے نقش قدم پر چل کر ملک و قوم کی آزادی کے لئے قربانی کا جذبہ بیدار کرنے کی سعی کی۔

باب ہذا میں تفصیل کے ساتھ باحوالہ مفتی صاحب کی اس دینی خدمت سے بحث کی گئی ہے جو انہوں نے عوام میں اور قومی اسمبلی میں ایوب خان کے دور میں نافذ شدہ عائلی قوانین کے خلاف کئے گئے اقدامات کی صورت میں انجام دیا۔

آپ کا ایک عظیم دینی کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے ملک بھر کے دینی مدارس کو "وفاق المدارس العربیہ" کی صورت میں منظم کیا۔ ایک نصاب اور ایک نظم کی صورت میں ان میں اتحاد کی صورت پیدا کی۔

۱۹۶۰ء کی دہائی میں جدید دینی مسائل کے بڑے بڑے چیلنج سامنے آئے۔ جامعہ ازہر مصر نے جدید مسائل پر بحث اور متفقہ فیصلہ کے لئے "مجمع البحوث الاسلامیة" کی تشکیل کی جس کے اجلاسوں میں دنیا بھر کے مسلمان علماء و مفتیین کو اظہار خیال کی دعوت دی جاتی تھی مفتی صاحب تین دفعہ ان اجلاسوں میں شرکت فرما چکے ہیں۔ اس باب میں آپ کی "مجمع البحوث الاسلامیة" میں شرکت اور وہاں آپ کی دینی سرگرمیوں سے بحث کی گئی ہے۔

صدر ایوب خان کے دور میں ڈاکٹر فضل الرحمن اور ان کے ادارے "اسلامی تحقیقاتی کونسل" کے گمراہ کن پروگرام کو مفتی صاحب اور دیگر علماء نے ناکام بنا دیا۔ اور ان کی ایک نہ چلنے دی۔ اس سے تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

آپ نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ دینی و مذہبی جماعتوں میں اتحاد کی فضا برقرار رہے۔ تاکہ وہ لادینیت کے سیلاب کے سامنے سد سکندری ثابت ہوں۔ مختلف حالات میں آپ کی یہ سعی کامیاب رہی ہے اور اسی اتحاد میں آپ کا قائدانہ کردار رہا ہے۔ اس باب میں اس سے بھی بحث کی گئی ہے۔

۱۹۷۲ء میں آپ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ بنے۔ آپ نے ۹ ماہ کے مختصر دورانیہ میں جو قانونی اور تعلیمی اصلاحات نافذ کیں۔ وہ ملک و قوم اور صوبہ کے لئے بہت مفید اور بروقت ثابت ہوئیں۔ آپ کی ان اصلاحات کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

۱۹۷۳ء کے آئین میں جتنے بھی اسلامی دفعات کو آئین کا حصہ بنایا گیا ہے۔ ان میں مفتی صاحب کا نمایاں کردار رہا ہے۔ آئین کی تشکیل میں کیا کیا مشکل مراحل پیش آئے۔ ان سب کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

باب ہذا میں جہاد افغانستان کے بارے میں بھی آپ کے موقف کو واضح کیا گیا ہے۔

حوالہ جات

(1) نور الہدیٰ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مولانا مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۵۱
(2) اشرف، عبدالرحیم، حکیم۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مولانا مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۳۸۔
(3) نور الہدیٰ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مولانا مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۵۱
(4) ظہیر، احسان الٰہی، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مولانا مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۳۱۔
(5) اسفندیار، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مولانا مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۵۲
(6) بنوری، محمد ایوب، سید، مولانا۔ روزنامہ "وفاق" لاہور (مولانا مفتی محمود نمبر) ص ۱۹
(7) مفتی محمود، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۳۷۰
(8) کمال، احمد حسین، ڈاکٹر۔ عہد ساز قیادت ص ۳۷۔
(9) جانباز مرزا۔ حیات امیر شریعت۔ ص ۳۳۵۔ مکتبہ "تبصرہ" لاہور۔ ۱۹۷۰ء
(10) کمال احمد حسین، ڈاکٹر عہد ساز قیادت۔ ص ۴۹
(11) خان محمد، خواجہ، مولانا۔ تحریک ختم نبوت۔ منزل بہ منزل۔ ص ۳۸۔ خانقاہ سراجیہ کندیاں، میانوالی
(12) جانباز مرزا۔ حیات امیر شریعت۔ ص ۳۴۴
(13) جانباز مرزا۔ حیات امیر شریعت۔ ص ۳۴۶
(14) جانباز مرزا۔ حیات امیر شریعت۔ ص ۳۴۶
(15) جانباز مرزا۔ حیات امیر شریعت۔ ص ۳۴۸،۳۴۷

(16) جانباز مرزا۔ حیات امیر شریعت۔ ص ۳۴۹،۳۴۸
(17) جانباز مرزا۔ حیات امیر شریعت۔ ص ۳۵۰
(18) جانباز مرزا۔ حیات امیر شریعت۔ ص ۳۵۲
(19) جانباز مرزا۔ حیات امیر شریعت۔ ص ۳۵۷،۳۵۶
(20) جانباز مرزا۔ حیات امیر شریعت۔ ص ۳۶۰
(21) جانباز مرزا۔ حیات امیر شریعت۔ ص ۳۶۱،۳۶۰
(22) عبداللطیف، قاضی، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۳۸
(23) کمال، احمد حسین، ڈاکٹر۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۵۶
(24) تاج محمود، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۵۴
(25) عبیداللہ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۴۴
(26) محمد اکبر، مولانا۔ تذکار محمود۔ ص ۱۸۶
(27) قادری، اکرام۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۳۸،۱۳۷
(28) روحانی بازی، محمد موسیٰ، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۴۳۷
(29) قاسم، ظفر احمد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۲۰۳
(30) نور محمد، مولانا۔ ایضاح المقال فی رؤیۃ الہلال۔ ص ۱۳۔ جامعہ دارالعلوم وانا جنوبی وزیرستان۔ ۲۰۰۰ء
(31) نور محمد، مولانا۔ ایضاح المقال فی رؤیۃ الہلال۔ ص ۱۳۔

(32) نور محمد، مولانا۔ ایضاح المقال فی رؤیۃ الہلال۔ ص ۱۳۔

(33) ملتانی، محمد شفیع، مفتی، مولانا۔ فیصلہ علماء متفقہ رؤیۃ الہلال۔ ص ۲

(34) ملتانی، محمد شفیع، مفتی، مولانا۔ فیصلہ علماء متفقہ رؤیۃ الہلال۔ ص ۲

(35) ملتانی، محمد شفیع، مفتی، مولانا۔ فیصلہ علماء متفقہ رؤیۃ الہلال۔ ص ۲

(36) ملتانی، محمد شفیع، مفتی، مولانا۔ فیصلہ علماء متفقہ رؤیۃ الہلال۔ ص ۲

(37) مفتی محمود، مولانا۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ج ۳۔ ص ۴۳۰

(38) مفتی محمود، مولانا۔ فتاویٰ مفتی محمود۔ ج ۳۔ ص ۴۳۰

(39) نور محمد، مولانا۔ ایضاح المقال فی رؤیۃ الہلال۔ ص ۱۵۔

(40) بٹالوی، ریاض۔ روزنامہ "مشرق" لاہور (۱۵ مارچ ۱۹۷۱ء)

(41) عابد، قطب الدین، مولانا۔ مفتی محمود سے ملیے۔ ص ۱۱۳۔ مفتی محمود اکیڈمی پاکستان کراچی۔ ۲۰۰۲ء

(42) شیر کوٹی۔ انوار الحسن۔ بیس بڑے مسلمان۔ ص ۵۵۴۔ مکتبہ رشیدیہ، ۳۲ شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔ طبع چہارم ۱۹۸۳ء

(43) عابد، قطب الدین، مولانا۔ مفتی محمود سے ملیے۔ ص ۱۳۹، ۱۴۰۔

(44) محمد اکبر، مولانا۔ تذکار محمود۔ ص ۱۸۴

(45) محمد اکبر، مولانا۔ تذکار محمود۔ ص ۱۸۴

(46) خان محمد، خواجہ، مولانا۔ تحریک ختم نبوّت۔ منزل بہ منزل۔ ص ۳۶

(47) عابد، قطب الدین، مولانا۔ مفتی محمود سے ملیے۔ ص ۱۳۰

(48) عابد، قطب الدین، مولانا۔ مفتی محمود سے ملیے۔ ص ۱۳۱

(49) عابد، قطب الدین، مولانا۔ مفتی محمود سے ملیے۔ ص ۱۳۱

(50) شجاع آبادی، محمد اسماعیل۔ خطبات محمود۔ ص ۷۳۔ مکتبہ سلیمانیہ مین بازار نشاط کالونی لاہور کینٹ۔ بار دوم ۲۰۰۱ء

(51) بنوری، محمد ایوب، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مولانا مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۱۵

(52) بنوری، محمد ایوب، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مولانا مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۱۶

(53) بنوری، محمد ایوب، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مولانا مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۱۶

(54) بنوری، محمد ایوب، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مولانا مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۱۶

(55) انور، عبید اللہ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مولانا مفتی محمود نمبر) ص ۱۱۸

(56) حامد میاں، سید، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۸۷

(57) عبید اللہ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مولانا مفتی محمود نمبر) ص ۷۸

(58) عبد الکریم۔ قاضی، مولانا۔ ماہنامہ "تبصرہ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۲۲۔ ج ۱۱۔ ش ۳ (جنوری ۱۹۷۰ء)

(59) خان محمد، خواجہ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مولانا مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۱۳

(60) انور، عبید اللہ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مولانا مفتی محمود نمبر) ص ۱۱۹

(61) چترالی، گل نایاب مولانا۔ مفتی محمود کی سیاسی زندگی۔ ص ۶۴۔ دارالعلوم محمدیہ ناصر پارک بلال گنج گلی نمبر ۱ لاہور۔ ۲۰۰۲ء

(62) قادری، الیاس۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۳۸

(63) راشدی، زاہد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۹۷

(64) محمد اکبر، مولانا۔ تذکار محمود۔ ص ۱۸۷

(65) اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور۔ ص ۲۔ ناشر قانونی کتب خانہ لاہور

(66) آسی، محمد نعیم۔ مولانا مفتی محمود (حیات و خدمات)۔ ص ۹۳، ۹۴

(67) مفتی محمود، مولانا۔ ماہنامہ "تبصرہ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۵۳۔ ج ۱۱۔ ش ۳ (جنوری ۱۹۷۰ء)

(68) مفتی محمود، مولانا۔ روزنامہ "مشرق" لاہور۔ ۱۵ مارچ ۱۹۷۱ء

(69) محمد زاہد، خواجہ۔ تذکار محمود۔ ص ۱۳۶

(70) کمال، احمد حسین، ڈاکٹر۔ عہد ساز قیادت۔ ص ۶۰

(71) محمد زاہد، خواجہ۔ تذکار محمود۔ ص ۱۳۶

(72) کمال، احمد حسین، ڈاکٹر۔ عہد ساز قیادت۔ ص ۶۷

(73) کمال، احمد حسین، ڈاکٹر۔ عہد ساز قیادت۔ ص ۹۰

(74) مفتی محمود، مولانا۔ اسمبلیوں کے اندر عالمانہ و مجاہدانہ تقریریں۔ ص ۳۔ ناشر دفتر جمعیۃ علماء اسلام مغربی پاکستان لاہور

(75) مفتی محمود، مولانا۔ اسمبلیوں کے اندر عالمانہ و مجاہدانہ تقریریں۔ ص ۴، ۵

(76) مفتی محمود، مولانا۔ عالمی مسائل پر عالمانہ تبصرہ (فتاویٰ مفتی محمود ج ۵۔ ص ۵۷)

(77) مفتی محمود، مولانا۔ عالمی مسائل پر عالمانہ تبصرہ (فتاویٰ مفتی محمود ج ۵۔ ص ۵۹)

(78) کمال، احمد حسین، ڈاکٹر۔ عہد ساز قیادت۔ ص ۹۳

(79) آسی، محمد نعیم۔ مولانا مفتی محمود (حیات و خدمات)۔ ص ۷۰، ۷۱

(80) آسی، محمد نعیم۔ مولانا مفتی محمود (حیات و خدمات)۔ ص ۷۱

(81) مفتی محمود، مولانا۔ ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور۔ ص ۱۰۔ ج ۶۔ ش ۳۸ (۷ اپریل ۱۹۶۱ء) انجمن خدام الدین شیرانوالہ گیٹ لاہور

(82) مفتی محمود، مولانا۔ ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور۔ ص ۱۰۔ ج ۶۔ ش ۳۸

(83) مفتی محمود، مولانا۔ ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور۔ ص ۱۰۔ ج ۶۔ ش ۳۸

(84) مفتی محمود، مولانا۔ ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور۔ ص ۱۸۔ ج ۶۔ ش ۳۸

(85) کمال، احمد حسین، ڈاکٹر۔ عہد ساز قیادت۔ ص ۷۰، ۷۱

(86) کمال، احمد حسین، ڈاکٹر۔ عہد ساز قیادت۔ ص ۷۱

(87) انور شاہ، محمد، مفتی، مولانا۔ تاریخ وفاق المدارس العربیہ پاکستان۔ ص ۲۰۳۔ مرکزی دفتر وفاق المدارس پاکستان ملتان

(88) آسی، محمد نعیم مولانا۔ مفتی محمود۔ ص ۲۶، ۵۶

(89) شمیم، محمد مسعود، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۹۹، ۱۰۰

(90) شمیم، محمد مسعود، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۰۰

(91) اسفندیار، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۵۲، ۱۵۳

(92) آسی، محمد نعیم، مولانا۔ مفتی محمود (حیات و خدمات)۔ ص ۶۵

(93) محمود شام۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۳۱۹، ۳۲۰

(94) محمود شام۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۳۱۹، ۳۲۰

(95) محمود شام۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ۳۱۹

(96) مفتی محمود، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ج ۱۸۔ ش ۳۲

(97) محمود شام۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۲۲۰

(98) لکھوی، معین الدین، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۱۳

(99) کلاچوی، عبدالکریم، قاضی، مولانا۔ ماہنامہ "تبصرہ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۴۴

(100) آسی، محمد نعیم، مولانا۔ مفتی محمود۔ ص ۴۷

(101) کمال، احمد حسین ڈاکٹر۔ عہد ساز قیادت۔ ص ۹۶،۹۵

(102) کمال، احمد حسین ڈاکٹر۔ عہد ساز قیادت۔ ص ۹۷

(103) مفتی محمود، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ج ۹۔ ش ۴۳ (۴ نومبر ۱۹۶۶ء)

(104) مفتی محمود، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ج ۹۔ ش ۳۷ (۳۰ ستمبر ۱۹۶۶ء)

(105) محمود شام۔ ہفت روزہ "اخبار جہان" کراچی۔ (اگست ۱۹۷۱ء)

(106) محمود شام۔ ہفت روزہ "اخبار جہان" کراچی۔ (اگست ۱۹۷۱ء)

(107) راشدی، زاہد، مولانا۔ حضرت مولانا مفتی محمود۔ زعماء ملت کی نظر میں۔ ص ۱۶۱
مکتبہ دیوبند محلہ جنگی قصہ خوانی پشاور۔ ۲۰۰۱ء

(108) آزاد، عبدالقادر، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۹۰

(109) علوی، سعید الرحمٰن، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ج ۱۱۔ ش ۷ (۲۳ فروری ۱۹۶۸ء)

(110) عابد، عبدالکریم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۹۰

(111) علوی، سعید الرحمٰن، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ج ۱۱۔ ش ۷ (۲۳ فروری ۱۹۶۸ء)

(112) عثمانی، محمد تقی، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۴۷

(113) قادری، اکرام۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۳۹

(114) ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ج ۹۔ ش ۴۵ (۲۵ نومبر ۱۹۶۶ء)

(115) عابد، عبدالکریم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۹۰

(116) ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ج ۹۔ ش ۴۵ (۲۵ نومبر ۱۹۶۶ء)

(117) ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ج ۹۔ ش ۴۵ (۲۵ نومبر ۱۹۶۶ء)

(118) قادری، اکرام۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۳۹

(119) تاج محمود، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۵۴

(120) علوی، سعید الرحمٰن، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۷۶

(121) قریشی، نورالحق، مولانا، ایڈووکیٹ۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۳۱

(122) سمیع الحق، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۳۹

(123) نصر اللہ خان، نوابزادہ۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۹۲

(124) غفور احمد، پروفیسر۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۹۱

(125) نورالہدیٰ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۵۱

(126) اشرف، عبدالرحیم، حکیم۔ روزنامہ "وفاق لاہور" (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۳۵

(127) کراروی، علی غضنفر، علامہ۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۳۲

(128) کراروی، علی غضنفر، علامہ۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۴۳

(129) مفتی محمود، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ج ۱۹۔ ش ۱۹ (۷ر مئی ۱۹۷۶ء)

(130) مفتی محمود، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ج ۹۔ ش ۱۲ (۱۰ر مئی ۱۹۶۶ء)

(131) قادری، اکرام۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۳۹

(132) قادری، اکرام۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۴۹، ۱۵۰

(133) کلمی، محمد یاسین، ڈاکٹر۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۳۳۹

(134) نور محمد، مولانا۔ تذکار محمود۔ ص ۱۱۱

(135) نور الہدیٰ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ لاہور" (مفتی محمود نمبر) ص ۱۵۱

(136) راشدی، زاہد، مولانا۔ تذکار محمود۔ ص ۱۶۴

(137) قاسمی، ضیائی، مولانا۔ تذکار محمود۔ ص ۱۷۳

(138) آسی، محمد نعیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۲۱۹

(139) مفتی محمود، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۵۵۵

(140) .... روزنامہ "مشرق" پشاور۔ ج ۵۔ ش ۲۶۳ (۲ر مئی ۱۹۷۲ء)

(141) .... روزنامہ "مشرق" پشاور۔ ج ۵۔ ش ۳۲۳ (۲۱ر جولائی ۱۹۷۲ء)

(142) .... روزنامہ "مشرق" پشاور۔ ج ۵۔ ش ۲۶۳ (۲ر مئی ۱۹۷۲ء)

(143) .... روزنامہ "مشرق" پشاور۔ ج ۵۔ ش ۲۶۷ (۶ر مئی ۱۹۷۲ء)

(144) کمال، احمد حسین، ڈاکٹر۔ عہد ساز قیادت۔ ص ۱۵۰

(145) آسی، محمد نعیم۔ مولانا مفتی محمود (حیات و خدمات)۔ ص ۱۸۰

(146) .... روزنامہ "مشرق" پشاور۔ ج ۶۔ ش ۴ (۲ر اگست ۱۹۷۲ء)

(147) القرآن الحکیم ۲: ۲۷۵

(148) عبدالحق، مولانا۔ عوام کا بے تاج بادشاہ۔ ص ۴۱

(149) .... روزنامہ "مشرق" پشاور۔ ج ۵۔ ش ۴۷۲ (۱۱ر جون ۱۹۷۲ء)

(150) آسی، محمد نعیم۔ مولانا مفتی محمود (حیات و خدمات)۔ ص ۱۸۳

(151) .... ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (۱۲ر جون ۱۹۷۲ء)

(152) .... روزنامہ "مشرق" پشاور (۱۶ر مئی ۱۹۷۲ء)

(153) .... روزنامہ "مشرق" پشاور (۱۱ر جون ۱۹۷۲ء)

(154) .... روزنامہ "مشرق" پشاور (۲۴ر جون ۱۹۷۲ء)

(155) .... روزنامہ "مشرق" پشاور (۱۱ر مئی ۱۹۷۲ء)

(156) ہاشمی، اشفاق، محمد۔ مفتی محمود کا دور حکومت۔ ص ۹۳۔ حسنین پبلیکیشنز، نعمان پلازہ، F-10 مرکز اسلام آباد۔ اشاعت پنجم ۲۰۰۳ء

(157) چترالی، گل نایاب۔ مفتی محمود کی سیاسی زندگی۔ ص ۲۲۴

(158) .... روزنامہ "مشرق" پشاور (۲۳ر ستمبر ۱۹۷۲ء)

(159) ہاشمی، اشفاق، محمد۔ مفتی محمود کا دور حکومت۔ ص ۴۴

(160) آسی، نعیم، محمد۔ مولانا مفتی محمود (حیات و خدمات)۔ ص ۱۸۲

(161) ہاشمی، اشفاق، محمد۔ مفتی محمود کا دور حکومت۔ ص ۴۲

(162) .... روزنامہ "مشرق" پشاور (۱۱ر مئی ۱۹۷۲ء)

(163) .... روزنامہ "مشرق" پشاور (۱۱ر جون ۱۹۷۲ء)

(164) قدوائی، انور، سید۔ درویش سیاستدان۔ ص ۵۱

(165) آسی، نعیم محمد۔ مولانا مفتی محمود (حیات و خدمات)۔ ص ۱۷۹

(166) ہاشمی، اشفاق محمد۔ مفتی محمود کا دورِ حکومت۔ ص ۳۰، ۳۱

(167) .... ہفت روزہ "الیسل و نہار" لاہور (۴ / مارچ ۱۹۷۲ء)

(168) چترالی، گل نایاب۔ مفتی محمود کی سیاسی زندگی۔ ص ۲۴۲

(169) چترالی، گل نایاب۔ مفتی محمود کی سیاسی زندگی۔ ص ۲۷۳

(170) قصوری، محمود علی، میاں۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۳۷

(171) مفتی محمود، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۵۳۸

(172) مفتی محمود، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۴۳۸

(173) مفتی محمود، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۹۶

(174) محمد اکبر، مولانا۔ تذکار محمود۔ ص ۱۸۸

(175) راشدی، زاہد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۹۷، ۱۹۸

(176) راشدی، زاہد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۴۳۸

(177) چنیوٹی، منظور احمد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۷۵، ۷۶

(178) اکبری، عبدالحکیم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۳۸، ۳۹

(179) غفور احمد، پروفیسر۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۹۱، ۹۲

(180) خان محمد، خواجہ، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۱۲

(181) ندیم، عبدالمجید، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۸۱

(182) قادری، اکرام۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۴۹

(183) کرداری، غضنفر، علامہ۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۷۳

(184) اچکزئی، زمان خان، محمد۔ روزنامہ "وفاق" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۲۱

(185) خان اشرف خان۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۵۳

(186) ظہور الٰہی، چوہدری۔ روزنامہ "وفاق" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۱

(187) حمزہ ایم۔ اے۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۹۷

(188) راشدی، زاہد، مولانا۔ روزنامہ "وفاق" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۲۹

(189) نصر اللہ خان، نوابزادہ۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۸۳

(190) سعید الرحمٰن، قاری، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۷۶

باب چہارم

سیاسی خدمات

ملکی سیاست میں آپ کا مقام

مفتی صاحب نے شروع دن سے اپنی سیاسی وابستگی کا جو مقصد متعین کیا تھا۔ آپ کی تمام سرگرمیاں اسی مقصد کے گرد گھومتی رہیں۔ یہاں تک کہ سیاسی لحاظ سے آپ کو ملکی سطح پر ایک اعلیٰ مقام ملا۔ جس کا اعتراف آپ کے تمام ہم عصر علماء اور سیاستدان کرتے رہے۔ مولانا عبیداللہ انور صاحب رقمطراز ہیں۔

> مفتی صاحب سے سیاسی تعارف اس وقت ہوا جب ۱۹۵۸ء میں والد بزرگوار حضرت مولانا احمد علی لاہوری حج پر تشریف لے گئے۔ اور مفتی صاحب کو اپنا قائم مقام بنا گئے۔ ایک صاحب کشف اور عارف باللہ ہستی کا اپنی مسند کے لئے آپ کو منتخب کرنا ایسا اعزاز تھا کہ اہل نظر کے نزدیک مفتی صاحب ایک نہایت مدبر اور سنجیدہ اور معزز سیاستدان کی حیثیت سے متعارف ہو گئے۔(۱)

مولانا عبیداللہ انور کے بقول حضرت لاہوری کی طرف سے مفتی صاحب کو جو اعتماد ملا۔ یقیناً یہ مفتی صاحب کے کمالات کا اعتراف ہے۔ اپنے بزرگوں کی طرف سے یہ اعتماد مفتی صاحب کے لئے اعزاز سے کم نہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم قاری محمد طیب صاحب نے مفتی محمود کی وفات حسرت آیات پر جو بیان جاری کیا تھا۔ اس میں وہ مفتی صاحب کی علمیت کے ساتھ ساتھ آپ کو ایک مخلص سیاستدان کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔ "مولانا مفتی محمود، دارالعلوم دیوبند کے ان فیض یافتگان میں سے ہیں جنہوں نے ایک زندہ جاوید تاریخ رقم کر کے بڑا نام پایا۔ وہ ایک جید عالم دین اور مخلص سیاستدان تھے"۔(۲)

برصغیر پاک و ہند کے مایہ ناز عالم دین، بین الاقوامی شہرت یافتہ سکالر حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی، مفتی محمود کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ "عالم اسلام

ہیں مولانا مفتی محمود کا نام ایک اسلام کے عظیم سکالر کی صورت میں معروف ہوا۔ پاکستان میں اسلام کے نفاذ کے لئے ان کی خدمات سنہرے حروف سے لکھی جائیں گی"۔ (۳)

مفتی صاحب کی علمیت اور آپ کی اعلیٰ خدمات کا اعتراف بین الاقوامی سطح پر کیا گیا اور دنیائے اسلام کے بڑے رہنماؤں، مقتدر قوتوں نے اس کا بار بار اعتراف کیا ہے۔ جلالۃ الملک پاسبان حرم خالد بن عبد العزیز فرمانروائے سعودی عرب، مفتی صاحب کی وفات پر ایک پیغام میں ارشاد فرماتے ہیں۔ "الشیخ مفتی محمود سے چند لمحات کی صحبت نے مجھے بے حد متاثر کیا ان کی علمی اور اصلاحی خدمات اہل اسلام کے لئے سرمایہ حیات ہیں"۔ (۴)

فضیلۃ الشیخ محمد صفوت السقاء امینی سربراہ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ نے مفتی صاحب کی اعلیٰ خدمات کا اعتراف کچھ یوں کیا ہے۔

> مفتی صاحب مرحوم بلاشبہ اسلام کے بطل جلیل اور متبحر عالم دین تھے۔ مرحوم نے پاکستان میں اسلامی معاشرے کے قیام کے لئے رائے عامہ کو منظم کرنے کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کی ترقی و استحکام اور سلامتی و وحدت کے لئے انتھک جدوجہد کی۔ (۵)

رابطہ عالمی اسلامی کے جنرل سیکرٹری جناب محمد علی الحرکان بھی آپ کے خدمات کے معترف ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔ "مفتی صاحب عالم اسلام کے ممتاز سکالر تھے جنہوں نے اپنی زندگی اسلام کے لئے وقف کی ہوئی تھی۔ (۶)

آپ کے ہم عصر سیاستدانوں نے بھی آپ کی ملکی و ملی سطح پر خدمات کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ پیپلز پارٹی کے بانی ارکان میں سے ایک اہم نام جناب غلام مصطفےٰ جتوئی صاحب کا ہے جو بعد میں نگران وزیر اعظم بھی بنے تھے۔

> مولانا مفتی محمود ایک ممتاز مذہبی، سیاسی سکالر، ممتاز رہنما اور جمہوریت پسند انسان تھے۔ ان کی وفات ملک کے لئے عظیم نقصان ہے۔ مرحوم اپنی زندگی میں اسلامی

> اصولوں اور جمہوریت کے کاز کے لئے جنگ کرتے رہے۔ مولانا آزادی کی تحریک میں برطانوی حکمرانوں کے خلاف صف اول کے رہنماؤں میں شامل تھے۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے سیاسی اور مذہبی محاذوں پر نمایاں خدمات انجام دیں۔ (۷)

دور ایوبی کے ایک اہم سیاسی رہنما جو بعد میں جمہوری قوتوں کے سرکردہ رہنماؤں میں شمار ہوتا ہے۔ جناب چوہدری ظہور الٰہی صاحب وہ حضرت مفتی صاحب کی خدمات کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ "مولانا مفتی محمود نے مجھے مذہب اور سیاست کے حوالے سے ازحد متاثر کیا مفتی صاحب کی وفات کے بعد ملک ایک عظیم سکالر اور محب وطن سیاسی رہنما سے محروم ہو گیا ہے۔ (۸)

جناب ریٹائرڈ ایئر مارشل اصغر خان، جناب مفتی صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> مولانا مفتی محمود کی حق گوئی، بے باکی، بلند نگاہی اور قوت تجزیہ سے حالات کو حقائق کی روشنی میں دیکھنے کی صلاحیت ایسی چیزیں تھیں کہ قوم کے اہل الرائے طبقے راہنمائی کے لئے ان کی طرف دیکھتے تھے۔ موصوف کی سیاست سے کسی کو اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن بصیرت، اخلاص سے کسی طبقے کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ (۹)

قومی اتحاد کے رہنماؤں میں ایک اہم رہنما جناب سردار شیر باز خان مزاری تھا۔ جو حضرت مفتی صاحب کے بہت قریب رہے تھا۔ اور تحریک بحالی جمہوریت میں مفتی صاحب کے ساتھ اس تحریک میں شریک رہے ہیں۔ وہ آپ کے بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔ "مولانا مفتی محمود کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے آزادی کے لئے چلائی جانے والی ہر تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ وہ آخر وقت تک قوم کو متحد کرنے کے لئے سرگرم رہے۔ (۱۰)

جناب پروفیسر غفور احمد نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان قومی اتحاد کے سیکرٹری جنرل تھے جبکہ مفتی صاحب قومی اتحاد کے صدر تھے۔ پروفیسر صاحب، جناب ذوالفقار علی بھٹو کے

ساتھ مذاکرات کے لئے قومی اتحاد کی ٹیم کے رکن تھے۔ حضرت مفتی صاحب کے بہت قریب رہے تھے۔ وہ مفتی صاحب کے بارے میں ایک مکتوب میں رقمطراز ہیں۔ "مولانا مفتی محمود معاملہ فہم انسان تھے۔ ان میں ظرف ضبط بلا کا تھا۔ ان کے کسی رویہ پر تنقید کی جاتی تو سکون سے سنتے اور پھر ٹھنڈے دل سے اس کا جواب دیتے اور معترض کو مطمئن کرتے۔ (۱۱)

بابائے جمہوریت اور پاکستان کے عظیم سیاسی رہنما جناب نوابزادہ نصر اللہ خان صاحب لکھتے ہیں۔ " مولانا مفتی محمود نے سرحد میں وزارت علیہ پر فائز ہوتے ہی یہ مثال قائم کر دکھائی تھی کہ ایک بوریہ نشین عالم دین ایک جدید جمہوری معاشرے میں حکومت کے فرائض کو اپنی تمام تر سادگی اور درویشی کے باوجود بطریق احسن چلا سکتا ہے۔ (۱۲)

عوامی نیشنل پارٹی کے سربراہ اور بھٹو حکومت کے خلاف تحریک بحالی جمہوریت کے اہم رہنما جناب عبد الولی خان صاحب مفتی صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ " مولانا مفتی محمود کا سیاسی مسلک اور سوچ اتنی واضح اور صاف تھی کہ وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کے لئے زیادہ دیر تک وقت کا انتظار نہیں کرتے تھے"۔ (۱۳)

پاکستان کے مشہور ماہر قانون، سپریم کورٹ کے مایہ ناز وکیل، سابق وزیر قانون جناب محمود علی قصوری صاحب مفتی محمود کی سیاسی خدمات کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں۔

> مولانا مفتی محمود کی وفات سے ملک ایک عظیم رہنما سے محروم ہو گیا ہے اور ان کا انتقال پاکستان کے لئے ایک سانحہ ہے۔ مرحوم ایک عظیم الشان اور صاحب استقامت مدبر تھے۔ انہوں نے جس استقامت سے بھٹو دور کے استبداد کا مقابلہ کیا، وہ تاریخ کے صفحات میں درخشاں باب کی حیثیت سے محفوظ ہو چکا ہے۔ ملکی سیاست کے اس انتہائی نازک موڑ پر ان کا ہم سے بچھڑ جانا انتہائی تکلیف دہ ہے۔ ملک کو ان کے مفید مشوروں کی انتہائی ضرورت تھی۔ (۱۴)

پاکستان کی سٹیج پر اس وقت جو سیاسی رہنما قوم کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں اور مفتی صاحب کے ساتھ متعدد محاذوں پر جن قائدین نے کام کیا ہے۔ اور انہوں نے قریب سے مفتی صاحب کی شخصیت، آپ کی علمی و عملی قابلیت اور سیاسی فہم و فراست کا مشاہدہ کیا ہے۔ ان کا آپ کی شخصیت کو خراج تحسین پیش کرنا اور آپ کی قائدانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرنا واقعۃً حقیقت حال کے بالکل موافق ہے۔ اس میں حقیقتاً کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہے۔

مفتی صاحب نے سیاست کی وادی میں قدم رکھا۔ لیکن سیاست برائے سیاست یا سیاست برائے اقتدار کے قائل نہ تھے۔ وہ ایک عظیم مشن کے لئے سیاست کے میدان میں آئے تھے۔ اور وہ شروع میں ہندوستان کو انگریز غاصب و ظالم کے پنجۂ استبداد سے آزادی دلانا تھا۔ اور قیام پاکستان کے بعد اس ملک میں نفاذ اسلام تھا۔ مولانا زاہد الراشدی نے آپ کے بارے میں ایک مضمون میں آپ کی سیاسی حیثیت کا ذکر کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

> سیاست زندگی بھر حضرت مفتی محمود صاحب کا اوڑھنا بچھونا رہی ہے۔ انہوں نے سیاست کو مشغلہ، ہابی یا آج کے سیاسی پس منظر میں کاروبار کے طور پر نہیں بلکہ مشن اور فریضہ کے طور پر اختیار کیا۔ اور اس کا حق ادا کر کے دکھا دیا۔ ان کا شمار ملک کے مقتدر اور کامیاب سیاستدانوں میں ہوتا تھا۔ اور ان کی سیاسی قیادت کا لوہا ان کے معاصر بلکہ حریف سیاستدانوں نے بھی مانا۔ (۱۵)

مفتی صاحب کو پاکستان کی سیاست میں نہایت اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ آپ صوبائیت سے بالاتر ہو کر وفاق پاکستان کی نمائندگی کرتے رہے۔ جس کی وجہ سے آپ پاکستان کے چاروں صوبوں میں یکساں مقبول رہے۔ ایک عالم دین اور مفتی کے علاوہ تمام صوبوں میں آپ کو سیاسی قائد کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا تھا۔ قاری نور الحق ایڈووکیٹ سابق صدر ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن ملتان رقمطراز ہیں۔

> مولانا مفتی محمود غالباً پہلے اور شاید آخری لیڈر تھے جو شمال مغربی سرحدی صوبے سے تعلق رکھنے کے باوجود پاکستان کی بنیاد پر مسلمہ لیڈر مانے گئے۔ جن کی قیادت پر چاروں صوبوں کے متعدد سیاسی رہنما متفق تھے۔ پٹھانوں کو پنجاب نے بطور قائد کبھی تسلیم نہیں کیا۔ عبد الغفار خان اور ولی خان کی مثالیں سامنے رکھئے خان عبد القیوم خان کو پٹھانوں نے کبھی اپنا قائد تسلیم نہیں کیا۔ جبکہ مفتی صاحب نے پنجاب سے عام انتخابات میں حصہ لیا کیونکہ وہ عالم دین اور مذہبی رہنما بھی تھے۔ جس کی وجہ سے انہیں مذہبی اجتماعات کے سلسلہ میں ہر شہر، قریہ اور بستی تک جانا پڑتا تھا۔ عام پنجابی مفتی صاحب کو پٹھان کم اور پنجابی زیادہ سمجھتا تھا۔ مفتی صاحب کو ایک عالم دین کی حیثیت سے پنجاب میں بہت زیادہ احترام ملا اور انہیں پنجاب نے مذہبی عالم کے ساتھ ساتھ سیاسی قائد بھی تسلیم کر لیا۔(۱۶)

مفتی صاحب کو سیاسی معاملات سلجھانے میں ایک خاص ملکہ حاصل تھا۔ سیاسی مسائل کو بصیرت سے حل فرماتے تھے۔ ہمیشہ جمہوری ذہن سے سوچتے تھے۔ ہمیشہ بلند عزائم رکھتے تھے۔ اور قوم کو بھی خودداری اور خود انحصاری کی تلقین کرتے تھے۔ قاری سعید الرحمٰن اپنے ایک مضمون میں اس سلسلے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

> مفتی صاحب کو سیاسی معاملات میں خداداد بصیرت حاصل تھی۔ انہیں سیاسی مجالس یا میٹنگز میں شرکت کے لئے کسی تیاری وغیرہ کی ضرورت نہ ہوتی۔ سیاسی مسائل کو بڑی بصیرت سے حل فرماتے۔ پاکستان قومی اتحاد نے بھٹو حکومت کے ساتھ مذاکرات کے لئے جو ٹیم مقرر کی تھی۔ اس کی قیادت بھی ان کے ذمے تھی۔ ملک اس وقت ایک نازک دور سے گزر رہا تھا۔ مفتی صاحب نے اپنی اعلیٰ سیاسی بصیرت اور کردار سے مذاکرات کے دوران قوم کی نمائندگی کا صحیح حق ادا کیا۔ وہ مایوس کن حالات میں بھی کبھی مایوس نہیں ہوتے تھے۔ ان کے عزائم ہمیشہ بلند رہتے۔ سیاسی امور میں ہمیشہ جمہوری ذہن سے سوچتے تھے۔ اور ملک میں اسلامی اقدار کے نفاذ کے ساتھ ساتھ

> جمہوری عمل اور جمہوری اداروں کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ سیاسی عمل کے مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد قوم کے سیاسی شعور میں خود بخود پختگی آجائے گی۔(۱۷)

مولانا فتح محمد مہتمم مرکز علوم اسلامیہ منصورہ۔ لاہور جماعت اسلامی کے مرکزی رہنماؤں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ سیاسی لحاظ سے وہ جماعت اسلامی سے وابستہ تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ مفتی صاحب کے سیاسی مقام کا اعتراف کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

> پاکستان کی سیاست میں مفتی محمود صاحب مرحوم کا رول انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اگرچہ ان کی ابتدائی زندگی ایک دینی رہنما کی حیثیت سے منصہ شہود پر آئی تھی لیکن پاکستان کے سیاسی حالات کی دگرگونی نے انہیں سیاست کے میدان میں لا کھڑا کیا۔ اور انہوں نے اس میدان میں نہایت اہم خدمات سرانجام دی ہیں۔ ان کا یہ کوئی کم کریڈٹ نہیں ہے کہ پاکستان کی تمام سیاسی اور مذہبی تنظیموں نے ان پر اعتماد کیا۔ اور ان کی رہنمائی میں اسلام اور جمہوریت کی کشمکش کو ایک خاص مقام تک پہنچایا۔ ان کو یہ مقام ان کی دینی اور سیاسی بصیرت، بلند حوصلگی، بلند اخلاق اور حسن معاملت کی وجہ سے حاصل ہوا۔ تمام جماعتوں کے کارکنوں کے ساتھ برابر کی سطح پر معاملہ آسان بات نہیں ہے۔ مفتی محمود مرحوم کافی حد تک اس خصوصیت کے حامل تھے۔ اور اپنی گفتگو اور طریق عمل میں جماعتی رقابت کو حائل نہیں ہونے دیتے تھے۔(۱۸)

مولانا مفتی محمود صاحب کے سیاسی مقام کے بارے میں آپ کے ساتھ عرصہ دراز تک مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں درس دینے والے جید عالم دین، آج کل مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے شیخ الحدیث، مولانا محمد اکبر صاحب کی رائے یہ ہے۔

> وہ عمومی اور بین الاقوامی سیاست میں ذی اثر خصوصیات کے حامل تھے۔ سیاسی معاملات میں ان کی ایک نکھری ہوئی رائے ہوتی تھی۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ مذہب اور دینی

معاملات میں نہایت پختہ اور متصلب تھے۔ ان کے ہاں کچھ ضابطے اور حدود مقرر تھے۔ جن پر سختی سے کاربند رہے۔ (۱۹)

انڈیا کے اعلیٰ دانشور اور مذہبی و سیاسی سوجھ بوجھ کے مالک جناب شمس تبریز خان صاحب نے مفتی صاحب کے سیاسی مقام کے بارے میں ایک مضمون لکھا ہے جس میں لکھتے ہیں کہ مفتی صاحب نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ عالم اسلام کے ایک اعلیٰ اور عظیم سیاستدان تھے۔ اور دین و سیاست دونوں کے ماہر اور اسلامی طرز حیات اور اسلامی نظریہ حکومت و سیاست کے علمبردار تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> مولانا مفتی محمود برصغیر ہند و پاک ہی نہیں بلکہ عالم اسلام میں اسلامی سیاست و قیادت کا ایک زندہ، مثالی اور عملی نمونہ تھے۔ انہوں نے اپنے قابل قدر طرز عمل سے دین و سیاست کی تفریق کا نظریہ بالکل باطل کر دکھایا تھا۔ اور پاکستان کی لڑکھڑاتی سیاست کو قوت و استحکام بخشا تھا۔ (۲۰)

آپ کی سیاسی بصیرت اور تدبر ہی کی وجہ تھی کہ آپ نے قومی اتحاد کی تحریک کو پروان چڑھایا ملک کی تمام سیاسی قوموں کو اپنے ساتھ ملایا۔ اور ان میں اتحاد کی روح پیدا کی تھی۔ اور نہایت جرأت و بے باکی کے ساتھ اس وقت کے حالات کے اعتبار سے قوم کی ترجمانی کا فریضہ انجام دیا تھا۔ اور یہ ثابت کر دیا تھا کہ ایک بوریہ نشین عالم دین قوم کی قیادت و سیادت کی بھرپور صلاحیت و اہلیت رکھتا ہے۔ مولانا گلزار احمد مظاہری رقمطراز ہیں۔

> مفتی محمود نے اپنی سیاسی بصیرت، تدبر اور اہلیت کا یوں ثبوت دیا کہ انتہائی دانشمندی سے اس اتحاد کو برقرار رکھا۔ انتہائی تدبر سے تحریک کو آگے بڑھایا۔ بڑی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے حریفوں سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی اور یہ ثابت کر دیا کہ مسجدوں میں رہنے والے بوریہ نشین سیاسی بات کر جاتے ہیں۔ ان میں بات کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ تحریکوں کی قیادت کر سکتے ہیں۔ وہ قوموں کی تقدیر

کا فیصلہ کرنے کی جرأت رکھتے ہیں وہ ملکوں کا انتظام سنبھالنے کی اہلیت میں کسی سے پیچھے نہیں۔ (۲۱)

مفتی صاحب کی قابلیت و اہلیت اور سیاسی تدبر و فراست ہی کا نتیجہ تھی کہ آپ نے نہ صرف مذہبی معاملات میں قوم کو قیادت فراہم کی بلکہ سیاسی قیادت بھی آپ کے حصہ میں آئی۔ مذہب و سیاست دونوں کا اجتماع آپ کی ذاتی اوصاف میں ایک اعلیٰ کمال کی حیثیت سے موجود تھی۔ آپ کے ساتھ قومی اتحاد کی تحریک میں شریک رہنما جناب خان محمد اشرف خان رہنما خاکسار تحریک پاکستان آپ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مرحوم و مغفور کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اسلامی معیار کے مطابق صحیح معنوں میں دینی راہنما یعنی بیک وقت ایک عظیم مذہبی عالم اور اعلیٰ ترین سیاسی بصیرت کے حامل تھے جبکہ دوسرے کسی راہنما میں (بیک وقت) یہ صفات موجود نہیں۔ اگر کوئی مذہبی رہنما ہے۔ تو سیاسی بصیرت مفقود اور سیاسی رہنما ہے تو مذہب سے بے بہرہ۔ یہی سب سے بڑی وجہ تھی کہ مفتی صاحب کی بھرپور صلاحیت اور پر اعتماد قیادت نے کروڑوں عوام کو متاثر کیا۔ (۲۲)

مولانا مفتی محمود اپنی سیاسی تدبر، اصابت رائے اور وسعت نظری کی وجہ سے چاروں صوبوں میں انتہائی عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے جاتے تھے۔ انہوں نے کبھی حالات سے فائدہ اٹھا کر ذاتی اغراض کو کبھی منتہائے نظر نہیں بنایا۔ آپ نے ہمیشہ علاقائی اور لسانی تعصبات سے بالا ہو کر ملک کے اتحاد کے بارے میں سوچا۔ اور اُمت مسلمہ کو فرقہ واریت اور گروہ بندیوں سے ہمیشہ بچانے کی کوشش کی۔ جناب حمزہ ایم۔ اے رقمطراز ہیں۔

> سیاسی اور مذہبی راہنمائی حیثیت سے انہوں نے پاکستان کے اتحاد اور سالمیت کے لئے گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ ولی اور بھٹو دور میں ذیر و اسماعیل خان کی نشست سے منتخب ہونے کے بعد وہ محض اپنے ضلع یا صوبہ کی بجائے سارے ملک کی نمائندگی کرتے

رہے سیاسی تحمل کے فقدان کی وجہ سے علاقائی اور لسانی تعصبات پروان چڑھنے کے لئے ساز گار فضا میسر آتی ہے۔ کم ظرف، خود غرض اور کوتاہ اندیش سیاستدان ان تعصبات کو مزید ہوا دے کر سیاسی مقاصد کے حصول کی فکر میں لگے رہے۔ لیکن مفتی محمود صاحب جیسے انسان دوست اور سچے عالم دین نے حالات کی ناسازگی کے باوجود ملی یکجہتی اور پاکستان اور پاکستانی قوم کے مفاد کو عزیز سمجھا۔ سیاسی حریفوں کی کم ظرفی سے بے نیاز وہ امت مسلمہ کو فرقہ اور گروہ بندی کے زہر ہلاہل سے بچانے کے لئے ہمہ تن مصروف رہے یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے چاروں صوبوں میں انہیں انتہائی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ (۴۳)

سیاسی میدان میں مفتی صاحب کو اپنی "صاف دامنی" کی وجہ سے نہایت اعتماد حاصل تھا۔ ملک کے علمی، دینی اور سیاسی رہنماؤں کی نگاہ میں ان کو عزت و احترام کا مقام حاصل تھا اور یہ سب کچھ انکی بے لوثی اور قناعت پسندی کی وجہ سے تھا۔ مولانا زاہد الراشدی صاحب کے بقول:

> الغرض حضرت مولانا مفتی محمودؒ ایک روایتی "سیاسی رہنما" نہیں بلکہ تحریک ولی اللہی کے باشعور نمائندے اور پاکستان کے نفاذ اسلام کی جدوجہد کے ایک ہوشمند قائد تھے جنہوں نے اپنی سیاسی قوت کو محدود اور کم ہونے کے باوجود اپنے مقاصد کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا۔ اس میں جہاں انکی علمی ثقاہت، سیاسی تدبر، جرات، بے باکی اور حکمت و دانش کا نمایاں حصہ ہے۔ وہاں میرے نزدیک سب سے بڑا کردار ان کی اس اخلاقی برتری کا ہے کہ وہ کسی حکومت یا سیاسی قوت کے اس درجہ میں احسان مند نہیں تھے کہ اس سے اپنے مشن اور پروگرام کی بات کرتے ہوئے انہیں کوئی حجاب یا رکاوٹ محسوس ہو۔ وہ بے لوث اور قناعت پسند سیاسی رہنما تھے اسی صاف دامنی کی وجہ سے انہیں ملک کے علمی، دینی اور سیاسی حلقوں کا اعتماد حاصل تھا اور اسی اعتماد نے ان کے لئے پیش رفت اور کامیابیوں کی راہ ہموار کی جو ان کی زندگی کے نمایاں ابواب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ نفاذ اسلام کی جدوجہد کی قیادت کا آج کے دور میں ایک صحیح اور آئیڈیل نمونہ تھے۔ (۴۴)

جناب ریاض بٹالوی مشہور صحافی تجزیہ نگار اور فیچر نگار ہیں۔ انہوں نے "لیڈران کرام" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں انہوں نے مولانا مفتی محمود صاحب کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اور انکی شخصیت، کردار اور طرز حیات سے تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> وہ نامور علماء دیوبند کے نام لیواؤں اور دیوبند کے اس طائفہ سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے دین اور سیاست دونوں میں نام پیدا کیا۔ اور علم و فضل، تقویٰ و تصوف اور استبداد کے خلاف سینہ سپر ہوتے ہوئے قید و بند کی صعوبتوں میں راحت محسوس کی۔ مفتی محمود نے دیوبند میں اپنی دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان رہنماؤں سے ملک و قوم کی سیاست کا بھی سبق لیا۔ اور جہد و عمل میں کود پڑے۔ وہ جمعیت علماء ہند سے وابستہ ہو گئے۔ اور انگریز استبداد کے خلاف معرکہ میں داد شجاعت دیتے رہے۔ مفتی محمود علماء دیوبند کے مدنی فکر کے حامل ہونے کے باعث خواص پر کم اور عوام پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز کے علاوہ ان کی جدوجہد سرمایہ داروں، نوابوں، جاگیرداروں اور اجارہ داروں کے خلاف زیادہ نمایاں رہا۔ ان کی قدر و منزلت مسلم امراء اور نوابوں کی نسبت مفلوک الحال عوام اور متوسط طبقے میں زیادہ شدت سے کی جاتی ہے۔ وہ عام آدمی کی سی بود و باش کے حامل ہیں۔ بظاہر رجعت پسند نظر آتے، مگر ترقی پسندوں سے وہ حق کے شدید الزامات کا ہدف ہیں۔ ان کی سیاست کا نقطہ امتیاز اسلام کی سربلندی کے ساتھ ساتھ عام انسانوں کی معاشی مشکلات سے نجات اور سماجی زندگی میں انہیں عزت و شرف کا مقام دلانے کی جدوجہد ہے۔ یہیں سے ان کی ذات کہیں مخالفت کا اور کہیں عزت و احترام کا اصل حقدار ٹھہرائی جاتی ہے
>
> ....
>
> .... سماجی اور معاشی لحاظ سے وہ ایک پسماندہ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں کوئی جائیداد ہے نہ زمین۔ مدرسہ قاسم العلوم (ملتان) کے شیخ الحدیث، امریکہ کے دشمن، عربوں کے دوست اور پاکستان کے لیڈران کرام میں صف اول کے رہنما ہیں۔ (۴۵)

مفتی صاحب کی سیاسی خدمات کو حاجی فقیر محمد سابق وفاقی وزیر جو کہ ضیاء الحق کابینہ میں قومی اتحاد کے نمائندہ وزیر تھے۔ اور جمعیۃ علماء اسلام کے مرکزی رہنما تھے۔ یوں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

> قائد محترم نے قوم کی انتہائی مشکل اور ناسازگار حالات میں بے مثال قیادت کر کے عظیم عوامی تحریکوں کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ علم و عمل، فہم و فراست، عزم و استقامت، جرأت و بیباکی کا وہ مظاہرہ کیا جس کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ قاصر ہے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی اسلام کی بالادستی کے لئے وقف کر رکھی تھی ....
>
> .... بیدار مغزی، موقعہ شناسی، معاملہ فہمی میں ان کا ثانی عصر حاضر میں ناپید ہے۔ وہ سینکڑوں میل دور طوفان کے خطروں کو بھانپ لیتے تھے۔ اور قوم کو بروقت حالات کی سنگینی سے باخبر کرو یا کرتے تھے۔ (۲۶)

مفتی صاحب کی سیاسی خدمات کو سامنے رکھتے ہوئے آپ کی سیاسی عظمت کے بارے میں مولانا تاج محمود صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ ان کو زبردست خراج تحسین ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ " اگر یورپ میں ہوتے تو قومی ہیرو کے طور پر ان کی عظمت کا اعتراف کیا جاتا۔ ان کے کارنامے قومی تعلیمی نصاب میں شامل کئے جاتے اور تمنا کی جاتی کہ اس نصاب کے پڑھنے والے اسی کردار کے حامل نوجوان بنیں "۔ (۲۷)

سیاست میں آمد

علماء حق نے ہمیشہ ہر دور میں اپنے فرائض کی بجا آوری کرتے ہوئے مقتدر طاقتوں کے سامنے کلمہ حق بلند کیا ہے جس کی پاداش میں ان کو جیلوں، قیدوں اور آزمائش کے مختلف مرحلوں سے گزرنا پڑا ہے۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ، امام احمد بن حنبل ہی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ حضرت امام ابن تیمیہ نے قلم و سنان دونوں سے باطل قوتوں کا مقابلہ کیا تھا۔ اور باطل کو سرنگوں

کیا تھا۔ ماضی قریب میں برصغیر میں انگریز غاصب کے خلاف علماء حق نے جہاد کیا تھا۔ بہت سے علماء شہید کر دیئے گئے تھے۔ عمر قید کی سزائیں دی گئی تھیں۔ ہزاروں کو پابند سلاسل کیا گیا تھا۔ ان کی جائیدادیں تک ضبط کر لی گئی تھیں۔ موجودہ دور میں امریکہ کے گوانتاناموبے کی طرح برطانیہ کے حکمرانوں نے مختلف جزیروں میں علماء حق اور آزادی کے لئے جدوجہد کرنے والوں کو قید کر رکھا تھا۔

ان تمام حربوں کے باوجود انگریز آزادی کے متوالوں کے دلوں سے آزادی کے جذبہ کو نہ نکال سکے۔ ہر دور میں ایسے علماء پیدا ہوتے رہے۔ جو انگریز حکمرانوں کو چیلنج کرتے رہے۔ اور اس کی پاداش میں آزمائشوں اور مصائب کے سیلابوں کا مقابلہ کرتے ہوئے دنیا و آخرت میں سرخرو ہوتے رہے۔

خانوادہ ولی اللہی سے فیض یافتہ علماء کو دین اسلام کے تحفظ اور آزادی کی تڑپ نے حالات کے مطابق ان کو دارالعلوم دیوبند کی صورت میں ایک طرف دینی علوم کی درسگاہ اور دوسری طرف جذبہ آزادی کو مہمیز دینے کے لئے مرکز جہاد کی تعمیر کی طرف رہنمائی ملی تھی۔

مولانا مفتی محمود بھی ظاہری علوم کے اعتبار سے قافلہ ولی اللہی کے فرد فرید ہیں تو باطنی علوم یعنی طریقت میں خاندان مجدد الف ثانی سے فیض یافتہ ہیں۔ سیاست کے آغاز کے ساتھ وہ خود ایک انٹرویو میں جو وہ جانباز مرزا کو دیتے ہیں، یہ بتاتے ہیں کہ وہ سیاست میں کن عظیم علماء سے متاثر تھے۔ وہ کہتے ہیں۔

> احقر جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں ایسے اساتذہ کے زیر تربیت رہا جو اسلامی سیاست کے شہسوار تھے۔ نیز حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے بہت متاثر رہا۔ طالب علمی کے زمانے میں سیاسیات کا وسیع مطالعہ کیا۔ ۱۹۳۷ء کے الیکشن میں بھی زمانہ طالب علمی میں اپنے اکابر کی زیر نگرانی سارے

یوپی (انڈیا) میں کام کیا۔ انہی دنوں جمعیۃ علماء ہند سے وابستگی ہوئی۔ اگرچہ طالب علمی میں جماعت کی ممبر سازی تک کام کیا جبکہ عمومی کاموں میں سرگرم رہے (۲۸)

ایک اور انٹرویو میں بھی آپ اپنی سیاست سے دلچسپی، سیاسی تربیت اور جن عظیم بزرگوں سے آپ متاثر رہے ان کا تذکرہ یوں کرتے ہیں۔

زمانۂ طالب علمی میں مجھے مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ اور مولانا سید فخر الدین جیسے بزرگوں سے شرف نیاز حاصل رہا۔ اور یہی وہ لوگ تھے جن سے میں متاثر ہوا۔ میری سیاسی تربیت اور میرا سیاسی شعور انہی بزرگوں کا مرہون منت ہے ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں میں نے طالب علم کی حیثیت سے کام کیا۔ (۲۹)

۱۹۳۷ء کے انتخابات میں جمعیۃ علماء ہند اور مسلم لیگ نے مشترکہ طور پر یوپی میں مسلم یونین بورڈ کے نام سے حصہ لیا تھا۔ مفتی صاحب نے ایک طالب علم کی حیثیت سے انتخابی مہم کے سلسلے میں مراد آباد کے دیہاتوں میں جا کر جمعیۃ علماء ہند کے امیدواروں کے حق میں مہم چلائی تھی۔ اور بیشتر مقامات کا پیدل سفر کیا تھا۔ سید عمران شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

مولانا مفتی محمود کی سیاسی زندگی کا آغاز زمانہ طالب علمی سے ہوا۔ دوران تعلیم ہی آپ نے جمعیۃ علماء ہند میں شمولیت اختیار کی۔ اور ۱۹۳۷ء میں ۱۹۳۵ء ایکٹ کے تحت ہونے والے انتخابات میں جمعیۃ علماء ہند اور مسلم لیگ کی مشترکہ انتخابی مہم جو یوپی میں مسلم یونین بورڈ کے نام سے جاری تھی۔ سارے یوپی میں کام کیا۔ اور بیشتر مقامات کا پیدل سفر کیا۔ (۳۰)

مولانا مفتی محمودؒ نے ایک طالب علم کی حیثیت سے دیگر طلباء کو بھی اس طرف متوجہ کیا۔ ان کی سیاسی تربیت کی ایک سیاسی نظم میں منظم کرنے کی جدوجہد شروع کی۔ دینی مدارس میں ان دنوں حضرت شیخ الہندؒ کی زیر سرپرستی مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی شب و روز محنت سے "جمعیۃ الانصار" ایک منظم پلیٹ فارم تھی۔ مولانا مفتی محمودؒ نے اس پلیٹ فارم سے اپنے آپ کو وابستہ کیا۔ اور دیگر طلباء کو منظم کرنے کی جدوجہد کی۔ جناب محمد فاروق قریشی رقمطراز ہیں۔

انہوں (مفتی محمود) نے دور طالب علمی میں دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ شاہی مراد آباد میں طلباء کو منظم کرنے کی جدوجہد کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ جس قوم کے طلباء منظم و متحد ہو جائیں اس کی آنے والی نسل از خود منظم مستحکم ہو گی۔ جمعیۃ الانصار کے نام سے طلباء کو منظم کرنے کی کوشش سے انہوں نے عملی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اس انقلابی تنظیم کے بانی حضرت شیخ الہندؒ اور نامور حضرت کے نامور اور انقلابی شاگرد مولانا عبید اللہ سندھیؒ تھے جنہیں عام طور پر امام انقلاب کہا جاتا ہے۔ (۳۱)

مولانا مفتی محمودؒ کی سیاست میں حصہ لیتے وقت مشترکہ ہندوستان کے کیا حالات تھے۔ اس وقت یہ ملک کن حالات سے دوچار تھا۔ آزادی پسند قوتیں کیا کر رہی تھیں؟ اور وہ کس طرح اس بڑی سامراجی طاقت کو بے بس کر کے اس ملک سے نکل جانے پر مجبور کرنے کے لئے تدابیر پر تدابیر اختیار کر رہی تھیں؟ اور جنگ عظیم دوم نے برطانیہ کی طاقت و قوت کو چیلنج کر کے کس طرح اس کے پنجۂ استبداد کو ڈھیلا کر دیا تھا؟ ان تمام حالات پر جناب عبد الحفیظ بن عبد العزیز ایک مدلل تجزیہ پیش کرتے ہیں اور پھر لکھتے ہیں کہ یہ وہ حالات تھے جس کی وجہ سے مولانا مفتی محمود نے اپنے جذبہ اور جوش و خروش سے کام لے کر دیگر آزادی پسند قوتوں کے ساتھ آپ بھی تحریک آزادی کی اس جدوجہد میں مصروف کار ہو گئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔

۱۹۳۷ء کا زمانہ تھا۔ امام الہند مولانا محی الدین ابو الکلام آزاد آل انڈیا کانگریس کے صدر اور انگریزوں اور ان کے ہمنواؤں کے مقابلہ میں وطن پرستوں کے قائد تھے۔ کاروان حریت اپنی منزل مقصود کے قریب تھا۔ بس فرنگی اقتدار کی گرتی دیوار کو آخری دھکا دینے کی ضرورت تھی۔ علماء حق انگریزی فوج میں بھرتی کے حرام ہونے کا فتویٰ پہلے ہی صادر فرما چکے تھے۔ جرمنی کے روز افزوں حملے پے در پے حملے کر کے "برطانوی شیر"

کو بوڑھا کر دیا تھا۔ تحریک آزادی کی شدت کے باعث نو آبادیات پر برطانیہ کی گرفت ذرا ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ جمعیت علماء ہند کے صدر شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنیؒ پہلے ہی بغاوت کے الزام میں پس دیوار زندان تھے۔ نیز ملکی استبداد سے آزادی کے لئے کانگریس کے صدر، مولانا ابو الکلام آزاد نے "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کا اعلان کر دیا۔ اس تحریک سے ہندوستان میں برطانوی حکومت ہل کر رہ گئی۔ تحصیل کانگریس کی اپیل پر کسانوں نے حکومت کو ٹیکس و مال گزاری اور لگان دینے سے صریح انکار کر دیا۔ اپنے گاؤں میں "متوازی چھپا حکومتیں" قائم کر دیں۔ سرکاری کرنسی کا بائیکاٹ کر کے مال کے بدلے مال کا نظام شروع ہو گیا۔ محنت کشوں نے ملیں، فیکٹریوں اور سرکاری محکموں میں ہڑتال کر کے نظام حکومت معطل کر دیا۔ [illegible] طور پر پیداوار کم کر دی۔ بیوپاریوں نے انگریزوں سے لین دین ترک کر کے امپیریل بینک اور دوسرے برطانوی بینکوں سے اپنا روپیہ نکال لیا اور سود اور قرضہ میں سرمایہ کاری شروع ہو گئی۔ مسلح افواج میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ بابو سبھاش چندر بوس برما میں "باغی" ہو گیا۔ ہندوستان کا چپہ چپہ "انگریز غاصبو! ہندوستان سے نکل جاؤ" کے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھا"۔

عبد الحفیظ بن عبد العزیز نے اس وقت ہندوستان کے حالات کا خوب نقشہ کھینچا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

اس عظیم الشان تحریک میں جمعیۃ علماء ہند سرحد کے ایک [illegible] مولوی محمود بھی پورے جذبہ اور جوش و خروش سے اپنے وقت کی سب سے بڑی سامراجی طاقت برطانیہ کے خلاف مصروف عمل ہے یہی مولوی محمود بعد میں مفتی محمود کے نام سے معروف ہو گئے۔ (۳۳)

مفتی محمود صاحبؒ نے دوران تعلیم اپنی محدود سیاسی سرگرمیاں جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے جاری رکھیں۔ اور دیگر طلباء کو بھی "فعال" رکھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد بھی آپ نے تدریسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ سیاسی سرگرمیاں بھی جاری رکھیں۔ سید عمر [illegible] کے

[illegible] میں آپ نے تعلیم سے فراغت حاصل کی تو "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک زوروں پر تھی آپ نے اس میں بھرپور حصہ لیا"۔ (۳۳)

اس ضمن میں جناب محمد فاروق قریشی رقمطراز ہیں۔

مولانا مفتی محمود نے دینی تعلیم سے فراغت کے فوراً بعد صوبہ سرحد خصوصاً اپنے علاقے میں ترویج دین کے ساتھ ساتھ سماجی خدمت اور سیاسی بیداری کے لئے جدوجہد شروع کی۔ قومی سیاست میں انہوں نے ۱۹۴۲ء میں قدم رکھا تھا جب برٹش سامراج کے خلاف "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک شروع ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ اپنے ذوق و فکر کے مطابق ملت اسلامیہ کی خدمت اور رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ (۳۴)

مفتی صاحب اس وقت اپنی سیاسی سرگرمیوں کے متعلق خود ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں کہ ۱۹۴۲ء میں جب پورے ہندوستان میں برطانوی سامراج کے بائیکاٹ کی مہم چلائی گئی تو ہم نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا میں اس وقت جمعیۃ علماء ہند کی آل انڈیا کونسل کا رکن اور سرحد میں جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر تھا"۔ (۳۵)

مفتی صاحب کے آغاز سیاست اور ان دنوں ہندوستان کے حالات کے بارے میں مولانا اکبر صاحب نے بھی اچھا تجزیہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

حضرت مفتی محمود صاحب زمانہ طالب علمی سے ہی علماء حق کے قافلے کے ساتھ سیاسی جدوجہد میں مصروف عمل رہے۔ اس دوران آپ نے سیاسیات کا وسیع مطالعہ کیا۔ مارچ ۱۹۳۷ء میں جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت انتخابات ہوئے تو سیاسی صورت حال اور علاقائی نزاکتوں کو بھانپتے ہوئے یوپی (انڈیا) میں جمعیۃ علماء ہند نے مسلم لیگ کے ساتھ انتخابی سمجھوتہ کیا۔ حضرت مفتی صاحب ان دنوں مدرسہ قاسمیہ شاہی مراد آباد میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے مایہ ناز شاگرد حضرت مولانا فخر الدینؒ سے دورہ حدیث کا شرف تلمذ حاصل کر رہے تھے۔ آپ نے اس الیکشن کے دوران شیخ الاسلام حضرت حسین احمد مدنیؒ کے زیر نگرانی ایک رضاکار کی حیثیت سے بھرپور حصہ

کو بوڑھا کر دیا تھا۔ تحریک آزادی کی شدت کے باعث نو آبادیات پر برطانیہ کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ جمعیۃ علماء ہند کے صدر شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنیؒ پہلے ہی بغاوت کے الزام میں پس دیوار زندان تھے۔ غیر ملکی استعمار سے آزادی کے لئے کانگریس کے صدر مولانا ابو الکلام آزاد نے "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کا اعلان کر دیا۔ اس تحریک سے ہندوستان میں برطانوی حکومت ہل کر رہ گئی۔ تین سال کانگریس کی اپیل پر کسانوں نے حکومت کو ٹیکس و مال گزاری اور لگان دینے سے صریح انکار کر دیا۔ اپنے گاؤں میں "نوراج پنچایتیں" قائم کر دیں۔ سرکاری کرنسی کا بائیکاٹ کر کے مال کے بدلے مال کا نظام شروع ہو گیا۔ محنت کشوں نے ملوں، فیکٹریوں اور سرکاری محکموں میں ہڑتال کر کے نظام حکومت "معطل کر ڈالا"۔ دانستہ طور پر پیداوار کم کر دی۔ بیوپاریوں نے انگریزوں سے لین دین ترک کر کے امپیریل بینک اور دوسرے برطانوی بینکوں سے اپنا روپیہ نکال لیا اور سوراج قرضہ میں سرمایہ کاری شروع ہو گئی۔ مسلح افواج میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ بابو سبھاش چندر بوس برما میں "باغی" ہو گیا۔ ہندوستان کا چپہ چپہ "انگریز صاحبو! ہندوستان سے نکل جاؤ" کے فلک شگاف نعروں سے گونجنے لگا"۔

عبد الحفیظ بن عبد العزیز نے اس وقت ہندوستان کے حالات کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

اس عظیم الشان تحریک میں جمعیۃ علماء ہند سرحد کے ایک اعلیٰ عہدیدار مولوی محمود بھی پورے جذبہ و جوش و خروش سے اپنے وقت کی سب سے بڑی سامراجی طاقت برطانیہ کے خلاف مصروف کار رہے۔ یہی مولوی محمود بعد میں مفتی محمود کے نام سے معروف ہو گئے۔ (۳۲)

مفتی محمود صاحبؒ نے دوران تعلیم اپنی جدوجہد و سیاسی سرگرمیاں جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے جاری رکھیں۔ اور دیگر طلباء کو بھی "فعال" رکھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد بھی آپ نے تدریسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ سیاسی سرگرمیاں بھی جاری رکھیں۔ سید عمران شاہ کے

بقول ۱۹۴۲ء میں آپ نے تعلیم سے فراغت حاصل کی تو "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک زوروں پر تھی آپ نے اس میں بھرپور حصہ لیا"۔ (۳۳)

اس ضمن میں جناب محمد فاروق قریشی رقمطراز ہیں۔

مولانا مفتی محمود نے دینی تعلیم سے فراغت کے فوراً بعد صوبہ سرحد خصوصاً اپنے علاقے میں ترویج دین کے ساتھ ساتھ سماجی خدمت اور سیاسی بیداری کے لئے جدوجہد شروع کی۔ قومی سیاست میں انہوں نے ۱۹۴۲ء میں قدم رکھا تھا جب برٹش سامراج کے خلاف "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک شروع ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ اپنے ذوق و فکر کے مطابق ملت اسلامیہ کی خدمت اور رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ (۳۴)

مفتی صاحب اس وقت اپنی سیاسی سرگرمیوں کے متعلق خود ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں کہ "۱۹۴۲ء میں جب پورے ہندوستان میں برطانوی سامراج کے بائیکاٹ کی مہم چلائی گئی تو ہم نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا میں اس وقت جمعیۃ علماء ہند کی آل انڈیا کونسل کا رکن اور سرحد میں جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر تھا"۔ (۳۵)

مفتی صاحب کے آغاز سیاست اور ان دنوں ہندوستان کے حالات کے بارے میں مولانا محمد اکبر صاحب نے بھی اچھا تجزیہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

حضرت مفتی محمود صاحب زمانہ طالب علمی سے ہی علماء حق کے قافلہ کے ساتھ سیاسی جدوجہد میں مصروف عمل رہے۔ اس دوران آپ نے سیاسیات کا وسیع مطالعہ کیا۔ مارچ ۱۹۳۷ء میں جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت انتخابات ہوئے تو سیاسی صورت حال اور علاقائی نزاکتوں کو بھانپتے ہوئے یوپی (انڈیا) میں جمعیۃ علماء ہند نے مسلم لیگ کے ساتھ انتخابی سمجھوتہ کیا۔ حضرت مفتی صاحب ان دنوں مدرسہ قاسمیہ شاہی مراد آباد میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے مایہ ناز شاگرد حضرت مولانا فخر الدینؒ سے دورہ حدیث کا شرف تلمذ حاصل کر رہے تھے۔ آپ نے اس الیکشن کے دوران شیخ الاسلام حضرت حسین احمد مدنیؒ کے زیر نگرانی ایک رضاکار کی حیثیت سے بھرپور حصہ

لیا۔ مفتی صاحب نے اپنی سیاسی جدوجہد کا آغاز ۱۹۴۲ء میں آزادی سے قبل جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے کیا۔ جو ہندوستان میں علماء کی ایک موثر اور متحرک جماعت تھی۔ ۱۹۴۲ء میں حضرت مفتی صاحب نے اپنے اکابر کے حکم پر مشہور تحریک "ہندوستان چھوڑ دو" میں حصہ لیا۔ جو آخری متحدہ تحریک تھی۔ جس میں تقریباً ۱۵ ہزار مسلمان اور ہندو پابند سلاسل ہوئے۔ اسی تحریک کے نتیجہ میں حضرت مفتی صاحب جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا رکن اور آل انڈیا جمعیۃ علماء ہند کے کونسلر منتخب ہوئے۔ نیز آپ نے یہ اعزاز محض تیئس سال کی عمر میں حاصل کیا۔ مئی ۱۹۴۵ء میں جب یورپ کی جنگ ختم ہو گئی اور ہندوستان کی آزادی ناگزیر ہو گئی۔ تو نئے حکمران قوتوں نے ۱۹۴۶ء میں انتخابات کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں حضرت مفتی صاحب ۱۹۴۶ء میں سہارنپور کی تاریخی کانفرنس میں سرحد جمعیۃ کے نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے اور اپنے اکابر کے ساتھ اس الیکشن میں بھرپور حصہ لیا۔ (۳۶)

آپ کے سیاسی مقاصد واہداف

مولانا مفتی محمود کی سیاست صرف دین کی سربلندی اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے تھی آپ کی تمام سرگرمیاں دینی احکامات کے تحت ہوتی تھیں اور آپ کی زندگی کا مقصد اور نصب العین یہی تھا کہ مملکت خداداد پاکستان میں ہر سطح پر دین کو فوقیت حاصل ہو۔ ملک کے لئے بننے والی تمام پالیسیاں خواہ اس کا تعلق تعلیم سے ہو معیشت سے ہو عدالت و تجارت سے ہو یا پارلیمنٹ سے ہو ان سب میں دین اسلام کی کارفرمائی ہو اور یہ تمام نظام ہائے حیات دین اسلام کے تابع ہوں تاکہ ایک ایسا پرامن معاشرہ تشکیل پا سکے۔ جس میں زندگی کے تمام طبقات کو دینی احکامات پر عمل کرنے کے سب کو برابر مواقع بسہولت حاصل ہوں اور ان کے تمام مسائل ومشکلات اللہ تعالی کے پسندیدہ دین، دین اسلام کی تعلیمات وہدایات کی روشنی میں حل ہوں۔

مفتی صاحب کے پیش نظر سیاست میں حصہ لینے کا مقصد اولین یہی تھا ان کے تمام تفکرات اور احساسوں کا یہی مقصد تھا ان کی اپنی پوری زندگی اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے میں گزری اور اپنے جماعتی کارکنوں کو بھی اس پر عمل کرنے کی تلقین فرماتے اور غفلت کی صورت میں باقاعدہ ان سے بازپرس بھی کرتے۔ اس مقصد کے لئے وہ ہر قربانی دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اور یہی جذبہ وہ اپنے تمام شاگردوں، متعلقین اور جماعتی کارکنوں میں بیدار کرنے کی سعی کرتے رہتے۔ مولانا اسفندیار (کراچی) لکھتے ہیں۔

> مولانا مفتی محمود کی پوری زندگی، اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ تھی۔ ان کی سب سے بڑی خواہش اور کوشش یہی تھی کہ پورے پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام میں اسلام کو عملی طور پر رائج اور نافذ کر دیا جائے۔ ان کے نزدیک سب سے بڑی اہمیت اسلام اور اسلامی تعلیمات کو حاصل تھی۔ اور وہ اس سلسلے میں کسی قسم کی سودے بازی برداشت نہیں کرتے تھے۔ اپنے کارکنوں کو اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کا حکم دیتے اور پھر ان سے ان پر عمل نہ کرنے کی صورت میں بازپرس بھی کرتے تھے۔ ایک بار فرمایا کہ اگر یہ مدارس اور خانقاہیں اسلامی نظام کے نفاذ میں رکاوٹ بنیں گی تو ہم ان کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ (۳۷)

"شریعت کونشن" "گوجرانوالہ سے خطاب کرتے ہوئے مفتی صاحب نے فرمایا" میں دعوے سے کہتا ہوں کہ حکومت ہمارے حوالہ کر دو۔ اگر چھ ماہ میں مکمل طور پر اسلامی نظام نافذ نہ کر دیں تو ہمیں پھانسی پر لٹکا دو"۔ (۳۸)

ایک انٹرویو میں وہ خود اپنی سیاست کے مقصد کو متعین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام کا نفاذ ایک عالم دین ہونے کے ناطے سے یہ میری ذمہ داری ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

> جب تک پاکستان میں مکمل اسلامی نظام قائم نہیں ہو جاتا میں اس وقت تک اپنی جدوجہد جاری رکھوں گا۔ ایک عالم دین ہونے کے ناطے مجھ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ

میں اسلام کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو چیلنج کروں۔ اور قرآنی اقدار کو ہر مرحلے پر واضح کرتا رہوں۔ (۳۹)

اور یہ سطحی بات نہ تھی جو جذبات کے رو میں آکر آپ نے کہہ دی تھی۔ یہ میں حقیقت ہے کہ آپ کی ساری زندگی اور اس کی تمام سرگرمیاں اس مقصد کے لئے تھیں۔ یہ آپ کی زندگی کا ایک اہم اور سب سے مقدم مشن تھا۔ وہ جمہوریت کے بھی اس درجہ قائل تھے کہ وہ عوام کو اقتدار کا حق دیتا ہے۔ جمہوریت ہی انتخابات کے ذریعہ عوامی رائے کو تقویت دیکر اس کے نمائندوں کو اقتدار کے ایوانوں تک پہنچاتا ہے۔ اس لئے مفتی صاحب انتخابات میں حصہ لیتے رہے اور جمہوری نظام کو اپنے نصب العین کے حصول کا ذریعہ سمجھتے رہے۔ اس سلسلے میں آپ ایک تقریر میں اپنے نصب العین اور اس کے حصول کے لئے جمہوریت اور انتخابات کو ایک ذریعہ کے طور پر قبول کرنے کی بات کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

> انتخابات کا اصل مقصد مضبوط جمہوری حکومت کا قیام ہے اس کے لئے ہم سیاسی قوت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اقتدار کا حصول اعلیٰ مقصد حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ ہمارا مقصد نظام مصطفےٰ کا قیام ہے اسی مقصد کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ وہ نظام حیات ہے جو خالق کائنات نے اپنے بندوں کے لئے پسند کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل کرکے دکھایا ہے۔ عوام کے مسائل کا حل نمائندہ حکومت کا قیام ہے اور جمہوریت کے قیام کا مقصد قانون کی بالادستی، عوام کی خوشحالی اور ہر قسم کے استحصال کا حقیقی خاتمہ ہے۔ جمعیۃ علماء اسلام ہر قسم کے استحصال سے پاک اسلامی نظام کی حامی ہے۔ (۳۰)

مفتی صاحب سیاست کو عین دین سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک دین وسیاست میں کوئی دوئی نہ تھی۔ بلکہ وہ سیاست کو دین ہی کا ایک اہم شعبہ سمجھتے تھے۔ اور جس طرح دین کے تمام احکام اور تمام شعبوں پر عمل کرنا لازم ہے۔ اسی طرح سیاسی جدوجہد بھی جو دین کے نفاذ اور دینی احکامات کے اجراء کے لئے ہو اس کو لازم اور فرض جانتے تھے۔ ایک بیان میں آپ فرماتے ہیں۔

> سیاست کئی قسم کی ہوتی ہے ملک میں ایک اکھاڑ پچھاڑ کی سیاست ہے ایک الیکشن کی سیاست ہے۔ ایک ملکی حفاظت اور استحکام کی سیاست ہے۔ میں آج آپ کے سامنے ملک کی حفاظت اور استحکام کی سیاست بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اور یہ ہر مسلمان پر ضروری اور فرض ہے۔ میں ایک مذہبی آدمی ہوں۔ میرے نزدیک مذہب و سیاست ایک ہیں۔ (۳۱)

قیام پاکستان کے وقت قوم کو جو نعرہ دیا گیا تھا وہ تھا کہ "پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ" جس کا واضح مقصد یہ تھا کہ پاکستان میں اسلامی نظام کا قیام و نفاذ ہوگا۔ اسلامی اقدار و شعائر کو تحفظ حاصل ہوگا۔ اس میں حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہوگی۔ قرآن وسنت کی حکمرانی ہوگی۔ اور پھر اس نیک مقصد کے لئے جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں نے وہ عظیم قربانیاں دیں جن کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ لاکھوں جانیں اس کی نذر کر دی گئیں۔ عصمتیں لٹیں۔ جائدادیں ترک کر دینی پڑیں۔ آبادی کے انتقال نے بہت سے مسائل کو جنم دیا۔ اور یہ سب کچھ اس خاطر ہوا کہ پاکستان کی صورت میں ایک اسلامی مملکت کا قیام ہوگا۔ جہاں دین اسلام کو حاکمیت حاصل ہوگی لیکن یہاں برسر اقتدار طبقات نے جو کھیل کھیلے۔ اقتدار کے حصول کے لئے جن سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے کام لیا گیا۔ جس کی وجہ سے پاکستان کے قیام کا مقصد پس پشت ڈال دیا گیا۔ اور کئی سال گزرنے کے باوجود آزادی کے مقصد سے چشم پوشی کی گئی۔ علماء حق نے برسر اقتدار طبقے کو مہلت بھی دی کہ شاید وہ آزادی کی صورت میں قوم کو جن مشکلات سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ ان پر قابو پانے کے لئے ان کو ایک مدت چاہیے لیکن اس سے فائدہ نہ اٹھایا گیا۔ بلکہ ان کے عزائم ہی ایک اور رنگ میں ظاہر ہونے لگے۔ تو علماء حق کو چند سال کی خاموشی کے بعد پھر اپنا فرض نبھانے کے لئے میدان عمل میں کودنا پڑا جن میں مولانا مفتی محمود بھی تھے۔ بلکہ علماء حق کو ایک تنظیم میں منظم کرنے کے لئے جو حضرات پیش پیش تھے ان میں آپ کا نام بھی شامل تھا۔ اور آپ ہی

نے اجتماع کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اور ملتان میں جہاں آپ مدرسہ قاسم العلوم میں مدرس و مفتی تھے۔ یہ اجتماع کرایا۔ اور نئے عزائم کے ساتھ علماء کی صف بندی کی۔ جناب قاری شیر افضل رقمطراز ہیں۔

> حضرت مفتی صاحب کا پہلا اور آخری مقصد اس ارض مقدس میں دین اسلام کا عملی نفاذ تھا .... حضرت مفتی صاحب کی سب سے بڑی آرزو اور تمنا یہی تھی کہ مسلمانان پاکستان نے تحریک پاکستان کے دوران خدا تعالیٰ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر ہمیں علیحدہ وطن مل گیا تو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا عملی نفاذ کر کے دم لیں گے۔ حضرت مفتی صاحب کو یہ فکر بھی ہمیشہ دامن گیر رہتی ہے جو قوم اللہ سے وعدہ کر کے ایک چیز مانگتی ہے۔ پھر وہ چیز ملنے کے بعد اس وعدہ کو پورا نہیں کرتی تو خدا کے غیظ و غضب سے وہ قوم بچ نہیں سکتی۔ حضرت مفتی صاحب نے اپنی قوم اور حکمرانوں کو اس وعدہ کی طرف ہمیشہ متوجہ کیا۔ (۳۲)

اور یہی بات مولانا محمد طیب کشمیری صاحب بھی کرتے ہیں۔

> جس غرض اور مقصد کے لئے پاکستان معرض وجود میں آیا تھا۔ اور اس کے حصول کے لئے لاکھوں مسلمانوں کی جانیں قربان ہوئی تھیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے شریعت محمدی کو مکمل طور پر عملاً نافذ کرنا ان کے یہاں سب سے زیادہ اہم امر تھا۔ نیز ملک کی سالمیت جمہوریت کا تحفظ، سوشلزم، کمیونزم اور سرمایہ دارانہ نظریات کی شدید مخالفت یہ بھی ان کے نزدیک اہم امر تھا۔ حضرت مفتی صاحب یہ چاہتے تھے۔ کہ یہاں کے لوگ، اسلامی قوانین کے تحت اپنی زندگی بسر کریں۔ وہ ہر معاملہ اور زندگی کے ہر شعبے میں صرف اور صرف اسلام کی رہنمائی حاصل کریں۔ اور اس غرض اور مقصد کے حصول کے لئے مفتی صاحب آخر تک کوشاں رہے۔ (۳۳)

مفتی صاحب کی اسلام سے وابستگی ہر شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ اور سیاست میں کردار ادا کرنے کی وجہ بھی وہ یہی بتاتے تھے۔ کہ اس سے بھی ہمارا مقصد صرف اسلام ہے۔ خواہ وہ کسی بھی طریقے اور جس راستے سے بھی آئے۔ ایک مرتبہ فرمایا۔

> نفاذ اسلام کے معاملہ میں میں غیر سیاسی ہوں۔ خواہ اسلام اوپر سے آئے یا نیچے سے آئے۔ ہم اسے قبول کریں گے۔ خواہ بذریعہ فوج آئے یا بذریعہ سول انقلاب یا انتخاب سے۔ کسی بھی طریقے سے آئے ہم اسے قبول کریں گے۔ اس کا خیر مقدم کریں گے۔ ہمارا مقصد حیات تو اسلام اور فقط اسلام ہے۔ (۳۴)

ایک بیان میں آپ نے انتخابات میں حصہ لینے کا مقصد بھی یہی بتایا۔ کہ ہمارا اس سے مقصد اس ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ ہے۔ نہ کہ بر سر اقتدار آکر عیش، عشرت کا حصول۔ وہ کہتے ہیں۔

> ہم الیکشن اس لئے نہیں لڑ رہے کہ ہمیں حکومت ملے گی یا بر سر اقتدار آکر جشن عشرت سے رہیں گے۔ بلکہ ہم اس لئے انتخاب میں حصہ لے رہے ہیں کہ جب ہمارے پاس حکومت آئے گی تو ہم اس ملک میں اسلامی قوانین کو نافذ کریں گے۔ اور قوم کی خدمت ہمارا اولین مقصد ہو گا۔ (۳۵)

اس عظیم مقصد کے لئے آپ نے ہر مشکل کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ اور قوم کو بھی اس کے لئے آمادہ کیا۔ مولانا غلام اکبر سلیمانی لکھتے ہیں کہ مفتی محمود صاحب فرمایا کرتے تھے۔

> انسان کو دین کے معاملہ میں سخت ہونا چاہیئے۔ اگرچہ اس میں جان ہی کیوں نہ چلی جائے اس لئے صدر ایوب خان کے دور حکومت سے جنرل محمد ضیاء الحق کے دور حکومت تک وہ ہمیشہ اسلام کے نفاذ اور جمہوریت کی بقاء کے لئے لڑتے رہے اور کارہائے نمایاں انجام دیئے جس کو رہتی دنیا تک بھلایا نہیں جا سکتا۔ (۳۶)

اور اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ آپ نے اپنی سیاست کے مقصد کو پشاور یونیورسٹی میں "سیرت کانفرنس" سے مئی ۱۹۷۶ء کو خطاب کرتے ہوئے بیان کیا۔ فرمایا۔

آج کل عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ملکی سیاست کا دین اور جناب نبی کریم ﷺ کی سیرت سے کوئی تعلق نہیں سیاست الگ ہے۔ دین الگ ہے۔ لیکن میں آپ پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ سیاست اگر دین کے تابع ہو، اگر دین کی روشنی میں سیاست کا کاروبار ہوتا ہو، اگر سیاست کے اصول دین کی رہنمائی میں طے پائے ہوں۔ تو وہ سیاست بھی دین ہے۔ اسے دین سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

آپ نے مزید فرمایا۔

میں آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ کہ ہماری سیاست وہی ہے جو دین کے تابع ہو۔ ہم اس سیاست کے قائل ہیں جسے دین کی روشنی میں تیار کیا جاتا ہو اور دین سے لاتعلق سیاست سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ (۳۷)

مفتی صاحب، تحریک ولی اللّٰہی کے نمائندہ اور ترجمان تھے۔ آپ اسی تحریک اور اس سے متاثر اساتذہ کے شاگرد اور زیر تربیت رہے تھے۔ اور اسی تحریک کے اعلیٰ روایات کے امین تھے۔ آپ نے وطن کی آزادی کی جنگ میں بھرپور حصہ لیا اور قیام پاکستان کے بعد آپ کی تمام تر جدوجہد کا مقصد اس ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ اور اس کے قوانین پر عملداری رہا۔ مولانا زاہد الراشدی لکھتے ہیں۔

مفتی صاحب ایک عالم دین کے طور پر اس نظریاتی تحریک کے نمائندہ اور باشعور رہنما تھے جسے ولی اللّٰہی تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس نے اس خطہ ارض میں مسلمانوں کے دینی تشخص، علوم و روایات اور ثقافت و تمدن کے تحفظ اور آزادی کے حصول کے لئے کم و بیش دو صدیوں پر محیط طویل جنگ لڑی اور دینی درسگاہوں کے ساتھ ساتھ جیل کی کال کوٹھڑیوں، پھانسی کے پھندوں اور میدان جہاد کے معرکوں کو بھی رونق بخشی۔ مفتی صاحب نے اس درسگاہ حریت سے تربیت حاصل کی اور انہی اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ وہ اپنے اساتذہ کے صرف علوم کے وارث نہیں تھے۔ بلکہ ان کی جدوجہد اور روایات کے بھی امین تھے۔ اور ان کی زندگی بھر کی تگ و

دو اس بات پر گواہ ہے کہ انہوں نے اس وراثت و امانت کی حفاظت اور اسے اگلی نسل تک پہنچانے میں کوئی کمی اور کوتاہی اپنی استطاعت کی حد تک روا نہیں رکھی۔ مفتی صاحب کی جدوجہد کا سب سے بڑا ہدف اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اسلام کا نفاذ اور اسلامی احکام و قوانین کی عملداری رہا ہے۔ انہیں زندگی میں جب بھی فیصلہ کن موقع ملا ہے انہوں نے نفاذ اسلام کے لئے اس موقع کو استعمال کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور ایک ہوشیار سیاست دان کی طرح انہوں نے موقع کی نزاکت سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ (۳۸)

اور آپ کی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے مقصد کے بارے میں مولانا ضیاء القاسمی یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

مفتی محمود کی سیاست بے دین سیاست نہیں تھی۔ ان کی سیاست پر دین غالب تھا۔ وہ سیاست کرتے وقت، سیاسی فیصلے کرتے وقت دینی مقاصد اور دینی تقاضوں کو اولیت دیتے تھے۔ ان کی سیاست برائے دین تھی۔ سیاست برائے دنیا نہیں تھی۔ ان کی پوری زندگی اس بات کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ آج ماضی کے حوالے سے جن علماء کا نام احترام سے لیا جاتا ہے ان میں مفتی محمود کا نام بھی شامل ہے۔ یہ ان کی روشن ضمیری اور بلند کردار کی وجہ سے ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے پیش نظر دینی اصولوں کو رکھا یہی بات انہیں سیاستدانوں میں ممتاز اور منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ (۳۹)

آپ کی یہی کوشش رہی کہ اسلام کو نظریہ حیات کے طور پر دستور العمل بنائے۔ اور اس کے لئے آپ زندگی بھر جدوجہد کرتے رہے۔ جس میں نہ تو آپ نے آرام کا خیال رکھا۔ اور نہ ہی کسی ڈاکٹر و حکیم کے مشورہ کو قبول کیا۔ بقول محمد یعقوب شیخ کے۔

اسلام کے نظریہ حیات پر آپ پختہ یقین رکھتے تھے۔ اس لئے ساری عمر نفاذ اسلام کے لئے کوشاں رہے۔ بڑھاپے اور بیماری میں بھی آرام و سکون کو ملحوظ نہ رکھا۔ حکیم اور ڈاکٹر بار بار آرام کا مشورہ دیتے مگر آپ نے کبھی اس مشورہ کو در خور اعتنا نہ سمجھا اور

> مسلسل جدوجہد میں مصروف رہے۔ اپنی زندگی میں ملک میں نفاذ اسلام دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے ہر حال میں اسلام کے نظریہ حیات کو اپنی قوم کا دستور العمل بنانے میں کوشاں رہے۔ اپنی زندگی ایسی پاکیزہ نظریہ حیات کے مطابق گزاری۔ (۵۰)

طرز سیاست

مولانا مفتی محمود ایک جید عالم دین اور عظیم پایہ کے مفتی و شیخ الحدیث ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ سیاسی رہنما بھی تھے۔ چونکہ آپ اپنے سیاسی نظریات کے اعتبار سے "جمعیہ علماء ہند" اور اس سے وابستہ اکابرین سے متاثر تھے۔ اور اس میدان میں انہیں کے زیر تربیت رہ کر ابتداء میں ملک کی آزادی کی جنگ لڑی تھی۔ اور آزادی کے بعد پاکستان کے استحکام، نظریہ پاکستان کے فروغ اور پاکستان میں دینی اقدار کی بالادستی اور شریعت کے نفاذ کو اپنی سیاسی سرگرمیوں کا مقصد متعین کر دیا تھا۔ اس لحاظ سے آپ سیاسی سمجھ بوجھ کے مالک اور سیاست کے میدان کے تقاضوں سے پوری طرح باخبر تھے۔ ایک مذہبی رہنما کی حیثیت سے آپ کی تمام سیاسی سرگرمیاں دین اسلام کی سربلندی اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے وقف تھیں۔ اور وہ دینی احکامات کے تحت ہوتی تھیں۔ وہ مملکت خداداد پاکستان میں ہر سطح پر دین کو فوقیت دینے کے لئے تگ و دو کرتے رہے۔ اور اس کے لئے علماء کو مدارس سے اور پیران طریقت کو خانقاہوں سے میدان عمل میں لانے کے لئے سرگرم عمل رہے۔ جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی رہے۔

مولانا مفتی محمود کا طرز سیاست اپنے اکابرین کی جدوجہد کی روشنی میں یہ تھا کہ وہ سیاست کو دین کا حصہ سمجھتے ہوئے اس میں سرگرم عمل رہتے تھے۔ علم دین کو آپ نے ہمیشہ سیاست پر ترجیح دی تھی۔ اور اس کو کبھی بھی سیاست اور سیاسی سرگرمیوں کے مقابلہ میں مغلوب نہ ہونے دیا تھا۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر لکھتے ہیں۔

> مولانا مفتی محمود کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے سیاست میں ایک انتہائی بلند مقام پانے کے باوجود سیاست کو ہمیشہ علم کا تحت رکھا اور جانا۔ اور علم کو سیاست سے کبھی بھی مغلوب نہیں ہونے دیا۔ کبھی کبھی وہ ملکی سیاست اور بے راہ رویوں پر گفتگو کرتے ہوئے رنجیدہ ہو جاتے اور ایسے مواقع پر کہتے کہ اگر میں سیاست کو دین کا حصہ نہ سمجھتے ہوئے ہوتا تو کبھی کا اس کوچے سے نکل کر مدرسہ میں جا بیٹھتا۔ (۵۱)

مفتی محمود نے سیاست کے ساتھ ساتھ دینی مدرسہ میں اپنی تعلیم و تدریس کے مشاغل کو بھی برابر جاری رکھا۔ اور اس میں سیاسی سرگرمیوں یا پارلیمنٹ میں کردار ادا کرنے کی وجہ سے کبھی اضمحلال نہ آنے دیا۔ اور یہی اکابر علماء دیوبند کا طرز رہا ہے۔ مفتی صاحب دورہ حدیث کے طلبہ کو پڑھاتے اور بھرپور انداز سے حدیث کی تدریس کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے اور طلباء کو مطمئن کرتے تھے۔ مولانا گلزار احمد مظاہری رقمطراز ہیں۔

> انھوں نے دین و سیاست اور درس و تدریس کو ایک ساتھ چلایا وہ ایک طرف پارلیمنٹ میں قومی امور پر بحث کرتے اور دوسری طرف اپنے مدرسہ میں حدیث کے طالب علموں کو بھی اپنے چشمہ علم سے سیراب کرتے۔ یہ کام معمولی نہیں غیر معمولی ہے۔ دورہ حدیث میں صرف حدیث کا ترجمہ کر کے طلباء کو مطمئن نہیں کیا جاتا بلکہ تقابل ادیان کی بحثیں ہوتی ہیں۔ اپنے مسلک کی ترجیح پر دلائل ہوتے ہیں۔ دوسرے مذاہب کے رد میں دلائل دیئے جاتے ہیں۔ پھر ان کا رد کر کے اپنے مسلک و عقیدہ کو مضبوط ثابت کیا جاتا ہے۔ طلباء کے اعتراضات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ یوں ہی ادھر ادھر کی باتوں سے تو جو ان علماء کو مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔ مفتی محمود کو قدرت نے ذہانت کا جو جوہر عطا فرمایا تھا۔ جس کے بل بوتے پر وہ ایک طرف قومی امور پر بحث کرتے اور دوسری طرف علم حدیث کے طالب علموں کی بھی تشنگی دور کرتے۔ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے بعد یہ پہلے عالم دین ہیں جنہوں نے علم و سیاست کو ایک ساتھ چلایا اور سنبھالا۔ (۵۲)

یہی وجہ تھی کہ حضرت مفتی محمود نے اپنی سیاست کے مراکز مسجد و مدرسہ کو سمجھا اور جہاں بھی جاتے مسجد ہی کو اپنی سرگرمی کا مرکز بناتے۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر کے بقول

> اس ملک میں ایک اور منفرد اعزاز بھی مفتی صاحب کو حاصل ہے اور وہ ان کی دین اور علم دین سے محبت کا آئینہ دار ہے۔ وہ اعزاز یہ ہے کہ انہوں نے سیاست کو مسجد سے دور نہیں ہونے دیا۔ بلکہ قریب لانے کا سبب بن گئے۔ ان کی اکثر میٹنگیں مساجد میں ہوتی تھیں۔ حتیٰ کہ بیشتر شہروں میں ان کا قیام بھی مسجد کے کسی حجرے ہی میں ہوتا تھا۔ اور انہیں حجروں میں وہ اجلاس بلاتے۔ ان کی صدارت کرتے۔ اور قوم کی رہبری و رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے۔ جس کے نتیجے میں رہبری اور رہنمائی کے لئے قوم کی نظریں ان کی طرف اٹھتی تھیں۔ (۵۳)

اپنے اکابرین کے طرز پر آپ کی سیاست، صاف ستھری اور نکھری ہوئی سیاست تھی۔ آپ نے اپنی سیاسی زندگی میں دوسرے سیاستدانوں کی طرح کبھی غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔ اور نہ کبھی جھوٹ بولا۔ مولانا اسفندیار صاحب کا بیان ہے۔

> یہ بات شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ مولانا مفتی محمود نے زندگی میں کسی بھی مرحلے پر غلط بیانی اور جھوٹ سے کام لیا ہو۔ حالانکہ آج کل سیاست میں اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کہ کوئی سیاستدان سچ بھی بول سکتا ہے۔ اس کی بات اور فعل کی نہ کسی مصلحت کا تابع سمجھا جاتا ہے۔ لیکن مفتی صاحب نے سیاسی جلسے ہوں یا عام نجی محفلیں ہمیشہ ہر جگہ سچ کو فوقیت دی اور کسی وقت بھی غلط بیانی کا سہارا نہیں لیا۔ بلکہ کسی کے جھوٹ بولنے پر یہ حدیث ارشاد فرماتے کہ منافق کی علامتوں میں سے ایک علامت جھوٹ بولنا ہے۔ (۵۴)

ان کی سچائی ہی کی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنے سیاسی نظریات کی نہ تو کبھی تاویل کی اور نہ ہی اس پر پشیمانی کا اظہار کیا۔ جس کو سچا اور مناسب سمجھا اس کا برملا اظہار کیا۔ اور اس پر ڈٹ گئے۔ مولانا گلزار احمد مظاہری تحریر کرتے ہیں۔

> مفتی صاحب کی عظمت کی ایک دلیل یہ بھی تھی۔ کہ انہوں نے اپنے سیاسی نظریات کی کبھی تاویل نہیں کی۔ جو کہا علم کھلا کہا۔ کسی سابقہ فیصلے یا اقدام پر انہیں کبھی پچھتاوا نہیں ہوا۔ کسی سابقہ بیان کی توجیہ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ جو بات جس وقت کی پوری ذمہ داری سے کی۔ (۵۵)

اس ضمن میں مولانا محمد تقی عثمانی صاحب آپ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

> ان کے سیاسی خط نظر اور طرز عمل سے خواہ کسی کو کتنا اختلاف رہا ہو لیکن یہ بات ناقابل انکار ہے کہ جس موقف کو انہوں نے درست اور حق سمجھا اس پر انتہائی سخت حالات میں بھی مضبوطی کے ساتھ جمے رہے۔ اور کسی قسم کا خوف یا عہدہ و منصب کا لالچ انہیں اپنے موقف سے متزلزل نہ کر سکا۔ وہ اگر چاہتے تو گزشتہ دور حکومت میں بڑے سے بڑا منصب حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن جس موقف کو انہوں نے درست سمجھا اس کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا۔ (۵۶)

مفتی صاحب نہ صرف اپنے اختیار کردہ موقف پر مضبوطی سے قائم رہتے بلکہ اپنے قوت استدلال سے اپنے مخالف کے قائل کرنے کا ہنر بھی جانتے تھے۔ اور مخالف کو آپ کے موقف کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہ رہتا۔ بقول مولانا زاہد الراشدی کے۔ "وہ اپنے موقف پر سختی کے ساتھ قائم رہتے تھے۔ اور اسکے حق میں دلائل و براہین کا انبار لگانے کے ساتھ ساتھ حالات اور جدوجہد کو اس طرح ترتیب دیتے تھے کہ مخالف کو انکے موقف کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہ رہتا"۔ (۵۷)

یہ بھی ہماری سیاست کا المیہ ہے کہ بعض دفعہ جماعتی کارکن اپنے رہنما پر اس قدر حاوی ہو جاتے ہیں کہ ان سے اپنی مرضی کے فیصلے کروا لیتے ہیں جن کی وجہ سے بعد میں جماعتی رہنما کو

وضاحتیں کرنی پڑتی ہیں۔ مفتی صاحب کا طرز سیاست کی یہ بھی ایک خصوصیت اور امتیاز تھا کہ آپ اپنے جماعتی احباب اور کارکنوں پر نہایت کنٹرول رکھتے تھے۔ مولانا گلزار احمد مظاہری لکھتے ہیں۔

> عام طور پر سیاسی اور مذہبی قائدین کے کارکن جماعتوں پر حاوی ہوتے ہیں کہ بہت سے فیصلے اپنی مرضی کے مطابق ان سے کروالیتے ہیں اور بہت سے کام کر گزرتے ہیں۔ جن پر بعد میں انہیں وضاحتیں کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ کہ فلاں کام ان کی مرضی کے بغیر ہوگیا ہے۔ جس کا انہیں علم نہیں تھا۔ مفتی صاحب کو اپنے کارکنوں پر بہت کنٹرول حاصل تھا۔ ان سے کارکن یا ملک کے بڑے اور ذمہ دار رہنما بھی اپنی مرضی سے کوئی کام نہیں کرواسکتے تھے۔ (۵۸)

مفتی صاحب سیاسی بالغ نظری کے ساتھ ساتھ "حب الوطنی" کی سیاست کرتے تھے۔ اپنے وطن اور ملک سے محبت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ آپ کی تمام تر سیاسی سرگرمیاں اپنے ملک سے محبت کے پیش نظر تھیں۔ حکمرانوں سے اختلاف بھی ایک محدود دائرے میں رہ کر کرتے تھے۔ اس سے آگے بڑھ کر "حب الوطنی" پر حرف آتا تو قدم روک لیتے تھے۔ قاری سعید الرحمن صاحب جو کہ بیرون ملک ایک سفر میں آپ کے شریک سفر رہے ہیں وہ تحریر کرتے ہیں۔

> ملکی سیاست کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سیاسی امور پر مفتی صاحب کی گہری نظر تھی۔ بیرون ملک دوروں کے دوران یہ بات محسوس ہوئی کہ مفتی صاحب کو وہاں کے حالات سے کماحقہ آگاہی ہوتی تھی۔ لیکن ان کی حب الوطنی کا کمال تھا کہ پاکستان میں حکومت سے اختلاف کے باوجود بیرون ملک اختلافی مسائل پر گفتگو نہ کرتے۔ (۵۹)

آپ کی حب الوطنی کے بارے میں جناب نوابزادہ نصر اللہ خان صاحب قمطراز ہیں۔

> ان کی سیاسی بصیرت اور حب الوطنی کا اس سے بڑا ثبوت نہیں فراہم کیا جاسکتا۔ کہ باوجود اس حقیقت کے وہ اس وقت کی مرکزی حکومت کے غیر جمہوری اقدامات کی وجہ سے دو صوبوں میں اقتدار سے محروم ہو چکے تھے۔ اور اس کی وجہ سے رنج اور تلخی کا ہونا

> بالکل فطری امر تھا۔ لیکن جب آئین سازی کا مرحلہ آیا تو ملک کو سیاسی استحکام بخشنے کے لئے اس حکومت سے بھی تعاون کرنا مناسب سمجھا۔ (۶۰)

حب الوطنی کی صفت سے موصوف ہونے کے باوجود دنیا میں کہیں بھی کسی پر ظلم ہوتا تو آپ مظلوم کی حمایت کے لئے کمربستہ رہتے۔ نسلی تعصب یا علاقائی تعصب کی بنیاد پر کسی دوسری نسل یا علاقہ کو اپنے سے کمتر سمجھنا اور ان کے ساتھ ایسا سلوک رکھنا جو نسلی تعصب پر مشتمل ہو۔ مفتی صاحب ضرور اس پر احتجاج بلند کرتے۔ اس سلسلے میں قاری سعید الرحمن، مفتی صاحب کے ساؤتھ افریقہ کے دورے کے بارے میں بتاتے ہیں۔

> ساؤتھ افریقہ میں قیام کے دوران جب انہوں نے کالے گورے کی تفریق کو اس طرح واضح انداز میں دیکھا کہ کالے نہایت کسمپرسی کے عالم میں ہیں تو بڑا دکھ ہوا اس وقت کے وزیر اعظم کو جب پاکستان کی اس عظیم شخصیت کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ ساؤتھ افریقہ میں ہیں تو اس نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ وہاں کے میزبانوں نے اس کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ لیکن جب مفتی صاحب نے ان میزبانوں کو اپنے جذبات سے آگاہ کیا۔ کہ میں اس ملاقات میں سب سے پہلے نسلی تعصب پر اور گوروں کی طرف سے کالوں پر مظالم کے بارے میں گفتگو کروں گا۔ تو وہاں کے لوگوں نے محسوس کیا کہ اگر یہ ملاقات ہوگئی تو شاید آئندہ پاکستان کے علماء کے دوروں میں مشکلات پیش آئیں چنانچہ ملاقات کا یہ پروگرام ختم کر دیا گیا۔ (۶۱)

مفتی صاحب کی سیاست اصولوں پر مبنی تھی۔ ان سے وہ سر مو انحراف گوارا نہیں کرتے تھے۔ اور اس سلسلے میں بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ وزارت علیا کا منصب چھوڑ دینا یہ صرف اصولی موقف پر آپ کے ڈٹ جانے کی وجہ سے ہوا تھا۔ آپ کا موقف یہ تھا کہ بلوچستان کی وزارت کو غیر آئینی اور غیر جمہوری طریقے سے کیوں معزول کر دیا گیا ہے۔ جب تک اس کو بحال نہیں کیا جاتا میں استعفیٰ واپس نہیں لوں گا۔ اور آپ مرکزی حکومت کے

مقابلے میں ڈٹ گئے تھے۔ اور دنیا کو بتا گئے تھے۔ کہ علماء، اقتدار اور حکمرانی کے بجوکے نہیں بلکہ اصولوں کی پاسداری بڑی بات ہے۔ اور اس کے لئے ہم ہر قربانی دینے کو تیار ہیں۔ قاری نورالحق صاحب لکھتے ہیں۔

ملک کی سیاست کی بنیاد بے اصولی پر رہی ہے سیاستدانوں نے محض اقتدار کی خاطر راتوں رات پارٹیاں چھوڑیں یا نئی پارٹیاں بنا ڈالیں اقتدار کی خاطر سالہا سال کے تعلقات کو خیرباد کہا۔ مگر اقتدار کی کرسی سے چمٹے رہے۔ ....

.... بہر حال ایک ایسے ماحول میں جہاں ضمیر فروشی اور بے اصولی کا کاروبار عروج پر ہو۔ ایک ایسا عالم سیاستدان بھی سامنے آتا ہے۔ جو ملک کے ایک اور صوبے میں جمہوری اصولوں کی پامالی دیکھ کر احتجاج کے طور پر اپنی وزارت علیا سے مستعفی ہو جاتا ہے۔ اسے بار بار منت سماجت سے استعفیٰ واپس لینے کی درخواست کی جاتی ہے۔ مگر اس کا موقف وہی ہے کہ بلوچستان کی آئینی و جمہوری وزارت کو غیر آئینی طریقے سے کیوں ختم کیا گیا ہے؟ .... کیا پاکستان کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ کہ کسی وزیر نے صرف اصول کی خاطر جمہوریت کی بقاء و احیاء کے لئے اور غیر آئینی اقدام کے خلاف اس قدر بھرپور احتجاج کیا ہو؟ وزارت ڈسمس دوسرے صوبے کی ہو اور استعفیٰ کسی اور صوبے کا وزیر اعلیٰ دے۔ (۶۲)

مفتی صاحب کی اصولی سیاست ہی کا نتیجہ تھا کہ آپ نے ہمیشہ جمہوری اداروں کے استحکام کے لئے کام کیا۔ قاری نورالحق صاحب اس سلسلے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

مولانا مفتی محمود کی سیاست صاف، شفاف اور بے داغ کردار کی حامل تھی۔ انہوں نے جمہوری اداروں کے استحکام میں بھی انہیں خطوط پر کام کیا۔ جمہوری اداروں کو محض تقریروں ہی سے استحکام نہیں بخشا بلکہ عملی طور پر اس کی سرپرستی کی۔ گویا وہ اقتدار کی کرسی پر فائز تھے۔ تب بھی انہوں نے صحیح معنوں میں جمہوری اداروں کو محض تقریروں ہی سے استحکام نہیں بخشا بلکہ عملی طور پر اس کی سرپرستی کی ....

.... گویا وہ اقتدار کی کرسی پر فائز تھے تب بھی انہوں نے صحیح معنوں میں جمہوری اداروں کی حفاظت کی۔ اختلاف رائے کو برداشت کیا۔ آزادی رائے کا احترام کیا۔ تحریر و تقریر پر کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ کوئی ٹریبونل قائم نہیں کیا۔ ڈی۔ پی۔ آر کے تحت کسی کو نظر بند نہیں کیا۔ (۶۳)

مفتی صاحب نے عام سیاستدانوں سے ہٹ کر سیاست کے میدان میں انتہائی سادگی کا مظاہرہ کیا۔ آپ کے رہن سہن کے تمام طریقے سادگی کی تصویر تھے۔ عام لوگوں سے ملاقات کے لئے ہر وقت آپ کے دروازے کھلے رہتے تھے۔ آپ کا ظاہر و باطن اور جلوت و خلوت میں یکسانیت تھی۔ آپ تکبر سے کوسوں دور رہتے تھے۔ آپ غریب پرور تھے۔ قاری سعید الرحمن صاحب رقمطراز ہیں۔

مفتی محمود نے جب سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے تو اس بلند عہدے پر ہونے کے باوجود انتہائی سادگی کا مظاہرہ کیا۔ تکبر اور رعونت آپ سے کوسوں دور تھے۔ وزارت علیا کے دوران آپ کے رہن سہن، طرز ملاقات، اسلوب معاشرت میں ذرا برابر فرق نہ آیا۔ شاید مفتی صاحب واحد وزیر اعلیٰ تھے جو اپنی سرکاری مصروفیات کے باوجود سینکڑوں افراد سے روزانہ ملاقات کرتے۔ مہمان نوازی کا بھی وہ انداز برقرار رہا جو پٹھانوں کی روایت میں شامل ہے۔ ....

سیاست میں ان کی کامیابی کے اسباب میں ان کی غریب پروری، سادگی، خلوص، عام سیاسی لیڈروں کی منافقانہ چالوں سے الگ تھلگ ہو کر ظاہر و باطن کی یکسانیت تھی۔ (۶۴)

مفتی محمود کی طرز سیاست کے بارے میں قاری نورالحق صاحب نے خوب تبصرہ کیا ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

مولانا مفتی محمود ایک مستند عالم دین، ایک باوقار اور ثقہ مفتی، دینی فرائض سے لے کر مستحبات کی ادائیگی کرنے والا انسان، موٹا جھوٹا پہننے، فیشن پرستی سے کوسوں دور، دیہات کا باشندہ اور مکمل پٹھانوں کی سی سادگی رکھنے والا آدمی، جذبی پشتی ہر قسم کے

ثقافت سے بہرہ مند شخص، میدان سیاست میں قدم رکھتا ہے تو سیاست میں پہلی بار ہیرا پھیری کی بجائے سادگی و خلوص، منافقت کی بجائے شرافت، جھوٹ اور فراڈ کی بجائے صداقت و راست بازی کو متعارف کراتا ہے۔ قول کے بجائے عمل کی تصویر پیش کرتا ہے۔ جذبات کی بجائے دلائل کی زبان سے بات کرتا ہے۔ مخالف پر آوازے کسنے، مذاق اڑانے، کردار کشی کرنے، بیہودہ الزام لگانے اور جھوٹا پروپیگنڈا کرنے کی بجائے اس کا احترام سے نام لیتے، اس کی سیاست کو واقعات و حالات کی روشنی میں غلط ثابت کرنے اور اسے چیلنج کرنے کی بجائے مذاکرات کی دعوت دیتا ہے۔ یہ عجیب سیاستدان ہے جس نے عمر بھر اپنے مخالف کو برسرِ عام گالی نہیں دی۔ جس نے شرافت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ انہوں نے کئی تحریکیں چلائیں۔ جن کی قیادت بھی کی۔ مگر مجال ہے کہ انہوں نے مجمع کو دیکھ کر نعرہ ہائے تحسین و آفرین سن کر آپے سے باہر ہو گیا ہو۔ یا کسی مخالف کے لئے کوئی گھٹیا لفظ یا لقب استعمال کیا ہو۔ (۶۵)

مفتی صاحب ایک معتدل سیاست دان تھے۔ انتہائی جذباتی ماحول میں بھی اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے کارکنوں اور عوام کے جذبات کو بھی اعتدال میں رکھتے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی نوجوان کارکنوں کے جذبات کو غلط استعمال نہیں کیا۔ بلکہ اگر ایسا موقع آیا بھی تو ایک مشفق مربی کی طرح ان کے جذبات کو ختم کرنے کی بجائے ان کو صحیح رخ پر لانے کی کوشش کی ہے۔ بقول قاری نور الحق کے۔

> اس جذباتی فضا میں مولانا مفتی محمود ایسے غیر جذباتی شخص کا وجود لیکر نئے اعتدال کی راہ پر لانا ایک معجزہ بالعقول واقعہ سے کم نہیں ہے۔ حضرت مفتی محمود صاحب ایک معتدل سیاستدان تھے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ جذبات سے عاری تھے۔ جذبات ضرور رکھتے تھے مگر ایسے جذبات جو انہیں اعتدال کی راہ سے نہ ہٹا سکیں۔ (۶۶)

مفتی صاحب کا طرزِ سیاست یہ رہا کہ آپ نے اپنی جماعت کے مشورے سے جو بھی سیاسی موقف اپنایا پھر کیسے ہی حالات پیش آئے ہوں آپ اس سے پیچھے نہیں ہٹے ہیں۔ نہ کبھی

اس سے سرمو انحراف کیا ہے۔ آپ کی حیثیت اپنے اکابرین کے خیالات و نظریات کی ترجمان تھی۔ اپنے اکابر کی مشن سے انکا وحدہ درجہ تک رہا۔ ان کے فلسفے اور ان کے طریق کار کو ہر مقام اور ہر سٹیج پر پیش فرمایا۔ اس میں آپ نہ کبھی مصلحت کا شکار ہوئے اور نہ ہی کبھی مداہنت کی۔ قاضی عبداللطیف لکھتے ہیں۔

> آپ کا کمال تھا کہ اپنا نصب العین پیش کرنے اور اپنے مشن کی تکمیل میں کبھی کوتاہی غفلت اور مداہنت سے کام نہیں لیا۔ مسجد ہو، بازار ہو، خصوصی میٹنگ ہو یا جلسہ عام، اسمبلی ہو، ایوان ہو یا حزبِ اختلاف کی مجلس، حکومت ہو یا جیل آپ کی زبان پر قال اللہ و قال الرسول کے زمزمے ہوتے۔ آپ کو یہ کمال شاید مولانا عبید اللہ سندھی کی تعلیمات اور حضرت لاہوری کی رفاقت سے میسر ہوا کہ وہ بڑے بڑے لیڈروں سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ وہ ہر ایک کے سامنے فلسفہ شاہ ولی اللہ اور شیخ الہند کے طریق کار کو بڑے فخر اور سربلندی سے پیش فرماتے تھے۔ (۶۷)

طرزِ سیاست کے اعتبار سے مفتی صاحب کی زندگی اور انکے شب و روز کی مساعی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات از خود سامنے آجاتی ہے کہ انکی تمام سیاست، سیاسی سرگرمیاں مذہب کے ماتحت ہوتی تھیں وہ دین و سیاست کے امتزاج کے نہ صرف مؤید تھے۔ بلکہ آپ نے ہمیشہ دین کو سیاست پر حاوی رکھا۔ بھارت کے مشہور صاحب علم و قلم جناب شمس تبریز خان اپنے ایک مضمون میں مفتی صاحب کے سیاسی رویے اور طرزِ سیاست کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

> مولانا مفتی محمود مرحوم کی کارناموں سے بھری زندگی ان سب لوگوں کے لئے درس عبرت و بصیرت ہے جو عصر حاضر میں اسلام کی صحیح اور موثر ترجمانی کرنا چاہتے ہیں اور اسلامی نظام کے عملی نفاذ و قیام کے لئے سرگرم عمل ہیں ان کی زندگی مدارس عربیہ کے علماء کرام اور طلبہ عزیز کے لئے خاص سبق رکھتی ہے۔ کہ انہوں نے اپنی زندگی میں دین و سیاست کا کیا خوشگوار امتزاج کر دکھایا۔ جس میں اعتدال و توازن قائم رکھنا آتش و پنبہ، شیشہ و آہن اور جام و سندان سے بیک وقت کھیلنے کا حکم رکھتا ہے۔ انہوں نے دینا

کو ہمیشہ سیاست پر حاوی و حاکم رکھا اور وہ زندگی کے ہر معاملہ میں دین و مذہب اور کتاب و سنت سے رجوع کرتے۔ صحیح دینی مزاج اور اسلام کے گہرے عرفان و شعور کے سبب ان میں وہ اولوالعزمی و عالی ہمتی، فراست و اصابت رائے اور قیادت و سیادت کے ایسے جوہر نمایاں ہوئے جو مرد مومن کی دیرینہ میراث ہیں۔ (۸۶)

علماء حق کے قافلے کے ہر راہرو کا سیاست کے میدان میں بھرپور کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تمام سرگرمیاں، تمام تگ و دو دین کی سربلندی کے لئے ہوتی ہے۔ وہ دین کو سب پر حاوی و حاکم دیکھنے کے لئے بڑی سے بڑی قربانیاں پیش کرتے ہیں۔ وہ اسلام کے نظام عبادات پر مکمل عمل کرنے والے ہوتے ہیں۔ اور اس میں ذرا بھر غفلت بھی گوارا نہیں کرتے مولانا مفتی محمود کی انہی صفات کے بارے میں جناب عبدالرشید ارشد صاحب لکھتے ہیں۔

عام طور پر قیادت کے لئے تین صفات کو لازمی قرار دیا جاتا ہے ذہانت، دیانت، استقامت لیکن اسلامی قیادت کے لئے ان تینوں سے زیادہ ضروری عبادت ہے۔ مغفور و مرحوم مفتی صاحب پہلی صفات کے ساتھ چوتھی صفت سے بھی متصف تھے۔ اور یہ چاروں صفات مفتی صاحب کی ذات میں برابر پائی جاتی تھیں۔ بلکہ ایک ایک کو علیحدہ علیحدہ دیکھتے تھے۔ تو ایک دوسرے سے بڑھی ہوئی نظر آتی تھی ....

.... اور یہ امر واقعہ ہے کہ پاکستان کی دو بڑی تحریکوں کو اس وقت کامیابی حاصل ہوئی جب ان کی قیادت ایسے مردان حق کے ہاتھ میں آئی جو مندرجہ بالا صفات کے حامل تھے۔ یہ دو تحریکیں ختم نبوت اور تحریک نظام مصطفےٰ سے یاد کی جاتی ہیں۔ (۶۹)

مولانا مفتی محمود، مشہور عالم دین اور مفتی دین متین کے باوصف آپ ایک عوامی سیاستدان تھے۔ ہمیشہ عام لوگوں میں گھرا رہنا ان کو اچھا لگتا تھا۔ جب صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ بنے تب بھی آپ کی ملاقات ہر خاص و عام کے لئے عام ہوتی تھی۔ عوام کے مسائل و مشکلات کے بارے میں سوچنا ان کے حل کے بارے میں عوام ہی سے رائے طلب کرنا اور انکے حل کی طرف

اقدام گویا آپ کی طبیعت ثانیہ تھی۔ تصنع، تکلف اور بناوٹ سے آپ کی زندگی بالکل پاک تھی۔ اور آپ ایک عوامی سیاستدان کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ مولانا محمد اکبر صاحب لکھتے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب میدان سیاست کے ایسے شاہ سوار تھے۔ جو فرنگی سیاست کو بخوبی جانتے تھے۔ وہ اس کے ہر وار کو بڑی خوب صورتی اور نہایت مدبرانہ حکمت عملی کی ڈھال کے ساتھ روکتے اور لطیف مسکراہٹ کے ساتھ اس کو ایک تو کیلا نشتر مارتے انہوں نے اپنی سیاسی روش کو پر تکلف بنانے کی بجائے عوامی بنا دیا تھا۔ (۷۰)

قاری نور الحق صاحب آپ کے طرز سیاست کے بارے میں تحریر کرتے ہیں۔

مفتی صاحب نے ہمیشہ سیاست میں خدمت کے جذبہ سے کام لیا ہے سیاست ان کا پیشہ نہیں تھا۔ یہی وہ جذبہ خدمت خلق ہے۔ جس کے بنا پر افہام و تفہیم، مذاکرات اور اجلاسوں میں شرکت کے لئے وقت اور بیماری ایسی کوئی چیز حائل یا رکاوٹ نہ بن سکی۔ (۷۱)

مفتی صاحب، سیاسی شعور رکھنے والے ایک نہایت بالغ نظر سیاستدان تھے۔ آپ جرأت، عزم و استقلال اور قوت و فراست کے مالک تھے۔ جس کی وجہ سے آپ کی شخصیت میں ایک توازن پایا جاتا تھا۔ آپ کی رائے نہایت صائب ہوتی تھی۔ کردار کی پختگی آپ میں کوٹ کوٹ بھری ہوئی تھی۔ بقول مولانا محمد اکبر کے۔

حضرت مفتی صاحب نے ساری زندگی پاکستان کے نظریاتی تحفظ کی جنگ لڑی قومی اقتدار کے فروغ، جمہوریت، جمہوری اداروں کی نشو و نما اور اسلامی نظام حیات کے نفاذ کے لئے نہایت محدود اختیارات کے باوجود جس جرأت، عزم و استقلال اور قوت و فراست سے پیش قدمی کی وہ آپ کے سیاسی شعور اور سیاسی بالغ نظری کا نتیجہ تھی۔ ان کی شخصیت میں توازن، متانت اور کردار کی پختگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ (۷۲)

مفتی محمود کا طرز سیاست وہ تھا جو انہیں اپنے اکابرین سے ورثہ میں ملا تھا۔ جن کی زیر تعلیم و تربیت رہ کر آپ نے اپنے خیالات کو جلا بخشی تھی۔ ان کے اکابرین سیاست میں بھی

شرافت، دیانت، سادگی اور اصول پرستی کے ساتھ گامزن رہے۔ اور اپنے وقت کی سیاست کو کافی زیادہ متاثر کر دیا تھا۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ان اکابرین کی ان روایات کو اور طرز سیاست کو طاق نسیان کی نذر کر دیا گیا تھا۔ مفتی صاحب نے سیاست کے میدان میں ان روایات کو پھر سے زندہ کر دیا تھا۔ مولانا زاہد الراشدی صاحب اس سلسلے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

> مفتی صاحب مرحوم کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے پاکستان کی سیاست میں جو ایک عرصہ سے سادگی، اصول پرستی، شرافت اور دیانت سے ناآشنا ہو چکی تھی۔ انہیں سنہری اصولوں کو اپنی سیاست کی بنیاد بنایا اور پھر ان کو اس وضع سے نبھایا کہ حق پرستی کی روایات ایک بار پھر سے وجود سے مشرف ہو کر تاریخ کے ماتھے کا جھومر بنیں۔ (۷۳)

آپ نے ایک دفعہ اپنے رفقاء کار کے مشورے سے جو بھی موقف قائم کیا۔ پھر اسی پر نہ صرف سختی سے کاربند رہے بلکہ اس کو منوانے کے لئے اپنی تمام قوت صرف کر دی۔ پھر ایسا ہوا کہ وہ خود تو قومی سیاست کے دھارے میں جذب نہ ہوئے۔ اس دھارے کو اپنے عزائم و پروگرام کی طرف موڑنے کی کوشش کی۔ اور بہت دفعہ اس میں آپ کامیاب بھی رہے۔ مولانا زاہد الراشدی لکھتے ہیں۔

> مرحوم نے قومی سیاست کے دھارے میں شامل ہو کر خود کو اس میں جذب نہیں کر دیا۔ بلکہ وہ اس دھارے کو اپنے عزائم و مقاصد کی طرف موڑنے میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ اور اگر آپ آج سے پچیس سال قبل کی قومی سیاست کا آج کی قومی سیاست سے موازنہ کریںگے تو آپ کو ان نمایاں تبدیلیوں کے پس منظر میں مولانا مفتی محمود اور ان کے رفقاء کی جدوجہد جھلکتی ہوئی نظر آئے گی۔ مفتی صاحب مرحوم کی جدوجہد کا سب سے تابناک پہلو یہ ہے کہ انہوں نے جو رائے قائم کی سوچ سمجھ کر قائم کی پھر اس پر نہ صرف پوری استقامت کے ساتھ پختہ رہے بلکہ بالآخر اسے منوا کر دم لیا۔ (۷۴)

مفتی صاحب اپنے سیاسی خیالات میں انتہائی وسیع الظرف واقع ہوئے تھے۔ وہ وسعت نظری اور رواداری کے قائل تھے۔ وہ مسلمانوں میں مذہب و مسلک کے اعتبار سے منافقت سے کوسوں دور تھے۔ قاری نور الحق قریشی کے بقول۔

> وہ اپنے مذہبی و سیاسی خیالات میں کسی تعصب، تنگ نظری اور محدود سوچ کے قائل نہیں تھے۔ مذہبی نظریات کے لحاظ سے وہ ایشیاء کی عظیم دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے خوشہ چینوں میں سے تھے مگر باین ہمہ وہ کسی دوسرے مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے کو برا بھلا نہیں کہتے تھے۔ اور نہ ہی فتویٰ بازی کی آڑ میں کسی کو مطعون کرتے تھے۔ وہ نہایت حوصلہ مندی، تدبر، رواداری اور متانت سے گفتگو کے عادی تھے۔ وہ مسلمانوں میں مروجہ منافقت سے کوسوں دور تھے۔ ....
>
> .... سیاسی محاذ پر بھی مفتی صاحب نے کسی کو سیاسی مخالفت کی وجہ سے ملک دشمنی، وطن دشمنی اور اسلام دشمنی کے طعنے نہیں دیئے۔ (۷۵)

مفتی صاحب عوامی سیاستدان تھے۔ آپ ایک خاص طبقہ کی بجائے عوام کی سیاست کرتے تھے۔ عوام کے مسائل کے حل کرنے میں پیش پیش رہتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ آپ کو "بائیں بازو" کا حامی خیال کیا جاتا تھا۔ جناب حمزہ ایم۔ اے صاحب لکھتے ہیں۔

> بعض لیڈران سیاسی و مذہبی مسائل کا ذکر کرتے وقت ملک کی عام آبادی کے مسائل کو بالکل نظر انداز کرتے ہیں یا ذکر کرنا گوارا نہیں کرتے۔ لیکن مفتی صاحب اپنی نجی مجالس یا تقاریر میں غریبوں اور ملک کی عام آبادی کے مسائل زیر بحث لاتے اور ان کے مسائل کے حل پر زور دیتے۔ اسی وجہ سے ملکی سیاست میں انہیں بائیں بازو کا حامی تصور کیا جاتا تھا۔ (۷۶)

بلکہ اسی عوامی سیاست اور مزدوروں، کسانوں کے مسائل کے حل پر زور دینے کی وجہ سے آپ کو "سوشلسٹ عالم" کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ اور اس میں پیش پیش وہ جاگیردار، سرمایہ دار اور ان کے حامی علماء تھے۔ جو مزدوروں، کسانوں کو ان کے حقوق سے محروم رکھنے کے لئے

طرح طرح کے حربے استعمال کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۰ء کے الیکشن کی فضا کچھ ایسی بنی کہ ان محروم طبقات میں کافی بیداری پیدا ہوئی تھی۔ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے اس کو اپنے حق میں نقصان دہ خیال کیا تھا۔ پھر انہوں نے بعض علماء کی خدمات حاصل کی تھیں۔ جنہوں نے ایک فتویٰ جاری کیا تھا۔ جس پر ایک سو تیرہ علماء کے دستخط تھے۔ لیکن مفتی صاحب نے اس فتویٰ کو مسترد کر دیا تھا۔ مفتی محمود کے اس فتویٰ کے استرداد کا وہ اثر ہوا کہ پھر کسی طبقے نے ان کے اس فتویٰ کو پذیرائی نہیں بخشی اور وہ فتویٰ اپنی ہی موت آپ مر گیا۔ اس سلسلے میں قاری نور الحق کہتے ہیں۔

> اسلامی سوشلزم کی اصطلاح کے بارے میں ان کا موقف یہ تھا کہ جو لوگ اقتصادی نظریات کی حد تک سوشلزم کا لفظ استعمال کرتے ہیں انہیں کافر نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ ۱۹۷۰ء میں جب ایک سو تیرہ مفتیوں کا فتویٰ کفر شائع ہوا تھا۔ مفتی صاحب نے اس کفر کے فتویٰ پر دستخط نہیں کئے تھے۔ بلکہ اس فتویٰ کو سیاسی فتویٰ قرار دیا۔ جس سے ملک کے پسے ہوئے طبقے یعنی مزدوروں اور کسانوں کی نگاہ میں مفتی صاحب کے بارے میں بڑا احترام پیدا ہوا۔ وہ ملک میں واحد عالم دین تھے۔ جنہیں لاکھوں اور کروڑوں غریبوں کی حمایت اور دعا حاصل تھی۔ انہوں نے جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ سیاست کے خلاف بھرپور کام کیا۔ اور مزدوروں کے محاذ پر اس قدر کام کیا۔ کہ جاگیردارانہ ذہنیت رکھنے والے بعض اسلام پسند قسم کے علماء مفتی صاحب اور مولانا غلام غوث ہزاروی کو سوشلسٹ علماء کے نام سے یاد کرنے لگے۔ (۷۷)

مفتی صاحب کا طرز سیاست اپنے اکابر علماء دیوبند کی سیاست کا آئینہ دار ہے۔ وہ نہ کسی جابر کے سامنے جھکتے ہیں۔ اور نہ کبھی اپنے ضمیر کا سودا کیا ہے وہ ہمیشہ کلمہ حق کہتے تھے۔ وہ کبھی بھی اپنے مقصد سے نہیں ہٹے اور نہ ان کو ہٹایا جا سکا تھا۔ وہ پاکستان میں اسلامی کے نفاذ کے زبردست داعی تھے۔ اور انہوں نے عوام کو یہ شعور بخشا تھا کہ وہ اس مقصد کی خاطر ہر قربانی کے لئے تیار

رہنا ہے اور یہ حق اگر انہیں زبردستی لینا پڑے تو اس سے بھی گریز نہ کیا جائے۔ مولانا غلام اکبر ملیانی تحریر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ مفتی صاحب نے مجھے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

> مولانا غلام اکبر! ہم ایسے لوگ نہیں ہیں کہ کسی کے سامنے جھکیں یا کسی لالچ میں آ جائیں یا کسی کے ہاتھوں استعمال ہوں یا اپنے ضمیر کو بیچ دیں۔ ہم نے جابر حکمرانوں کے سامنے کلمہ حق کہا ہے اور جب ہمیں مجبور کیا گیا کہ ہم ان کی ہر بات پر لبیک کہیں اور دست ماتحت وزارتیں اور عہدے حاصل کریں۔ تو ہم نے ان کا یہ کہنا ماننے سے انکار کر دیا حتی کہ صوبہ سرحد کی وزارت علیا کو چھوڑ کر ثابت کر دیا کہ ہم باضمیر ہیں اور کسی کے ناجائز دباؤ میں ہرگز آنے والے نہیں اور نہ ہی ہمیں اقتدار کی ضرورت ہے۔ وہ ایک ایسی شخصیت تھی جنہوں نے حالات کا رخ بدل دیا اور اس درویش منش انسان نے اپنے فقر کو بادشاہت پر ترجیح دی۔
>
> نہ تاج و تخت میں نہ لشکر و سپاہ میں ہے
> جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے
>
> ایک دن ہم دونوں اکٹھے بیٹھے تھے فرمانے لگے۔
>
> غلام اکبر! دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے لیکن میں اپنا مشن چھوڑنے کے لئے قطعاً تیار نہیں ہوں۔ میں آخر وقت تک اسلام کی سربلندی کے لئے کوشاں رہوں گا۔ اور اسلام کی راہ میں اپنی زندگی گزار دوں گا۔ کبھی کبھی وہ فرمایا کرتے تھے کہ قوم کو ہم نے یہ بات سمجھا دی ہے کہ یہ ملک اسلام کے نام پر معرض وجود میں آیا ہے اور اس ملک میں اسلام کے سوا کچھ اور نہیں پنپ سکتا۔ اور یہ بھی قوم کو سمجھا دیا ہے۔ کہ اپنے حق کے لئے خود کوشش کرو۔ یہاں تک کہ غاصب سے اپنا حق زبردستی واپس لے لو۔ اور نتیجہ سے بے پرواہ ہو کر لڑو۔ کیونکہ مستقبل پردہ غیب میں مستور ہے۔ (۷۸)

مولانا مفتی محمود نے اپنے اکابرین کے طرز سیاست کے مطابق سیاست کے میدان میں حصہ لیا تھا۔ حالات کے مطابق انہوں نے سیاست میں نہایت مثبت اثرات مرتب کئے تھے۔ اور اس سلسلے میں قائدانہ کردار ادا کیا تھا۔ مفتی صاحب کی شخصیت آپ کے اعلیٰ کردار اور آپ کے

طرز سیاست کے اثرات جو پاکستانی سیاست پر مرتب ہوئے۔ اس میں علماء کا سیاست میں حصہ لینا اور اس میں غالب حیثیت سے کردار ادا کرنا ہے۔ آپ کی وفات پر روزنامہ "جسارت" کراچی نے مورخہ ۱۶ را کتوبر ۱۹۸۰ء کو فکر انگیز اداریہ لکھا تھا اس میں ہے۔

اپنے عہد وزارت میں انہوں نے قرون اولیٰ کے مسلمان حکمرانوں کی سی درویشانہ شان کا مظاہرہ کیا۔ اپنی مجموعی سیاسی زندگی میں انہوں نے ایک چیز بہت واضح طور پر ثابت کی کہ قدیم اسلامی طرز کی درسگاہوں کے فارغ التحصیل علماء جدید دنیا کی انتہائی شاطرانہ جمہوری فضا میں حزب اختلاف کے پلیٹ فارم سے یا ایوان حکومت کے اندر ہوشمندانہ اور دیانتدارانہ سیاست چلانے کی پوری اہلیت وصلاحیت رکھتے ہیں۔ مولانا مفتی محمود کی شخصیت کے ساتھ علماء پاکستان میں پہلی بار سیاسی تحریکات پر غالب آئے اور ان کی موجودگی نے سیاست کے انداز، اطوار، اور نعرے بدل ڈالے اور پھر ان ہی کی قیادت میں برصغیر کی ۸۰ سالہ جدید تاریخ کی سب سے زیادہ پرجوش اور ولولہ انگیز تحریک "تحریک نظام مصطفےٰ" چلی۔ (۷۹)

آپ نے ایثار و خلوص، سچائی اور ایمانداری، عزم و ثبات، جرأت واستقامت کے ساتھ اسلامی طرز حیات کی بالادستی کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ اور پاکستان کی سیاست پر نہایت دیرپا اور مثبت اثرات چھوڑے اس لئے آج بھی ان کو عزت واحترام سے نہ صرف یاد کیا جاتا ہے۔ بلکہ ان کے بے لوثی، دور اندیشی اور معاملہ فہمی کے صفات کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ بھارت کے مشہور عالم، ادیب اور تجزیہ نگار جناب شمس تبریز خان لکھتے ہیں۔

انہوں نے سیاست وحکومت میں مذہب واخلاق، ایثار وخلوص، سچائی اور ایمانداری کو از سر نو رواج دینے کی کوشش مرتے دم تک جاری رکھی۔ پاکستان میں اسلامی جمہوریت کی بحالی ان کی سیاست کا طغرائے امتیاز تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے گزشتہ اور موجودہ حکومتوں میں اپنی سرگرم اور یادگار خدمات سے دریغ نہیں کیا۔ اور اپنے اس نیک مقصد اور کار خیر کے لئے خلوص وایثار کے ہر معیار پر پورے اترے۔ ان کی

مومنانہ عزم وثبات اور جرأت واستقامت کو کوئی تحریص وترغیب اور تہدید وتخویف متزلزل نہ کر سکی۔ حکومت اور حزب اختلاف کی ہر سطح سے انہوں نے کلمۂ حق بلند رکھا اور حاکمیت ومحکومیت کے ہر دور میں انہوں اسلامی طرز حیات، طریقہ کار اور نظریہ حکومت وسیاست کی بالادستی کے لئے مخلصانہ مساعی جاری رکھیں۔ ان کی اس ناقابل فراموش، ولولہ آفرین، تاریخی اور تاریخ ساز خدمات کے پیش نظر بعض پاکستانی احباب کا یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ "مولانا مرحوم کی وفات سے چودھویں صدی ہجری کا آخری چراغ گل ہو گیا"۔

آگے چل کر جناب شمس تبریز خان لکھتے ہیں۔

معاملہ فہمی، دور اندیشی اور تحریکی ذہن کے سبب سیاسیات سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ مگر یہ دلچسپی کسی مادی غرض پر نہیں بلکہ ملی مصالح اور بے غرضی پر مبنی تھی۔ (۸۰)

آپ نے سیاست میں جس طرز کی بنیاد رکھی تھی۔ وہ اخلاقیات پر مبنی تھی۔ ان کی کوشش رہی تھی اور سیاسی پلیٹ فارم کو بھی اس کے لئے استعمال کرتے رہے کہ ملک سے بے حیائی، فحاشی، عریانی وغیرہ بد اخلاقیوں کا خاتمہ ہو وہ ملک کے نوجوانوں میں مردانہ صفات اور بہادرانہ جذبات کی تشکیل اسلامی اقدار اور تقاضوں کے مطابق چاہتے تھے۔ وہ نسلی اور صوبائی تعصب کے بھی سخت خلاف تھے۔ مولانا اسفندیار یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

آپ ملک میں بے حیائی، عریانی، فحاشی، رقص وسرود، شراب نوشی، زناکاری اور تمام مخرب اخلاق امور کو خلاف قانون دینے کے لئے اسی طرح جدوجہد کرتے تھے۔ جیسے ایک پیر کامل اپنے حلقۂ ارادت میں اپنے معتقدین ومتوسلین کے تزکیہ نفس کی کوشش کرتا ہے۔ ملک کے نوجوانوں میں مردانہ صفات، بہادرانہ جذبات اور اعلیٰ اسلامی اقدار پیدا کرنے کے لئے ہمیشہ فکر مند رہتے۔ صوبائی اور نسلی تعصب کو ایک عظیم مصلح کی طرح ختم کرنے کی کوشش فرماتے تھے۔ مفتی محمود کی

سیاست کی بنیاد دین پر تھی۔ سیاست میں جو بعد پیدا ہو گیا تھا حضرت مفتی صاحب کے مساعی سے ختم ہو گیا۔ (۸۱)

اس سلسلے میں آپ کے طرز سیاست کے بارے میں مولانا محمد اکبر صاحب لکھتے ہیں۔

ان کا طرز سیاست، حضرت مدنیؒ کی طرح معتدل تھا۔ مفتی صاحب کی ساری زندگی کی مساعی جمیلہ میں دین اور سیاست ہم سفر اور قدم بقدم رہے۔ اور ایک حق پرست سیاستدان اور عارفانہ رنگ لئے ہوئے تھے۔ دین کے بغیر سیاست کو چنگیزیت تصور کرتے تھے۔ آپ نے بحر سیاست میں اپنی کشتی کی تختہ بندی کر لی تھی مگر اپنے بے داغ سیاسی کردار کو آلودہ نہیں ہونے دیا۔ جو ایک جینئس (Genious) شخصیت کی خصوصیات میں سے ہے۔ .... نے اس سیاسی احوال سے کبھی گٹھ جوڑ نہیں کیا جو دین کی نفرت کا باعث بنتے تھے۔ انہوں نے سیاست کو کاروبار نہیں بنایا ہمیشہ غیر متزلزل ایمان کے مالک رہے۔ (۸۲)

مولانا محمد اکبر صاحب نے مفتی صاحب کے طرز سیاست کے بارے میں اس سے پہلے کچھ یوں اظہار خیال کیا ہے۔

وہ عمومی اور بین الاقوامی سیاسیات میں ذی اثر خصوصیات کے حامل تھے۔ سیاسی معاملات میں ان کی ایک نکھری ہوئی رائے ہوتی تھی تاہم اس کے ساتھ ساتھ مذہب اور دینی معاملات میں نہایت پختہ اور متصلب تھے۔ ان کے ہاں کچھ ضابطے اور حدود مقرر تھے۔ جن پر سختی سے کاربند رہتے۔ (۸۳)

سیاسی جماعتوں کے اتحاد میں آپ کا کلیدی کردار

مولانا مفتی محمود ہمیشہ اپنے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے "اتحاد بین المسلمین" کے داعی رہے۔ اور وہ اتحاد ہی کو منزل کے حصول کے لئے سب سے زیادہ موثر ذریعہ سمجھتے رہے۔

دین و مذہب کے بنیادی مطالبات کے لئے انہوں نے ہمیشہ دینی جماعتوں اور مذہبی تنظیموں کو اتحاد کی دعوت دی ہے۔ اور ان کی کوشش رہتی تھی کہ آپس کے اختلافات کو فراموش کر کے اعلیٰ مقاصد کے لئے ان کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے ان کو یکمشت کر دیا جائے۔ اور مقابل قوتوں کو شکست سے دوچار کر دیا جائے۔

آپ کی دینی و مذہبی جماعتوں اور تنظیموں کو اتحاد کی لڑی میں پرونے کے بارے میں آپ کی خدمات کا تذکرہ آپ کی دینی خدمات کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ یہاں یہ کوشش کی جائے گی کہ آپ نے سیاسی جماعتوں اور تنظیموں کو قریب لانے کے سلسلے میں جو خدمات انجام دی ہیں۔ ان سے بحث کی جائے۔

مولانا مفتی محمود ایک نہایت وسیع الظرف اور وسیع النظر شخصیت کے مالک تھے۔ آپ نے سیاسی معاملات میں کبھی بھی تنگ نظری او تعصب سے کام نہیں لیا ہے۔ بلکہ آپ اپنے ساتھ دیگر سیاسی قوتوں کو بھی ملانے کی سعی فرماتے رہے ہیں۔ ملک میں جب بھی اہم مسئلہ اور حالات پیش آتے تو تمام سیاسی جماعتوں اور قوتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لئے جو آواز سب سے پہلے اٹھتی وہ انہی کی ہوتی تھی۔

قیام پاکستان سے پہلے "مجلس احرار اسلام" کے مرکزی رہنما اور قیام پاکستان کے بعد اپنی سیاسی زندگی میں سب سے زیادہ حزب اختلاف کے پلیٹ فارم سے کردار ادا کرنے والے اور "بابائے جمہوریت" کا خطاب پانے والے جناب نوابزادہ نصر اللہ خان صاحب، مفتی صاحب کے اتحاد کے لئے کوششیں صرف کرنے کے بارے میں ان کو ان الفاظ سے خراج تحسین پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

جس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے وہ یہ کہ مسلمانوں کے جتنے بھی مکاتب فکر ہیں انہیں متحد کرنے کے لئے جس وسعت قلب اور وسعت نظر کی ضرورت ہے وہ مفتی

صاحب میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ انہوں نے ہمیشہ تعصبات سے بلند ہو کر اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی جیسا کہ ختم نبوت کی تحریک کے دوران ہوا۔ اسی طرح مختلف سیاسی جماعتوں کو بنیادی اقدار پر متحد کرنے کے لئے بھی مفتی صاحب جتنی سعی و جہد کر سکتے تھے۔ انہوں نے اس میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ (۸۴)

قاری نور الحق قریشی صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "مولانا مفتی محمود کی سیاست میں ایک پہلو یہ بھی سامنے آتا ہے کہ وہ جمہوریت، رواداری اور ملک کے سنگین مسائل کے حل کے لئے مذاکرات اور گفت و شنید پر یقین رکھتے تھے"۔ (۸۵)

مفتی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے جو فہم و فراست، فضل و بصیرت اور سیاسی فہم سے نوازا تھا۔ انہوں نے اس سے کما حقہ فائدہ حاصل کیا۔ اور انہیں اوصاف سے کام لیکر آپ نے اپنی قیادت میں متضاد نظریات کی حامل افراد و جماعتوں کو یکجا کیا۔ اور ان کی قوت میں کئی گنا اضافہ کر کے ان کی اجتماعی صلاحیتوں کو اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے نہایت خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا۔ مولانا تاج محمود صاحب لکھتے ہیں۔

ملک اور قوم کو جبر و بربریت سے بچانے کے لئے قوم کے مختلف طبقے، مختلف نظریات کی حامل جماعتوں کے رہنما، دینی اداروں کے سربراہ، مساجد کے ائمہ، یونیورسٹیوں کے طلباء، مارکیٹوں کے تاجر، ٹریڈ یونین کے نمائندے اور ملی محاذ پر کام کرنے والے متعدد اداروں کے رضاکار ان ان کی قیادت میں اکٹھے ہو گئے۔ ملک کی تاریخ میں اس قدر وسیع اتحاد اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا اور اسی طرح قیام پاکستان کے بعد کسی قومی رہنما کی قیادت میں اتنے انسان اسلامی نظام کے نفاذ کی جنگ لڑنے کے لئے یکجا نہیں ہوئے۔ علاوہ ازیں یہ ہمارے دور کی واحد مثال ہے کہ اس قدر متضاد نظریات کے حامل افراد کو متحد و مطمئن رکھتے ہوئے آخر دم تک ان سے کام لیا گیا۔ ان کی صلاحیتوں کو ایک اعلیٰ مقصد کے لئے انتہائی خوبصورت طریقے سے استعمال کیا گیا۔ اگر یہ اعزاز ہے تو یہ اعزاز

مفتی محمود کو مل چکا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ مفتی محمود اپنی خداداد صلاحیت و بصیرت کے لحاظ سے اس ملک میں کم از کم اس اعزاز کے مستحق تھے۔ (۸۶)

مولانا گلزار احمد مظاہری نے لکھا ہے کہ مفتی محمود کی قیادت میں قومی اتحاد کی صورت میں تمام مذہبی اور سیاسی جماعتوں کی اتحاد کا یہ واقعہ ہے۔ کہ تمام سیاسی قیادت کے ساتھ ساتھ مذہبی جماعتوں کے رہنماؤں کا ایک عالم کی قیادت میں متحد ہو کر کام کرنا ایک واحد مثال ہے۔ اس سے پہلے بھی اتحاد ہوتے رہے مگر وہ علماء غیر عالم کی قیادت میں متحد ہوتے تھے۔ یہ علماء کا ایک عالم کی قیادت کو تسلیم کرنے کی منفرد مثال ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں۔

مفتی صاحب کی بعض خصوصیات سے نہ صرف متاثر بلکہ مرعوب بھی تھا۔ ان خصوصیات میں سب سے پہلی اور سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس سے قبل ہمارے جتنے اتحاد ہوئے ان کا محور ہمیشہ ہی کوئی غیر عالم رہا ہے کسی عالم دین کی قیادت میں کبھی بھی کوئی بڑا اور قابل ذکر اتحاد نہیں ہوا۔ علماء ہمیشہ کسی نہ کسی غیر عالم کی قیادت میں جمع ہوئے اور کام کیا .... بلکہ تاریخ کے بعض ادوار میں ایسے وسیع تر اتحاد کی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ نہ صرف مسلم فرقوں کے درمیان اتحاد کی بات ہوئی بلکہ اس سے بڑھ کر غیر مسلم قوموں کے ساتھ بھی اتحاد کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اور اس سے "فلسفہ اتحاد ادیان" سامنے آیا لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ علماء نے کسی عالم دین کی قیادت میں جمع ہو کر کوئی تحریک چلائی یا تحریک میں حصہ لیا ہو۔ ہماری تاریخ کا یہ منفرد واقعہ مفتی محمود کے دور میں وقوع پذیر ہوا اور چشم فلک نے بھی پہلی بار یہ منظر دیکھا کہ تمام مذہبی اور سیاسی جماعتوں کے زعماء ایک عالم دین کی قیادت میں جمع ہو کر عہد حاضر کی سب سے بڑی آمریت کے خلاف سینہ سپر ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد یہ پہلا واقعہ تھا کہ تمام شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو گئے۔ تمام جماعتوں نے اتحاد کیا اور اس اتحاد کا قائد مفتی محمود کو بنایا گیا۔ (۸۷)

مفتی محمود اتحاد کے معاملے میں بہت ہی فراخ دل واقع ہوئے تھے۔ کیونکہ ان کے سامنے جو اعلیٰ مقاصد تھے وہ بغیر اتحاد کے حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ اور نہ ان تک پہنچا جا سکتا تھا اس لئے بعض دفعہ ان کو اپنے احباب کو بھی ناراض کرنا پڑا مگر انہوں نے اس کی بھی کوئی پرواہ نہیں کی۔ آپ کی اتحاد کے بارے فراخ دلی کے بارے میں مولانا انور الہدیٰ لکھتے ہیں۔

ایک بار کسی محفل میں کسی نے (مفتی صاحب سے) پوچھا کہ ملک میں فقہ حنفی نافذ ہو یا فقہ جعفری؟ آپ نے سوال کرنے والے کی طرف دیکھا اور کہا افسوس کی بات ہے کہ تم لوگ تیس سال تک انگریزی نظام کے تحت چپ رہے اب جب ذرا کچھ اسلامی نظام کی امید ہوئی ہے تو فقہ حنفیہ اور فقہ جعفریہ پر لڑائی کر رہے ہو۔ فقہ حنفی ہو یا فقہ جعفریہ کم از کم اس نظام سے تو بہتر ہو گا۔ جو اس وقت انگریزی اور بے دینی نظام کی صورت میں یہاں رائج ہے اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ سب لوگ اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے متحد ہو جائیں۔ مولانا مفتی محمود اتحاد کے معاملے میں خاصے فراخ دل واقع ہوئے تھے۔ اور اس معاملے میں انہوں نے بعض دفعہ اپنے احباب کی ناراضگی کی بھی پرواہ نہیں کی۔ (۸۸)

تحریک قومی اتحاد کی بھرپور قیادت کے بعد جب بھٹو حکومت کے ساتھ آپ کی سربراہی میں مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا۔ مذاکرات آخری مرحلے میں تھے۔ کہ اس وقت کے بری افواج کے سربراہ جناب ضیاء الحق نے فوج کی حمایت و تعاون سے ملک کی باگ ڈور سنبھالی۔ اور حالات نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔ ان حالات میں بعض سیاسی جماعتوں نے قومی اتحاد سے علیحدگی اختیار کر لی تو ان حالات سے اور خاص کر بعض سیاسی رہنماؤں کی اس عظیم اتحاد سے علیحدگی نے آپ کو بہت رنجیدہ کر لیا۔ آپ فرماتے تھے۔ کہ "قوم نے ہم پر اتحاد کی وجہ سے اعتماد کیا تھا۔ تسبیح کے بکھرے ہوئے دانوں کی طرح سیاسی جماعتوں کا الگ الگ کام کرنا، قوم کے اعتماد اور اتحاد کو ٹھیس پہنچائے گا۔ اور قوم ایسے لوگوں کو کبھی بھی معاف نہیں کرے گی۔ (۸۹)

علماء کی سیاسی بیداری میں آپ کا بنیادی کردار

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں علماء کرام کا بہت واضح اور جاندار کردار رہا ہے۔ یہاں پاتھن مسلمان حکمرانوں کے ساتھ بہت سے علماء و مصلحین آئے ہیں۔ اور یہاں دینی علوم کی اشاعت اور عوام کی اصلاح میں کارہائے نمایاں انجام دے چکے ہیں۔ مسلمان حکمرانوں کے دربار میں ان کو عزت و وقار کا مقام حاصل تھا۔ تمام دینی شعبہ جات خصوصاً شعبہ قضا انہیں کے سپرد ہوتا تھا۔ اور اس سلسلے میں ان کی رائے، مشورہ، تجویز کو فوقیت حاصل ہوتی تھی۔ درس و تدریس، افتاء اور مساجد کی امامت کے عوض حکومت کی طرف سے ان کے وظائف مقرر ہوتے تھے۔ معاشرہ میں بھی ان کو نہایت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ عوام الناس روزمرہ کے مسائل و مشکلات میں انہیں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ چنانچہ ان کو ایک اعتماد حاصل تھا۔

انگریز کے یہاں آنے کے بعد آہستہ آہستہ علماء کرام کی حیثیت کو ختم کرنے کی کوششیں شروع کر دی گئی تھیں۔ ان کو بدنام کرنے کے لئے طرح طرح حربے استعمال کئے گئے تھے۔ ان کو عوام کی نظروں سے گرانے کے لئے غلط پروپیگنڈا کیا گیا۔ ان کی طرف غلط نسبتیں کی گئیں۔ دینی علوم کے حصول کے مقابلہ میں عصری علوم کی ترغیب شروع کر دی گئی۔ علماء اور مذہبی رہنماؤں کو بدنام کرنے اور ان کی حقارت کے لئے روزمرہ محاورات کو عام کر دیا گیا۔ اور عام لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات ڈال دی گئی کہ یہ طبقہ کسی کام کا نہیں ہے۔ بلکہ یہ معاشرہ کے ناتواں کندھوں پر ایک معاشی بوجھ ہے۔ خاص کر حکومتی ذمہ داریوں کی یہ بالکل صلاحیت و اہلیت نہیں رکھتا اور یہ اس قابل نہیں ہے کہ وہ عوام کے مسائل و مشکلات کے حل کرنے میں کوئی کردار ادا کر سکیں۔ اور اس کے لئے خاص اس طبقہ کو استعمال کیا گیا جو انگریز نے اپنے مراعات سے نواب،

سر، خان، خوانین اور مختلف خطابات دیکر پیدا کیا تھا۔ اور جس نے اس سلسلے میں "شاہ سے زیادہ شاہ کے وفاداروں" کا کردار ادا کیا تھا۔

ان حالات میں بھی علماء حق کا قافلہ اپنے فرائض سے کبھی غافل نہیں رہا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نام لیواؤں اور حضرت شاہ ولی اللہ کے پیروکاروں نے جان و مال کی قربانیوں سے تاریخ آزادی کی کتاب میں روشن باب کا اضافہ کیا ہے۔ حضرت سیّد احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید اور اس قافلہ حریت کے دیگر اکابرین و قائدین سے ہوتا ہوا دارالعلوم دیوبند کے بانیان اور وابستگان نے قافلہ حق کی قیادت سنبھالی ہے۔ اور دینی و مذہبی علوم و روایات اور اسلامی ثقافت کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ملک سے انگریزوں کے انخلاء کے لئے ایک طویل جدوجہد کا نہ صرف اک حصہ بنے ہیں بلکہ اس میدان میں قربانیوں کی عظیم روایات قائم کی ہیں۔ اور یہ انہی آزادی کے متوالوں کی قربانیوں، قید و بند کی صعوبتوں اور جائیدادوں کی ضبطگی کی صورت میں نقصانات گوارا کرنے کا نتیجہ تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے انگریز کی غلامی سے برصغیر پاک و ہند کو آزادی کی نعمت سے سرفراز کیا۔ آزادی کا سورج طلوع ہوا۔ اور مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن کا حصول ممکن ہو گیا۔ جس کو پاکستان کا نام دیا گیا۔ اس ملک کے حصول کے پیچھے بھی ایک طویل جدوجہد کی داستان ہے۔ اس کے لئے ایک تحریک چلی تھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے قائداعظم محمد علی جناح اور دیگر عظیم مسلمان رہنماؤں کی قیادت میں یہ ملک منصہ شہود پر آیا ہے۔ تحریک پاکستان کے لئے مسلمان قوم کو جس نعرہ پر متحد کیا گیا تھا۔ وہ نعرہ یہ تھا کہ "پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ" جس کا واضح مقصد یہ تھا کہ اس ملک میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت ہو گی۔ قرآن و سنت کو بالادستی ہو گی اور ملک کے اقتدار سے لیکر عام افراد کی زندگیوں تک میں شریعت اسلامیہ کی کارفرمائی ہو گی۔ اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات و ارشادات کے مطابق قوم کی

حکمرانی کے اصول طے ہوں گے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں شرعی احکامات کو اولیت و فوقیت حاصل ہو گی۔ لیکن ہائے افسوس ایسا نہ ہو سکا۔

مسلمانوں کی تمام امیدوں کا خون کر دیا گیا۔ دین و شریعت کو مذاق بنا دیا گیا۔ نظام حکومت سے لیکر نظام معیشت، نظام تعلیم، نظام عدالت میں دینی احکامات کو اجنبی بنا دیا گیا۔ اور ان نظام ہائے زندگی کو انگریز کے چھوڑے ہوئے ورثہ کے طور پر سینہ سے لگایا گیا۔ جو غلاموں کے لئے بنائے گئے تھے۔ آزادی کے بعد بھی وہی غلاموں کے لئے بنائے گئے نظام ہائے زندگی کو جاری و ساری کر دیا گیا۔ اگر کہیں شریعت کی بالادستی کی بات اٹھتی یا اس کا مطالبہ کیا جاتا۔ تو اس کو درخور اعتناء نہ سمجھا جاتا۔ اور ان آواز اٹھانے والوں کی آواز کو دبا دیا جاتا۔ ان پر پہرے بٹھا دیئے جاتے۔

علماء کرام اور مدارس کے بارے میں انگریز نے جو ذہن بنایا تھا۔ پاکستان کی مقتدر قوتیں بھی انہیں خیالات کی حامل تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ علماء ایک قوت بنیں۔ اور ان کو عوام میں پذیرائی حاصل ہو۔ ادھر علماء و دینی طبقات اسی انتظار میں تھے۔ کہ پاکستان کے اقتدار پر قابض قوتوں کو موقع فراہم کیا جائے کہ انہوں نے تحریک پاکستان کے وقت عوام کو جو نعرہ دیا تھا۔ پاکستان کے حصول کے جو مقاصد متعین کئے تھے۔ ان پر عمل درآمد کا ان کو موقع ملنا چاہیئے تاکہ ان پر اتمام حجت ہو سکے اور کل وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں قانون سازی اور دستور سازی کا موقعہ نہیں دیا گیا۔

ان حالات میں بعض علماء کرام نہ صرف یہ کہ اپنے مدارس و مساجد اور خانقاہوں تک محدود ہو کر رہ گئے۔ بلکہ انہوں نے حق کی آواز بلند کرنے کا فریضہ تک ترک کر دیا۔ اور حالات کی روش پر بہنے لگے۔ ان سے حق گوئی و بیباکی اور جرأت و بہادری کی وہ صفات رخصت ہو گئیں جو ان کے اکابر کے اوصاف تھے۔

ان حالات میں چند ایک علماء نے غفلت کے اس شعار کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کیا اور حالات کو بدلنے کے لئے میدان عمل میں کود پڑے۔ ان میں مولوی محمود بھی تھے جو بعد میں مولانا مفتی محمود کے نام سے عالمگیر شہرت کے مالک بنے۔ انہوں نے دیگر اکابر علماء کے ساتھ مل کر جمعیۃ علماء اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد رکھی۔ اور ملک کے کونے کونے میں موجود علماء مدرسین اور پیران عظام سے رابطے کئے۔ اور ان کو اپنے فرائض کی طرف متوجہ کیا۔ اور سیاسی عمل میں ان کو شرکت کی دعوت دی۔ مفتی صاحب کے اس اقدام سے علماء اور دیندار طبقے میں ایک بیداری کی لہر پیدا ہوئی۔ سن ۱۹۶۲ء کے الیکشن میں آپ قومی اسمبلی کے ڈیرہ اسماعیل خان سے ممبر منتخب ہوئے جبکہ ضلع ہزارہ سے صوبائی اسمبلی کی ایک نشست مولانا غلام غوث ہزاروی نے جیتی۔ اور یوں پاکستان کی قومی اسمبلی اور مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی میں علماء کی نمائندگی ان دو ہستیوں کو حاصل ہوئی۔ جنہوں نے اپنے جاندار کردار کے ذریعہ قوم کی بہترین نمائندگی کا حق ادا کر دیا۔ اور حکومت وقت کے لادینی اقدامات کا نہایت جرأت سے مقابلہ کیا۔ ان رہنماؤں کی اس بے مثال کارکردگی کی بنیاد پر نہ صرف یہ کہ عوام وخواص کے ذہنوں میں ان شکوک وشبہات کا ازالہ ہوا جو علماء کے بارے میں انگریز اور ان کے ہمنواؤں نے پیدا کرنے کی کوششیں کی تھیں۔ بلکہ اس سے علماء کے عزت واحترام میں اضافہ ہوا۔ اور خاص کر جب مفتی صاحب سن ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں ذوالفقار علی بھٹو کو ڈیرہ اسماعیل خان کی قومی اسمبلی کی سیٹ پر تیرہ ہزار ووٹوں کی برتری سے شکست دی جبکہ وہ دیگر پانچ نشستوں پر کامیاب رہا تھا۔ اس سے مفتی صاحب کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی اور پھر جب ۱۹۷۲ء میں صوبہ سرحد کی وزارت علیا کا منصب آپ نے سنبھالا۔ آپ نے اپنی وزارت علیا کی نہایت مختصر یعنی نو مہینوں کی مدت میں یہ بات ثابت کی۔ کہ علماء بہترین منتظم بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ اور وہ اپنی فہم وفراست اور تدبر وبصیرت سے حکومت کرنے کی نزاکتوں کو بھی جانتے ہیں اور ان کو قوت فیصلہ بھی حاصل ہوتا ہے اور وہ بہترین حکمران بھی ثابت ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ وہ عصری علوم کے حامل افراد

سے فیصلہ کرنے اور فیصلہ منوانے کی بہتر پوزیشن میں ہوتے ہیں۔ آپ کی ان بصیرانہ اقدامات اور کردار کے بارے میں مولانا ضیاء القاسمی رقمطراز ہیں۔

> آپ میں اکابر علماء دیو بند کا جذبہ جہاد اور شاہ ولی اللہ کے فکر کی صلابت اور شاہ اسماعیل شہید کے قافلہ کے مومنانہ جرأت اور حضرت مدنیؒ کے لشکر کے سپہ سالار ہونے کے جوہر کھل کر نظر آنے لگے۔ یہی وجہ تھی کہ پورے ملک کے علماء حق نے آپ کو جمعیۃ علماء اسلام کا قائد، قافلہ حق کا حدی خواں اور جرنیل وسپہ سالار منتخب کرایا۔ آپ نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے علماء کرام کو پھر سے جذبہ جہاد سے سرشار کر دیا۔ اور علماء کرام کو اسی راستہ پر گامزن کیا جو ان کے اسلاف اور اکابر کا راستہ تھا۔ پاکستان میں جب علماء کرام کا وجود ایک سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق گالی بنا دیا تھا۔ مفتی صاحب نے نے ایک ٹھہرا ہوا عظمتوں کا امین اور اسلام کی عظمت رفتہ کا روشن مینار بنا دیا جن کی چمکتی ہوئی روشنی سے پورا پاکستان روشن ہو گیا۔ اخبارات، ریڈیو، ٹی وی اور رسائل وجرائد جو لفظ علماء سے گھبراتے تھے ان کے پاس اب علماء کے کلام پر روشن تبصرے اور اداریئے اور انکی سوچ اور فکر کو پاکستان کی تعمیر میں شامل کرنے کے لئے دعوت دی جانے لگی۔ مفتی صاحب نے علماء اور قدیم دانشوروں میں باہمی مشاورت اور سوچ کا دروازہ کھولا۔ اور اسلام کی روشنی جدید طبقے کے دلوں میں اتارنے کی پوری کوشش کی۔ یہی وجہ تھی کہ مفتی صاحب قدیم وجدید میں یکساں مقبول تھے۔ اور ان کی مجلس میں جہاں علماء اور عوام اپنی پیاس بجھانے کے لئے آتے تھے وہیں تجزیہ نگار، صحافی، طلبہ، سیاسی رہنما اور مختلف مکاتب فکر سے متعلق ملی رہنما بھی اکتساب فیض کرنے آتے تھے۔ (۹۰)

مفتی صاحب نے اپنے سیاسی کردار کے ذریعہ علماء کرام کے احساس کمتری کو ختم کر دیا۔ اور ان میں سر اٹھا کر چلنے کی جرأت وہمت پیدا کر دی اور ان میں ملت اسلامیہ کی قیادت وسیادت سنبھالنے کی اہلیت پیدا کر دی۔ محمد فاروق قریشی لکھتے ہیں کہ

مولانا مفتی محمود بھی ایک مولوی تھے۔ سیدھے سادے ماحول میں نشوونما پانے والے انہوں نے سب سے پہلے علماء کو منظم کیا۔ اور اپنی انتھک جدوجہد سے معاشرہ میں علماء کرام کے وقار کو واضح کیا۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ملت اسلامیہ نے قیادت وسیادت علماء کے لئے وقف کر دی۔ اور عملاً تسلیم کیا۔ کہ دراصل قیادت کے صحیح حقدار علماء ہی ہیں۔

یہاں فقط سر شاہین کے واسطے ہے کلاہ

غور سے دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ یہ سر اس مولوی سے مختلف ہے جو احساس کمتری کے مرض میں مبتلا معاشرے کے سرمایہ داروں زمینداروں اور صاحبان اقتدار کی چوکھٹ پر جبین سائی کر تا رہا ہے۔ یہ سر فخر سے بلند ہے اعلیٰ و ارفع ہے۔ مفتی صاحب نے علماء کا وقار بحال کرنے کے لئے کارہائے جلیلہ سرانجام دیے علماء میں احساس کمتری کو ختم کر کے معاشرے کے دوسرے طبقات کے سامنے بالا و بلند کیا۔ (۹۱)

اس ضمن میں عبدالکریم عابد صاحب لکھتے ہیں۔

مولانا مفتی محمود کی ذات طبقہ علماء کے لئے باعث افتخار تھی۔ ان کی شخصیت نے یہ ثابت کیا۔ کہ علماء اس بیسویں صدی میں بھی طاقت وعظمت رکھتے ہیں۔ اور وقت کے حکمرانوں سے ٹکر لے سکتے ہیں۔..

.............................ہمارا مغرب زدہ طبقہ ہمیشہ یہ کہتا رہا کہ بیچارے ملا کو سیاست کا فہم نہیں لیکن مفتی صاحب نے ساری دنیا کو بتا دیا کہ ہمارے علماء غیر معمولی سیاسی بصیرت کے حامل ہیں۔ (۹۲)

مفتی صاحب نے اپنے اسلاف کے طرز سیاست کو انہیں کی روایات کے مطابق زندہ کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں علماء و دیندار طبقے کو ایک مدبرانہ قیادت فراہم کی۔ انہوں نے اپنی شب و روز محنت سے علماء اور دینی حلقوں سے متعلق لوگوں کو میدان عمل میں لانے کی ان کو راہ دکھائی اور باطل قوتوں کے سامنے ان کو مقابلے کے لئے کھڑا کیا۔ مولانا قائم الدین کے بقول

انہوں نے جمہوری اور سیاسی جدوجہد کا ایک تاریخی ولولہ انگیز دور سے آغاز کیا انتہائی نامساعد حالات میں اسلامی اور جمہوری روایات کو ظالمانہ یلغار سے بچانے کے لئے بڑا جرأت مندانہ کردار ادا کیا۔ اپنے اسلاف کے باوقار کردار و روایات کو زندہ کرتے ہوئے مدبرانہ قیادت کے ساتھ علماء اور دینی حلقوں کو مساجد اور مدارس سے باہر نکال کر نظام اسلام کے قیام کے لئے باطل قوتوں کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا۔ (۹۳)

جناب اشفاق ہاشمی صاحب اس وقت کے حالات کے تناظر میں مفتی صاحب کی خدمات جلیلہ میں سے اس خدمت کہ اس نے سیاسی میدان میں علماء کے وقار میں نہ صرف اضافہ کیا بلکہ علماء کا سکہ رائج کرنے کا بھی آپ ہی باعث بنے لکھتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد جب سیاست اور معیشت پر مخصوص مفادات کا حامل بر طانوی اقتدار کا پیدا کردہ طبقہ مسلط ہو گیا اور اسلام، جمہوریت، انسانی حقوق اور معاشی آزادی کے حامل افراد اور جماعتوں پر قدغنیں لگا دی گئیں اور علماء دین (جو برصغیر کی سیاست کا اہم عنصر تھے) کا ملک کی سیاست سے اثر ختم کر دیا گیا۔ اور انہیں محض مساجد، مدرسوں اور خانقاہوں تک محدود کر دیا گیا۔ تو مولانا مفتی محمود پہلے شخص تھے جو نہایت نامساعد حالات مالی وسائل اور پروپیگنڈائی ہتھیاروں سے تہی دست ہوتے ہوئے علماء کی سیاسی اہمیت کو ملک بھر میں تسلیم کروانے سیاسی میدان میں علماء حق کا سکہ پھر سے رائج کرنے اور ملک میں اسلام کو باقی اور قائم رکھنے کے لئے ۱۹۵۶ء میں سکندر مرزا کی صدارت کے دوران سیاسی سٹیج پر نہایت آہستگی اور توازن سے نمودار ہوئے۔ (۹۳)

مفتی صاحب نے اپنے عمل سے علماء کو یہ حوصلہ دیا کہ وہ پوری قوم کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔ مفتی صاحب نے علماء میں جرأت پیدا کی۔ اور ان میں یہ حوصلہ پیدا کیا کہ وہ ظالم وجابر حکمرانوں کو اقتدار سے محروم بھی کر سکتے ہیں۔ مولانا غلام اکبر سلیمانی لکھتا ہے۔

اپنی عظیم المرتبت شان نے قوم پر یہ بات واضح کر دی کہ علماء کرام صرف مساجد کی امامت اور خطابت کے لئے نہیں بلکہ وہ پوری قوم کی رہنمائی بھی کر سکتے ہیں۔ اور اگر وہ علماء میدان میں نکل آئیں تو کسی بھی ظالم و جابر کو حکومت سے نیچے اتار سکتے ہیں۔(۹۵)

صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے دنیا کو یہ باور کرایا کہ علماء حکومتی ذمہ داریاں کو بھی احسن اور بہتر طریقے سے انجام دے سکتے ہیں۔ ہندوستان کے مشہور کالم نگار، تجزیہ کار اور صحافی جناب شمس تبریز صاحب یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

اپنے عہد وزارت میں انہوں نے قرون اولیٰ کے مسلمان حکمرانوں کی درویشانہ شان کا مظاہرہ کیا اپنی مجموعی سیاسی زندگی میں انہوں نے ایک چیز واضح طور پر ثابت کی کہ قدیم اسلامی طرز کی درسگاہوں کے فارغ التحصیل علماء جدید دنیا کی انتہائی شاطرانہ جمہوری فضا میں حزب اختلاف کے پلیٹ فارم سے یا ایوان حکومت کے اندر ہوشمندانہ اور دیانتدارانہ سیاست چلانے کی پوری اہلیت و صلاحیت رکھتے ہیں۔(۹۶)

اور جب آپ نے دیکھا کہ مرکز کی مداخلت کی وجہ سے ایک صوبہ کی حکومت چلانے کو مشکل بنا دیا گیا ہے اور یہ کہ اس وقت کی سیاسی قوتوں کو ایک عالم دین کی حکومت برداشت نہیں ہو رہی۔ اور انکی پالیسیوں اور حکمت عملی کی بدولت صوبہ کے امن وامان کا مثالی ہونا ان سے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ تو ایسے حالات میں مفتی صاحب نے وزارت کی کرسی کو لات مار دی۔ اور یوں علماء کی عزت کی لاج رکھ دی۔ اور یہ ثابت کر دیا کہ علماء وزارت میں صرف قوم کی خدمت کے جذبہ کے لئے لیتے ہیں۔ اور جب وہ سمجھتے ہیں کہ قوم کی خدمت کا موقع نہیں دیا جا رہا۔ تو وہ اس کو لات مار دیتے ہیں۔ ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔

میں نے کرسی اقتدار کو لات مار کر عوام کے ہاتھوں سے علماء کی داڑھیوں کو بچا لیا۔ میں نے علماء کے وقار کو تحفظ دیا ہے۔ اگر میں ہر طور اقتدار سے چمٹا رہتا تو لوگ کیا

کہتے؟ ہمارے اکابر جن کا ماضی شاندار اور روشن ہے لوگ ان کے متعلق کیا رائے قائم کرتے؟ لوگوں نے ہمارے اکابر کو ہمارے آئینہ میں دیکھنا ہے۔(۹۷)

اور آپ کا یہی مثالی کردار تھا۔ کہ علماء نے بھی آپ کو اپنا رہبر و رہنما تسلیم کیا۔ اور آپ کی قیادت و سیادت کے آگے سر تسلیم خم کیا۔ مولانا محمد اکبر رقمطراز ہیں۔

عزم و عمل کے اس پہاڑ کے سامنے اہل علم و فضل اپنا سر جھکانا فخر کا باعث سمجھتے تھے۔ وہ وقت کے ان علماء اور محققین کے سرخیل تھے جن کی علمی اور سیاسی خدمات پر عالم اسلام فخر کرتا تھا۔ علم و دانش کے اس بحر بیکراں کا علمی اور سیاسی مقام وقت کے علماء اور سیاستدانوں کے لئے قابل رشک تھا۔ اس مجموعہ شخصیت نے علماء کو سیاست کے رموز بتائے مسند تدریس سے کئی جماعتوں کو اپنی قیادت سے نوازا۔(۹۸)

مولانا مفتی محمود پارلیمنٹ میں

مولانا مفتی محمود جمہوری عمل پر یقین رکھتے تھے۔ ان کی جماعت بھی جمہوری سوچ رکھنے والی جماعت ہے۔ انہوں نے ہمیشہ سیاسی عمل کے ذریعہ اسمبلیوں تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ الیکشن خواہ بی۔ڈی ممبروں کے ذریعہ ہو، خواہ "ایک آدمی ایک ووٹ" کے ذریعہ ہو۔ صدارتی طرز حکومت ہو یا پارلیمانی۔ انہوں نے ہمیشہ انتخابی سیاست کے ذریعہ نمائندوں کے انتخابات کے عمل میں حصہ لیا ہے۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے ملک کو ایک جدید آئین دیا۔ اور اس میں قومی اسمبلی اور دو صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا بی۔ڈی ممبروں کے ذریعہ انتخاب کا اعلان کیا۔ چونکہ اس نئے آئین کے تحت سیاسی جماعتوں پر پابندی تھی اس لئے امیدوار ذاتی بنیادوں پر انتخابات میں حصہ لے سکتے تھے۔ مولانا مفتی محمود نے قومی اسمبلی کی سیٹ پر ڈیرہ اسماعیل خان کی واحد نشست سے الیکشن لڑا۔ اور ایک کے سوا تمام مخالف امیدواروں کی ضمانتیں ضبط کرا کر کامیاب ہوئے۔ یہ الیکشن اپریل 1962ء کے اوائل میں ہوئے۔ جبکہ ۶ مئی کو نتائج

کا اعلان ہوا۔ مفتی صاحب کے انتخاب سے دینی حلقوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ڈاکٹر احمد حسین کمال لکھتے ہیں۔ " ظاہر ہے کہ اسمبلی کے ایوان میں خالص کتاب و سنت کی آواز بلند ہونے کے مواقع پیدا ہو گئے۔ اور تاریخ کا ایک نیا باب لکھا جانا ممکن ہو گیا۔ ملک کے دینی حلقوں کے لئے یہ کامیابی زبردست خوشی کا موجب بنی"۔(۹۹)

اس ضمن میں جناب اشفاق ہاشمی صاحب رقمطراز ہیں۔

مفتی صاحب مالی وسائل اور ذرائع ابلاغ کی فراہمی نہ ہونے کے باوجود عالی ہمت، استقامت، متانت، سنجیدگی اور توازن و تسلسل سے سیاسی پیش قدمی کرتے ہوئے ۱۹۶۲ء کے مارشل لاء کے دور ہی کے انتخابات میں ڈیرہ اسماعیل خان سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ ۱۹۶۲ء کے انتخابات میں مفتی صاحب کی کامیابی اس لحاظ سے پاکستان کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی تھی کہ اس سے ایک جانب تو اسلام کے حامی عناصر کے حوصلے دوچند ہوئے اور انہیں اسلامی نظام کی جدوجہد کو آگے بڑھانے کے مواقع میسر آئے اور دوسری جانب علماء جو ملک کی سیاسی زندگی سے کٹ چکے تھے۔ ایوان ہائے حکومت اور سیاست میں ان کی نمائندگی نظر آنے لگی اور اسمبلی کے ایوان میں کتاب و سنت کی آواز بلند ہونے لگی۔(۱۰۰)

مولانا ظفر احمد قاسم لکھتے ہیں۔

۱۹۶۲ء کے انتخابات میں مفتی صاحب کی کامیابی اس لحاظ سے پاکستان کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس سے ایک طرف تو ہمدردان اسلام کے حوصلے بلند ہوئے دوسرے ایک فقیہ، محدث اور صاحب بصیرت سیاستدان کے ذریعہ ملک کی سیاسی زندگی سے کٹے ہوئے علماء کی اسمبلی میں نمائندگی ہونے لگی۔(۱۰۱)

جون ۱۹۶۲ء کے شروع میں قومی اسمبلی کا اجلاس بلایا گیا۔ مفتی صاحب نے پہلے ہی اجلاس میں حلف برداری کے موقع پر حق کا بول بالا کر دیا۔ اور ایوب خان کے غیر جمہوری، غیر اسلامی اور آمرانہ دستور کے خلاف بغاوت کر دی۔ مفتی محمود صاحب نے حلف کے ان الفاظ کہ

"دستور کو باقی اور قائم رکھوں گا" کے ساتھ اضافہ کر دیا۔ کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم دستور کو جوں کا توں رکھیں گے۔ بلکہ اس دستور کے تحت حاصل اختیارات کو بروئے کار لا کر ان میں جو خامیاں ہوں گی ان کی نشاندہی کر کے قرآن و سنت اور جمہوری اصول کے تحت اس میں ترمیم و تنسیخ کریں گے۔ مفتی صاحب کی اس تحریک و تجویز کو سپیکر قومی اسمبلی جناب مولوی تمیز الدین نے باقاعدہ اسمبلی کی کاروائی میں درج کرنے کی اجازت دے دی۔ جناب اشفاق ہاشمی لکھتا ہے۔

مفتی صاحب نے قومی اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں رسم حلف وفاداری کے موقع پر ہی ایوب خان کے غیر جمہوری، غیر اسلامی اور آمرانہ دستور کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اور حلف کے اس جملہ کے بعد " دستور کو باقی اور قائم رکھوں گا"۔ ان الفاظ کا اضافہ کیا" اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اس کو جوں کا توں قائم رکھیں گے بلکہ اس دستور کے دیئے ہوئے اختیارات کو بروئے کار لا کر ان جملہ خرابیوں اور خامیوں کی جو کتاب و سنت یا جمہوری لحاظ سے اس میں ہوں گی ان میں ترمیم و تنسیخ کریں گے"۔

اشفاق ہاشمی صاحب آگے لکھتے ہیں۔

مفتی صاحب کے یہ الفاظ حلف کی کاروائی میں باقاعدہ درج ہوئے اس معمولی سی کاروائی سے مفتی صاحب کی نکتہ آفرین، سیاسی بصیرت اور دور اندیشی کا اظہار ہوتا ہے۔ قومی اور ملکی مسائل پر آپ کی سوچ کی گہرائی اور وسعت کا پتہ چلتا ہے۔(۱۰۲)

۱۴ر جولائی ۱۹۶۲ء کو قومی اسمبلی نے سیاسی جماعتوں کی تشکیل و احیاء کا قانون منظور کیا۔ اور ان کو اپنی تنظیم و تشکیل کی آزادی دی۔ اس سے قبل جو سیاسی رہنما گرفتار تھے ان کو رہا کر دیا گیا۔ سیاسی جماعتوں پر سے پابندی ہٹانے کے لئے اس قانون کی منظوری کے موقع پر مفتی صاحب نے جو تقریر کی وہ نہ صرف ایک تاریخی یادگار کی حیثیت سے یاد کی جاتی ہے بلکہ علماء کے نمائندگی کی حیثیت سے جس طرح اسلام کے کاز کی نمائندگی کی وہ ایک مؤثر نمائندگی تھی۔

جناب ڈاکٹر احمد حسین کمال کے بقول۔

مارشل لاء حکومت کی قائم کردہ پہلی قومی اسمبلی کے اس پہلے اجلاس میں حضرت مولانا مفتی محمود نے بحیثیت ایم۔ این۔ اے جو تقریر کی وہ نہ صرف ایک تاریخی یادگار ہے بلکہ اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ علماء حق کے اس نمائندہ نے کس موثر طریقے سے اسلام کے کاز کو پہلی مرتبہ ایک ایسے ایوان میں پیش کیا جس سے ایوان کے نزدیک مولوی سماج کا ایک حقیر عنصر ہے اور جو اسے کبھی خاطر میں نہیں لایا۔ (۱۰۳)

مولانا مفتی محمود قومی اسمبلی کے اجلاس میں بھرپور حصہ لیتے رہے۔ اور موقعہ بموقعہ کوئی ایسی تجویز اور کوئی ایسی تحریک ضرور پیش کرتے جو غیر اسلامی قوانین کے منسوخ کرنے کے مطالبہ اور اسلامی احکام کو قانونی حیثیت دینے پر مشتمل ہوا کرتی تھی۔ انہیں دنوں قومی اسمبلی میں یہ تجویز پاس کرائی گئی۔ کہ ملک میں موجود قوانین کو کتاب و سنت سے ہم آہنگ کیا جائے گا۔ تو اس وقت کے وزیر قانون جسٹس (ریٹائرڈ) محمد منیر نے جواب دیا کہ موجودہ قوانین کو کتاب و سنت کے مطابق کرنا حکومت کے لئے بہت مشکل ہے تو اس پر مفتی صاحب نے تحریک التواء کا نوٹس دیا۔ کہ وزیر قانون کے اس بیان سے زبردست مایوسی پیدا ہوئی ہے۔ مفتی صاحب نے اس تحریک پر تقریر کرتے ہوئے حکومت وقت کے خوب لتے لئے۔ (۱۰۴)

۱۹۶۲ء کے بجٹ پر مفتی صاحب نے تفصیلی تقریر کی جس میں انہوں نے آئینی مسائل سے بحث کی۔ اس میں خامیوں کی نشاندہی کی۔ آپ نے ملک میں اسلامی احکامات کے تحت قوانین کی تشکیل کا مطالبہ دہرایا۔ آپ نے اس بجٹ تقریر میں سود اور شراب پر پابندی کا مطالبہ کیا۔ خاندانی منصوبہ بندی کی تشہیر پر خرچ ہونے والی رقوم کو انہوں نے تضیع مال بتایا اور اس کی سخت مخالفت کی۔ آپ نے سود، شراب اور خاندانی منصوبہ بندی کی اجازت کی صورت میں اس بجٹ کو ایک لادینی حکومت کا بجٹ قرار دیا۔ آپ نے اسی تقریر میں دینی مدارس سے بے اعتنائی کا سخت

نوٹس لیا۔ اور آخر میں انہوں نے اپنے حلقے ڈیرہ اسماعیل خان کے مسائل کا ذکر کیا اور ان کے حل کے لئے مطالبات پیش کئے۔ جناب ڈاکٹر احمد حسین کمال صاحب لکھتے ہیں۔

مفتی محمود نے ۱۸ مارچ کو ڈھاکہ میں منعقد ہونے والے قومی اسمبلی کے اجلاس میں عائلی قوانین کو منسوخ کرانے کی تجویز کا نوٹس دیا اور اس مقصد کے لئے ملک بھر میں احتجاجی مہم جاری کی گئی۔ چنانچہ سارے ملک میں بڑے بڑے جلسے جمعیۃ علماء اسلام کے زیر اہتمام منعقد ہوئے اسپیکر اور ارکان اسمبلی کو محضر نامے بھیجے گئے۔ ۸ مارچ 1963ء کو ہونے والے قومی اسمبلی کے اجلاس کے لئے مفتی محمود نے متعدد سوالات کے نوٹس دیئے۔ ڈیرہ اسماعیل خان کی ترقیاتی اسکیموں سے متعلق، عیسائی مشنریوں کے اسکولوں کے بارہ میں، ریلوے ملازمین کی چھٹیوں کے بارے میں، چشمہ بیراج کے منصوبے سے متعلق، حج کی سہولتوں کے متعلق، نوٹ پر تصویر چھاپنے کے متعلق، درآمدی اور برآمدی لائسنسوں کے بارے میں، اتوار کی تعطیل کے بارے میں، پاکستان کے قومی لباس کے متعلق، مدارس عربیہ کی حیثیت سے متعلق وغیرہ (105)

مارچ 1963ء کو ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کے اس اجلاس میں حکومت کی طرف سے ایک بل پیش ہوا۔ جس کو "بنیادی حقوق" کا نام دیا گیا تھا۔ اس بل میں مفتی صاحب نے متعدد ترامیم کا نوٹس دے دیا۔ اس میں ایک یہ تھا کہ اس بل میں یہ اضافہ کیا جائے کہ "کسی مسلمان کو مرتد ہونے کی اور ارتداد کی اشاعت کی اجازت نہیں ہوگی"۔ دوسری تجویز تعلیمی اداروں سے متعلق تھی۔ کہ بل میں یہ اضافہ کیا جائے کہ "تعلیمی اداروں میں خلاف اسلام تعلیم و تبلیغ نہیں ہوگی"۔

مگر مفتی صاحب کے ساتھ باوجود وعدہ کے حزب اختلاف نے جو اس وقت "اسلامی محاذ" کے نام سے کام کر رہا تھا حکومت کی طرف سے پیش کردہ بل کی جوں کی توں حالت میں رکھنے کے حق میں ووٹ دیا اور مفتی محمود صاحب کے ترامیم کی انہوں نے حمایت نہیں کی۔ اور یوں مذہبی آزادی کے نام پر ملک میں ارتداد کی اجازت دے دی۔

جناب ڈاکٹر احمد حسین کمال لکھتے ہیں۔

ڈھاکہ میں ہونے والے مارچ 1963ء کے قومی اسمبلی کے اجلاس میں پاکستان کے دستور میں ترمیم کا ایک بل پیش ہوا۔ یہ بل بنیادی حقوق کے نام سے پیش کیا گیا تھا۔ اس میں مفتی محمود صاحب نے مندرجہ ذیل ترمیمات کا نوٹس دیا۔ مذہبی آزادی کی دفعہ میں یہ بھی اضافہ کیا جائے کہ "کسی مسلمان کو مرتد ہونے کی اور ملک میں ارتداد کی اشاعت کی اجازت نہیں ہوگی"۔ تعلیمی اداروں کی دفعہ میں یہ اضافہ کیا جائے کہ "کسی تعلیمی ادارہ میں خلاف اسلام تعلیم و تبلیغ کی اجازت نہیں ہوگی"۔ اور اسی طرح متعدد ترمیمیں اس نوٹس میں شامل تھیں۔.................... اصولاً بنیادی حقوق کے نفاذ سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اس میں جو دفعات شامل کی جا رہی تھیں وہ مذہبی آزادی کے عنوان سے ارتداد کو جائز قرار دینے والی تھیں۔ ان دفعات کی موجودگی میں بنیادی حقوق کا بل ایک خطرناک چیز بن گیا تھا۔(۱۰۶)

ڈھاکہ کے اس اجلاس میں مفتی صاحب نے "عائلی قوانین" پر تفصیلی بحث کی۔ جو "دینی خدمات" کے عنوان کے تحت اس سے تفصیل سے بات کی گئی ہے۔ ڈاکٹر احمد حسین کمال لکھتے ہیں۔

قومی اسمبلی کے ڈھاکہ کے اجلاس میں پھر عائلی قوانین پر بحث ہوئی۔ یہاں بھی مفتی صاحب نے دلائل سے پر تقریر کی۔ اور نتیجتاً ایوان کے قائد اور سرکاری پارٹی کے لیڈر عبد الصبور خان نے اعلان کیا۔ کہ آئندہ ہم علماء کے مشورہ سے ایک ترمیمی بل لائیں گے۔ اگرچہ یہ وعدہ پورا نہیں ہوا۔ تاہم جمعیۃ نے عائلی قوانین کے خلاف اپنی مہم جاری رکھی۔(107)

آپ کے اس وقت قومی اسمبلی کے ایوان میں سرگرمی اور بھرپور حصہ لینے اور خاص کر آئینی اور قانونی مسائل پر دین اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں ان پر دلائل سے بھرپور گفتگو کو تمام طبقات نے سراہا۔ پارلیمنٹ میں کسی قانونی نکتہ پر بحث و مباحثہ کا اپنا ایک طریقہ کار ہوتا ہے۔

پھر ہر پارلیمنٹ کی اپنی روایات ہوتی ہیں۔ مفتی صاحب نے اپنی فراست و بصیرت اور قوت استدلال سے سب کو حیران کر دیا۔ خاص کر پرانے پارلیمنٹیرین آپ کے طرز استدلال سے بہت متاثر ہوئے۔ مولانا عبد الحکیم صاحب اس پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

لیکن مفتی محمود نے جب قومی اسمبلی کی عام مباحث میں حصہ لیا۔ تو جماعت کے بڑے بڑے قد آور رہنما حیران و ششدر رہ گئے۔ صرف انھیں پر کیا منحصر ہے قومی اسمبلی میں پرانے پارلیمنٹیرین بھی ان کے دلائل سے دم بخود ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انھیں حیرت تھی۔ کہ ایک مدرسہ کا مولوی اس قدر کھاگ اور تجربہ کار سیاستدان سے کس طرح نبرد آزما ہے۔ لیکن ان کی تمام بحثیں ایک طرف اور قومی اسمبلی میں عائلی قوانین کے بل پر انہوں نے جو کچھ کہا وہ ایک طرف۔ انہی علمی تقاریر نے ملک اور جماعت میں ان کی ترقی کا دروازہ کھولا....................

.... قومی اسمبلی میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ مذاہب خمسہ کی نمائندگی تھی۔ پارلیمنٹ کی تاریخ میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے عائلی قوانین کے خلاف مذاہب خمسہ کی آواز کو بلند کیا۔ قومی اسمبلی میں عائلی قوانین بل پر اپنی طویل تقریر میں انہوں نے مذاہب خمسہ کی جس خوبصورتی سے نمائندگی کی وہ اپنی مثال آپ تھی۔ تقریر میں اٹھائے گئے سوالات نے عائلی قوانین کے ارباب بست و کشاد کو دم بخود کر دیا۔(۱۰۸)

مفتی صاحب نے قومی اسمبلی میں اس اعتبار سے بھرپور کردار ادا کیا۔ کہ اکیلے علماء حق کی نمائندگی کرنے والے اس عالم دین نے دین کے خلاف ہر قانون سازی کی بساط بھر مخالفت کی۔ اور حکومت کو بے بس کر دیا۔ آپ خود فرماتے ہیں۔

اسمبلی کے اندر میری موجودگی میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دین کے خلاف کوئی کاروائی، کوئی قانون سازی مکمل نہیں ہو سکے گی۔ میں حضرت صدیق اکبرؓ کے خطبے سے رہنمائی حاصل کرتا ہوں جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ "اینقص الدین و انا حی"۔(۱۰۹)

مارچ ۱۹۶۵ء میں ایوبی دور میں دوسرے الیکشن کرانے کا اعلان ہوا۔ مفتی صاحب نے جمعیۃ علماء اسلام کی طرف سے اس اسمبلی میں ڈیرہ اسماعیل خان کے قومی اسمبلی کی واحد نشست پر مقابلہ کیا۔ یہ الیکشن بھی بی۔ ڈی سسٹم کے تحت کرائے جا رہے تھے۔ چونکہ ایوب خان، مفتی صاحب کی طرف سے اسمبلی کے فلور پر حکومت کے مخالفانہ موقف کو بھولے نہیں تھے۔ اس لئے انتخابات میں مفتی صاحب کو ناکام بنانے کے لئے متعلقہ حکام کو خاص ہدایات دی گئیں۔ یہاں پر جس صوبائی سیٹ پر الیکشن لڑنے والے امیدوار سے تعاون کا معاہدہ ہوا تھا۔ اس نے عین وقت پر اس معاہدہ کی خلاف ورزی کر دی۔ اور مفتی صاحب کو ناکام کر دیا گیا۔ مفتی صاحب خود کہتے تھے

> اس زمانے میں جہاں ہم لوگ ووٹ مانگنے جاتے تھے وہاں ہم سے پہلے پولیس موجود ہوتی تھی۔ حلقہ کے بی۔ ڈی ممبران کو متعلقہ تھانوں میں طلب کیا جاتا تھا۔ اور انہیں خوف دلایا جاتا تھا کہ اگر مفتی محمود صاحب ان کے علاقے سے کامیاب ہوئے تو اس کی سزا انہیں بھگتنا ہو گی۔ (۱۱۰)

اس الیکشن میں اگرچہ مفتی صاحب کو شکست سے دوچار کر دیا گیا۔ مگر آپ کی دینی و مذہبی خدمات اور اس سلسلے میں قوم کی رہنمائی سے آپ ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہیں رہے۔ اور اسمبلی سے باہر اپنی جماعت کے مقاصد کے حصول کے لئے جدوجہد کو جاری رکھا۔ اور اپنی جماعت کے کارکنوں کو بھی فعال رکھا۔ ایوب خان کے زوال کے بعد ملک میں جنرل یحییٰ خان کی مارشل لاء کی صورت میں آمریت مسلط کر دی گئی۔ بالآخر عوام کی بھرپور تحریک کے بعد یحییٰ خان نے ملک میں عام انتخابات کا اعلان کر دیا۔ ملک سے مارشل لاء کے ہٹانے کا وعدہ کیا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں عام انتخابات ہوئے۔ ڈیرہ اسماعیل خان کے قومی حلقہ سے مفتی صاحب کے مقابلہ میں پیپلز پارٹی کے صدر جناب ذوالفقار علی بھٹو نے بھی داخلہ لیا۔ اور مفتی صاحب کے مقابل آ گئے۔ وہ پانچ دیگر حلقوں سے انتخابات لڑ رہے تھے۔ جس کی وجہ سے اس حلقے نے ایک بین الاقوامی حیثیت

اختیار کر لی۔ اور سب کی نظریں اس حلقے پر مرکوز رہیں۔ مفتی صاحب کی عوام میں پذیرائی اور جمعیۃ علماء اسلام کے کارکنوں کی محنت کی بدولت جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب، مفتی صاحب کے مقابلہ میں اس حلقے سے شکست کھا گئے۔ جبکہ باقی پانچوں حلقوں سے کامیاب رہے۔

مفتی صاحب کا قومی اسمبلی کے ایوان میں یہاں بھرپور کردار رہا ہے۔ یہ ایک آئین ساز اسمبلی تھی۔ اس کے پیش نظر ملک کے لئے آئین سازی تھی۔ مفتی صاحب اس ایوان میں اپنی جماعت کے چھ دیگر ارکان کے ساتھ اپنی جماعت کے پارلیمانی لیڈر رہے تھے۔ آئین سازی کے لئے جو کمیٹی بنائی گئی۔ اس میں مفتی صاحب بھی اس کمیٹی کے رکن چنے گئے۔ اور آپ کی دلچسپی اور تعاون کی وجہ سے ملک کو ۱۹۷۳ء کا آئین ملا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ چند مہینے پہلے بھٹو صاحب نے مفتی صاحب کے لئے صوبہ سرحد میں آپ کی حکومت کے دوران بڑی مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ یہاں تک بلوچستان کی حکومت کی برطرفی پر آپ نے بھی احتجاجاً استعفیٰ دے دیا تھا۔ اور یہ ماحول میں ابھی یہ تلخی موجود تھی۔ مگر مفتی صاحب نے ملک کے لئے آئین سازی کے اس تاریخی مرحلے میں قطعاً تلخی سے کام نہیں لیا۔ اور بھرپور توجہ اور دلچسپی سے آئین سازی کے مراحل میں حصہ لیا۔ بہت سے ایسی دفعات جن کا تعلق بنیادی انسانی حقوق سے ہے۔ آئین میں ان کی شمولیت کا سہرا مفتی صاحب کے سر ہی سجتا ہے۔ جناب نوابزادہ نصر اللہ خان صاحب تحریر کرتے ہیں۔

> اقتدار سے محروم ہونے کے بعد بھی مفتی صاحب کا کردار حب الوطنی اور اسلامی تقاضوں کے مطابق رہا۔ ایسا نہیں ہوا کہ وہ اس تلخی کی وجہ سے ملکی تقاضوں کو نظر انداز کرتے چنانچہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ 73ء کے آئین کی تشکیل میں مفتی محمود صاحب نے بڑا نمایاں کردار ادا کیا اگر کالعدم جمعیۃ علماء اسلام اور کالعدم نیشنل عوامی پارٹی اس مرحلہ پر تعاون نہ کرتیں تو آئین بنانا ممکن نہ ہوتا۔.........................
>
> .... اس معاملہ میں مفتی محمود صاحب نے حکومت کے

غیر ضروری اقدامات کو نظر انداز کرتے ہوئے ملک کے وسیع تر مفاد کو پیش نظر رکھا اور آئین کی تشکیل میں بھرپور حصہ لیا۔ چنانچہ 73ء کے آئین میں جتنی اسلامی دفعات موجود ہیں ان کو آئین کا حصہ بنانے میں مفتی صاحب کا سب سے نمایاں حصہ تھا۔ اس آئین میں صوبائی خود مختاری کی جو حدود متعین کی گئیں ان کے بارے میں بھی اپنے رفقاء کو آمادہ کرنے میں مفتی صاحب کا بڑا ہاتھ تھا۔ (۱۱۱)

۱۹۷۳ء کا آئین بڑی مشکل مرحلوں کے بعد متفقہ صورت میں ملک کو ملا۔ حکومت اپنی اکثریت کے زعم میں مبتلا تھی۔ اور وہ حزب اختلاف کے مطالبات کو آئین کا حصہ بنانے کے لئے آمادہ نہیں ہو رہی تھی۔ ادھر حزب اختلاف جس کی قیادت جناب عبد الولی خان کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اپنے مطالبات کو آئین کا حصہ بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ اس مرحلہ پر مفتی صاحب نے قائدانہ کردار ادا کیا۔ اور ملک کو ایک متفقہ آئین دینے میں کافی حد تک کامیابی حاصل کی۔ جناب اشفاق ہاشمی صاحب لکھتے ہیں۔

> پاکستان کی تاریخ میں دستور سازی کا معاملہ نہایت پیچیدہ رہا ہے۔ 25 برس تک ملک کو کوئی اسلامی جمہوری آئین نہ مل سکا تھا۔ جس کی وجہ سے ملک کو پے در پے کئی بحرانوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۷۱ء کے بحران کے بعد پاکستان کے بقیہ حصہ کو بچانے کے لئے فوری طور پر ایک ایسے جمہوری آئین کی ضرورت تھی۔ جو اسلامی تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل ہو۔ اور جمہوریت کے تمام اصولوں پر حاوی ہو۔ چنانچہ اس موقع پر جمعیۃ علماء اسلام کے قائد مفتی محمود صاحب اور ان کے ہمنوا خان عبد الولی خان نے شاندار کردار ادا کیا۔ اور حزب اختلاف کی تمام جماعتوں کو ایسے پارلیمانی طرز کے جمہوری آئین جس میں اسلام کے لئے واضح دفعات موجود ہوں کے مطالبہ پر متحد و مربوط کر لیا۔ .... اور اکتوبر ۱۹۷۲ء میں حکومتی پارٹی اور حزب اختلاف کے مابین آئینی مسائل پر سمجھوتہ ہو گیا۔ .... آئین کی تدوین کے مرحلہ پر مارچ ۱۹۷۳ء میں حکومت کے ساتھ مذاکرات میں آپ نے حزب اختلاف کی نمائندگی کی۔ (112)

۱۹۷۴ء میں ملک میں "تحریک ختم نبوت" چلی جس کا بنیادی مطالبہ مرزائیت وقادیانیت کو غیر مسلم اقلیت قرار دینا تھا۔ اس تحریک کے لئے بڑی قربانیاں دی گئیں۔ ۳۲ فدائین ختم نبوت نے اپنی معصوم جانیں قربان کیں، کئی زخمی ہوئے۔ ہزاروں کی تعداد میں علماء، صلحاء اور نیک مسلمان جیلوں میں گئے۔ آخر کار مجبور ہو کر حکومت نے اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے قومی اسمبلی کو ایک "کمیٹی" کا درجہ دیا۔ حکومت کی نمائندگی اس وقت کے وزیر قانون اور اٹارنی جنرل کر رہے تھے۔ جبکہ امت مسلمہ کی طرف سے نمائندگی کا شرف مولانا مفتی محمود کے حصہ میں آیا۔ کمیٹی کے فیصلے کے مطابق اس وقت مرزائیوں کے سربراہ مرزا ناصر کو بلایا گیا۔ 13 دن تک اس پر جرح ہوتی رہی۔ اس طرح لاہوری مرزائی کے سربراہ کو بھی بلایا گیا۔ کچھ اس سے سوال و جواب ہوتے رہے۔ اور بالآخر کمیٹی کے فیصلے کے مطابق مرزائیت کے دو جماعتوں (قادیانی، لاہوری) کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا گیا۔ اور اس کا آئین میں باقاعدہ اندراج ہوا۔ اور اس میں مولانا مفتی محمود کا کردار کلیدی رہا ہے۔ اور وہ اس مسئلہ کے حل کرنے کو اپنی اخروی سعادت سمجھتے ہیں اور دل کے اطمینان کا باعث، وہ ایک تقریر میں کہتے ہیں۔

> میں بسا اوقات یہ سوچتا تھا کہ ایک شخص جو ہر سال مسلسل بخاری شریف، مسلم شریف اور ترمذی شریف کو پڑھاتا ہے۔ اور وہ اسمبلی کی چار دیواری میں گھس جائے تو وہ حدیث کے پڑھانے میں روحانی سکون اور قلبی اطمینان جو دینی مدرس کے ماحول میں میسر تھا وہ اسمبلی ہال میں میسر ہوگا۔ دل میں یہ خلش رہتی کہ حدیث کے درس کو چھوڑ کر ادھر آنے ہم نے کافی خسارہ کیا لیکن جب اللہ تعالیٰ نے یہ مسئلہ حل فرمایا تو اب میرا دل مطمئن ہے کہ بخاری شریف پڑھانے سے یہی ایک مرکزی مسئلہ حل ہو نا بدرجہا بہتر ہے۔ جب تحفظ

> ختم نبوت ہے۔ تو دیگر اسلامی شعائر مدارس اور اسلامی اقدار زندہ و تابندہ ہیں۔ اور اگر اس میں ہم ناکام رہے تو یہ سب مراکز و مشاہد بے روح ہوتے۔(113)

اسمبلی کے ایوان میں آپ نے شروع میں جمعیۃ علماء اسلام کے پارلیمانی لیڈر اور حزب اختلاف کے ایک اہم رکن کی حیثیت سے یہ ذمہ داری نبھائی جب ۸ر فروری ۱۹۷۵ء کو پشاور یونیورسٹی میں بم کا دھماکہ ہوا۔ جس میں کئی قیمتی جانیں شہید ہوگئیں جن میں پیپلز پارٹی کے صوبائی سربراہ اور سینئر وزیر حیات محمد خان شیرپاؤ بھی تھے۔ حکومت وقت نے اس واقعہ قتل کی ذمہ داری قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف خان عبدالولی خان کے بیٹے (اسفندیار ولی خان) اور اس کے دیگر رشتہ داروں اور جناب شیرپاؤ کے سیاسی مخالفین پر ڈال دی۔ خان عبدالولی خان اور ان کے جماعت کے مرکزی رہنماؤں کو گرفتار کرلیا گیا۔ اور ان کی جماعت پر پابندی لگادی۔ ولی خان کی گرفتاری کے بعد حزب اختلاف نے اپنی قیادت کی ذمہ داری مولانا مفتی محمود صاحب کو سونپ دی۔ آپ نے اپنے طویل پارلیمانی تجربے، متوازن سیاسی کردار اور حزب اختلاف کے جماعتوں کے رہنماؤں کے بے پناہ اعتماد کی بدولت یہ ذمہ داری احسن طریقے سے انجام دی۔ جناب اشفاق ہاشمی صاحب لکھتے ہیں۔

> مفتی محمود نے نہایت جاندار اور موثر طریق سے ہر قسم کے خوف اور لالچ سے بے نیاز ہوکر آئین کی پامال کے خلاف اسمبلی میں بھرپور جنگ کی قانون کی حاکمیت اور جمہوری اقدار کے فروغ پر ہمیشہ زور دیا اور حکومت کے غاصبانہ اقدامات کے خلاف ہر موقع پر آواز اٹھائی۔(114)

یہاں تک کہ وہ مرحلہ بھی آیا کہ جب آئین میں چوتھے ترمیم کے لئے قومی اسمبلی میں بل لایا گیا۔ اور حزب اختلاف نے بھرپور انداز میں اس کی مخالفت کی تو قائد حزب اختلاف مولانا مفتی محمود سمیت حزب اختلاف کے دیگر ارکان کو زبردستی فورس کے ذریعہ ایوان سے باہر دھکیل دیا گیا۔ اور ان پر اسمبلی کے تمام دروازے بند کردیئے گئے۔ لیکن ان سب کے باوجود مفتی محمود

صاحب نے قائد حزب اختلاف کا کردار نہایت سنجیدگی اور متانت سے ادا کیا۔ جو پارلیمانی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

1977ء کے الیکشن میں مفتی محمود صاحب نے دو حلقوں ڈیرہ اسماعیل خان اور ڈیرہ غازی خان کی نشستوں سے حصہ لیا اور دونوں حلقوں سے بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے مگر بھٹو حکومت کی دھاندلی کے خلاف جو ایک تاریخی تحریک چلی جس کے نتیجہ میں انہوں نے احتجاجاً ان نشستوں سے استعفیٰ دے دیا۔ ملک گیر احتجاجی تحریک کے نتیجے میں ملک میں مارشل لاء نافذ کردیا گیا۔ اور جمہوریت کی بساط لپیٹ کر ملک کی باگ دوڑ ایک دفعہ پھر فوجی حکمرانوں کے ہاتھ میں آگئی۔

مولانا مفتی محمود کا پارلیمنٹ میں کردار ناقابل فراموش ہے۔ اسی کردار کی بدولت ملک کے تمام طبقات میں آپ کو مقبولیت و محبوبیت حاصل رہی۔ اور تمام جماعتوں کی طرف سے آپ کو حمایت و تعاون حاصل رہا۔ حتیٰ کہ سیکولر ذہن رکھنے والی جماعتوں نے بھی جمہوری اقدار کے تحفظ کے لئے آپ کا بھرپور ساتھ دیا۔ مولانا تاج محمود، مفتی صاحب کے پارلیمنٹ کے اندر کردار کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

> مفتی صاحب کے علاقے کے لوگ اس لحاظ سے قابل تکریم ہیں کہ انہوں نے ایک نیا موتی قوم کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے تین بار مفتی صاحب کو قومی اسمبلی کے لئے منتخب کیا۔ اور دوبار ان کو اسی ایوان میں ذمہ داریاں نبھانے کا موقع ملا۔ قومی اسمبلی میں انہوں نے جو ناقابل فراموش کردار ادا کیا۔ قومی اسمبلی میں اسی کردار نے ان کی ذات کو ناقابل فراموش بنایا۔ اسی کردار و عمل کی بدولت ملک کے ہر طبقے میں ان کے خیالات کو پذیرائی ملی۔ یہیں سے وہ بہترین قائد کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔ اس ایوان میں کلمہ حق کی پاداش میں انہیں اٹھا کر باہر پھینکا گیا۔ اس مقام پر کھڑے ہو کر اس مرد مجاہد نے ظلم و بربریت کا قلع قمع کرنے کا عہد کیا۔ اور آخرکار اسی ایوان کے

تقدس کی بحالی کے لئے اپنے دور کے سب سے بڑے آمر بھٹو سے نبرد آزما ہوئے۔ اس جنگ میں انہیں نہ صرف اسلام کی صداقت پر یقین رکھنے والی تمام جماعتوں بلکہ سیکولر ذہن کی تنظیموں کی بھی حمایت حاصل رہی۔(115)

آئینی مسائل کے ساتھ ساتھ آپ نے ہمیشہ موقع محل اور وقت کے تقاضوں کے مطابق اپنے حلقۂ انتخاب ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے بنیادی مسائل کو اٹھایا ہے۔ خاص کر بجٹ کے اجلاسوں میں آپ نے تفصیل کے ساتھ نہایت زوردار طریقے پر حکومت کو ان مسائل کے حل کی طرف متوجہ کیا ہے۔

سقوط ڈھاکہ اور اس کے روکنے کے لئے مفتی محمود کی کوششیں

تحریک پاکستان کی کامیابی کی صورت میں حکومت برطانیہ نے برصغیر پاک وہند کو تقسیم ملک کے لئے جو کمیشن قائم کیا تھا۔ اس کے فیصلے کی روشنی میں پاکستان کے دو حصے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان قرار پائے تھے۔ جبکہ ان دونوں حصوں کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ اور درمیان میں ہندوستان کا ملک تھا۔ ان دونوں حصوں کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ ایسے اقدمات کئے جاتے۔ کہ ان دونوں حصوں کو محبت والفت کے ساتھ رہنے کے لئے ضروری ہوتے۔ چاہئے تھا کہ اقتصادی اور معاشی لحاظ سے ان دونوں حصوں میں جو اقدامات اس کی مضبوطی کے لئے ضروری ہیں۔ مساوی طور پر ان میں وہ وسائل تقسیم کر دئے جاتے تاکہ وہاں کے رہنے والوں کو احساس محرومی کا احساس نہ ہوتا۔ مادی وسائل کی تقسیم کے ساتھ روحانی لحاظ سے ان دونوں حصوں کو مربوط بنانا بھی ضروری تھا۔ ایسے ہی اقتدار میں مساوی شرکت کے لئے بھی ان کو مواقع کا حصول لازمی تھا۔ فوج میں، بیوروکریسی میں انکی شرکت اس طریقے سے ہوتی کہ نہ تو ان کے باشندگان کو اور نہ ہی بیرونی مخالف قوتوں کو اس سلسلے میں مخالفانہ پروپیگنڈے کا

ہتھیار ہاتھ لگتا۔ کاش کہ یہ سب کچھ نہ ہو سکا۔ اور یہ سب کچھ دیدہ ودانستہ کیا گیا۔ مشرقی پاکستان کو اپنے حصے سے محروم کر دیا گیا۔ ان کی نمائندگی کی حیثیت کو بھی کم وزن کر دیا گیا۔ اور یوں وہ آہستہ آہستہ احساس محرومی کا شکار کر دئے گئے۔ ان حالات میں انہوں نے اس سیاسی قیادت کو زیادہ اہمیت دینا شروع کر دی جو انکی محرومی کے ازالہ کی بات کرتی۔ اور اس قیادت کو انہوں نے اپنے خلاف سمجھا جو پاکستان کی اتحاد کی بات کرتی۔ مولانا مفتی محمود اور انکی جماعت جمعیۃ علماء اسلام کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ مشرقی پاکستان کے رہنے والوں کو بھی مساوی حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔ اور ان دونوں بازؤوں کو متحد کرنے کے لئے ہر وہ اقدام کرنا چاہئیے جو اس سلسلے میں ضروری ہو۔ ان کی احساس محرومی کو ختم کرنا چاہئیے۔ تاکہ ان کو برابری کا احساس ہو۔ مشہور ہفت روزہ "اخبار جہاں" میں آپ کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے۔ انٹرویو لینے والے مشہور صحافی جناب محمود شام ہیں۔ محمود شام کا سوال اور مفتی صاحب کا جواب درج ذیل ہے۔

سوال: مغربی اور مشرقی پاکستان میں یکجہتی پیدا کرنے اور دونوں بازؤوں کے عوام کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لئے سب سے موثر اقدام کیا ہو سکتا ہے؟

جواب: میرے خیال میں اسلامی اخوت کے جذبات کو ابھارکرنا ہی مشرقی اور مغربی پاکستان کے دونوں حصوں کے مسلمانوں کو اکٹھا رکھنے میں سب سے زیادہ معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ اور یہ کہ دونوں صوبوں کے لوگوں کو ضروریات زندگی مہیا کرنے میں کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہ کیا جائے۔ تجزیہ کر اقتصادی عدم مساوات کو دور کرنے کے لئے کوئی موثر قدم اٹھایا جائے۔ زبان کے اختلافات کی وجہ سے جو بعد دونوں حصوں میں رہا ہے اس کو اس طرح کم کیا جا سکتا ہے کہ عربی زبان کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دیا جائے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ پانچ برس کے عرصے میں لوگ بخوبی عربی بول سکیں گے اور لکھ سکیں گے۔ عربی زبان سے مسلمانوں کو دلی لگاؤ ہے۔ یہ کلام اللہ کی

زبان ہے۔ اس کے ساتھ سب مسلمانوں کی عقیدت ہے اس لئے لوگ اس طرح جلد مائل ہو گئے۔(116)

اس بیان میں مفتی صاحب نے ان دونوں بازوؤں مغربی اور مشرقی پاکستان کو متحد رکھنے کے لئے جو تجاویز پیش کی ہیں۔ وہ یقیناً اس وقت کے اعتبار سے نہایت ضروری تھیں۔ لیکن حکمرانوں کی غلط اندیشیوں نے ان کو اس طرف توجہ دینے یا کسی اقدام کرنے سے روکے رکھا۔ کہ ان حالات میں جنرل یحیٰی خان نے عام الیکشن کا اعلان کر دیا۔ مشرقی پاکستان میں دیگر سیاسی پارٹیوں کے ساتھ جناب شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ نے چھ نکات کی بنیاد پر یہ الیکشن لڑا اور کل قومی اسمبلی کی 300 نشستوں میں سے ۱۵۱ نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ ۹ سیٹوں پر سیلاب کی وجہ سے الیکشن ملتوی کر دیے گئے۔ واضح بات تھی کہ یہ سیٹیں بھی عوامی لیگ ہی کی تھیں۔ اور یوں ان کو مرکزی سطح پر واضح برتری حاصل ہو گئی۔ اور چاہیے تھا کہ ان کو حکومت سازی کی دعوت دی جاتی۔ لیکن یحیٰی خان اور بھٹو کے اندرون خانہ گٹھ جوڑ نے مشرقی پاکستان کے رہنے والوں کو حکومت سازی کے حق سے محروم کرنے کی سازشیں شروع کر دیں۔

مفتی صاحب الیکشن کے بعد کے حالات کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

> گزشتہ انتخابات کو آج کے حکمرانوں نے ضرورت سے زیادہ اہمیت دی۔ اور انہیں فیصلہ کن انتخابات قرار دیا۔ لیکن جب ان انتخابات کے نتیجہ میں مجیب الرحمٰن کو اکثریت حاصل ہوئی۔ تو اس کو حکومت دینے اور اس کی سیاسی برتری کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا نتیجہ ملک دولخت ہونے کی صورت میں سامنے آیا۔ اگر اس وقت اقتدار مجیب کے حوالے کر دیا جاتا تو آج شاید یہ روز سیاہ ہم نہ دیکھتے۔ لیکن بدقسمتی سے ایک طرف مجیب کی حق طلبی کی ضد تھی۔ اور دوسری طرف بھٹو صاحب کی دو وزراء اعظم اور دو اسمبلیوں کی منطق۔ ان کی ضد اور ان کے منطق کے ٹکراؤ میں ملک پس گیا۔

عوام پس گئی اور اب تو غیرت اور حمیت بھی پستی ہوئی نظر آ رہی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ " حمیت نام تھی جس کی گئی تیمور کے گھر سے "۔(117)

مفتی صاحب نے از حد کوشش کی کہ تمام سیاسی قوتوں کو ایسے فارمولے پر متفق کیا جائے کہ جس کی وجہ سے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو روکا جا سکے۔ اور یہ ملک متحد و متفق رہے۔ اور دونوں میں جو بعد پیدا کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اس کو ختم کر دیا جائے۔ مولانا زاہد الراشدی نے اس وقت کے حالات اور مفتی محمود کی خدمات کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

> پاکستان کی سیاسی تاریخ کا سب سے نازک اور سنگین مرحلہ 70ء کے انتخابات سے لیکر سقوط ڈھاکہ تک کا دور ہے۔ مشرقی پاکستان کی نمائندگی بلاشرکت غیرے شیخ مجیب الرحمٰن کے پاس تھی۔ مغربی پاکستان کے دو صوبوں پنجاب اور سندھ میں مسٹر بھٹو کی پیپلز پارٹی اور دو صوبوں سرحد و بلوچستان میں جمعیۃ علماء اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی کو اکثریت حاصل تھی۔ مسٹر بھٹو نے مسٹر مجیب سے ساز باز کرنا چاہی جو نہ ہو سکی۔ تو بھٹو نے قومی اسمبلی کے ڈھاکہ سیشن (سہ مارچ اے۱۹ء) کا بائیکاٹ کر دیا۔ اور لاہور کے جلسہ عام میں اعلان کیا کہ قومی اسمبلی کا جو (پیپلز پارٹی کا) رکن ڈھاکہ جائے گا۔ اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ اس جلسہ میں مسٹر بھٹو نے دو اکثریتی پارٹیوں اور ادھر تم ادھر ہم کا تصور پیش کر دیا۔ مسٹر بھٹو کی اس دھمکی کے باعث مغربی پاکستان کے اقلیتی لیڈروں میں گھبراہٹ پیدا ہوئی۔ مگر جمعیۃ علماء اسلام کی مجلس شوریٰ کے اجلاس کے بعد مولانا مفتی محمود نے دو ٹوک اعلان کیا کہ ہم ڈھاکہ سیشن میں شرکت کریں گے۔ کیونکہ ہمارے نزدیک ڈھاکہ سیشن کا بائیکاٹ ملک کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے مترادف ہے۔ مفتی صاحب کے اس اعلان کے بعد دوسرے لیڈروں کو بھی حوصلہ ہوا۔ اور کئی جماعتوں نے ڈھاکہ اجلاس میں شرکت کا اعلان کیا۔ جس سے سیاسی دنیا پر یہ بات واضح ہو گئی کہ مغربی پاکستان کی سیاست پر مسٹر بھٹو کی واحد اجارہ داری نہیں ہے۔ اور ان کے موقف سے

اختلاف کرنے والے سیاسی عناصر بھی موجود متحرک ہیں۔ اس کے بعد یحییٰ خان، شیخ مجیب اور بھٹو کے درمیان مصالحت کے لئے دوسرے لیڈروں کے ساتھ ساتھ مولانا مفتی محمود نے بھی ڈھاکہ کے مسلسل سفر کئے۔ اور ہر ممکن کوشش کی کہ یہ کشمکش ملک کی تقسیم پر منتج نہ ہو.................. اس کے بعد شیخ مجیب کے عوامی لیگ کو کالعدم قرار دیا گیا۔ فوجی ایکشن ہوا۔..................

....

یحییٰ، مجیب، بھٹو کی آنکھ مچولی میں اگرچہ وطن عزیز دولخت ہو گیا۔ لیکن مولانا مفتی محمود اور ان کے رفقاء نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ ملکی وحدت اور سالمیت کے تحفظ کی جنگ میں وہ کسی سے پیچھے نہیں۔ (118)

اس سلسلے میں جناب محمد فاروق قریشی نے مفتی صاحب کے خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

۱۹۷۱ء میں جب عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی میں اقتدار کی رسہ کشی کا کھیل جنرل یحییٰ خان کی سرپرستی میں شروع ہوا تو مولانا مفتی محمود نے اس نازک مرحلے پر بھی صدر یحییٰ خان اور شیخ مجیب الرحمن سے ملاقاتیں کیں تاکہ دشت و چمن زار کے فاصلے کم کرنے کے لئے اول وقل کے سامان بہم کر دیئے جائیں لیکن طبقاتی اور علاقائی مفادات کی خلیج اس قدر وسیع ہو چکی تھی کہ ملکی مفادات اس میں نابود ہو کر رہ گئے۔ مولانا مفتی محمود نے ملک کے دونوں بازوؤں کو متحد رکھنے کے لئے حتی المقدور کوششیں کیں لیکن نشۂ اقتدار میں بدمست حکمرانوں کی بے تدبیری آڑے آتی رہی حضرت مفتی صاحب نے مشرقی پاکستان کے مسلمانوں سے یک جہتی اور حکمرانوں کو صراط مستقیم دکھانے کے لئے مغربی پاکستان کی اقلیتی جماعتوں کا اتحاد قائم کیا جس میں پاکستان پیپلز پارٹی اور قیوم مسلم لیگ کے سوا تمام قابل ذکر جماعتیں موجود تھیں۔ انہوں نے ملک کی سلامتی اور تحفظ کے لئے ہر چند کوشش کی لیکن بے بصیرت حکمرانوں اور طالع آزما سیاستدانوں کے غلط فیصلوں کی بنا پر یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور یوں وطن عزیز دولخت ہو گیا۔ (119)

انتخابات کے بعد کی صورت حال نے ملکی سیاست میں ایک ہلچل کی کیفیت پیدا کر دی۔ دونوں بڑی پارٹیوں کی انتہا پسندی اور اپنے اپنے موقف میں لچک پیدا نہ کرنے کی پالیسی نے پاکستان کی سالمیت کا سوال پیدا کر دیا۔ 12 فروری 1971ء کو بھٹو صاحب نے مولانا مفتی محمود سے پشاور میں ملاقات کی۔ اس ملاقات میں بھٹو صاحب نے مفتی صاحب کو شیخ مجیب الرحمن کے عزائم سے خبردار کیا۔ اور یہ تجویز پیش کی کہ مغربی پاکستان کی تمام منتخب جماعتوں کو اس حصے کے تحفظ کے لئے متحدہ موقف اپنانا چاہیے۔ اور ایک ہی آواز اٹھانی چاہیے تاکہ شیخ مجیب کو ٹھیک کیا جا سکے۔ بھٹو صاحب نے مزید کہا کہ ہمیں قومی اسمبلی کے مجوزہ (۳ مارچ) کا بائیکاٹ کر دینا چاہئے تاکہ شیخ مجیب اپنی مرضی کا آئین ہم پر مسلط نہ کر سکے۔ مولانا مفتی محمود نے کہا کہ اجلاس بلا کر ملتوی کرنا خوفناک نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ لہٰذا ہم اس اجلاس کا بائیکاٹ نہیں کریں گے۔ باقی رہا شیخ مجیب کا چھ نکات کی بنیاد پر آئین مسلط کرنا تو ہم اپنے حصے کے مفادات کا تحفظ کریں گے۔ اگر ہم اس میں ناکام رہے تو اسمبلی کے اجلاس سے واک آؤٹ کر جائیں گے۔ [نعیم آسی۔ مولانا مفتی محمود۔ ص123]

نعیم آسی صاحب مزید لکھتے کہ

جب یحییٰ خان نے دیکھا کہ مولانا مفتی محمود صاحب بھٹو کی بات نہیں مان رہا تو اس نے 20 فروری کو مولانا مفتی محمود اور مولانا ہزاروی کو اپنے پاس بلا لیا۔

....

....

مگر یحییٰ خان کے پاس مفتی صاحب کی باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ مفتی صاحبؒ نے یحییٰ خان کو یہ تجویز پیش کی۔ کہ یحییٰ خان صبر سے کام لیں وہ شیخ مجیب سے بات کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی دن 20 فروری کو مفتی صاحب ہزاروی کی معیت میں ڈھاکہ براستہ کولمبو پہنچے۔ اور 21 فروری کو شیخ مجیب سے مذاکرات کئے۔ (حوالہ بالا)

اس ملاقات سے حالات کی بہتری کے کافی امکانات پیدا ہو گئے تھے مگر یحییٰ خان نے یکم مارچ کو ریڈیو پر اسمبلی کے اجلاس کے ملتوی ہونے کا اعلان کر دیا۔ جس نے حالات کے بگاڑ میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔

ملک پاکستان کو دولخت کرنے میں جہاں انہوں نے اپنے مفادات کے حصول کے پیش نظر سرگرمی دکھائی وہاں ہندوستان کی حکومت نے بھی شروع میں درپردہ اور جب حالات کو اس نے اپنے حق میں سازگار بنا دیا تو کھلم کھلا مداخلت کی اور پاکستان کو متحد رکھنے کے موقف کو کمزور ثابت کرنے کے لئے نہایت زہرناک پروپیگنڈہ شروع کیا۔ جس سے کافی دوست ممالک بھی متاثر ہوئے۔ مفتی صاحب اور انکی جماعت نے ہندوستان کے مخالفانہ پروپیگنڈے کے اثرات کو ختم کرنے کے لئے دوست ممالک اور خاص کر عرب ممالک کے دورہ کے لئے ایک وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس وفد کو حکومت کی طرف سے کوئی سہولت فراہم نہیں کی گئی۔ یہ وفد مولانا مفتی محمود، مولانا غلام غوث ہزاروی اور بنوں کے حاجی غلام محمد پر مشتمل تھا۔ 26/ اگست 1971ء کو یہ وفد مشرق وسطیٰ کے کامیاب دورے سے کراچی واپس پہنچا۔ اس وفد کی روانگی، اس کے مقاصد اور اس کے نتیجے کے بارے میں جناب نعیم آسی صاحب رقمطراز ہیں۔

جب مولانا مفتی محمود نے یحییٰ خان کی ماتم انگیز بے حسی دیکھی تو وہ تڑپ کر اٹھے اور جولائی کے اوائل میں جمعیۃ علماء اسلام کی طرف سے ایک دو رکنی وفد لیکر مشرق وسطیٰ کے دورہ پر روانہ ہوئے۔ یہ روانگی 10/ جولائی ۱۹۷۱ء کو عمل میں آئی۔ وفد میں مولانا مفتی محمود، مولانا غلام غوث ہزاروی اور حاجی غلام محمد شامل تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ حکومت نے اس وفد کو کسی قسم کی سہولت فراہم کرنا قطعاً گوارا نہ کی۔ وفد کے مقاصد میں بھارتی پروپیگنڈا کا جواب، مشرقی پاکستان کی صحیح صورت حال کا بیان اور مسلم ممالک کے اتحاد کی کوششیں شامل تھیں۔ مصر کے علاوہ لیبیا، سوڈان، شام، لبنان، سعودی عرب اور کویت کا دورہ اس پروگرام میں شامل تھا۔ اس دورہ میں جمعیۃ کے وفد

کو خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ انہوں نے عربوں کو مشرقی پاکستان کی صحیح صورت حال بتائی۔ خاص طور پر بھارت کے توسیع پسندانہ عزائم کا پردہ چاک کرتے ہوئے انہیں اسرائیل کے عزائم سے ہم آہنگ کیا۔ لیبیا میں اس وفد کا بہت زیادہ خیر مقدم ہوا۔ وہاں کے اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی نے اس وفد کو بہت اہمیت دی۔ (۱۲۰)

مفتی محمود نے ملک کو در پیش اس کٹھن اور سنگین مرحلہ میں حب الوطنی کا بھرپور ثبوت دیا۔ اور باوجود اس کے کہ وہ تحریک پاکستان اور اس کے نتیجے میں ملک کی تقسیم کے خلاف تھے۔ لیکن جب ایک دفعہ یہ ملک معرض وجود میں آگیا۔ تو پھر آپ نے اس کی ترقی و استحکام اور اتحاد و اتفاق کے لئے بہت زیادہ قربانیاں دیں۔ اور ان لوگوں سے جو تحریک پاکستان کا تمغہ اپنے سینے پر سجاتے ہوئے اپنے آپ کو سب سے زیادہ محب وطن ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مفتی محمود اور ان کے رفقاء نے ان سے زیادہ حب الوطنی کا مظاہرہ کیا۔ شیخ مجیب الرحمن تو اصل میں مسلم لیگی تھے۔ اور تحریک پاکستان میں اس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ مسٹر بھٹو بھی اپنے بزرگوں کو یہ اعزاز دیتے ہوئے نہیں تھکتے تھے کہ ان کا پاکستان کے قیام میں برابر کا حصہ ہے۔ یہی عناصر ملک کو دولخت کرنے میں پیش پیش تھے۔

نومبر ۱۹۷۱ء میں ہندوستان اور پاکستان کی فوجوں کے درمیان سرحدات پر جھڑپوں کا سلسلہ بڑھ گیا تھا۔ جس کا آغاز جون سے ہو چکا تھا۔ مشرقی پاکستان کے عوام بھی پاکستانی فوج کے خلاف تھے۔ ملک کے دونوں حصے عملاً کٹ چکے تھے۔ اور یوں پاکستانی فوج کو شکست سے دوچار کر دیا گیا۔ پاکستان کے فوجی، غیر فوجی 92000 افراد کو قیدی بنا لیا گیا۔ اور اس کے اگلے دن بنگلہ دیش کی آزادی کا اعلان کیا گیا۔

20/ دسمبر 1971ء کو جنرل یحییٰ خان نے صدارت سے استعفیٰ دیا۔ اور حکومت پیپلز پارٹی کے سربراہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے حوالہ کر دی۔ اور وہ ملک کے پہلے سول مارشل لاء

ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے ملک کے حکمران بن گئے۔ اس سے قبل صدر یحیٰی خان نے مسٹر نور الامین کو پاکستان کا وزیر اعظم اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو ڈپٹی وزیر اعظم اور وزیر خارجہ کے عہدہ پر متمکن کیا تھا۔ جو وہ اس وقت اقوام متحدہ کے سلامتی کونسل کے اجلاس میں شریک تھا۔ اور وہاں اس نے جنگ بندی سے متعلق پالینڈ کی قرارداد کو پھاڑا تھا۔ وہاں سے یحیٰی خان نے ان کو بلا کر اقتدار ان کے حوالہ کیا۔

جب عوامی مطالبہ کے دباؤ پر جناب ذوالفقار علی بھٹو نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے لئے فوجی وجوہات کی تحقیقات کے لئے ایک کمیشن بنایا۔ جو اپنے چیئرمین محمود الرحمن کی وجہ سے محمود الرحمن کمیشن کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ تو دیگر رہنماؤں کی طرح مولانا مفتی محمود بھی اس کمیشن کے سامنے پیش ہوئے۔ اور کمیشن کے سوالات کے آپ نے جو جوابات دیئے وہ تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ آپ نے اس میں شیخ مجیب کی طرح اس سازش میں یحیٰی خان اور مسٹر بھٹو کو بھی اس کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ اور اپنے پہلے سوال کے جواب میں آپ نے ۳ مارچ ۱۹۷۱ء کے ڈھاکہ سیشن کے التواء کو اس کی بنیادی وجہ قرار دیا ہے۔

ملک کو درپیش مسائل کے حل کے بارے میں حکمت عملی

مولانا مفتی محمود، ایک بہترین عالم دین اور مفتی اعظم کے ساتھ ساتھ آپ اعلیٰ درجہ کے سیاسی مفکر بھی ہیں۔ آپ نے اپنے جماعتی کارکنوں کو وقت کے تقاضوں کے مطابق ملک کو درپیش مسائل و مشکلات کے حل کرنے کے لئے جو نظریات، پالیسیاں، حکمت عملی اور ڈپلومیسی دی ہے۔ وہ واقعتاً ان مسائل و مشکلات کے حل کے لئے ہر لحاظ سے بہترین ہیں۔ آپ نے ساری سیاسی زندگی میں ان مسائل و مشکلات کے حل پر زور دیا ہے۔ اور ان کا پرچار کیا ہے۔ اور کارکنوں کی ذہن سازی کی ہے۔ اس لحاظ سے آپ کو "مفکر اسلام" اور "قائد جمعیۃ" کے خطابات سے یاد

کیا جاتا ہے۔ مسائل خواہ تعلیمی ہوں سماجی ہوں، سیاسی ہوں یا معاشی، داخلی ہوں یا خارجی تمام مسائل کے حل کے بارے میں آپ کی نظریات، خیالات اور ڈپلومیسی سے آج بھی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

انہوں نے اپنی فراست و بصیرت، دور اندیشی اور اپنی مجاہدانہ زندگی سے انگریزوں کے دین و سیاست میں پیدا کردہ تفریق کو ختم کر دیا۔ آپ ملکی حالات اور مسائل و مشکلات سے پوری طرح آگاہ تھے۔ اور آپ کی کوشش رہی کہ ملک سے ابتری کی یہ کیفیت، اور قومی سطح پر بڑھتی ہوئی لادینیت سے قوم کو نکالے آپ نے ملک کی جغرافیائی، سیاسی، تعلیمی، معاشی، معاشرتی بہتری کے لئے حتی المقدور جد و جہد کی۔ آپ ایک تقریر میں ملکی مسائل و مشکلات کی نشاندہی کرتے ہیں اور اس کے حل کے بارے میں اپنی ڈپلومیسی بتاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

> ہمارے یہاں بھی بے چینی اور بے دینی کے سائے پھیلے ہوئے ہیں عوام میں غلط قسم کے سیاسی، اقتصادی و معاشی درجہ بندی ہے۔ اور ان باتوں کے نتیجے میں ہر طرف بے چینی، بے اطمینانی اور انتشار سر اٹھائے ہوئے ہیں جب تک ہم ان سب کا ازالہ نہیں کر لیتے۔ ایک بہتر مستقبل کی توقع نہیں کر سکتے۔ ہمیں پاکستان کی نئی نسل کو بے چینی اور بے دینی کے خطرات سے بچانا ہے۔ ہمیں سیاسی جبر وروایات کا خاتمہ کرنا ہے۔ ہمیں اقتصادی تفاوت کے ایسے عوامل دور کرنے ہیں جن سے بے چینی اور بے اطمینانی کے سائے گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ ان دونوں مقاصد کو اسلامی احکام کے ذریعہ سے بہتر طریقے پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جب ایک بار ملک میں اللہ کی حاکمیت کا اصول نافذ ہو جاتا ہے۔ تو قرآن و سنت کے تمام احکام اور ارشادات دستور و قانون کی اساس قرار پاجاتے ہیں۔ اور ملک کے تمام محکمے عدلیہ، پولیس اور فوج وغیرہ ان احکام کی پابند بنادی جاتی ہیں۔ تو اس کے بعد کسی بھی گروہ کے لئے سیاسی جبر و بالادستی کے مواقع باقی نہیں رہتے اسلام کی رو سے سربراہ مملکت سے لیکر ایک عام شہری تک اسلامی احکام کے اجراء

وفادی کی پابندی سے مستثنیٰ نہیں رہ سکتا۔ اور سب یکساں طور پر قانون کے سامنے جواب
دہ بن جاتے ہیں اس طرح تمام بدعنوانیوں کا خاتمہ ہو تا ہے۔(121)

مفتی صاحب اپنی شب و روز جد و جہد سے ملک سے تمام بدعنوانیوں، بد اخلاقیوں، ناہمواریوں اور طبقاتی تقسیم کو ختم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اور وہ چاہتے تھے کہ تمام مسلمان ملا بھائی بھائی بن جائیں اور ہر قسم کی تفاوتیں اور اس کے نتیجے میں نفرتیں اور ناچاقیاں ختم ہوں۔ وہ اسی تقریر میں آگے جاکر فرماتے ہیں۔

> ہم پاکستان کے غریب عوام، کسانوں، مزدوروں، طالب علموں اور تمام آدمیوں کو اس سطح پر لانا چاہتے ہیں جہاں پاکستان کے تمام مسلمان ملا بھائی بھائی نظر آسکیں۔ اور یہ اس وقت ممکن ہو سکے گا جب کہ بے لاگ طور پر ملک میں قرآن و سنت کے احکام نافذ کر دیئے جائیں۔ خاتم النبیین ﷺ اور خلفائے راشدینؓ کے عہد کا عملی نمونہ اختیار کر لیا جائے اور ملک سے سیاسی، اقتصادی اور معاشی ظلم و جبر کا خاتمہ کر دیا جائے۔(122)

آپ ملک کے موجودہ تمام مسائل و مشکلات کا حل صرف اسلامی نظام میں بتاتے ہیں۔ آپ بتاتے ہیں کہ نہ صرف انفرادی بلکہ ہماری اجتماعی مسائل کا حل بھی صرف اسلام سے وابستہ رہنے میں ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ اجتماعی مسائل کا بنیادی ہمارے عقیدہ اور یقین کا کمزور اور متزلزل ہونا ہے۔ اور اس کا علاج اسلام میں ہے جس سے عقیدہ و یقین میں استحکام آتا ہے اور غیر متزلزل عقیدہ و یقین سے ایک مسلمان کے لئے زندگی کا ہر مشکل آسان اور ہر مصیبت راحت میں بدل جاتی ہے۔ جس سے نہ صرف پاکستان کے مسائل حل ہونگے بلکہ عالم اسلام کے تمام مسائل و مشکلات کا حل بھی اسی میں ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

> سامعین محترم! میں پوری بصیرت اور پورے یقین کے ساتھ یہ اعلان کرتا ہوں کہ عہد حاضر کے وہ مسائل جن سے انسانیت کو سابقہ پڑا ہے ان کا حل اسلام میں موجود ہے۔ اور پاکستان جن مسائل سے دوچار ہے وہ بھی صرف اسلام کو اختیار کرنے سے حل

ہو سکتے ہیں۔ کل پاکستان جمعیۃ علماء اسلام اول دن سے اس بنیادی اور اہم نکتہ پر زور دیتی چلی آرہی ہے۔ سائنس کی ٹیکنالوجی کے اس دور نے انسانی فکر ہی کو نہیں بلکہ اجتماعیت کے ایک ایک مسئلہ کو بھی گہرے طور پر متاثر کیا ہے۔ آج انسان کو گہرے اعتقاد و یقین کی ضرورت ہے۔ اور اجتماعیت کے مسائل میں انسانیت کے مجموعی مفاد کا مقدم رکھنا بھی نہایت ضروری ہے۔ اسلام ان دونوں ضرورتوں کو جس خوبی و کمال کے ساتھ پورا کرتا ہے اس کا اندازہ قرآن و سنت پر بصیرت مطالعہ ہی سے کیا جا سکتا ہے اسلام انسان کو ایک نہایت مستحکم اور غیر متزلزل عقیدہ و یقین سے سرشار کرتا ہے۔ جس کے اثر سے ایک مومن و مسلم زندگی کی ہر مشکل عبور کرتا ہوا موت کے پل پر سے ہنستے مسکراتے گزر جاتا ہے۔ اور انسانیت کے مجموعی مفاد کو اسلام میں اس حد تک ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ایک مسلمان دوسرے کی بھلائی اور فائدے کے لئے اپنی محبوب سے محبوب چیز کو قربان کر دینے کا پابند ہے۔ ان صفات سے حامل دین سے ہی تمام مسائل کے حل کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اور پاکستان میں ہم مسلمان اس کا عملی مظاہرہ کر کے دنیا کو اس طرف متوجہ کر سکتے ہیں۔ پاکستان میں بھی ہمارے مسائل کی یہی نوعیت ہے۔(123)

تعلیمی مسائل

اسلام کو یہ منفرد مقام حاصل ہے کہ اس نے علم کو نہایت اونچا مقام عطا کیا ہے۔ اور حصول علم کی اہمیت، اس کی ضرورت کو بہت واضح احکامات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اور اس پر جو پہلی وحی نازل ہوئی وہ علم اور خاص کر علم بالقلم سے متعلق ہے۔ قرآن حکیم سراپا علم و حکمت ہے۔ اور جس نے اس سے تعلق جوڑا وہ سراپا علم بن گیا۔ قرآن حکیم نے بتایا کہ آدم علیہ السلام اور بنی آدم کی دیگر مخلوقات کی فضیلت و برتری کا دار و مدار علم کی صلاحیت و استعداد پر ہے۔ علم کو روشنی کہا گیا ہے۔ یہ جہاں ہوتی ہے وہاں جہالت کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں۔

علم کو نور اور جہالت کو ظلمت کہا گیا ہے کہ ایک علم ہی باقی تمام ظلمت پر غالب ہو کر رہتا ہے۔ موجودہ دور میں علم کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ آج قوموں میں وہی قوم سرفراز ہے جس کے لئے علم کے دروازے کھلے ہیں۔ علم دین کا ہو یا دنیا کا۔ وہ چاند نالاتا ہے۔ دنیوی علم کو اگر اللہ کی معرفت اور اسکی مخلوق کے نفع میں استعمال میں لایا جائے۔ تو وہ بھی نور علی نور ہو جاتا ہے۔

برصغیر ہند و پاک پر تقریباً ڈھائی سو سال انگریز حکمران رہا۔ اس نے جہاں ہندوستان بھر کے وہ ذرائع اس کے رہنے والوں پر بند رکھے جس سے ان میں بیداری آئے۔ آزادی کی خواہش پروان چڑھے اور ملک اور اس کے رہنے والوں میں خوشحالی، استحکام اور ترقی کے باعث ہوں۔ اس نے ہندوستان کے ساتھ ہر وہ برا سلوک کیا جو ایک غلام کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے انگریز کو جب شروع میں یہاں پاؤں جمانے کا موقع ملا۔ تو اس نے سب سے پہلے یہاں کی تعلیمی درسگاہوں اور ان میں تعلیم دینے اور تعلیم حاصل کرنے والوں کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔ انگریز نے اس غلام قوم کو تعلیم کا ایسا انتظام اور نصاب مرتب کر کے دیا۔ جس کے بارے اس کے تشکیل کر دینے والے نے کہا کہ یہ ایسا نصاب تعلیم ہے کہ اگر ہندوستانیوں کو انگریز نہ بنا سکے۔ لیکن ان کو ہندوستانی بھی نہیں رہنے دے گا۔ اور یہی ہوا کچھ انگریزوں نے کچھ ان کے ناز پروردہ ہندوستانیوں نے مسلمانوں کو دین سے برگشتہ کرنے، ان کے عقائد و نظریات کو بگاڑنے اور ان کے دلوں سے آزادی کے جذبہ کو نکالنے میں انگریزوں کے دیے ہوئے نظام تعلیم کے ذریعہ بڑا کردار ادا کیا۔ اور مسلمانوں کے اندر ایک ایسا طبقہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ جو شکل و صورت سے ہندوستانی لیکن مگر خیالات و نظریات اور طور اطوار کے لحاظ سے انگریز ہیں۔ اور یہی وہ مراعات یافتہ طبقہ تھا۔ جس نے آزادی کی جدوجہد میں رکاوٹ ڈالی۔ اور آزادی کی تڑپ رکھنے والوں اور اس کے لئے قربانی دینے والوں کے راستہ میں پتھر بنے۔ انکی دینی حمیت اور قومی غیرت کی جگہ انگریز کی بوٹ پالش اور انگی خوشامد نے لے لی۔ اور یوں خاص کر مسلمانوں کو طبقات میں تقسیم کر کے ان کی قومی، ملی روح کو ان

کے قومی ملی وجود سے نکال دیا۔ اور ان کو بے جان لاش کر دیا۔ ایک طبقہ ایسا تھا۔ جو دینی علم سے بہرہ ور تھا جنہوں نے بڑی مشکل اور بڑی قربانیوں کے بعد اس کو سینے سے لگائے رکھا۔ اور وہی طبقہ آزادی کا سرخیل اور اس کے راستے میں اس کے حصول کے لئے قربانیاں دینے میں پیش پیش رہا۔ مسلمانوں کی قربانیوں کی بدولت اور دوسری جنگ عظیم کے نتیجہ میں جب انگریز نے یہاں سے رخصت سفر باندھا۔ اور ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ہندوستان اور پاکستان دو ملک معرض وجود میں آئے۔ تو پھر پاکستان کا سارا انتظامی ڈھانچہ انگریز کے دیئے ہوئے نظام کے مطابق چلایا جاتا رہا۔ حتیٰ کہ تعلیم جو مسلمانوں کی میراث ہے۔ اس کو بھی انگریزی نصاب و نظام کے ماتحت کر دیا گیا۔ جس سے بڑے بڑے مسائل نے جنم لیا۔

مولانا مفتی محمود نے تعلیم کے اعتبار سے مسائل کی نشاندہی کی ہے۔ اور ان کے حل کے بارے میں جو پالیسی اختیار کی ہے۔ کوشش کی جائے گی کہ حوالہ جات کے ساتھ اس سے بحث کی جائے۔

مفتی صاحب کی طرف سے یہ تجویز بھی آئی ہے کہ تعلیم کا مسئلہ حل کرنے کے لئے ہنگامی بنیادوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کام کے لئے نجی شعبہ کی حوصلہ افزائی بھی ضروری ہے۔ اور اس کے لئے ٹیکس میں چھوٹ بھی دی جائے۔ تاکہ قوم کے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے میں جو رکاوٹیں ہیں ان کا خاتمہ ہو سکے۔ اور شرح تعلیم میں خاطر خواہ اضافہ ہو۔ ایک انٹرویو میں ایک سوال کے جواب میں کہتے ہیں۔ " تعلیم اور ٹرانسپورٹ کا مسئلہ حل کرنے کے لئے ہنگامی بنیادوں پر کام کرنے کا آغاز ہو۔ اس مقصد کے لئے نجی شعبے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اس کے لئے ٹیکس وغیرہ کی چھوٹ بھی دی جا سکتی ہے "۔ (124)

مفتی صاحب نے اس ضرورت پر زور دیا ہے کہ تعلیم کا نظام ایسا ہو جو ہمارے نظریہ ملت روایات اور ہماری ثقافت کے مطابق ہو۔ ورنہ اس کے بغیر ہم اچھا مسلمان تو کجا اچھا پاکستانی

بھی کسی بچے کو نہیں بنا سکیں گے۔ وہ ملک کے نظام تعلیم کو یکسر تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ وہ ایسے نظام تعلیم کے حق میں تھے جو ہماری نظریاتی اور ملی ضروریات کے مطابق ہوں۔ اور جس سے استفادہ کرنے والے بچے صحیح مسلمان اور وفادار پاکستانی بن سکیں۔ وہ فرماتے ہیں۔ " جب تک ہمارا نظام تعلیم ہمارے نظریہ حیات، ہماری روایات اور ہماری ثقافت کو مد نظر رکھ کر ترتیب نہیں دیا جاتا اس وقت تک ہم اچھا مسلمان تو کجا اچھا پاکستانی بھی پیدا نہیں کر سکیں گے۔ (125)

انگریز کے دیئے ہوئے نظام تعلیم نے دو طبقات پیدا کر دیئے تھے۔ اور دونوں میں باوجود مسلمان اور پاکستانی ہونے کے بعد المشرقین تھا۔ مفتی صاحب کی شدید خواہش تھی کہ دینی تعلیم کے طلبہ اور کالج، یونیورسٹی کے طلبہ کے درمیان انگریز کی پیدا کردہ یہ خلیج ختم ہو۔ اور ان میں مکمل ہم آہنگی و یگانگت پیدا ہو۔ جناب محمد فاروق قریشی صاحب مفتی کی ڈپلومیسی کے بارے میں رقمطراز ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

مفتی صاحب دینی تعلیم کے طلبہ اور کالج، سکول، یونیورسٹی کے طلبہ میں باہم یکجہتی کے حامی تھے۔ وہ دونوں طبقات کو نامکمل خیال کرتے تھے۔ ان کے خیال میں شیخ الہندؒ کے مطابق دینی علوم حاصل کرنے والے طلبہ کو فنی علوم بھی حاصل کرنے چاہئیں اور فنی علوم کے طلبہ پر دینی تعلیم بھی ضروری ہے۔ اس وقت تک دونوں طلباء علم کے لحاظ سے نامکمل ہیں۔ ان کے خیال میں مسلمان طلباء میں علم کی یہ تقسیم بھی انگریز کی یادگار ہے۔ جس کا خاتمہ جس قدر جلد ہو بہتر ہے۔ (126)

مفتی صاحب ہمیشہ عوامی اجتماعات ہوں یا خصوصی مجالس، اسمبلی کا ایوان ہو یا اخباری نمائندوں سے خطاب۔ ہر جگہ آپ انگریزوں کے پیدا کردہ طبقاتی نظام تعلیم کو تنقید کا نشانہ بناتے تھے۔ اور اس کو ختم کرنے کی ڈپلومیسی بھی بتاتے تھے۔ ایک تقریر میں جہاں وہ برطانوی سامراج کے مسلط کردہ اور پاکستانی حکمرانوں کی طرف سے جاری کردہ نظام تعلیم کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔

وہاں اس کے ساتھ اس کے خاتمہ اور اس سے بہتر صورت بتا کر اس کے حل کے بارے میں حکمت عملی بھی بتاتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

" برطانوی سامراج نے ہمیں شب و روز کی چالوں اور سازشوں سے دو مختلف نظام ہائے تعلیم میں تقسیم کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے یونیورسٹی اور مدرسہ دو اسلحہ ساز فیکٹریوں کی طرح اپنی اپنی پیداوار میں مسلسل و پیہم اضافہ کر رہے ہیں۔ اس کے لازمی نتیجے میں نظریاتی جنگ جاری ہے۔ اور پاکستان کوئی مستقل آئین بنانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ دراصل مدارس کو یونیورسٹیوں سے علیحدہ رکھ کر دونوں نظاموں سے فارغ ہونے والے طلبہ کے اذہان میں ایک تباہ کن خلا پیدا کیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے دونوں میں نظریاتی جنگ بلا انقطاع جاری ہے۔ یونیورسٹیوں میں یہ بات ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ علم دین پر دسترس چنداں سود مند نہیں اور مدارس کے طلبہ عصر جدید کے علوم و فنون سے بے بہرہ رہتے ہیں اور وہ اسے دین نہیں سمجھتے۔ فی الحقیقت انگریز کا منشا بھی یہی تھا کہ مسلمان ہمیشہ کے لئے خلافت کے راستے سے بے بہرہ رہیں۔ بعض حضرات کو اسکولوں اور کالجوں کی طرف بھیجا۔ جو دین سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ لیکن اس کے لئے نصاب تعلیم بھی ایسا تشکیل دیا کہ جسے پڑھ کر دین سے نفرت پیدا ہو اور کچھ لوگوں کو دنیا سے بالکل ناواقف رکھ کر دینی مدرسوں میں مقید کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اب صورت حال یہ ہے کہ دینی مدارس کے طلبہ تو حکومت کے محکموں میں آ نہیں سکتے کیونکہ ان لوگوں کو دنیاوی علوم سے واقفیت نہیں ہے جس کی وجہ سے اختلاف و بحران ہے۔

پھر مفتی صاحب نے اس افسوسناک، المناک صورت حال سے نکلنے کی جو صورت بتائی ہے۔ وہ قابل غور بھی ہے اور قابل عمل بھی اور نتیجہ کے اعتبار سے سو فیصد درست بھی۔ وہ فرماتے ہیں۔

اس سے بچاؤ کی ایک ہی صورت ہے کہ جو فنی علوم پڑھتے ہیں انہیں ان طلباء عربیہ سے ملا دیا جائے۔ قرآن و حدیث سے جوڑ دیا جائے۔ اور یہ لوگ جو فرشتوں کی مانند ہیں ان کو دنیا والوں سے ملا دیا جائے تو اس طرح ہمارے ماہرین قانون مستقبل میں قوم کی بے نظیر رہنمائی کر سکیں گے۔(127)

مفتی صاحب کی اس تقریر کو نقل کرنے کے بعد محمد اکبر شاہ ہاشمی لکھتے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب کی یہ تقریر آپ کے افکار عالیہ کی مظہر ہے۔ آپ کے بلند ارادوں اور اسلامی جذبات و افکار کی آئینہ دار ہے۔ اور نظام تعلیم کے حوالے سے اپنے خیالات کی پوری تشریح و توضیح ہے۔ یہ الفاظ آپ کے محض جذبات نہیں بلکہ ملت اسلامیہ کے اجتماعی احساسات کو بیدار کرنے کی کوشش ہے۔(128)

مفتی صاحب کے بقول تعلیم کے مسئلہ میں بہت خرابیاں ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ جدید تعلیم گاہوں میں حکومتی پالیسیوں کی خرابی کے باعث آج صرف کلرک تیار کئے جاتے ہیں۔ غریب طلبہ پر انجینئرنگ اور میڈیکل کالجز کے دروازے بند ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے جو وظائف دیئے جاتے ہیں وہ بھی سیاسی رشوت کے طور پر خاص لوگوں کو دیئے جاتے ہیں۔ تعلیم کے مسئلہ میں خرابیوں کو دور کرنا ہو گا ورنہ اس وقت یہ قوم اعلیٰ روایات کی امین نہیں بن سکے گی۔ آپ فرماتے ہیں۔

جہاں تک تعلیم کا مسئلہ ہے تعلیم کے مسئلہ میں جو خرابیاں ہیں بہت زیادہ ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں آج ہمارے ہاں لڑکوں کو سکولوں اور کالجوں میں .... صرف کلرک تیار کرنے کے لئے اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔ فنی تعلیم یہاں پر نہیں دی جاتی۔ اور کسی انجینئرنگ کالج میں یا میڈیکل کالج میں غریب لوگوں کا داخلہ ممکن نہیں ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے جو وظائف دیئے جاتے ہیں وہ بھی ترجیحی بنیادوں پر اپنے خاص لوگوں کو سیاسی رشوت کے طور پر اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔(129)

تعلیم کے مسئلہ کے بارے میں مفتی صاحب کے خیالات اور آپ کی ڈپلومیسی بالکل واضح ہے۔ اس لئے جب آپ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے تو محدود اختیارات کے باوجود آپ نے اس کی بہتری کے لئے اقدامات کئے۔ بقول محمد فاروق قریشی کے۔

مفتی صاحب نے اپنے دور حکومت میں کالج میں داخلہ کے لئے میٹرک کے ساتھ ساتھ قرآن ناظرہ اور نماز کی تعلیم بھی ضروری قرار دی۔ جس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ میٹرک کے امتحان کے فوراً بعد صوبہ سرحد کے دینی مدارس و مساجد میں طلبہ کی بھرمار ہو گئی۔(۱۳۰)

مفتی صاحب نے صوبہ سرحد میں تعلیم عام کرنے کے لئے دور رس اقدامات کئے۔ تعلیمی سہولتوں کے لئے ایک جامع منصوبے پر عمل درآمد شروع کیا۔ خاص کر سکولوں میں قرآنی تعلیم کو عام کرنے کے خاص انتظامات کئے۔ جناب اشفاق ہاشمی لکھتے ہیں۔ "مفتی صاحب نے نئی پود کو قرآنی تعلیم سے آشنا کرنے کے لئے صوبہ کے ۱۹۱ سکولوں میں علوم دینیہ کے ماہر قرآء اور فاضل علماء کا تقرر کرنے کا اعلان کیا"۔(۱۳۱)

تعلیم کے بعد روزگار کا حصول ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔ ہزاروں سے تعداد تجاوز کر کے اب لاکھوں تک بے روزگار تعلیم یافتہ نوجوانوں کی پہنچ چکی ہے۔ اور سال بہ سال اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور اب اس مسئلہ نے قومی المیہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ کیونکہ اکثر اخباری رپورٹس سے یہ بات ثابت ہوئی ہے۔ کہ ملک میں جرائم کی بڑھتی ہوئی تعداد میں اضافہ کی وجہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بیروزگاری ہے۔ مفتی صاحب کی ڈپلومیسی یہ ہے کہ نوجوانوں کو ایک منصوبہ بندی کے تحت تعلیم دی جائے۔ فنی تعلیم کے لحاظ سے ہر شعبہ میں جس قدر نوجوانوں کی ضرورت پیش آنے والی ہے۔ اتنے ہی طلباء کو مطلوبہ شعبہ میں مطلوبہ تعداد کو فنی تعلیم فراہم کی جائے۔ بے روزگار نوجوانوں کے لئے گزارہ الاؤنس مقرر کیا جائے۔ محمد فاروق قریشی تحریر کرتے ہیں۔

مفتی صاحب فراغت تعلیم کے بعد بے روزگاری کو معاشرہ کے لئے دق سمجھتے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق منصوبہ نظام تعلیم رائج ہونا چاہیئے۔ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ملک کی مجموعی ضروریات کا تخمینہ لگایا جائے۔ اور جس شعبہ میں جس قدر افرادی قوت کی ضرورت ہو اسی شعبہ میں اسی قدر طلبہ کو داخلے دیئے جائیں۔ اور حصول تعلیم کے بعد ہر فارغ التحصیل کو روزگار مہیا کیا جائے۔ تاکہ معاشرے میں بے روزگاری کی لعنت موجود نہ ہو۔ اور جب تک حکومت روزگار فراہم نہ کر سکے اس وقت ان تعلیم یافتہ افراد کو گزارہ الاونس دیا جائے۔

آگے جا کر محمد فاروق قریشی صاحب لکھتے ہیں کہ مفتی محمود صاحب نے اپنی وزارت کے دوران بے روزگار نوجوانوں کو تجرباتی بنیادوں پر الاونس دینے کا فیصلہ بھی کیا تھا۔ اور ابتدائی طور پر انجینئرنگ گریجویٹس کی رائے شماری کا حکم بھی دیا تھا۔ مگر مرکز کی بے جا مداخلت اور حکومت سے استعفیٰ کی وجہ سے اس منصوبہ پر عمل کی نوبت نہ آسکی۔ وہ لکھتے ہیں۔ "اس سلسلے میں وہ تجرباتی طور پر اپنے صوبہ میں عمل کرنا چاہتے تھے۔ اور انہوں نے ابتدائی طور پر انجینئرنگ گریجویٹس کی رائے شماری کا حکم دیا تھا۔ مگر مرکز کی بے جا مداخلت اور حکومت سے علیحدگی کے بعد ان کا یہ منصوبہ روبعمل نہ آسکا"۔(132)

مفتی صاحب نے دینی مدارس کی ترقی و استحکام کی طرف بھی بار بار حکومتوں کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ وہ ایک بجٹ تقریر میں قومی اسمبلی میں بیان دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> اس ملک میں مشرقی و مغربی دونوں حصوں میں کثرت سے مدارس عربیہ قائم ہیں۔ جہاں خالص دینی ماحول میں درس نظامی کا نصاب پڑھایا جاتا ہے۔ ان مدارس کی امداد کے لئے اسلامی ملک کے قومی بجٹ میں ایک حصہ مخصوص کرنا ضروری ہے۔ کیا یہ مدارس ہمارے ملک کے تعلیمی ادارے نہیں ہیں؟ کیا اس میں اس ملک کے بچے تعلیم نہیں پاتے؟ فرنگی دور اقتدار میں ان دارالعلوموں کو تعلیمی طور پر نظر انداز کرنا تو قرین قیاس تھا۔ لیکن آج آزادی کے بعد بھی ہمارے بجٹ میں ان مدارس کے لئے ایک پائی ہوتو نہیں۔(133)

اس بجٹ تقریر میں آپ نے اسلامی قانون پر تحقیقی کام کے لئے ایک معتدبہ رقم مخصوص کرنے، جدید علوم کے تصانیف کے لئے علمی ادارے کے قیام اور نصاب تعلیم کو دینی ضرورتوں کے مطابق زیر غور لانے کے لئے کمیشن مقرر کرنے کا بھی مطالبہ کیا۔(134)

معاشرتی مسائل

پاکستان میں معاشرتی مسائل بھی انگریزی نظام کے پیدا کردہ ہیں۔ خاص کر عورتوں سے متعلق مسائل کی وجہ سے معاشرہ میں فساد و بگاڑ اور اکثر دفعہ قتل و مقاتلہ تک نوبت پہنچتی ہے۔ یہ جہاں تک دین سے دوری کی وجہ سے ہیں۔ وہاں انگریز کی روایات کا بھی ان میں بڑا دخل رہا ہے۔ مفتی محمود صاحب معاشرہ کے مسائل اور اخلاق کی پستی پر بڑے کڑھتے تھے۔ محمد فاروق قریشی تحریر کرتے ہیں۔

> معاشرتی مسائل کے سلسلے میں مولانا مفتی محمود کا تجربہ بہت گہرا ہے۔ وہ معاشرہ کے اخلاق کی پستی پر دن رات کڑھتے تھے۔ ان کے خیال میں معاشرے کی خرابی میں ہمارے انگریزی نظام کے پروردہ بیوروکریٹ کا بڑا دخل ہے۔ انہوں نے اپنے دور حکومت میں انگریزی روایات کو گن گن کر ختم کیا۔ تمام سرکاری آفیسرز کو قومی لباس کی ہدایت کی تاکہ تمیز بندہ و آقا ختم ہو۔ رشوت کو معاشرے کا سرطان قرار دیا۔ ملی وحدت کے لئے قومی لباس کے طور پر قمیص شلوار کو پسند کیا۔(135)

عورتوں کے حقوق کے بارے میں آپ نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ عورتوں پر بہت ظلم ہو رہا ہے۔ علماء نے ان پر ظلم کے ازالہ کے لئے بہت قربانیاں دی ہیں اور دے رہے ہیں۔ آپ نے عورتوں کو یقین دلایا۔ کہ علماء آپ کے دشمن نہیں نہ ہی آپ کے خلاف ہیں۔ بلکہ ان کی کوشش ہے کہ عورتوں کو وہ تمام حقوق ملیں جو اسلام انہیں دیتا ہے۔ اور جن میں ان کے جان و آبرو کی تحفظ کی مکمل ضمانت ہے۔ وہ بتاتے ہیں۔

مجھے خواتین سے انتہائی ہمدردی ہے اور مجھے احساس ہے کہ موجودہ دور میں خواتین کے اوپر بڑے بڑے ظلم ہو رہے ہیں امیری بہنیں یہ بات دل سے نکال دیں کہ علماء خواتین کے خلاف ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ علماء ہمیشہ خواتین کے حقوق کے لئے لڑے ہیں۔ فرنٹیئر میں خواتین کو وراثت میں جو حق ملا ہے یہ وراثت بل انگریزوں کے زمانہ میں پاس ہوا تھا۔ وہاں کے علماء کرام نے عورتوں کی محرومی کے خلاف تحریک چلائی تھی اور کہا تھا کہ اگر عورتوں کو وراثت نہیں دو گے تو یہ اسلام کے خلاف ہے۔ کفر ہے، عورتوں پر سراسر ظلم ہے۔(136)

اسی بیان میں مفتی صاحب نے عورتوں کو یقین دہانی کرائی ہے کہ اسلام میں ہمیشہ مردوں نے جس طرح ان کے حقوق کی حفاظت کی ہے آئندہ بھی کریں گے۔ اور ان کے حقوق کے لئے اسی طرح لڑیں گے۔ جس طرح اپنے حقوق کے لئے لڑتے ہیں۔ مفتی محمود نے یہ بھی بتایا کہ عورتوں کے حقوق کا جو واویلا کیا جاتا ہے۔ یہ مغرب و یورپ کے تقلید کی وجہ سے ہے۔ جبکہ اسلام ان کے حقوق کا بھرپور حامی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

ہم ان سے پھر کہیں گے کہ آپ ہماری مائیں، بہنیں، بیٹیاں ہیں آپ اپنے حقوق اسلام کے دائرہ کے اندر رہ کر مانگیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن خدا کے لئے اسلام کے خلاف جو بھی (قدم) غلطی سے اٹھایا گیا ہے اس کو ختم کیجئے۔ اور اس کمزوری کو دور کیجئے۔ جو کچھ بھی اسلام نے حق دیا ہے اور اسلامی شریعت نے حقوق دلائے ہیں وہ ان کو ضرور دلائے جائیں وہ ہماری مائیں بہنیں ہیں ہم ان کے حقوق کے لئے اسی طرح لڑیں گے جیسے اپنے حقوق کے لئے لڑتے ہیں۔ اسلام کی تاریخ میں عورتوں اور مردوں کے حقوق پر کبھی لڑائی نہیں ہوئی۔ آج جو عورتوں کے حقوق کی لڑائی کی فضا پیدا ہوئی ہے یا کی گئی ہے وہ موجودہ دور اور یورپ کی تقلید کی پیداوار ہے۔ ہم اب بھی ان کے حقوق کے حامی ہیں جو اسلام نے ان کو دئے ہیں۔(137)

مفتی محمود صاحب جہاں عورتوں کے معاشرتی حقوق کے لئے آواز بلند کرتے ہیں۔ وہاں آپ مردوں کے ساتھ عورتوں کے اختلاط اور آزادانہ گھومنے پھرنے کو بے حیائی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس لئے آپ نے اپنی وزارت علیا کے زمانہ میں عورتوں کے لئے پردہ کو لازمی قرار دیا تھا اور اس کو قانونی حیثیت دی تھی۔ محمد فاروق قریشی لکھتے ہیں کہ "عورتوں کے اختلاط اور آزادانہ بے پردہ گھومنے کو بے حیائی سے تعبیر کرتے تھے۔ اپنے دور حکومت میں عورتوں پر بلا وجہ بے پردہ گھر سے باہر نکلنے پر پابندی عائد کر دی تھی"۔(138)

مفتی محمود معاشرتی خرابیوں کے اسباب میں چار چیزوں کو بھی شمار کرتے تھے۔ اور اس خواہش کا اظہار کرتے تھے۔ کہ میرا بس چلے تو ان چار چیزوں پر پابندی عائد کر دوں۔ بقول محمد فاروق قریشی کے " تمباکو نوشی، تاش بازی، چائے اور پان کو معاشرتی خرابیوں میں شمار کرتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ میرا بس چلے تو ملک میں چار چیزوں کا استعمال ممنوع قرار دے دوں۔ تمباکو کا پتہ، پان کا پتہ، چائے کا پتہ اور تاش کا پتہ"۔(139)

مفتی صاحب معاشرتی خرابیوں کے ایک معالج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ان چار چیزوں کو معاشرتی خرابیوں میں سے شمار کرتے ہیں۔ اور واقعتاً ایسا ہی ہے۔ یہ جہاں پیسوں کا ضیاع ہے وہاں وقت اور صحت کا بھی ضیاع ہے۔ اور ان پر بہت سارا ملک کا زرِ مبادلہ خرچ کیا جاتا ہے۔ ان پر پابندی یقیناً ہر لحاظ سے ملک کے لئے اور عوام کے لئے نفع بخش ہے۔

جنرل ضیاء الحق کے دور میں پاکستان قومی اتحاد نے ان کے ساتھ کابینہ میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔ اس موقعہ پر مفتی صاحب سے نئی کابینہ سے آپ کی کیا توقعات ہیں؟ سے سوال کیا گیا۔ تو آپ نے جو تفصیلی جواب دیا۔ اس میں آپ نے معاشرتی مسائل کی بھی نشاندہی کی۔ اور یہ توقع ظاہر کی کہ نئی کابینہ کے ارکان ان معاشرتی مسائل کو حل کرنے میں کردار ادا کریںگے۔ آپ نے سوال کرنے والے کے جواب میں کہا۔

سادگی اختیار کی جائے، وزیر اپنا نمونہ پیش کریں۔ اپنے گھروں کی تزئین و آرائش پر ہزاروں روپے خرچ نہ کریں۔ ڈرائنگ روم میں قیمتی صوفوں کے بجائے چٹائی کیوں نہیں بچھائی جا سکتی؟ اور بیڈ روم میں قیمتی پلنگوں کے بجائے عام چارپائی کیوں نہیں کام دے سکتی؟ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ شہری علاقوں میں بڑے مکانوں کی تعمیر پر پابندی لگائی جائے........ تین سو گز سے زیادہ مکان کسی صورت نہ بننے دیا جائے۔ ہمارے اکثر ملکی قوانین ایسے ہیں جو رشوت کا دروازہ کھولتے اور لوگوں کے مصائب میں اضافہ کرتے ہیں۔ ان کا جائزہ لے کر ہر قانون میں چور دروازہ بند کر دیئے جائیں۔ رشوت، بد عنوانی اور ملاوٹ پر کڑی سزائیں دی جائیں۔ اور ان کا قلع قمع کر دیا جائے۔ شلوار قمیص کی حوصلہ افزائی ہو۔ سرکاری ملازم دفتر میں قومی لباس پہن کر آئیں۔ اس طرح غیر ملکی لباس جو نفسیاتی رعب داب عطا کرتا ہے۔ اس سے نجات مل سکے گی۔ ایسے ضوابط بنائے جائیں کہ جھوٹ چھاپا یا لکھا نہ جاسکے۔ جھوٹ ایک زہر ہے۔ جو معاشرہ کی اچھائیوں کو ڈس لیتا ہے۔ بے حیائی اور فحاشی کی روک تھام بھی ہو۔ ویڈیو، ٹیلی ویژن اور فلموں کی فوری اصلاح کی ضرورت ہے۔(۱۴۰)

پاکستان کے معاشی مسائل

کسی بھی ملک، قوم، معاشرے اور خاندان کے لئے معیشت ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر معاشی نظام صحیح خطوط پر استوار ہے۔ اور وہاں کے رہنے والے معاشی لحاظ سے مستحکم ہیں۔ تو وہ قوم، ملک مضبوط ہے۔ اور دوسری اقوام کے لئے اس کی پالیسیاں قابل رشک قرار دی جاتی ہیں۔ اور معاشی لحاظ سے مستحکم قومیں، ملک زندگی کے دیگر شعبوں میں مضبوط سمجھی جاتی ہیں۔ اور جو ملک، قوم معاشی لحاظ سے ابتری کا شکار ہو تو وہ دیگر شعبوں میں اضمحلال اور کمزوری کا شکار ہوتا ہے۔ دیگر قوموں، ملکوں کی نگاہ میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے اپنے وجود کو برقرار رکھنا بھی مشکل بنا دیا جاتا ہے۔

مولانا مفتی محمود کی معاشی ڈپلومیسی، پاکستان کے حالات کے تناظر میں یہ ہے۔ کہ ملک سے معاشی ناہمواری کو ختم کرنا ہوگا۔ جو انگریزوں کی غلط بخشیوں کی وجہ سے وجود میں آئی ہے۔ ان کی معاشی ڈپلومیسی کے بارے میں محمد اسماعیل شجاع آبادی لکھتے ہیں۔

> مفتی صاحب کے خیال کے مطابق ملت اسلامیہ کا سب سے بڑا اور بنیادی مسئلہ معاشی ناہمواری ہے۔ اور اس کی وجہ انگریز کی عطا کردہ وہ جاگیریں ہیں جو اس نے مجاہدین آزادی کی مخبری کرنے والوں کی نذر کی تھیں۔ اس سے انگریزوں کے دو مقاصد تھے ملت میں تفریق اور مسلمانوں میں معاشی ابتری۔ اس لئے آج ملک کے بیشتر علاقوں میں انگریز کی عطا کردہ جاگیروں کے قابض ملک و ملت کی اصل دولت پر ناجائز تصرف کرتے ہوئے قوم کی دولت کو ناجائز ذرائع پر خرچ کر رہے ہیں۔ جبکہ غریب محنت کش نان جویں تک کے لئے ترس رہا ہے۔(۱۴۱)

اسی مضمون میں مفتی صاحب انگریز کی عطا کردہ جائیدادوں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے بتاتے ہیں۔ کہ اس کا علاج یہ ہے کہ یہ جاگیریں ان جاگیرداروں سے لیکر ضبط کی جائیں اور ان کو کاشت کرنے والوں کے حوالہ کیا جائے۔ وہ کہتے ہیں۔

> ملک و ملت سے غداری اور انگریز کی غلامی کی عوض حاصل کردہ زمینیں اور حالیہ مدت میں بڑے بڑے لوگوں میں تقسیم کردہ زمینیں "غیر اسلامی ملکیت" کی ضمن میں آتی ہیں جنہیں بلا معاوضہ ضبط کر لیا جائے گا اور ان پر کاشت کرنے والوں کو صحیح مالک قرار دیا جائے گا۔(142)

اور اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں۔ "اسلام کے نزدیک زمین پر صرف اس شخص کو ملکیت کا حق پہنچتا ہے جس نے اپنی محنت سے اسے آباد کیا ہو"۔(143)

مفتی صاحب نے سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی برائیاں بیان کرتے ہوئے کہا کہ اسی نظام معیشت سے امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر بنتا جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں تمام

برائیوں کی اصلی وجہ یہی نظام ہے جب تک اس کو مکمل ختم نہیں کیا جاتا ہے ایک فلاحی معاشرے کا تصور کرنا ناممکن ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

> موجودہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت جس میں غریب، غریب تر اور امیر، امیر تر بنتے جارہے ہیں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا چاہیے۔ مغربی استعماری نظام، مغرب زدہ ظالمانہ نظام ہمارے تمام مسائل کی بنیاد ہے اور جب تک اس کا خاتمہ نہیں کیا جاتا اس وقت تک معاشرے میں فلاح کا کوئی تصور بے سود بے کار ہے خیال خام ہے۔(144)

ملک میں جن دنوں ۱۹۷۳ء کے آئین کے لئے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ جس کی تشکیل کے لئے بنائی گئی کمیٹی کے مفتی صاحب ایک اہم رکن تھے تو ان دنوں ۲۳ جون ۱۹۷۲ء میں "ختم نبوت کانفرنس" لاہور میں منعقد ہوئی۔ جس میں مفتی صاحب نے آئین کے بعض اسلامی دفعات پر روشنی ڈالی اور اس کی ضرورت و اہمیت کو اپنی تقریر میں واضح کیا۔ اسی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ آئین ایسا ہو جو ظلم کا خاتمہ کرے جس میں مزدور، کسان، محنت کش اور چھوٹے درجے کے ملازمین کے حقوق کا تحفظ ہو اور ان کو باعزت زندگی گزارنے کا موقع دے۔ انہوں نے کہا کہ مشرقی پاکستان کا المیہ بھی غریبوں، مزدوروں، محنت کشوں کی استحصال کی وجہ سے ہوا۔ اور اب مزید یہ ملک ایسے حادثات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ آپ نے فرمایا۔

> ہم چاہتے ہیں کہ آئین ایسا آئین ہو جس میں ظلم کا مکمل خاتمہ ہو اور جس میں کوئی شخص غریب پر ظلم نہ کر سکے۔ جس میں مزدور کو، کسان کو چھوٹے درجے کے ملازمین کو محنت کشوں کو ان سب کو پاکستان میں باعزت زندگی گزارنے کا موقع میسر ہو اور وہ بھی خوشحال زندگی بسر کریں۔
>
> ....
>
> .... مشرقی پاکستان کے سقوط کا واقعہ کیا کم ہے؟ مشرقی پاکستان کے سقوط کے واقعہ کو میں دہرانا نہیں چاہتا کہ وہ کیوں ہوا؟ بہت طویل اور دردناک داستان ہے۔ لیکن ہمیں اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر پھر بھی ہم نے پاکستان میں استحصال جاری رکھا، غریبوں کے حق چھینے، مزدوروں کا خون چوسا تو پاکستان میں کوئی نظام پاکستان کے وجود کو قائم نہیں رکھ سکتا۔(145)

مفتی محمود صاحب کی معاشی ڈپلومیسی اسلامی تعلیمات کے عین مطابق رہی۔ اور اسی کا پرچار کرتے رہے اسی طرح وہ یہ بھی کہتے تھے کہ وہ دولت جو ناجائز طریقوں سے کمائی گئی ہو اگر ہم کامیاب ہو گئے تو وہ تمام دولت ہم چھین لیں گے۔ ایک تقریر میں وہ فرماتے ہیں۔

> اسلام دولت آفرین ذرائع پر کنٹرول کرتا ہے اور کاروبار کے اسلامی اصولوں سے ہٹ کر حرام اور ناجائز طریقوں سے دولت کمانے کی قطعاً اجازت نہیں دیتا ہم اگر کامیاب ہو گئے تو حرام طریقوں سے کمائی ہوئی تمام دولت چھین لی جائے گی۔(146)

وہ ملک میں سودی نظام کے سخت مخالف تھے۔ کیونکہ اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام ٹھہرایا ہے۔ دوسرا یہ کہ سود کا فائدہ صرف چند افراد تک محدود ہوتا ہے اور اس کے نقصان کی لپیٹ میں سارا معاشرہ آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ "ملک میں منصوبہ بندی کے تحت ایسا غیر سودی معاشی نظام رائج کیا جائے جس کا فائدہ صرف چند خاندانوں کو نہیں بلکہ پوری قوم کو ہو"۔(147)

۱۹۷۰ء کی دہائی میں ملک میں ایسا طبقہ سامنے آیا جس نے سوشلزم اور کمیونزم کی پرچار شروع کی۔ اور غریب محنت کشوں، مزدوروں اور کسانوں کو سبز باغ دکھا کر اسلام کے عادلانہ اور منصفانہ معاشی نظام سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے اپنی پارٹی کے منشور میں "سوشلزم ہماری معیشت" کا نعرہ شامل کیا۔ اور اس نے ملک کے تمام بڑے بڑے شہروں میں "روٹی، کپڑا اور مکان" کا نعرہ لگایا۔ اور اس نعرہ پر اس نے ۱۹۷۰ء کا الیکشن لڑا۔ اور مغربی پاکستان میں اکثریت حاصل کر لی۔ اس کے مد مقابل ایک اور طبقہ سامنے آیا۔ جس نے مذہب کے نام کو استعمال کیا۔ اس نے سوشلزم اور کمیونزم کی مخالفت شروع کی۔ پرنٹ میڈیا اور پریس کا پورا

تعاون اس کو حاصل رہا۔ لیکن اس کی مخالفت کا انداز شعوری طور پر ایسا تھا کہ جس سے "سرمایہ دارانہ نظام" کے تحفظ اور "جاگیردارانہ نظام" کی حمایت معلوم ہوتی تھی۔ بلکہ واقعتاً ایسا تھا۔

ان حالات میں مفتی صاحب اور انکی جماعت کا کردار بڑا تاریخی رہا ہے۔ انہوں نے ایک طرف جناب ذوالفقار علی بھٹو سے ۱۹۷۳ء کے آئین کی تشکیل کے مرحلہ میں یہ مطالبہ کیا کہ وہ انتخابات میں تو روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ لگاتا رہا۔ اس نعرے کو اب آئین میں شامل کر کے اس کو آئینی تحفظ فراہم کرو۔ مگر بھٹو صاحب نے انکار کیا۔ پھر مفتی صاحب نے کہا کہ پانچ سال کے ساتھ اس کو مشروط کر دو کہ پانچ سال تک ملک کے تمام لوگوں کو روٹی، کپڑا، مکان فراہم کیا جائے گا مگر وہ پھر بھی مکر گئے۔ آخر کار مفتی صاحب نے دس سال کی شرط عائد کی مگر اس نے وسائل کی کمی کا بہانہ بنا کر گویا اس نعرے سے دستبرداری اختیار کر لی۔ دوسری طرف سرمایہ دارانہ نظام کے حامیوں نے مفتی صاحب پر "سوشلسٹ مولوی" ہونے کا الزام لگایا۔ ایک بیان میں انہوں نے کہا۔

> غریبوں سے ہمدردی رکھنے کی بنا پر بعض لوگ ہم پر "سوشلسٹ مولوی" ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ حالانکہ اسلام غریبوں کا حامی اور مددگار بن کر آیا ہے۔ ہم اسلامی تعلیمات کے مطابق غریبوں کی مشکلات دور کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ہم پاکستان میں سرمایہ داری کی حفاظت کے لئے اسلام کا نام استعمال نہیں ہونے دیں گے۔ سرمایہ داری کے ظالمانہ نظام کی حفاظت کے خواہاں اور امریکی سامراج کی مدد سے پاکستان کو ترقی دینے کے دعویدار پاکستان اور اس کے عوام کے دشمن ہیں۔ (148)

انہی دنوں جب مفتی صاحب سے ایک اخبار نویس نے پوچھا کہ اسلام اور سوشلزم میں کیا فرق ہے؟ تو آپ نے الٹا اس سے سوال کیا؟ نور اور ظلمت میں کیا فرق ہے؟ اس نے پھر پوچھا کیا ایک مسلمان سوشلسٹ ہو سکتا ہے؟ تو آپ نے جواب دیا کہ میں اس شخص کو مسلمان نہیں سمجھتا جو اسلام کے سوا کسی اور نظریئے سے راہنمائی حاصل کرتا ہے"۔ اخبار نویس نے پھر پوچھا مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی اسلامی سوشلزم کی اصطلاح کے بارے

میں آپ کی کیا رائے ہے؟ تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ اگر کوئی شخص مارکس اور لینن کے نظریہ کو اسلامی سوشلزم سے تعبیر کرتا ہے تو وہ اسلامی تعلیمات کی تکذیب کرتا ہے۔ اور اگر وہ اسلام کی مساوات اور اسلام کے معاشی نظام کو "اسلامی سوشلزم" کا نام دیتا ہے تو یہ شخص کافر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ وہ تعبیر کی غلطی کا شکار ہے۔ (149)

سرمایہ داروں ہی کے اشارہ پر اس وقت بعض علماء نے مفتی صاحب اور ان کے ہمنواؤں پر فتویٰ لگایا۔ اور اس کو دائرہ اسلام سے خارج کرنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ فتویٰ 113 علماء کے فتویٰ کے نام سے شہرت رکھتا ہے۔ مفتی صاحب کا جرم یہ تھا کہ وہ غریبوں، مزدوروں، کسانوں اور محنت کشوں کا حامی تھا۔ اور ان کے لئے سرمایہ دارانہ، جاگیردارانہ نظام کو استحصالی نظام بتاتا تھا۔ اور اس کے مقابلے میں ان کے سامنے اسلام کا عادلانہ، مساویانہ معاشی نظام پیش کرتا تھا۔ اور وہ انکی فلاح، ترقی اور معاشی استحکام کا ضامن بتاتا تھا۔ مفتی صاحب کے اس کردار کے بارے میں مولانا غلام ربانی صاحب لکھتے ہیں۔

> مفتی صاحب کی عظیم سیاسی شخصیت کا نقش میرے دل پر اس وقت بیٹھا جب روٹی، کپڑا، مکان کے نعرے لگانے والے عوام کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جا رہا تھا۔ یعنی عوام کی مشکلات، تکالیف، مصیبتوں اور مسائل سے نظر چرائی جا رہی تھی۔ اور ان کو کافر قرار دیا جا رہا تھا۔ گویا بے گناہ اور غریب مسلمانوں کی مسائل کا حل ان کے کافر بنانے میں مضمر تھا۔ تمام سرمایہ پرست مولوی اپنے اور دیگر سرمایہ داروں کے تحفظ کے لئے کافر سازی کے بھالے اور فتووں کی تلواریں سونت کر میدان میں نکل آئے تھے۔ ایسے میں ان کے مقابلے میں دین اسلام کی ایک ہی آواز تھی اور وہ مفتی محمود کی آواز تھی۔ انہوں نے کہا کہ روٹی مانگنا کوئی جرم نہیں اور نہ ہی کپڑے اور مکان کا نعرہ لگانا شرعی حیثیت سے گناہ ہے۔ یوں غریب مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کیمونزم کی گود میں جانے سے بچ گئی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ مفتی صاحب کے اعمال میں اگر ان

کی دوسری اسلامی خدمت شامل نہ بھی کی جائے تو بھی ان کی بخشش کے لئے ان کا یہی عمل کافی ہے۔(۱۵۰)

اس سلسلے میں جناب محمد فاروق قریشی نے مفتی صاحب کے اس کردار کے بارے میں لکھا ہے۔

> اس موقع پر مولانا مفتی محمود نے ایک مذہبی رہنما اور سیاستدان کے ساتھ ساتھ معاشی مصلح کا کردار ادا کیا کیونکہ اگر وہ وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر صحیح اندازہ نہ لگاتے اور عوام کے جذبات واحساسات کی تشفی کے لئے اسلام کا انقلابی معاشی پروگرام پیش نہ کرتے تو یقیناً عوام کے جذبات کا دھارا غلط راست اختیار کر چکا تھا۔(۱۵۱)

مفتی صاحب نے معاشی لحاظ سے کمزور طبقات کو یقین دلایا کہ سوشلزم تمہارا ہمدرد و خیر خواہ نہیں اور نہ ہی تمہاری غربت کا مداوا سوشلزم یا کیمونزم میں ہے۔ بلکہ تمہارا ہمدرد و خیر خواہ اور تمہارے تمام مسائل کا حل اسلام میں ہے سوشلزم و کیمونزم نہیں۔ نیز ان پر واضح کیا کہ اسلام جتنا سرمایہ دارانہ نظام کا مخالف ہے۔ اتنا سوشلزم نہیں۔ جناب محمد فاروق قریشی تحریر فرماتے ہیں۔

> دراصل عوام اپنے بنیادی مسائل سے تنگ آکر اور لاعلمی کی وجہ سے اسلام کو سرمایہ داری کا محافظ سمجھتے ہوئے (کیونکہ اس وقت اکثر نام نہاد علماء کا رویہ سرمایہ دارانہ نظام کے محافظوں کا تھا) روٹی، کپڑا، مکان کی ضمانت پر دھڑا دھڑ سوشلزم اور کیمونزم کی گود میں جارہے تھے۔ لیکن ناعاقبت اندیشان ملت کا ایک گروہ عوام کے اس طرز عمل اور سوچ کو اسلام اور کفر کی میزان پر تولنے لگے۔ مفتی محمود نے وقت کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے غریب عوام پر واضح کیا کہ تمہارا ہمدرد اور خیر خواہ سوشلزم نہیں اسلام ہے۔ اور سوشلزم اتنا سرمایہ داری کا مخالف نہیں جتنا اسلام ہے۔........ لیکن الحمد للہ اکابر جمعیۃ کی بروقت سوچ نے کروڑوں مسلمانوں کو کفر کی آغوش میں جانے سے بچایا۔(152)

مفتی صاحب نے ان حالات میں ایک اور مصلحانہ اور حکیمانہ قدم اٹھایا اور وہ مزدور، محنت کش جو اپنی لاعلمی اور سرمایہ داروں اور ان کے ہمنوا علماء صحافی حضرات کے پروپیگنڈے کی وجہ سے رد عمل کے طور پر سوشلزم اور کیمونزم کی گود میں اپنی سلامتی، نجات اور اپنے معاشی مسائل کے حل سمجھ رہے تھے۔ ادھر جناب ذوالفقار علی بھٹو کی پارٹی کے خوش نما روٹی کپڑا مکان کا نعرہ ان کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ مفتی صاحب اور انکی جماعت نے آگے بڑھ کر اس وقت پاکستان کی مزدوروں، کسانوں، محنت کشوں کی سب سے بڑی تنظیم "لیبر پارٹی" جو کہ جناب بشیر احمد بختیار اور طاؤس خان وغیرہ مشہور لیبر رہنماؤں کی سربراہی میں کام کر رہی تھی، کے ساتھ ایک معاہدہ کیا۔ اس معاہدہ کو اس وقت کا بہترین فیصلہ قرار دیا گیا۔ جبکہ سرمایہ داروں اور ان کے ایجنٹوں نے اس معاہدہ کو خوب اُچھالا۔ مفتی صاحب اور ان کی جماعت کا یہ اقدام اس اعتبار سے ایک تاریخی ہے کہ اس وقت جب ملک میں معاشی مسائل کو اسلام اور کفر کی جنگ قرار دیا جارہا تھا اور اپنے معاشی مسائل کے حل کے لئے آواز بلند کرنے والوں کو اسلامی تعلیمات سے برگشتہ کر کے ان کو سوشلزم اور کیمونزم کے کیمپ کی طرف دھکیلا جارہا تھا۔ جمعیۃ لیبر پارٹی کا یہ معاہدہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور وہ بھی ان حالات میں کہ لیبر پارٹی نے یہ معاہدہ جمعیۃ علماء اسلام کی شرائط کی بنیاد پر کیا تھا اور جمعیۃ علماء اسلام کے ساتھ بھرپور اور مکمل تعاون کا اعلان کیا تھا۔ مفتی صاحب نے ایک دفعہ اس معاہدہ کے بارے ایک اخباری نمائندے کے سوال کے جواب میں فرمایا۔ "لیبر پارٹی سے ہمارا معاہدہ اسلامی اصولوں کی بنیاد پر ہوا ہے۔ اور لیبر پارٹی نے ہمارے منشور کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ اس سے مکمل تعاون کرنے کا اعلان بھی کیا ہے۔ گویا کہ لیبر پارٹی سے ہمارا معاہدہ ہماری شرائط پر ہوا ہے"۔(153)

مفتی محمود صاحب سے جب ہفت روزہ "اخبار جہاں" کے نمائندہ جناب "محمود شام" صاحب (جو آب بھی بقید حیات اور روزنامہ "جنگ" کراچی سے منسلک ہیں) نے یہ استفسار کیا کہ عوام کی اقتصادی پریشانی کا فوری حل کیا ہو؟ جب کہ ملک کی دولت صرف چند خاندانوں میں

ستمی ہوئی ہو پورے ملک کے عوام کی خوشحالی کا مسئلہ کیسے حل ہو سکتا ہے؟ تو اس سوال کے جواب میں مفتی صاحب نے فرمایا؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت ملک میں سب سے اہم ملک کی 90 فیصد آبادی کے بڑے طبقے اور غریب عوام کے مسائل ہیں۔ جو ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں جنہیں اپنے وطن میں نہ مکان میسر ہے نہ خوراک نہ لباس اور نہ زندگی کی دوسری سہولتیں میسر ہیں اور وہ یقیناً حیوانات سے بھی بدتر زندگی گزار رہے ہیں جب تک ان کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اس وقت تک پاکستان میں کسی کو امن و سکون حاصل نہیں ہوگا۔ اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ ایک عام مسلمان تو پاکستان میں محنت کرنے کے باوجود اپنے بچوں کا پیٹ پال نہ سکے۔ اور بھوک اور فاقہ کشی کی زندگی گزار رہا ہے جب کہ چند انسان یہاں پر عیاشیاں کرتے پھریں۔ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ نے فرمایا ﴿ان مات الکلب عن جوع علی شط الفرات لکان عمر مسؤلاً عنہ یوم القیامۃ﴾ ترجمہ: اگر ایک کتا بھی فرات کے کنارے بھوک سے مرتا ہے تو قیامت کے دن عمرؓ سے اس کا سوال کیا جائیگا۔

مفتی صاحب نے ملک اور ملک کے غریب عوام کو اس صورت حال سے نجات دینے کے بارے میں جو ممکن العمل صورتیں بیان کیں۔ وہ واقعی غربت کا خاتمہ اور ملک کے عوام کی خوشحالی کے لئے بہترین تجاویز ہیں۔ جو شرعی نقطہ نظر سے بھی لاجواب ہیں۔ آپ نے فرمایا۔

اس کے لئے بنیادی طور پر زمینداریوں اور کارخانوں کے مسائل کا حل کرنا ضروری ہے۔ اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ غیر آباد زمین کو آباد کرنے والا سرکار اس کا مالک ہوتا ہے۔ اس اصول کے مطابق تمام وہ زمینیں جو عنقریب آباد ہوئی ہیں ان کے آباد کار مزارعین ان زمینوں کے مالک قرار دیئے جائیں اور قدیم آباد زمینوں سے متعلق یہ تحقیق کی جائے کہ آیا یہ اراضی کسی جائز طریقے سے حاصل کی گئی تھیں یا انگریز نے "حق الخدمت" میں بطور جاگیر کے کسی کو عطا کی تھیں۔ اگر ایسا ہے تو ایسی تمام اراضی کو

لازماً واپس لے کر بے زمین لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اگر مزارعین کو اس کے باوجود مظلومیت محسوس ہو تو کوئی بھی اسلامی حکومت ضرورت کے تحت مزارعت کے سسٹم کو ناجائز قرار دے سکتی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ تینوں امام اس پر متفق ہیں کہ مزارعت کا معاملہ جائز نہیں۔ چونکہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے اور ائمہ میں اختلاف رہا ہے اس لئے ضرورت کے تحت اس کو ممنوع قرار دینا کسی طرح بھی قابل اعتراض نہیں ہو سکتا۔

پھر آگے جا کر مفتی صاحب نے مزدوروں اور محنت کشوں کے مسائل کے حل کی تجویز یہ پیش کی۔

رہے بڑے بڑے صنعت کاروں کا مسئلہ تو اس سے متعلق سب سے اچھی صورت یہ ہے کہ حکومت لازمی طور پر مزدوروں کی تنخواہوں کو اس حد تک بڑھا دے کہ مزدور کو اپنی محنت کا پورا صلہ مل سکے۔ جس سے ان کی زندگی کی بنیادی ضروریات، بچوں کی تعلیم علاج وغیرہ کی حسن و خوبی کے ساتھ کفالت ہو سکے۔ اس طرح یہ مسئلہ بھی آسانی سے حل کیا جا سکتا ہے۔

زراعت، ملکی ترقی میں جس کا وافر حصہ ہے۔ زراعت جس قدر عام ہوگی اور زراعت پیشہ لوگوں کو سہولتیں فراہم ہوں گی۔ ملک اتنا ہی ترقی کرے گا۔ مفتی صاحب نے زراعت کی ترقی کے بارے میں فرمایا۔

زراعت کو عام کیا جائے۔ غیر آباد زمینوں کو آباد کیا جائے زمینوں کو ناجائز طور پر سیاسی رشتوں کے لئے الاٹ نہ کیا جائے۔ زمین بے زمین لوگوں میں الاٹ ہوں، آبپاشی کے ذرائع کی توسیع ہو، مشینی آلات کے ذریعے سے بھی ملکی زراعت کو ترقی دی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ مشینی آلات کے تمام ذرائع اجتماعی طور پر استعمال ہوں۔ ایک شخص کو یہ اختیارات حاصل نہ ہوں۔ اس طرح مزدور کسان بے کار ہو جائینگے۔

پاکستان کا ایک معاشی مسئلہ یہ بھی ہے کہ دیہات سے آبادی شہروں کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔ ملازمتیں اکثر شہروں میں فراہم ہوتی ہیں۔ فیکٹریاں، صنعتیں اکثر شہروں میں لگتی ہیں۔ تمام سہولتیں مثلاً تعلیم، روزگار، صحت وغیرہ کی سہولتیں شہروں میں حاصل ہوتی ہیں۔ اس لئے جو بھی ایک دفعہ شہر کا رخ کرتا ہے تو پھر دیہات کی طرف نہیں جاتا۔ جس سے جہاں شہروں کے مسائل میں اضافہ ہو رہا ہے۔ وہاں دیہات غیر آباد ہوتے جا رہے ہیں۔ مفتی صاحب کی نگاہ دوربین اس طرف بھی تھی چنانچہ آپ نے فرمایا۔

بڑے شہروں میں کارخانوں کے قیام نے دیہات کی ترقی تو کیا ان کے وجود ہی کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ غریب لوگ دیہات سے بھاگ رہے ہیں۔ شہروں میں کارخانوں (اور دیگر اداروں سرکاری غیر سرکاری) میں ملازمت کرتے ہیں شہروں کے مسائل بھی اس طرح بڑھ جاتے ہیں۔ اس مسئلے کا حل صرف یہ ہے کہ دیہی ترقیاتی سکیموں پر زور دیا جائے۔ اس لئے کہ ہمارے ملک کی غالب اکثریت دیہی آبادی پر مشتمل ہے۔ اس کے بغیر ہمارا ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ اور اس روش سے ملک کی زرعی معیشت بھی بہت متاثر ہوتی ہے۔(154)

حضرت مفتی صاحب نے "اخبار جہاں" کے اس انٹرویو میں دو اہم مسائل کی نشاندہی کی ہے جس سے اس وقت بھی اور آج بھی پاکستان اور اس کے عوام دوچار ہیں۔ ایک مسئلہ غیر آباد زمینوں کی آبادکاری کا ہے اور دوسرا مسئلہ مزارعت کا ہے۔ کیونکہ جب تک اس کا صحیح اسلامی حل نہیں نکالا جائے گا اور اس کو زو بعمل نہیں لایا جائے گا۔ نہ غربت ختم ہو گی اور نہ عوام خوشحال ہو سکیں گے۔

پاکستان میں جاگیردارانہ نظام جو انگریز کی غلط بخشیوں کے نتیجہ میں قائم ہوا ہے متعدد مشکلات کا باعث ہے۔ حضرت مفتی صاحب کی حکیمانہ سوچ اور مدبرانہ فکر سے اس سلسلے میں تین اہم اقدامات ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ غیر آباد زمینوں کو آباد کرنے والے کو اس کو مالک ٹھہرایا جائے۔ دوسرا یہ کہ مزارعت کی اجازت ہرگز نہ دی جائے۔ بلکہ ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق کاشتکاری کرے یا مزدوروں سے کاشت کا کام لے۔ تیسرا یہ کہ انگریز کی عطا کردہ جاگیروں کو ان سے چھین کر کاشتکاروں میں تقسیم کر دیا جائے۔

مسئلہ احیاء اموات

جہاں تک پہلے مسئلے کا تعلق ہے اس ضمن میں حضرت مفتی صاحب کی مدلل فقہی رائے کو مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ نے نقل کیا ہے۔ جو انہوں نے کراچی کے جید علماء کرام و مفتیان عظام کی "اسلام کی مالیات کے نظام" کے بارے میں قائم مجلس میں جس کا بار بار اظہار کیا ہے اور اس پر زور دیا ہے۔ لیکن پہلے اس مسئلہ کی تھوڑی سی وضاحت ہو جائے اور اس کے لئے مقالہ نگار کی نظر میں اختصار کے ساتھ مگر جامع انداز میں مولانا مجیب اللہ ندوی کی کتاب "اسلامی قانون محنت و اجرت" میں ہے۔ یہاں اس کا اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔

"احیاء اموات "یعنی وہ زمینیں جو بیکار پڑی ہیں ان کو جو شخص قبضہ میں لے آئے گا وہ اس کی ملکیت سمجھی جائے گی۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔

(1) ایک یہ کہ وہ زمین بالکل ہی بے کار اور بنجر ہو اس پر کبھی کھیتی باڑی نہ کی گئی ہو نہ وہ کسی کی ملکیت ہو تو اس کو جو شخص بھی قبضے میں لا کر کھیتی باڑی کرے گا وہ اس کی ملک ہو گی۔ بشرطیکہ وہ جگہ کسی مفاد عامہ کے استعمال میں نہ ہو مثلاً چراگاہ، قبرستان یا کسی اور ضرورت کے لئے۔ امام ابو حنیفہؒ نے اس میں حکومت سے اجازت کی بھی شرط لگا دی ہے۔ یعنی بغیر حکومت کی اجازت کے اس کو کسی زمین پر قبضہ کرنے کا حق نہیں ہے مگر صاحبین یعنی امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے بغیر اجازت بھی اس کو قبضہ کرنے کا حق دیا ہے۔ امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں امام ابو حنیفہؒ کے قول کی توجیہ کی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی یہ رائے اس صورت میں ہے جب اختلاف کا خدشہ ہو ورنہ عام

حالات میں حکومت کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ مصالح عامہ کے تحت بہتر یہ ہے کہ حکومت وقت کی اجازت اس میں شامل ہو۔

امام مالکؒ نے اس بارے میں یہ رائے دی ہے کہ اگر وہ مقام دشوار گزار جگہ پر ہو یا بالکل ویرانہ تو اجازت کی ضرورت نہیں ہے اور اگر آبادی کے قریب کی زمین ہو تو اجازت کی ضرورت ہے۔

امام شافعیؒ اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ وہ بغیر اجازت بھی زمین پر قبضہ کر سکتا ہے اس لئے اگر قانونی اجازت کی پابندی لگا دی جائے تو غریب اور دور دراز جگہوں کے رہنے والوں کے لئے اس سے نئی مصیبت پیدا ہو جائے گی۔

مگر موجودہ دور میں اللہ نے ایک طرف آمد و رفت اور نقل و حمل کی سہولتیں پیدا کر دی ہیں۔ دوسری طرف معاشرہ کے افراد میں امانت و دیانت کی کمی ہی نہیں بلکہ فقدان ہو گیا ہے ان کے پیش نظر اس زمانہ میں قانونی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے امام ابو حنیفہؒ کی رائے کے مطابق ہی عمل کرنا اسلامی حکومت کے لئے مناسب ہے ورنہ اس طرح ایک انارکی اور لاقانونیت کی صورت پیدا ہو جائے گی۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ وہ زمین جن کے مالک تو ہیں مگر انہوں نے اس کو بالکل بے کار چھوڑ رکھا ہے یا ان کے مالکوں کا پتہ نہیں ہے ایسی زمین کے لئے حکومت خود فیصلہ کرے گی۔ اور جن لوگوں کے پاس زمین نہ ہو گی ان میں تقسیم کرے گی اس کے لئے ایک شرط ہے کہ وہ مسلسل تین سال تک بے کار چھوڑ دی گئی ہو۔

دونوں صورتوں کی تفصیل حدیث و فقہ میں موجود ہے۔ [مولانا مجیب اللہ ندوی۔ اسلامی قانون محنت و اُجرت۔ ص25،24]

مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ نے حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی اس ضمن میں جو رائے نقل کی ہے وہ یہ ہے۔

حضرت مفتی صاحب نے ان مجالس مذکورہ میں "احیاء اموات" کے باب پر بہت زور دیا تھا۔ فرماتے تھے کہ فقہ کے اس باب کو پڑھنے اور پڑھانے کے زمانہ میں ذہن نے

اہمیت نہیں دی تھی مگر اب غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت ہی اہم باب ہے اور غریب ہاریوں کے بہت سے امراض کا علاج ہے۔

احیاء اموات کا مطلب یہ ہے کہ غیر آباد اراضی کو آباد کرنا اس سلسلے میں ایک مرفوع حدیث بھی موجود ہے جو محدثین کے نزدیک صحیح ہے۔ حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ جو کسی غیر آباد زمین کو آباد کرے وہ آباد کرنے والے کی ہے اس میں ائمہ اربعہ کے درمیان تھوڑا سا اختلاف ہے امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک غیر آباد زمین حکومت وقت کی اجازت کے بعد آباد کی جا سکتی ہے اور آباد کرنے والے کی ملکیت میں اسی وقت آئے گی جب حکومت کی اجازت سے اس نے آباد کی ہو اس کے بغیر نہیں۔ دوسرے ائمہ کے نزدیک اجازت حکومت شرط نہیں۔

مفتی صاحب کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان کے غریب ہاریوں کے افلاس اور فقر و فاقہ کا علاج یہ ہے کہ حکومت غیر آباد اراضی ان کو دے اور ان سے آباد کرائے، آباد کرنے کے بعد ان کی ملکیت قرار دے دے۔ اس طرح بے زمین "ہاری" زمین کے مالک بن جائیں گے اور اراضی بھی آباد ہو جائے گی۔ جس سے ملک کو غلہ کے باب میں خود کفیل ہونے میں مدد ملے گی۔ احیاء اموات کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔
[مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی۔ میدان علم و سیاست کا شہسوار۔ ہم اللہ قادری مفتی محمود۔ ج 6۔ ص 37 (مقدمہ)]

"احیاء ارض میتہ" کے بارے میں حضرت مفتی صاحب کے موقف کے بارے میں مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے رئیس دار الافتاء مولانا مفتی مسعود تحسین صاحب نے ایک مقالہ کی صورت میں جو تحقیقی مضمون تحریر کیا ہے۔ جو "تذکار محمود" کا حصہ ہے۔ وہ بہت واضح ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

رسول خدا ﷺ کے ایک واضح ارشاد ﴿من احیا ارضا میتۃ فھی لہ﴾ کی روشنی میں حضرت مفتی صاحب فتویٰ دیا کرتے تھے کہ "غیر آباد زمین کو آباد کرنے والا

شرعاً اس کا مالک ہو جاتا ہے" نیز فرماتے تھے کہ "اسی اصول کے مطابق تمام وہ زمینیں جو عنقریب آباد ہوئی ہیں موجودہ آبادکار مزارعین ان زمینوں کے مالک قرار دیئے جائیں گے"۔

درمیان میں مولانا مفتی مسعود تحسین صاحب نے ایک "ضابطہ" بیان کیا ہے وہ یہ ہے "اگر کسی شخص کو بنجر زمین سربراہ حکومت عطا کردے اور وہ تین سال تک اسے آباد نہ کرسکے تو حکومت یہ زمین واپس لے سکتی ہے"۔

وہ لکھتے ہیں کہ مذکورہ ضابطہ سے درج ذیل امور مستفاد ہوئے۔

(۱) زمین حکومت کی جانب سے اسے ملی ہو ورنہ ملکیت نہیں آئے گی جیسا کہ مختصر الطحاوی میں تصریح ہے۔﴿و لا یملکه الا بتملیك الامام﴾

(۲) مذکورہ شخص کے لئے ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ تین سال کی مدت میں اس زمین کو آباد کرے۔ چنانچہ فرمان رسولﷺ سے یہی بات ثابت ہے۔﴿ولیس للمحتجر حق بعد ثلاث سنین﴾ (کتاب الخراج لابی یوسف)

(۳) مذکورہ فرمان رسولﷺ سے یہ بھی واضح ہوا کہ محض طویل مدت تک اس زمین کو روکے رکھنا ملکیت کا باعث نہیں۔ مطلب یہ کہ سالہا سال تک بھی اگر ایسی زمین بے آباد رہی تو شخص مذکور کا قبضہ اس کا مالک ہونا ثابت نہیں کرتا کہ ملکیت کے لئے احیاء ارض ہی ضروری ہے۔

اس ضابطہ سے معلوم ہونے والے نکات کے بعد مولانا مفتی مسعود تحسین صاحب، حضرت مفتی صاحب کا موقف لکھتے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ جن مزارعین کو مالک بنا دینے کا فرماتے تھے وہ ایسی زمینوں کے مزارعین تھے کہ جن میں مذکورہ تین شرائط میں سے کوئی شرط مفقود تھی۔ آپ کے اس موقف پر جہاں احادیث رسولﷺ اور فقہاء کرام رحمہم اللہ کی

تصریحات شاہد ہیں وہاں خلیفۃ المسلمین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا عمل بھی مؤید و موثق ہے۔ اور وہ یہ ہے۔

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال بن حارث مزنی رضی اللہ عنہ سے اللہ کے رسول ﷺ کی جانب سے عطا کردہ ایسی زمین کی واپسی کا مطالبہ کردیا تھا کہ جسے حضرت بلال آباد نہیں کرسکے تھے اور تین سال گزرنے پر ان کا حق آبادکاری بھی ختم ہو گیا تھا۔

پس انہی احادیث و واقعات کی بنیاد پر فقہاء کرام رحمہم اللہ نے تین سال تک آباد نہ کرنے والے سے زمین واپس لے لینے کا ضابطہ وضع فرمایا۔ چنانچہ صاحب ہدایہ تحریر کرتے ہیں۔

ومن حجر ارضا و لم یعمر ثلاث سنین اخذها الامام و دفعها الی غیره لان الدفع الی الاول کان لیعمرها فتحصیل المنفعة للمسلمین من حیث العشر و الخراج، فاذا لم یحصل یدفعه الی غیره تحصیلا للمقصود و لان التحجیر لیس باحیاء یملکه به لان الاحیاء انما هو العمارة (هدایہ جلد۴)

ترجمہ: اور جو شخص کسی زمین کو پتھروں سے گھیرے اور تین سال تک اسے آباد نہ کرے تو سربراہ حکومت اس سے لے کر وہ زمین کسی دوسرے کو دے دے۔ اس لئے کہ پہلے شخص کو زمین دینے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اسے آباد کرے تاکہ اس کے عشر و خراج ادا کرنے سے مسلمانوں کو منفعت حاصل ہو۔ لیکن جب یہ حاصل نہ ہوئی تو امام یہ زمین اسی مقصد کے لئے دوسرے کو دیدے۔ اور یہ اس لئے بھی درست بات ہے کہ محض پتھر لگا لینے سے کوئی اس کا مالک نہیں بن جاتا کہ یہ کوئی احیاء نہیں ہے۔ احیاء کا مطلب تو زمین کو آباد کرنا ہے۔

مولانا مفتی مسعود تحسین صاحب، حضرت مفتی صاحب کے طرز استدلال کا ذکر کرتے ہیں۔

ان تفصیلات کی روشنی میں حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمۃ کا موقف بڑا واضح ہو جاتا ہے کہ جب ایک زمین، صحابیؓ رسولؐ کے پاس ہو، رسول اللہ ﷺ نے اس کو عطائی ہو اور فاروق اعظمؓ جیسا احکام شریعت کا پاسبان، و محافظ خلیفہ اس رسول خدا ﷺ کی عطا کردہ زمین کا محض اس بنیاد پر واپسی کا مطالبہ کرتا ہے کہ صحابیؓ رسولؐ کی ضرورت سے زائد ہے اور یہ صحابیؓ اتنی زمین کے آباد کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو آج وطن عزیز میں اس قانون کے جاری کرنے میں کون سی شرعی دلیل حائل ہے؟ آج یہ کیوں ممکن نہیں کہ اللہ کی ساری زمین کو کاشت میں لا کر، وطن عزیز سے غربت و افلاس کے سائے دور کئے جا سکیں؟ رزق خداوندی کو عام کر دیا جائے تاکہ ہر کس و ناکس کی اس تک رسائی ہو، بے روزگاروں کو روزگار میسر آ جائے۔ اور یہ بندگان خدا غیروں کی محتاجی سے محفوظ ہو جائیں۔ (تذکار محمود۔213۔216)

مسئلہ مزارعت

دوسرا اہم مسئلہ مزارعت کا ہے۔

حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ، کراچی کے علماء کی مجلس کا ذکر کرتے ہوئے مسئلہ مزارعت میں مولانا مفتی محمودؒ کے موقف کو بیان کرتے ہیں۔

مزارعت کا مسئلہ زیر بحث آیا تو اس سلسلے میں حضرت مفتی صاحب نے بڑی فاضلانہ تقریر فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ اس زمانہ میں مزارعت کی وجہ سے بڑے بڑے فتنے پیدا ہوئے ہیں۔ ہاریوں کو زمیندار غلام سمجھتے ہیں۔ اور چونکہ مسئلہ اختلافی ہے۔ اکثر کبار میں سے حضرت امام ابو حنیفہؒ اس کے خلاف ہیں اس لئے ان کے قول پر فتویٰ دیتے ہوئے اگر مزارعت کی ممانعت کر دی جائے اور مالکان زمین سے کہا جائے کہ وہ ملازم رکھ کر کاشت کرائیں یا خود کاشت کریں تو کوئی حرج نہیں۔ [مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی۔ فتاویٰ مفتی محمود (مقدمہ۔ ج6۔ ص39،38]

لیکن اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اس مسئلہ کو اور اس میں حضرت مفتی محمود صاحب کے موقف کو مولانا مسعود تحسین نے تحریر کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

مزارعت کا معاملہ فی نفسہ ایک جائز اور مفید معاملہ ہے۔ اس میں زمیندار، کاشتکار دو فریقوں کی طرح ہوتے ہیں اور دونوں کی حیثیت مساوی ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ معاہدہ اگر نیک نیتی سے کیا جائے تو زمیندار، کاشتکار کا آپس میں باہمی تعاون، ہمدردی، غم خواری کی ایک بہترین شکل ہے۔ چنانچہ زمانہ رسول ﷺ میں بھی یہ معاملہ بلا اس جاری رہا۔ مہاجر صحابہ کرامؓ اپنے انصاری بھائیوں کی زمینوں پر بحیثیت کاشتکار سالہا سال تک کام کرتے رہے۔ اور اس کی اجازت خود آنحضرت ﷺ نے مرحمت فرمائی تھی، وراس بعد یہی معاملہ آپ نے اہل خیبر کے ساتھ کیا اور آپ کے بعد سیدنا ابو بکر صدیق و سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس معاملہ کو اسی طرح باقی رکھا، چنانچہ فی نفسہ یہ معاملہ بالکل جائز ہے۔

حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمۃ فی زمانہ اس معاملہ کو ناجائز خیال فرماتے تھے۔ موجودہ حالات میں، حضرت قدس سرہ کا موقف یہ تھا کہ اسلامی حکومت، ضرورت کے تحت مزارعت کے سسٹم کو ناجائز قرار دے، اپنے اس موقف کی حمایت میں حضرت فرماتے تھے۔

"امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام مالک رحمہم اللہ تینوں امام اس بات پر متفق ہیں کہ مزارعت کا معاملہ جائز نہیں، لیکن چونکہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے۔ ائمہ میں اختلاف رہا ہے، اس لئے ضرورت کے تحت اس کو ممنوع قرار دینا، کسی بھی طرح قابل اعتراض نہیں ہو سکتا۔"

اس کے بعد مفتی مسعود تحسین صاحب نے امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کو واضح کیا ہے اور احادیث نبوی کی روشنی میں اس کے جواز و عدم جواز کی صورتیں بتائی ہیں۔ آگے وہ پھر مفتی محمود صاحب کے موقف اور اس پر دلائل سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اب آتے ہیں حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کے موقف کی جانب! حضرت مفتی صاحب موجودہ حالات میں مزارعت کے پورے سسٹم کو ناجائز و ممنوع قرار دینے کی بات فرماتے تھے جس کا مطلب یہ ہے کہ مزارعت کی وہ صورت بھی کہ جس میں مذکورہ بالا تینوں شکلیں موجود نہیں ہیں، موجودہ حالات میں ناجائز قرار دینی چاہیے۔

بظاہر حضرت کا یہ موقف بلاشبہ احادیث رسول اللہ سے متصادم نظر آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس خاص صورت کو ممنوع نہیں فرمایا۔ لیکن واضح رہے کہ مزارعت کے مسئلہ میں حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کی اپنی منفرد رائے تھی جس میں اجتہادی رنگ نمایاں تھا۔ حضرت علیہ الرحمۃ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ

"اللہ کے رسول ﷺ نے مزارعت کی جن صورتوں کو ممنوع قرار دیا ہے اگر ان میں غور کیا جائے تو اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ ان تمام صورتوں میں کاشتکار کی حق تلفی ہوتی تھی۔ پس کاشتکار کے اس استحصال کی وجہ سے اللہ کے نبی ﷺ نے مزارعت کی ایسی تمام صورتیں ناجائز فرمادیں"

گویا ان صورتوں کے عدم جواز کی علت کاشتکاروں یا کسی بھی فریق کا استحصال و حق تلفی ہے۔ پس موجودہ حالات میں جبکہ سسٹم ہی کچھ ایسا ہے کہ زمینداروں کی بدعنوانیوں پر قابو پانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ کاشتکار کی نہ صرف حق تلفی ہوتی ہے بلکہ اس کی عزت بھی محفوظ نہیں۔ زمیندار اسے اپنا غلام سمجھتا ہے تو ان حالات میں مزارعت کو ممنوع قرار دے دینا کسی شرعی ضابطے کی خلاف ورزی نہیں، قرون اولی کے اس دور میں اور ابھی کی یہ شکل ایسی نہ تھی کہ کسی کاشتکار کے ساتھ ظلم و زیادتی کا اندیشہ کیا جاتا۔ بلاشبہ فی نفسہٖ مزارعت نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ زمیندار و کاشتکار کا ایک دوسرے کے ساتھ یہ باہمی تعاون، ہمدردی و غم خواری کی ایک بہترین شکل ہے لیکن اگر کوئی زمیندار محض ذاتی وقار اور اقتدار بڑھانے کے لئے یہ معاملہ کرے (جس کا لازمی نتیجہ کاشتکار کا استحصال ہے) اور کاشتکار کی مجبوری و بے بسی اس کے لئے زیادتی دولت کا باعث ٹھہرے یا اس کی مفلوک الحالی اس کی خوشحالی کا ذریعہ ہو تو جبر کے ان

حالات میں اسلام قطعاً مزارعت کی اجازت نہیں دیتا بلکہ ایسے حالات میں فقہ اسلام کا ضابطہ یہ ہے۔

فلهذا ينبغي تحذير الناس من المزارعة التي يترتب عليها حرمان العادل من كده و استغلال المالك اياه لحاجة۔ [عالمگیری]

ترجمہ: مزارعت کی ان شکلوں سے منع کر دینا ہی مناسب ہے جو کاشتکاروں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کریں۔

پس حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ موقف موجودہ حالات کے مطابق تھا اور یوں بھی مزارعت کو اسلام نے جائز تو کہا ہے لیکن اسے فرض یا واجب قرار نہیں دیا نہ ہی آنحضرت ﷺ نے اسے کوئی ایسا مثالی طریقہ تجویز کیا ہے کہ اسے بہر صورت باقی رکھنا ضروری تصور کیا جائے بلکہ اسے مثالی طریقہ قرار بھی کیسے دیا جا سکتا ہے کہ جس میں بقول حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ :

"ایک عام مسلمان تو محنت کرنے کے باوجود، اپنے بچوں کا پیٹ بھی نہ پال سکے، بھوک اور فاقے کی زندگی گزارتا ہے، جب کہ چند انسان یہاں عیش و مستیاں کرتے پھریں۔ اسلام کی روح تو یہ ہے کہ جیسے سیدنا فاروق اعظمؓ نے فرمایا تھا ﴿لو مات كلب على شاطئ الفرات جوعًا، لكان عمر مسؤلا عنه يوم القيٰمة﴾ یعنی اگر فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو قیامت کے دن اس کے متعلق بھی عمر سے باز پرس ہوگی۔ [مولانا مفتی مسعود حسین صاحب۔ تذکار محمود۔ ص22تا231]

انگریزوں کی عطا کردہ جاگیروں کو چھین کر بے زمینوں میں تقسیم کردینا

جنوبی ایشیا میں انگریز غاصب نے اپنے ناجائز تسلط کو دوام دینے کے لئے بہت سے مقامی افراد کو خرید لیا تھا۔ ان کو قوم سے بے وفائی کے بدلہ میں اعزازات سے نوازا جاتا تھا۔ ان کو انگریز افسروں کے درباروں میں شرف باریابی حاصل ہوتا تھا۔ ان کو "میر جعفر و میر صادق" کے کردار ادا کرنے کے عوض بڑی بڑی جاگیریں عطا کی جاتی تھیں۔ آج پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد میں جو بڑی بڑی جاگیریں ہیں۔ وہ اکثر انگریز حکمرانوں کی عطا کردہ ہیں۔ آزادی کے بعد سب سے پہلے یہ اقدام ضروری تھا کہ انگریز کی بوٹ پالش کے بدلہ میں ملنے والی جائیدادوں کو حکومتی تحویل میں لے کر بے زمینوں میں تقسیم کردیا جاتا۔ جیسا کہ ہمارے پڑوسی ملک ہندوستان نے آزادی کے فوراً بعد یہ کارنامہ انجام دیا۔ اور بڑی بڑی جاگیرداریاں ختم کردی تھیں۔ جبکہ پاکستان کے حکمران بوجوہ یہ کام نہ کرسکے تھے۔ آج اس ملک میں اکثر خرابیوں کی بنیاد اسی جاگیردارانہ نظام کو بتایا جاتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب کا اس سلسلے میں واضح موقف تھا اور وہ اس پر باقاعدہ دلائل دیتے تھے۔ مفتی صاحب ؒ کے موقف کے بارے میں مولانا مفتی مسعود تحسین صاحب لکھتے ہیں۔

> زمین یا کسی بھی جائیداد کے ملک میں آنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ وراثت، عطیہ اور خرید و فروخت جیسے جائز طریقوں سے حاصل ہو۔ ناجائز ذرائع سے حاصل شدہ جائیداد کی ملک ثابت نہیں ہوتی۔ لہٰذا اگر کسی شخص کے بارے میں یہ ثابت ہوجائے کہ اس نے فلاں جائیداد ناجائز طریقے سے حاصل کی ہے تو اسلامی حکومت تحقیق و تفتیش کے بعد یہ جائیداد اس سے لے کر اصل مالکوں کو لوٹا دے۔ اور اگر مالک معلوم نہ ہوں تو بحق سرکار ضبط کرے۔ پس اس اسلامی اصول کی روشنی میں حضرت مفتی علیہ الرحمۃ فرماتے تھے کہ "قدیم زمینوں کے متعلق یہ تحقیقات کی جائیں کہ آیا یہ اراضی کسی جائز طریقے سے حاصل کی گئی تھیں یا انگریز نے بطور جاگیر کے حق الخدمت میں کسی کو عطا کی ہیں۔ اور اگر ایسا ہے تو یہ اراضی فوری طور پر واپس لے کر بے زمین لوگوں میں تقسیم کردی جائیں"۔ [ہفت روزہ "اخبار جہاں" کراچی 24 ستمبر 1969ء]

مذکورہ بالا بیان سے واضح ہے کہ اگر یہ اراضی کسی جائز طریقے سے حاصل کی گئی تو حضرت موصوف علیہ الرحمۃ کو بھی اعتراض نہیں، حضرت نے ان زمینوں کے واپس لینے کی بات کی ہے کہ جو ناجائز ذرائع سے حاصل کی گئی تھیں۔ اور یہ موقف بلاشبہ الحق بالصواب ہے۔

مولانا مفتی مسعود تحسین صاحب نے اس موقف کے بارے میں حضرت مفتی صاحب کے تین دلائل ذکر کئے ہیں۔

دلیل نمبر ۱

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کا ایک واقعہ کتب تاریخ میں محفوظ ہے کہ آپؓ نے اپنے بعض گورنروں مثلاً عمرو بن العاص، حضرت ابوہریرہ، حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت حارث رضی اللہ عنہم کی ذاتی املاک میں سے آدھا حصہ ضبط کرکے بیت المال میں داخل کرلیا۔ وجہ یہ تھی کہ آپ کی رائے میں ان حضرات نے یہ جائیداد اپنے اختیارات سے تجاوز کرکے حاصل کی تھی۔ چنانچہ امیر المؤمنین کے دریافت کرنے پر جب ان حضرات نے بتلایا کہ ہم اپنی بچت سے ذاتی تجارت بھی کرتے تھے تو فاروق اعظمؓ اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئے اور جواب میں صرف یہ فرمایا کہ "تم لوگوں کو وہاں بھیجنے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ تجارت کرتے پھرو"۔ یہ کہہ کر جائیداد ضبط کرلی۔

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس عمل کی کوئی بھی توجیہ کرلی جائے تو بھی یہ اصول بہرحال ملتا ہے کہ سربراہ حکومت کی نظر میں، حصول جائیداد کے ذرائع اگر مشکوک ٹھہریں تو

ایسی جائیداد کا ضبط کر لینا اس کے لئے جائز ہے۔ خواہ اس اصول کی زد میں آنے والے لوگ عمال حکومت ہی کیوں نہ ہوں۔

دلیل نمبر ۲

حضرت مفتی صاحبؒ اپنے موقف میں دوسری دلیل بقول مفتی مسعود تحسین صاحب علامہ ابن فرحون مالکیؒ کا قول پیش کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔

اسی زریں اصول کی روشنی میں علامہ ابن فرحون مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

ان للامام ان یأخذ من قضاته و عماله ما وجد فی ایدیهم زائدا علی ما ارتزقوه من بیت المال و ان ما یحصی ما عند القاضی حین ولایته و یأخذ منه ما اکتسبه زائدا علی رزقه [تبصرۃ الحکام لابن فرحون، ج2]

ترجمہ: امام کو حق ہے کہ اگر اپنے قاضیوں اور کارندوں کے پاس ایسا مال پائے کہ جو ان کی اس تنخواہ سے زائد ہو جو انہیں بیت المال سے ملتی ہے۔ تو اس مال کو ضبط کرے نیز اسے چاہیئے کہ جب قاضی کا تقرر کرنے لگے تو اس کی جائیداد کا شمار کرلے اور آئندہ اس کے پاس اگر اس کی تنخواہ کے علاوہ بھی کچھ مال نظر آئے تو اسے ضبط کرلے۔

دلیل نمبر ۳

حضرت مفتی صاحب کی تیسری دلیل کے بارے میں مولانا مفتی مسعود تحسین صاحب رقمطراز ہیں۔

نیز صاحب در مختار، سیدنا فاروق اعظمؓ کے اسی مذکورہ عمل سے استدلال کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

ان مصادرۃ السلطان لارباب الاموال لا تجوز الا لعمال بیت المال مستدلا بان عمر رضی اللہ عنہ صادر ابا ھریرۃ۔ [در مختار۔ باب الکفالۃ]

ترجمہ: بلا معاوضہ صاحب مال لوگوں کی جائیدادیں ضبط کر لینا سربراہ حکومت کے لئے جائز نہیں۔ لیکن بیت المال کے کارندوں کے پاس اگر ایسا مال ہو تو اس کا ضبط کر لینا جائز ہے، دلیل اس کی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت ابوہریرۃؓ کے مال کو ضبط کرنا ہے۔

حضرت مفتی صاحب کے اصولی موقف اور اس پر تین دلائل کے حوالہ دینے کے بعد مولانا مفتی مسعود تحسین صاحب پاکستان کی بڑی بڑی جاگیروں اور جاگیرداروں کے بارے میں حضرت مفتی صاحب کے موقف کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

پس مذکورہ بالا فقہی اصول و ضوابط اور فعل سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے معلوم ہوا کہ مالی بے ضابطگی جس سے سرزد ہو، اس کا سدباب ہونا ضروری ہے۔ سربراہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ صاحب اموال لوگوں کی چھان بین کرے اور اگر کسی شخص کے بارے میں ثابت ہو جائے کہ اس نے فلاں جائیداد ناجائز ذرائع اور بدعنوانیوں کے راستے حاصل کی ہے تو اسے ضبط کرلے۔ یہی بات حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمۃ ارشاد فرماتے تھے اور آج بھی اگر اس بات کو عملی جامہ پہنا دیا جائے تو تحقیق و تفتیش کے نتیجہ میں یہ تیر ان کن حقیقت منکشف ہو گی کہ اس مادر وطن پر برسر اقتدار جاگیردار طبقہ نے انہی ناجائز ذرائع کو استعمال کیا، جاگیریں بنائیں اور بالآخر آج یہ طبقہ اس سطح کو آپہنچا کہ وطن عزیز کے سیاہ و سفید کا مالک ہے اناولا غیری کا فرعونی نعرہ لگا کر، غریب عوام کے ساتھ وہی سلوک کر رہا ہے جو صدیوں پہلے اس کے روحانی باپ نے بنی اسرائیل کے ساتھ کیا تھا۔ ایسے وقت میں حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کی آواز، صدائے موسیٰ کی وہی بازگشت ہے جس نے اس خدا کے باغی کو للکارا تھا۔ مفتی صاحب رحمہ اللہ بھی اپنے وقت کے فرعونوں کو للکارتے رہے، ان کی جائیدادیں ضبط کرنے پر اصرار کرتے رہے۔ آپ چاہتے تھے کہ سنت فاروقی زندہ ہو، معاشی ناہمواری ختم ہو جائے اور

اہالیانِ وطن اپنی آنکھوں سے اس خوشحالی و امن کا مشاہدہ کریں۔ جس کی نوید قرآن حکیم نے وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا کے مسحور کن الفاظ سے دی ہے۔ آپ کے یہ الفاظ کتنے حقیقت پسندانہ ہیں۔

بہر حال یہ امر مسلم ہے کہ جو لوگ دس کروڑ عوام کے مسائل کو حل کئے بغیر یہ سمجھتے ہیں کہ چند سرمایہ داروں سے امن قائم ہو جائے گا وہ جنت الحمقاء میں رہتے ہیں۔ غریبوں کے مسائل حل کئے بغیر نہ پاکستان ترقی کر سکتا ہے اور نہ کوئی مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ (الف روزہ "اخبار جہاں" کراچی۔ 27، ستمبر 1979ء)

خارجہ پالیسی

مولانا مفتی محمود کو سامراج دشمنی اپنے اکابرین سے ورثہ میں ملی ہے۔ اس لئے جہاں دنیا بھر میں مذہب و مسلک کے تمیز کے بغیر وہ آزادی کے لئے تحریک چلانے والوں کی تحریک کو اپنی تحریک تصور کرتے ہیں۔ اسی طرح قوموں، ملکوں سے آزادی کے حق چھیننے والوں سے آپ کو نفرت و عداوت ہے۔ آزادی کی تحریک ہو یا کسی ملک و قوم کے حقوق کی جنگ ہو مفتی صاحب اور انکی جماعت نے ہمیشہ ان کی آواز میں اپنی آواز شامل کی ہے۔ اور ان کی کوشش رہی ہے کہ وہ آزادی کے لئے چلنے والی تحریکوں کے ساتھ اپنا تعاون شامل کریں۔

مفتی صاحب اور انکی جماعت کی خارجہ پالیسی کے بارے میں محمد فاروق قریشی رقمطراز ہیں۔ "جمعیۃ نے ہمیشہ آزاد خارجہ پالیسی کی حمایت کی ہے جو سامراجی تسلط سے آزاد ہو۔ اور پڑوسی ملکوں کے ساتھ امن و آشتی اور بھائی چارہ کے تعلقات پر مبنی ہو تا کہ ملک اقتصادی طور پر ترقی کر سکے"۔ (155)

مفتی صاحب کی نگاہ میں استعماری عزائم کے شکار ہونے سے بچنے کے یہی صورت ہے کہ دائیں بائیں کی آلائشوں سے پاک غیر جانبدارانہ پالیسی پر عمل پیرا ہوں۔ وہ کہتے ہیں۔

"مولانا مفتی محمود یمین و یسار کی آلائشوں سے پاک غیر جانبدار پالیسی کے حامی تھے تا کہ پاکستان کو اندرونی اور بیرونی طور پر عالمی استعماری عزائم کا شکار نہ ہونا پڑے۔ جیسا کہ 71ء میں ہم اپنی غلط پالیسی کی وجہ سے ملک و ملت کا عظیم نقصان کر چکے ہیں۔ (156)

مفتی صاحب غیر جانبدارانہ پالیسی کے ساتھ اس بات کے حق میں تھے کہ آزادانہ پالیسی کے ساتھ اسلامی اصولوں کی روشنی میں ہماری پالیسی ہونی چاہیئے۔ تا کہ پاکستان اپنے اندر اسلامی ملکوں کی قیادت کر سکے۔ انہوں نے کہا کہ تمام مغربی ملکوں سے فوجی معاہدات ختم کر دینے چاہئیں۔ جبکہ عرب ممالک سے تعلقات کو استوار و مستحکم کرنا چاہیئے۔ وہ کہتے ہیں۔

آزادانہ اور غیر جانبدارانہ پالیسی ہی پاکستان کے حق میں بہتر رہ سکتی ہے۔ پاکستان کو اپنے مفاد کے پیش نظر اور اسلام کے اصولوں کی روشنی میں ایسی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے جس سے پاکستان اسلامی ملکوں کی قیادت کی اہلیت بھی اپنے اندر پیدا کر لے اور بین الاقوامی دنیا میں بھی اسے مستحکم پوزیشن حاصل ہو۔ (157)

خارجہ تعلقات کو کسی ملک کے استحکام میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ خاص کر ہمسایہ ممالک کے ساتھ تعلقات جس قدر مستحکم ہوں گے، اعتماد بحال ہو گا۔ در پیش مسائل میں ان کا موقف یکساں ہو گا۔ وہ ملک بیرونی خطرات سے محفوظ ہو گا۔ اور وہ ملک اقتصادی لحاظ سے مضبوط ہو گا۔ اور داخلی لحاظ سے مستحکم۔ اسی لئے مفتی صاحب نے بار بار ہمسایہ ممالک کے ساتھ تعلقات کو مستحکم کرنے پر زور دیا ہے۔ ایک تقریر میں وہ فرماتے ہیں۔ "اس طرح پاکستان کو اپنے ہمسایہ ملکوں کے ساتھ بھی اچھے روابط قائم کرنے چاہئیں۔ تا کہ خارجی اثرات سے محفوظ رہ کر پاکستان قومی ترقی کے لئے آزادی کے ساتھ آگے بڑھ سکے"۔ (158)

ہمسایہ ملکوں سے تعلقات کے ضمن میں آپ کی یہ بھی خواہش رہی کہ بھارت سے بھی ہمارے تعلقات بہتر ہوں۔ تا کہ ملک مزید ترقی کر سکے۔ بھارت سے تعلقات کی بگاڑ کی وجہ سے

ہمارے بجٹ کا کافی حصہ دفاع پر خرچ ہو جاتا ہے۔ اور بھارت اور پاکستان کے تعلقات کے بگاڑ کی وجہ سے امریکی سامراج کو بھی موقع ملتا ہے اس سے وہ فائدہ اٹھا کر بھارت کو فوجی امداد دینے کی وجہ سے وہ جنوبی ایشیا میں طاقت کا توازن بگاڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ بجٹ تقریر میں وہ فرماتے ہیں۔

ہماری آمدنی کی جو رقم ہے یا بیرونی امداد کے ذریعہ جو رقم ملتی ہے وہ فوج کے دفاع پر زیادہ خرچ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ایسے حالات میں گھرے ہوئے ہیں اور مجبور ہیں کہ یہ خرچ برداشت کریں۔ کیونکہ بھارت سے ہمارے اختلافات ہیں۔ اور دوسرے ہمسایہ ملکوں سے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ اس کے باوجود اگر امریکہ بھارت کو بھاری فوجی امداد دیتا ہے تو وہ ایشیا میں طاقت کا توازن بگاڑ رہا ہے۔ اور بگاڑ چکا ہے۔ اور ہم اس وقت عظیم خطرہ سے دوچار ہیں۔ ہمارے ملک کی وہ رقم جسے ہم نے اقتصادی اور معاشی پروگرام میں صرف کرنا تھا وہ فوج پر صرف کر رہے ہیں۔ یہ امریکہ کی غلط پالیسی نے ہمیں مجبور کیا ہے۔ (195)

اور جب ایک مرحلہ سیاسی اُتار چڑھاؤ میں ایسا آیا کہ پاکستان کے اس وقت حکمرانوں نے ہندوستان کے ساتھ تعلقات کو استوار کرنے کی کوشش کی۔ اور آپس میں وفود کا تبادلہ ہوا۔ سفیروں کا تبادلہ ہوا تجارتی معاہدے کے بارے پینگیں بڑھائی جانے لگیں۔ اور تعلقات کو خوشگواری کی سمت لے جایا جانے لگا۔ تو مفتی صاحب نے اس کا خیر مقدم کیا۔ انہوں نے کہا۔

ہندوستان سے بھی ہمارے تعلقات اچھے ہو گئے ہیں اور میں اسی حق میں ہوں کہ ہمسایہ ملکوں سے ہمارے تعلقات بہتر ہونے چاہئیں اور حقیقت ہے کہ ایک ملک اس وقت ترقی کر سکتا ہے جب کہ ہمسایہ ملکوں کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے ہوں۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہندوستان سے بھی ہمارے تعلقات اچھے ہو رہے ہیں۔ سفارت خانے بحال کئے جا رہے ہیں۔ سفیر ان کے تبادلے عنقریب ہونے والے ہیں تجارتی معاہدے ہو رہے ہیں۔ (۱۶۰)

ہمسایہ ملکوں سے تعلقات کے سلسلے میں یہ بھی آپ کی پالیسی کا حصہ تھا کہ افغانستان جو ہمارا مغرب میں پڑوسی ملک ہے اس سے بھی تعلقات کو مستحکم کیا جائے۔ اور جو اختلافی مسائل ہیں اس کو گفت و شنید کے ذریعہ ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور فضا کو خوشگوار بنایا جائے۔ افغانستان سے بعض مسائل ایسے ہیں۔ جو عدم روابط کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ وہ ہمارا پڑوسی ملک ہے اور وہ پاکستانی مصنوعات کے لئے بہترین منڈی ثابت ہو سکتا ہے۔ ملک کی معیشت پر افغانستان سے تعلقات کی استواری بہت مثبت اثرات ڈالے گا۔ یہاں تک کہ جب ۱۹۷۶ء میں جناب ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں افغانستان کے ساتھ تعلقات کچھ خوشگوار ہونے لگے۔ تو مفتی صاحب نے اس کا خیر مقدم کیا اور ۱۹۷۶ء کے بجٹ میں اجلاس میں بجٹ پر تقریر کرتے ہوئے آپ نے اس کو اچھی خوشگوار تبدیلی کہا۔ (۱۶۱)

مسلمان ممالک کے ساتھ بہتر اور مضبوط تعلقات ہمیشہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کا محور رہے ہیں۔ مفتی محمود صاحب نے بھی اس بات پر ہمیشہ زور دیا ہے۔ ایک تقریر میں وہ کہتے ہیں کہ "عرب ممالک کو یقین دلانا چاہئے کہ پاکستان ایک بھائی کی حیثیت سے ہر وقت ان کے ساتھ ہے"۔ (162)

مفتی صاحب کی اس سلسلے میں یہ تجویز بھی تھی کہ اسلامی ممالک کا ایک بلاک بننا چاہئے تاکہ اس کے ذریعے عالمی مسائل کے حل کرنے میں وہ بہتر اور موثر طریقے سے اپنا کردار ادا کر سکیں۔ وہ 1969ء میں بجٹ تقریر میں قومی اسمبلی میں قومی مسائل کو زیر بحث لاتے ہوئے مسلم ممالک کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنانے کے بارے میں کہتے ہیں۔

اسلامی ممالک کے ساتھ ہمارے تعلقات انتہائی اچھے ہونے چاہئیں۔ افغانستان، ایران، عراق، ترکی، سعودی عرب، متحدہ عرب، اردن اور شام میں تمام مسلمان آباد ہیں۔ میں نے ابھی پندرہ مسلم ممالک کا دورہ کیا ہے اگر ان تمام مسلمان ممالک میں اتحاد و یگانگت ہو جائے تو آسانی کے ساتھ ایک اسلامی بلاک بن جائے گا اور پھر اس کے ذریعہ عالمی اسلامی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ (163)

اس سے بڑھ کر مفتی صاحب نے یہ تجویز بھی ایک دفعہ مدینہ منورہ میں مدینہ یونیورسٹی کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے پیش کی۔ کہ تمام اسلامی ممالک کے بڑے مشائخ اور متقدر علماء کا ایک گروپ منتخب کیا جائے جو تمام دنیائے اسلام کے لئے ایک متفق قانون مرتب کریں۔(164)

اسی تقریر میں آپ نے کہا کہ "اسلامی ممالک کو معاشیات، اقتصادیات اور اسلامی بینک کے قیام کا مشترکہ حل نکالنا ہے جس میں سودی نظام کو ختم کیا جاسکے۔ جب بھی لسانی، اقتصادی، معاشی اور دیگر باہمی رشتہ قوی ہوگا ایک دوسرے سے قریب ہوتے جائینگے"۔(165)

مفتی صاحب اور ان کی جماعت جمعیۃ علماء اسلام کا موقف یہ تھا کہ مسلمان ممالک کو آپس میں متحدہ تنظیم کی صورت میں متحد کیا جائے لیکن یہ اتحاد عملاً اس وقت تک بروئے کار نہیں آسکتا جب تک مسلمان ممالک سے غیر ملکوں کی سیاسی اور اقتصادی اثرات کا خاتمہ نہ کردیا جائے وہ اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

جمعیۃ علماء اسلام پاکستان میں مکمل اسلامی نظام نافذ کرنے کے ساتھ ساتھ اس امر کی بھی خواہاں ہے کہ پورا عالم اسلام اتحاد کی لڑی میں منسلک ہو جائے لیکن یہ اتحاد عملاً اس وقت تک بروئے کار نہیں آسکتا جب تک کہ مسلمانوں کی سرزمین سے غیر ملکیوں کے سیاسی اور اقتصادی اثرات کا کلیۃً خاتمہ نہ ہو جائے۔ عربوں کے سینے سے اسرائیل کا خنجر نہ اٹھایا جائے اور کشمیر کے مسلمان آزادی کے حق سے بہرہ ور نہ ہو جائیں۔ چنانچہ میری جماعت اسرائیل اور غیر ملکی سامراج کے اثرات کے خلاف عربوں کی غیر مشروط اور بلا تحفظ حمایت کرتی ہے۔(166)

اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اقتصادی و معاشی لحاظ سے کمزور ممالک اپنے بجٹ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے دوسری بڑی ملکوں کی طرف امداد کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ اور جب وہ قرض کی صورت میں ان کو امداد فراہم کرتی ہیں۔ تو وہ مقروض ملکوں کی پالیسیوں پر

اثر انداز ہوتی ہیں۔ جس سے آزاد ممالک کی آزادی چھین لی جاتی ہے۔ اور وہ اپنی پالیسیوں میں بھی ان کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ یہی بات مفتی صاحب نے بیان کی ہے وہ کہتے ہیں۔ "جہاں تک خارجہ پالیسی کا تعلق ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ خارجہ پالیسی ہماری آزاد ہونی چاہیئے اس وقت تک ہم جن ملکوں کے مقروض ہو چکے ہیں ہم ان کی پالیسی کے خلاف عمل نہیں کر سکتے"۔(167)

مفتی صاحب اس وقت کے سیٹو سنٹو معاہدوں کے بھی مخالف تھے۔ انہوں نے کہا کہ ان دفاعی معاہدوں سے ہمارے منسلک رہنا بے سود ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ " ان حالات میں ہمارا سیٹو سنٹو سے منسلک رہنا بے سود ہے دفاعی معاہدوں میں اگر ذمہ داری پوری نہ کی جائے تو اس سے کیا فائدہ؟"۔

کشمیر کے مسئلہ کو بھی پاکستان کی خارجی پالیسی میں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہی مسئلہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ہمیشہ سے وجہ نزاع رہا ہے۔ اور اس مسئلہ پر تقریباً دو جنگیں لڑی جاچکی ہیں۔ ملک کی بجٹ کا بہت زیادہ حصہ دونوں ملکوں کا دفاع پر خرچ ہو جاتا ہے۔ اور اس میں سرفہرست مسئلہ، مسئلہ کشمیر ہے۔ کشمیر کے مسئلہ میں بھی مفتی محمود اور ان کی جماعت کا موقف ہمیشہ واضح رہا ہے۔ جو کہ قومی امنگوں کے عین مطابق ہے۔ جمعیۃ علماء اسلام کی خارجی پالیسی میں اس کو ترجیحی بنیادوں پر عمل کرنے پر زور دیا جاتا رہا ہے۔

اس سلسلے میں مفتی صاحب کی وہ تقریر جو آپ نے جامعہ ازہر مصر کے "مجمع البحوث الاسلامیہ" میں کی ہے۔ جس میں انہوں نے مسئلہ کشمیر کی تحقیق کی طرف ان کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے اور عربوں اور دیگر مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ کشمیر کے حل میں تعاون کریں۔ آپ نے بتایا ہے کہ فلسطین کے مسئلہ کی طرح یہ مسئلہ بھی پاکستان اور کشمیر کے مسلمانوں کے لئے نہایت اہم ہے اور اس کا حل کشمیریوں کے امنگوں کے مطابق لازمی ہے۔ انہوں نے کہا۔

جس کے باشندوں میں مسلمانوں کی تعداد اسی فی صد ہے۔ ہندوستانی حکومت نے اس خطے کو غصب کر کے وہاں کے باشندوں کی آزادی سلب کر لی ہے۔ مسلمان وہاں دن رات سختیوں، مصیبتوں اور خونریزی کا شکار ہیں۔ وہ ہر طرح کی مصیبتوں کو برداشت کر رہے ہیں اور ان مشرک ہندوؤں کے تسلط سے آزادی حاصل کرنے کے لئے قربانیاں دے رہے ہیں۔(۱۶۹)

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے آزاد کشمیر میں پیپلز پارٹی کی تشکیل کی اور اس کا اگلا پروگرام یہ تھا کہ آزاد کشمیر کے لوگوں کو پاکستان کی قومی اسمبلی اور سینٹ کے ایوان میں نمائندگی دی جائے۔ اس صورتحال کے بارے میں جب مفتی محمود سے سوال کیا گیا۔ تو آپ نے جہاں حکومت کے اس پروگرام کی سخت مخالفت کی اور اس کو کشمیر کے مسئلہ کے بارے میں پاکستان کے بین الاقوامی فورم پر موقف سے انحراف قرار دیا وہاں آپ نے مسئلہ کشمیر کے بارے میں اپنے موقف کی بھی وضاحت کی۔ انہوں نے جواب میں فرمایا۔

بیس سال سے کشمیر کے متعلق پاکستان کا یہ موقف چلا آرہا ہے کہ کشمیریوں کی تقدیر کا فیصلہ حق خود ارادیت سے ہو گا۔ خواہ ان کشمیریوں کا تعلق آزاد کشمیر سے ہو یا مقبوضہ کشمیر سے، وہ اپنے بارے میں خود فیصلہ کرلیں گے۔ پاکستان نے کشمیر کی تقسیم کو ابھی تک تسلیم نہیں کیا۔ اگر آزاد کشمیر کے لوگوں کو پاکستان قومی اسمبلی اور سینٹ کے کسی ایوان میں نمائندگی دی گئی تو اس کا واضح مطلب ہو گا کہ آزاد کشمیر کو پاکستان کا حصہ تسلیم کر لیا گیا ہے اور موجودہ کنٹرول لائن کو مستقل لائن کی حیثیت دے کر کشمیر کے مسئلے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا ہے۔ یہ فیصلہ ایسا ہو گا کہ گویا مقبوضہ کشمیر بھارت کو طشتری میں رکھ کر پیش کر دیا جائے۔(۱۷۰)

مفتی صاحب امریکی اور روسی سامراج دونوں کے سخت خلاف تھے۔ جناب محمد فاروق قریشی صاحب لکھتے ہیں۔

امریکی سامراج ہو یا روسی۔ مفتی صاحب کی لیفٹ بلیفٹ صاف قومی مفاد میں دونوں کی راہ میں مزاحم رہے۔ 70ء میں امریکہ پاکستان میں سیاسی طور پر خاصا سرگرم تھا .... اسی طرح روسی سامراج کے توسیع پسندانہ عزائم جس کا مظاہرہ اس نے افغانستان کی خود مختار جمہوریہ میں غاصبانہ دراندازی کی صورت میں کیا ہے پاکستان میں سب سے پہلے مفتی محمود نے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور افغانستان کے مجاہدین کی مکمل اور غیر مشروط حمایت کا اعلان کیا۔(۱۷۱)

پاکستان کے پڑوسی ملک میں 79ء میں جب روس نے وہاں فوجیں اتار دیں۔ اور اپنا تسلط جمانے کی کوشش کی روسی افواج نے وہاں علماء اور دیندار لوگوں کو گرفتار کرنا اور مارنا شروع کیا۔ تو اکثر بے بس لوگ مہاجرین بن کر پاکستان کی طرف کوچ پر مجبور کر دیئے گئے۔ اور بعض لوگوں نے پرانی بندوقیں اٹھا کر ان کے خلاف جہاد شروع کیا۔ تو مفتی صاحب نے جہاں مہاجرین کی آباد کاری میں اور ان کے ساتھ تعاون میں پورا ساتھ دیا وہاں مجاہدین کی بھی بھرپور سرپرستی کی۔ قاری سعید الرحمن صاحب لکھتے ہیں۔

افغانستان کے مسئلہ میں مفتی محمود صاحب کا نہایت واضح اور سخت موقف تھا وہ روسی تسلط کو انتہائی جارحانہ اور ظالمانہ اقدام قرار دیتے تھے۔ افغانی مجاہدین کی حمایت کے لئے انہوں نے اندرون اور بیرون ملک دورے کئے۔ انتہائی بیماری اور ضعف کے باوجود وہ دور دراز علاقوں تک گئے۔ افغانی مجاہدین کے لیڈروں سے ہمیشہ رابطہ رکھتے اور ان کے درمیان اتحاد کے لئے کوشاں رہے۔ افغان لیڈر بھی ان کے پاس مشورے کے لئے آتے رہتے۔ افغان لیڈروں میں اتحاد کے لئے کئی بار پشاور میں ان کے مراکز میں گئے۔ اور انہیں اتحاد کے لئے قائل کیا۔ بالآخر ان کی یہ کوششیں نتیجہ خیز ثابت ہوئیں۔ چاہے ظاہری طور اس اتحاد کا کریڈٹ کوئی اور لے۔ لیکن اس اتحاد میں مفتی صاحب کی کوششوں کو بڑا دخل تھا۔(172)

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے۔ کہ مفتی محمود کا انتقال اکتوبر ۱۹۸۰ء میں ہوا۔ اس وقت تک ابھی امریکہ نے افغانستان جہاد میں کوئی خاص دلچسپی نہیں دکھائی تھی۔ یہ تو بعد میں وہ اس طرف متوجہ ہوا۔ اس نے روس کو شکست دینے کے لئے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔

کسی ملک کی خارجہ پالیسی کی وضاحت اور اس کے دیگر ممالک میں بین الاقوامی مسائل پر موقف کو بیان کرنے کی ذمہ داری اس ملک کے سفارت خانوں کی ہوتی ہے۔ اس میں متعین سفیر اپنے ملک کے نمائندے ہوتے ہیں۔ اور ملک کی پالیسی اور موقف کو سب چیزوں پر ترجیح پیش نظر رہتی ہے۔ لیکن مفتی صاحب ہمیشہ اس بات سے نالاں رہے کہ پاکستانی سفیر اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کرتے۔ اور وہ وہاں ملک کے وقار کے خلاف سرگرمیوں میں ملوث ہوتے ہیں۔ وہ عرب ممالک کے دورے سے واپسی پر ایک بیان میں کہتے ہیں۔

> بدقسمتی سے ہماری وزارت خارجہ کا اتنا بھی پروپیگنڈہ نہیں ہے کہ ان تمام اسلامی ممالک میں اپنا تعارف کرا سکے۔ لیکن پھر بھی وہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان بڑا اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ میں نے جتنے بھی اسلامی ممالک کا دورہ کیا سب جگہ یہی حال ہے مصر میں تو یہ حال کہ وہ یہ تک نہیں جانتے کہ پاکستان ایک مستقل ملک ہے بلکہ وہ پاکستان کو ہندوستان کا ایک حصہ سمجھتے ہیں .... اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے سفارت خانے صحیح طور پر کام نہیں کر رہے ہیں۔ ہمارے سفیروں کا انتخاب اچھا نہیں ہوتا ہے .... مصر کے لوگ کشمیر کے مسئلہ سے بالکل ناواقف ہیں۔ کشمیر کا مسئلہ ایسا ہے کہ جب تک اچھی طرح عالم اسلام میں پروپیگنڈہ نہ ہو اور سب کا تعاون حاصل نہ کیا جائے تو یہ حل نہیں ہو سکتا۔(173)

مفتی صاحب کو غیر مسلم ممالک میں مسلم اقلیت کے مسائل سے بھی بہت آگاہی حاصل تھی۔ اور وہ انکے مسائل کے حل کے لئے بھی وقتاً فوقتاً مقتدر قوتوں کو متوجہ فرماتے تھے۔ دنیا میں سب سے بڑی مسلم اقلیت ہندوستان میں ہے جن کی آبادی پاکستان کی مسلم آبادی سے

بھی کسی طرح کم نہیں وہ اس کے لئے ضروری قرار دے رہے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام کی اساس پر قائم حکومت بھارت کے مسلمانوں کے مصائب میں ان کا مدد کر سکتی ہے۔ اور اہل کشمیر کی آزادی کی جدوجہد میں کشمیریوں کے لئے اور اسرائیل کی جارحیت کے مقابلہ میں عربوں کی پشت پناہ واقع ہو سکتی ہے۔ وہ ایک تقریر میں کہتے ہیں۔

> میری جماعت بھارت میں بسنے والے چھ کروڑ مسلمانوں (جن کی تعداد اب ۱۲ کروڑ سے تجاوز ہے) کے موجودہ سنگین حالات سے بھی بے پرواہ نہیں ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اسلامی نظام اور اسلامی اخوت اور اسلامی مساوات کی اساس پر مبنی نظام کے قیام سے پاکستان میں ایک ایسی مستحکم اور با اثر حکومت قائم ہو سکتی ہے۔ جو بھارت کے مسلمانوں کے مصائب کا مداوا کرنے کے قابل ثابت ہو سکے گی۔ ایسی ہی حکومت اہل کشمیر کی آزادی اور اسرائیل کی جارحیت کے مقابلہ میں عربوں کی پشت پناہ بھی بن سکتی ہے۔(174)

ملکی دفاع کے بارے میں حکمت عملی و تجاویز

کسی بھی ملک کے لئے اس کا دفاع، سرحدات کا تحفظ، اس ملک کے رہنے والوں کو جان ومال عزت و آبرو کی تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ ملک کے خطہ کا ایک ایک انچ ایک تقدس رکھتا ہے۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے بھی سرحدات کے تحفظ کرنے والوں کے لئے بہت بڑے اجر و ثواب کے وعدے ہیں۔ مولانا مفتی محمود بھی ایک محب وطن ہیں۔ حب الوطنی کے اسی جذبہ کے تحت آپ نے ملکی دفاع کے مضبوط کرنے پر ہمیشہ زور دیا ہے۔ ۱۹۷۲ء کے قومی بجٹ پر قومی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے ملک کی دفاع اور اس پر خرچ ہونے والی رقم کا دفاع کیا ہے۔ اور دفاع کو مضبوط بنانے کی تاکید کی ہے۔ مفتی صاحب اسی تقریر میں ایٹم بم بنانے کو ایک اخلاقی اور دینی فرض بتاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم ایٹم بم کیوں نہیں بنا سکتے ہمیں بھی وہ تمام ذرائع حاصل ہیں جو

اس کے بنانے کے لئے ضروری ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم بھوک پیاس برداشت کر لینگے مگر ایٹم بم ضرور بنائینگے۔ وہ اس تقریر میں ملکی دفاع پر اظہار خیال کچھ یوں کرتے ہیں۔

ملک کے دفاع پر جتنا پیسہ خرچ کیا جائے ہم اس پر خوش ہیں۔ تاہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری فوج مضبوط ہو۔ اور ہم اسلامی نقطہ نظر سے یہ بھی کہتے ہیں کہ ان ملکوں کے مقابلے میں جن کے پاس ایٹم بم ہے ہائیڈروجن بم ہے۔ ہمارے پاس بھی یہ تمام چیزیں ہونی چاہیئے۔ اور یہ ہمارا اخلاقی اور دینی فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ﴿وَ أَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ﴾ کہ اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں اپنی قوت کو تیار رکھو۔ یہ عجیب بات ہے کہ ایٹم بم بنتے ہیں تو غیر ملکوں میں۔ پاکستان بھی ایک بڑا ملک ہے اس میں بھی ایٹم بم بن سکتے ہیں اس کے بھی ذرائع ہیں۔ ہم بھوک برداشت کر سکتے ہیں پیاس برداشت کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس بھی جدید قسم کے آلات ہوں۔ اور ہم بھی پوری طرح مسلح ہوں۔ جیسے دوسری قومیں مسلح ہیں۔ (175)

مئی ۱۹۷۹ء میں مفتی صاحب وزارۃ الاوقاف کویت کی دعوت پر کویت تشریف لے گئے تھے۔ وہاں آپ اپنے اسی دورہ میں "جمعية الاصلاح الاجتماعى" کے دفتر بھی تشریف لے گئے۔ وہاں اسی جمعیۃ کے ہفتہ روزہ " المجتمع " کے ایڈیٹر نے آپ سے انٹرویو کیا۔ جس میں اکثر اس وقت کے پاکستان کے حالات سے متعلق سوالات تھے جن کے مفتی صاحب نے تفصیل کے ساتھ جوابات دیئے۔ ان میں ایک سوال "ایٹم بم" بنانے سے متعلق تھا۔ جس کا مفتی صاحب نے تفصیل سے جواب دیا۔ جس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

ہم ایٹم بم ضرور بنائینگے اور یہ صرف اس لئے نہیں ہوگا کہ ہم اس سے تباہی لائیں یا قتل وخونریزی کے لئے اس کو استعمال کریں۔ بلکہ ہمارے اس سے اور مقاصد ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا ایٹم بم بنانا تمام مسلمانوں کے لئے جس کا تعلق دنیا میں کسی بھی ملک سے ہے۔ باعث فخر ہے۔ کیونکہ جیسے کافر "ملت واحدۃ" ہیں۔ ایسا ہی مسلمان بھی "ملت واحدۃ" ہیں۔ کفار ممالک میں امریکہ، فرانس، برطانیہ، روس اور چین کے پاس ایٹم بم ہیں یہاں تک کہ ہندوستان بھی اس کے بنانے میں لگا ہوا ہے۔ لیکن ساری دنیا میں کوئی مسلم حکومت نہیں ہے۔ جس کے پاس یہ قوت ہو۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو واضح حکم دیا ہے کہ وہ کفار کے مقابلہ پر اپنی استطاعت کے مطابق ضرور اپنی قوت کو مضبوط بنائیں اور تیاری کریں۔ اور یہ اللہ عزوجل کا حکم دیا ہے جیسے کہ اس نے ہمیں نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ اور یہ احکام برابر برابر ہیں۔ اس لئے ہم تمام حکومتوں کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس واجب چیز کے پورے کرنے اور تکمیل تک پہنچانے میں ہماری مدد کریں۔ (176)

مفتی صاحب اپنے ملک پاکستان کے دفاع کی مضبوطی کے بارے میں کس قدر فکرمند ہیں۔ ان بیانات سے اس کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ مضبوط دفاع کو ایک دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری سے اس کی تعبیر کرتے ہیں۔ اور یہ بتاتے ہیں کہ اس سے نہ صرف پاکستان مضبوط و مستحکم ہو گا۔ بلکہ دنیا کے تمام مسلم حکومتوں کی مضبوطی واستحکام کا باعث ہوگا۔ اور تمام اسلامی حکومتیں اس پر بجا طور پر فخر کر سکیں گی۔

قومی اور عوامی مسائل ومشکلات کے حل کرنے کے لئے آپ کی جدوجہد

مولانا مفتی محمود نے صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے جو قانون اور تعلیم سے متعلق اصلاحات نافذ کیں۔ ان کے بارے میں " ان کی دینی خدمات " کے عنوان کے تحت تفصیل کے ساتھ اس پر باحوالہ روشنی ڈالی جاچکی ہے۔ یہاں آپ کی حکومت کی ترقیاتی منصوبوں کے بارے میں جو تجاویز وسفارشات تھیں۔ اس سے بحث کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ چونکہ مفتی صاحب کا طرز سیاست اور انداز حکمرانی عوامی تھا۔ اس کے دور میں وزیر اعلیٰ ہاؤس کے دروازے ہر وقت ملاقاتیوں کے لئے کھلے رہتے تھے۔ خاص کر عصر کے وقت سے لیکر رات دیر

تک ہر وقت عام لوگوں کے ہجوم میں گھرے رہتے تھے۔ اور ان کے مسائل دریافت کرتے اور ان کے حل کے لئے احکامات صادر کرتے رہتے تھے۔ آپ ہمیشہ عوامی مسائل کے حل کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔ عوام ہی میں رہتے تھے۔ انہیں کے ساتھ بیٹھتے اس لئے بہت سے عوامی مسائل ومشکلات سے خود بھی آگاہ تھے۔ اور ان کی مشکلات کو دیکھ کر بہت دکھ محسوس کرتے تھے اور اس پر کڑھتے رہتے تھے۔ اس لئے جب ایک محدود مدت (۹ماہ) کے لئے محدود اختیارات ہی سہی ان کے ہاتھ آئے تو انہوں نے اس کو بروقت عوامی مسائل کے حل کرنے میں استعمال کرنے میں کوئی کوتاہی روا نہیں رکھی۔ انہوں نے اپنی حکومت کے ابتداء میں جن عوامی مسائل کے حل کو پیش نظر رکھا اگرچہ نوماہ کی وزارت میں ان کو روبعمل لانا ممکن نہ تھا۔ اور نہ ان سکیموں اور منصوبوں پر عمل درآمد اتنا آسان تھا۔ لیکن پھر بھی آپ نے ان کے ڈیزائن، فزیبلٹی رپورٹس وغیرہ کو منظور کرا کر گویا ان کی بنیادیں رکھوادیں۔ مفتی صاحب نے وزارت کا حلف اٹھانے کے چند روز بعد ایک خود مختار ترقیاتی ادارے کے بنانے کا فیصلہ کیا جس کا مقصد صوبہ سرحد میں ترقیاتی منصوبوں اور سکیموں کے بارے میں رپورٹس تیار کرنے اور ان کو پایہ تکمیل تک پہنچانے اور دستیاب وسائل کے اندر رہتے ہوئے ان کو روبعمل لانا تھا۔ ڈاکٹر احمد حسین کمال نے اپنی کتاب "مجدد ساز قیادت" میں لکھا ہے۔ "صوبہ سرحد کے اپنے خود مختار ترقیاتی ادارے نے جو حال ہی میں قائم کیا گیا ہے۔ اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ یہ ادارہ عوام کی بنیادی ضروریات کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے ساتھ ساتھ صنعتی اور زرعی ترقیات کی سکیمیں بھی شروع کرے گا"۔(177)

> اس ترقیاتی ادارے نے مردان شوگر مل کے لئے زمین حاصل کرلی۔ یہ کارخانہ جلیبم کی حد سے قائم کیا جا رہا ہے۔ اس منصوبہ پر سات کروڑ روپیہ خرچ کرنے کا تخمینہ تھا۔ سیمنٹ کارخانہ کے بارے میں یہ فیصلہ ہوا کہ یہ کوہاٹ میں قائم ہو گا۔ اس منصوبہ پر آٹھ کروڑ روپیہ سے زیادہ لاگت کا اندازہ تھا۔ سوتی کپڑے کے کارخانے کے بارے میں

فیصلہ ہوا کہ ایک سوات میں اور ایک دیر میں قائم ہو گا۔ اور ہر کارخانہ پر لاگت کا تخمینہ ۳،۲۰ کروڑ روپے کا تھا۔ جو دو سال میں مکمل ہونے والے تھے۔ کیمیاوی کھاد کے کارخانہ کے قیام کے لئے چار پانچ سال کی مدت رکھی گئی۔ جس پر آٹھ کروڑ روپے لاگت آنے کی۔ اس کو موزوں مقام پر قائم کرنے کا منصوبہ تھا۔ ورسک سٹیل پلانٹ کے نام سے فولاد کے کارخانہ کا منصوبہ زیر تجویز تھا۔ اس پر سترہ کروڑ روپے کا تخمینہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی بھاپ سے پیدا ہونے والی بجلی کے سٹیشن کے قیام کا منصوبہ زیر غور تھا۔ ایسے ہی سوڈا ایش کے کارخانہ قائم کرنے کی ایک تجویز تھی۔ جس پر ۸ کروڑ کے اخراجات تھے۔ اور ان تمام منصوبوں پر اخراجات میں زرمبادلہ بھی شامل تھا۔ کاغان، سوات، چترال، دیر اور کوہستان کے علاقے پن بجلی پیدا کرنے کے لئے موزوں مقامات تھے۔ اور وہاں اس کے پیدا کرنے کے وسائل بھی تھے۔ صوبہ سرحد کے ترقیاتی ادارے کا وہاں چھوٹے چھوٹے پاور ہاؤس قائم کرنے کا پروگرام تھا۔ جس سے ایک ہزار پانچ سو دیہات تک بجلی پہنچانے کا انتظام ہو سکتا تھا۔ ایسے کان کنی کے شعبے کو فعال بنانے کے لئے ضروری اقدامات کا فیصلہ ہوا۔ ایسے آبنوشی اور آبپاشی کے منصوبے بھی اس ترقیاتی ادارے کے زیر غور تھے آبنوشی کے سکیموں کے لئے حکومت نے دو سال کا عرصہ مقرر کیا۔ نیز چشمہ رائٹ بینک کینال کے منصوبہ بھی زیر غور تھا۔ جس کی تفصیل ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے ترقیاتی منصوبوں کے تحت آگے درج ہے۔ شروع میں تربیلا ڈیم سے صوبہ سرحد کے لئے آبپاشی کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ مفتی صاحب کی حکومت نے وہاں سے پہور کینال منظور کرایا۔ جس کے لئے وہاں سے ٹنل کا انتظام کرایا گیا۔ اور پھر اس ٹنل کا نام "مفتی ٹنل" رکھا گیا۔ جو اب بھی موجود ہے۔ کوٹ ادو سے ڈیرہ اسماعیل خان کو بجلی پہنچانے کا انتظام اس کے علاوہ زراعت اور دیہی ترقی کے منصوبے بنائے گئے۔(178)

صوبہ سرحد نہایت پسماندہ صوبہ ہے۔ اپنے وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود حکومتوں کی کبھی بھی یہ دلچسپی نہیں رہی ہے کہ اس صوبہ کو ترقی سے ہمکنار کیا جائے۔ اور عوام

کے مسائل ومشکلات کو آسان بنایا جائے۔ معدنیات و آبی وسائل سے مالا مال صوبہ ہونے کے باوجود ادھر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ مفتی صاحب کی شدید خواہش اور کوشش رہی کہ اس صوبہ کو اپنے دستیاب وسائل کے مطابق ترقی سے ہمکنار کیا جائے۔ اس لئے آپ ہمیشہ ان مسائل و مشکلات کے حل کرنے پر زور دیتے خصوصاً آپ کے اپنے حلقے ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے مسائل آپ تفصیل کے ساتھ بیان کرتے اور حکومت سے ان کے حل کرنے کا مطالبہ کرتے تھے۔

۱۹۶۲ء کی اسمبلی میں آپ کی بجٹ تقریر میں ضلع ڈیرہ اسماعیل خان میں آب نوشی کے لئے پانی کی ضرورت پر آپ نے جس دل سوزی سے روشنی ڈالی ہے وہ دل دہلا دینے والی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

> میں ہاؤس کو اس طرف بھی متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ کہ میرا ضلع ڈیرہ اسماعیل خان ہے۔ اور اس سے ملحقہ تحصیل کلی مروت، میرے خیال میں پاکستان بھر کا سب سے زیادہ پسماندہ علاقہ ہے۔ وہاں کی اکثر آبادی پینے کے پانی سے محروم ہے۔ آج اس سخت گرمی میں وہاں کے لوگ اپنے گھروں کو خیر آباد کہہ کر دس دس، بارہ بارہ میل دور کہیں پانی کے لئے خانہ بدوشی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہاں چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں ان کے چہرے گرم گرم ہواؤں سے سیاہ ہو چکے ہیں۔ کاش! میں آپ کو اپنے دل کی زخموں سے مطلع کر سکتا کہ ایک علاقہ میں تو لازمۂ حیات (پانی) سے مخلوق خدا محروم ہے۔ اور دوسرے علاقوں میں بجلی بتی جلتی، گرمیوں میں ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پی کر آرام کیا جاتا ہے۔ (179)

1969ء کے بجٹ تقریر میں بھی آپ اپنے حلقے کے عوام کے پینے کے پانی کی مشکلات کا ذکر کرتے ہیں اور ان کے حل کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

> وہاں پانی کی شدید قلت ہے تین سال سے حکومت کو درخواستیں دے رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کوئی انتظام نہیں کیا گیا میں نے ایک تحریک التواء بھی اس کے متعلق پیش کی تھی تو آپ (اسپیکر قومی اسمبلی) نے فرمایا تھا کہ بجٹ میں اس کے متعلق باتوں میں عرض کر سکتا ہوں اس ضلع میں سوائے چند ایک مقامات کے پانی کا وجود نہیں ہے۔ لوگ

> پیاس کے مارے گھر چھوڑ چھوڑ کر دور دراز پانی کے کنارے جھونپڑیوں میں جا کر رہتے ہیں .... میں چیلنج کرتا ہوں کہ کوئی میرا بیان جھٹلا دے۔ کتنی بدبختی ہے کہ لوگ پیاس سے مر رہے ہوں۔ مگر اس کا گورنمنٹ کوئی تدارک نہیں کرتی .... جیسے مشرقی پاکستان کے بھائی پسماندگی کی شکایت کرتے ہیں انہوں نے ہمارا ضلع نہیں دیکھا اور نہ وہ کبھی بھی اپنی پسماندگی کو روتے گویا ہمارا ضلع بہت پسماندہ ہے حکومت کی فوری توجہ کا مستحق ہے۔ (۱۸۰)

پھر جب مئی ۱۹۷۲ء میں آپ نے صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ تو آپ نے سب سے پہلے زیادہ توجہ اس بات کی طرف دی کہ جہاں جہاں پینے کے پانی کی ضرورت ہے وہاں اس کا انتظام کیا جائے۔ اور آپ نے اس کے لئے زیادہ سے زیادہ دو سال مدت مقرر کی۔ کہ دو سالوں کے اندر اندر ہر دیہات تک پانی پہنچایا جائے گا۔ بحیثیت وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد اگرچہ آپ کے وسائل محدود تھے۔ اور پھر آپ کو موقعہ بھی نو ماہ کا ملا۔ جس میں ان تمام سکیموں اور منصوبوں پر عملدرآمد ممکن نہ تھا۔ پھر بھی ان کی فیزیبلٹی رپورٹس اور ڈیزائن وغیرہ کو منظور کروا کر آنے والی حکومتوں کے لئے ان سے چشم پوشی یا ان کو نظر انداز کرنا ممکن نہ رہا۔ اور پھر بعد میں آنے والی حکومتوں نے آپ ہی کے منظور کردہ منصوبوں پر عمل کیا۔ اور سوائے چند دیہاتوں کے اکثر جگہ آب نوشی کا مسئلہ حل ہو چکا ہے۔

ضلع ڈیرہ اسماعیل خان، پاکستان کے ان اضلاع میں سے ہے۔ جو رقبہ کے لحاظ سے بہت وسیع ہے۔ اکثر میدانی ہموار زمین ہے۔ لیکن پانی کی عدم دستیابی کی وجہ سے اس کی زمین بنجر اور خشک ہے۔ اور پانی کو ترستا ہے۔ اگر آبپاشی کا صحیح بندوبست ہو جائے۔ تو اس ضلع کی پیداوار سارے صوبہ سرحد کو غلہ کی پیداوار میں خود کفیل کر سکتا ہے۔ مگر اس طرف توجہ نہیں دی گئی ہے۔ یہاں آبپاشی کے دو ذرائع ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ دریائے سندھ سے نہر کے ذریعہ یہاں تک

پانی لایا جائے اور زمینوں کو سیراب کیا جائے۔ دوسرا ممکنہ ذریعہ یہ ہے کہ پہاڑی ندی نالوں میں آنے والے پانی کو کنٹرول کیا جائے اور اس کو حسبِ ضرورت استعمال میں لایا جائے۔

مفتی صاحب اپنے سیاسی دور میں دونوں ذرائع کو قابلِ استعمال بنانے کا مطالبہ کرتے رہے ہیں۔ 1962ء میں بجٹ تقریر میں آپ نے دونوں ذرائع سے ڈیرہ اسماعیل خان کی زمینوں کو پانی کی فراہمی کا مطالبہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

علاوہ ازیں ہمارے ضلع کی صاف اور خوشنما زمین اور وہاں کے میدان جو سونا اگلنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن آبپاشی کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے آج وہ معطل ہیں۔ پورے ضلع میں ایک چھوٹی نہر چشمہ کی طرف سے جاری ہے۔ جو ششماہی ہے اور بالکل ناکافی ہے۔ چشمہ بیراج پر جو عالمی بینک کی رقم سے کام شروع ہونے والا ہے۔ اور وہاں سے پانی چناب، جہلم کی طرف پہنچانے کی سکیم شروع ہونے والی ہے۔ اگر ہمیں بھی دریائے سندھ کے پانی سے بھرپور سندی پانی دیا جائے۔ اور اس نہر کو وسیع تر کیا جائے تو ہمارا ضلع آباد ہو سکتا ہے۔ نیز گل بگھ سکیم جسے اب ملتوی کر دیا گیا ہے۔ ہمارے ضلع کی زمینوں کو شاداب بنانے کے لئے لازمی سکیم ہے لیکن افسوس کہ اسے ملتوی کرنے کا حکم صادر کر دیا گیا ہے۔ میری درخواست ہے کہ اس سکیم کو بہت جلد عملی جامہ پہنانے کا حکم جاری فرمایا جائے۔ (۱۸۱)

1972ء کی بجٹ تقریر میں آپ نے تفصیل کے ساتھ اس مطالبہ کو پیش کیا۔ انہوں نے کہا

جناب والا! میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ڈیرہ اسماعیل خان کے ضلع میں ستر لاکھ ایکڑ زمین وہ ہے جو بالکل صاف ہے۔ تقریباً کوئی اس میں اونچ نیچ نہیں اگر پانی مل جاتا تو ستر لاکھ ایکڑ زمین وہ ایک ضلع میں سیراب ہو جائے گی اور یہی تو فرنٹیئر کا صوبہ ہے باہر کا نہیں پندرہ لاکھ ایکڑ زمین چشمہ رائٹ بینک کینال سے یہ سیراب ہو سکتی ہے۔ لیکن اس میں خواہ مخواہ ٹال مٹول کی پالیسی اختیار کی گئی ہے۔ ہمارا کوئی جھگڑا نہیں تھا ہمارا صرف مطالبہ تھا۔ وزیر اعظم سے جو اس وقت صدر بھی تھے ان سے عرض کیا تھا۔ کہ

آپ اس کی منظوری دیں۔ اس لئے کہ اس وقت 53 لاکھ سے اوپر کے منصوبہ میں مرکزی حکومت کی منظوری لازمی ہوتی تھی لیکن منظوری نہیں دی گئی۔ اور آج تک نہیں دی گئی۔ اور مسلسل اسے ٹالا جا رہا ہے۔ اور کہتے ہیں جب تقسیم پانی کی ہو گی تو سندھ اور پنجاب کے درمیان تمہارا حصہ بھی متعین کر دیا جائے گا۔

اسی تقریر میں آگے جا کر دریائے سندھ کے پانی پر اپنے حق کے بارے بڑا وزنی دلیل پیش کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

جناب والا! اگر آپ کہیں کہ دریائے سندھ سندھ کی ملکیت ہے اس میں ہمارا حصہ نہیں ہے تو میں یہ عرض کروں گا۔ کہ یہ دریائے کابل جو اکوڑہ نوشہرہ سے ہوتے ہوئے اٹک کے پل کے قریب اس دریا میں گرتا ہے۔ یہ تو خاص فرنٹیئر کا پانی ہے اس پانی کو ہمیں وہاں ڈیرہ اسماعیل خان میں واپس کر دو۔ اس میں آپ کا ہم شکریہ بھی ادا کریں گے۔ ہمارا کام ہو جائے گا۔ آخر وہ زمین بھی پاکستان ہی کی زمین ہے اگر وہ کاشت کاری کے قابل ہو جائے تو آپ کا کیا نقصان ہو گا۔ (182)

اس کے بعد مفتی صاحب نے آبپاشی کے دوسرے سکیم پہاڑی پانی کو کنٹرول کرنے کی سکیم کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے کہا۔

جہاں تک گجوری ڈیم کا تعلق ہے اس پر تقریباً کروڑوں روپے خرچ ہو چکے ہیں۔ کروڑوں روپے خرچ ہو جانے کے باوجود اس کو ترک کر دیا گیا ہے۔ انتہائی اہم منصوبہ کہ وہ بھی زراعت کے لئے جو ضروری منصوبہ ہے اس کو ترک کر دیا گیا اور کروڑوں روپے اس ملک کے ضائع چلے گئے ہیں اور اگر اس پر اور خرچ کر لیا جاتا تو یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا۔ جناب والا! ہمارا مسئلہ صرف پانی کا ہے ہمیں پانی چاہیے صرف پانی صرف پانی۔ اور اگر پانی مل جاتا اور ہماری 13.5 لاکھ ایکڑ زمین پھر سیراب ہو جاتی ہے وہاں یقیناً گنا پیدا ہو گا۔ کپاس پیدا ہو گی ہر چیز ہو گی وہاں پر کارخانے بھی لگیں گے اور وہاں پر شوگر مل لگ سکتی ہے۔ اور وہاں ٹیکسٹائل مل بھی لگ سکتی ہے۔ (183)

ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کا دوسرا بڑا مطالبہ صوبہ پنجاب اور ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے درمیان رابطہ پل کا تعمیر و قیام تھا۔ کیونکہ دریائے سندھ پر پل نہ ہونے کی وجہ سے بالکل صوبہ پنجاب سے کٹا رہتا تھا۔ ڈیرہ اسماعیل خان اور اس وقت ضلع میانوالی کے مشہور قصبے دریاخان میں جو کہ چودہ میل کا فاصلہ تھا۔ یہ راستہ چودہ گھنٹوں میں طے ہوتا تھا۔ لوگ بڑی مشکلات میں مبتلا ہوتے تھے۔ تجارت پر بھی اس کے برے اثرات پڑتے تھے۔ مفتی صاحب نے ۱۹۶۲ء کے بجٹ تقریر میں اس کا تذکرہ یوں کیا ہے۔

دریاخان سے ڈیرہ اسماعیل خان تک دریا کو پار کرنے کے لئے چودہ میل کا سفر چودہ گھنٹے میں طے کیا جاتا ہے۔ وہاں نہ انجنوں کا انتظام ہے۔ نہ جہاز اور سٹیمر کا۔ ایک جہاز جو دقیانوس کے زمانہ کا ہے۔ وہاں چلتا ہے جو اکثر بیشتر خراب ہی رہتا ہے۔.........

.... اس کا بہت جلد انتظام ضروری ہے۔ (184)

پھر یہی مطالبہ آپ 1964ء کی بجٹ تقریر میں بھی کرتے ہیں۔ ۱۹۶۷ء کے بجٹ میں آپ یہ مسئلہ پھر شد و مد کے ساتھ اٹھاتے ہیں۔ اور اس کے لئے حکومت سے فنڈز کی منظوری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

جہاں تک دوسرا مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ ڈیرہ اسماعیل خان کا ضلع گرمی کے زمانے میں ایک جزیرہ بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ راستہ پنجاب کے ساتھ باقی نہیں رہتا۔ اور عرصے دریا کا پل ٹوٹ جاتا ہے۔ (گرمیوں میں) اور دریاخان اور میانوالی کے ضلع سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے اس طریقے سے یہ پسماندہ ضلع تقریباً آٹھ تو مہینے مسلسل جزیرے کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ وہاں پر دریاخان اور ڈیرہ اسماعیل خان کے درمیان پل کا منصوبہ بن چکا ہے۔ اس پل کی منظوری مل چکی تھی۔ لیکن اس کے بعد وہ روپیہ واپس لے لیا گیا اور اس کو سنگل مل کراچی کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ جناب والا! اگر یہ بن جائے یعنی پل تو اس سے ہمارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ ہمارا سارے پاکستان کے ساتھ رابطہ قائم ہو

سکتا ہے۔ اس لئے یہ پل نہایت ضروری ہے۔ اگر وزیر خزانہ ڈیرہ اسماعیل خان کی طرف توجہ دیں تو یہ بڑی اچھی بات ہے۔ (185)

مفتی صاحب نے ۱۹۷۷ء میں بھٹو حکومت کے خلاف جو تحریک چلائی جس میں وہ تمام اپوزیشن پارٹیوں کے اشتراک سے قائم اتحاد "پاکستان قومی اتحاد" (P N A) کے صدر تھے۔ جس تحریک نے بعد میں "تحریک نظام مصطفےٰ ﷺ" کے نام سے شہرت پائی۔ بھٹو حکومت کا خاتمہ کر کے جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے چیف مارشل لاء کی حیثیت سے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد اسی قومی اتحاد کی بعض پارٹیاں جناب ضیاء الحق کی دعوت اور اصرار پر مرکزی کابینہ میں شامل ہو گئیں۔ تو اس میں مفتی صاحب کی جماعت جمعیت علماء اسلام بھی تھی۔ جس کو مرکزی کابینہ میں تین وزارتیں دی گئیں تھیں۔ مفتی صاحب نے اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے جنرل ضیاء الحق صاحب سے ڈیرہ اسماعیل خان کی آبپاشی کا عظیم منصوبہ C.R.B.C (چشمہ رائٹ بنک کینال) منظور کرا لیا۔ اور آپ ہی کی دعوت پر جنرل ضیاء الحق صاحب ڈیرہ اسماعیل خان تشریف لائے۔ اور C.R.B.C کی کھدائی اور ڈیرہ دریاخان پل کا سنگ بنیاد رکھا۔ اور یہ دونوں منصوبے جس کا آپ ہمیشہ ڈیرہ اسماعیل خان کے لئے حکومتوں سے مطالبہ کرتے رہے۔ آپ ہی کے اثر و رسوخ کی وجہ سے زیر عمل آئے۔ اس کے لئے کثیر فنڈز منظور کروائے۔ اور اب دونوں منصوبوں کی تکمیل ہو چکی ہے۔ اور یہ آپ کا عظیم کارنامہ ہے۔ جو آپ نے ڈیرہ اسماعیل خان کی ترقی کے لئے انجام دیا ہے۔ آپ نے ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے دیگر مطالبات کو بھی ہمیشہ اہمیت دی اور حق نمائندگی ادا کرتے ہوئے ہمیشہ بجٹ تقاریر میں اور دیگر مواقع پر ان کو اجاگر کیا ہے۔ اور ان کے حل پر زور دیا ہے۔ جن میں سے اکثر تو آپ نے اپنی وزارت علیا کے دوران حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح صوبہ سرحد کے جنوبی اضلاع میں

واحد عظیم درسگاہ گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان کا بھی مفتی صاحب ہی کی کوششوں اور مساعی سے قیام، عمل میں آیا ہے۔

ڈیرہ اسماعیل خان آپ کا رہائشی اور انتخابی حلقہ ہے۔ اس کو ترقی یافتہ اضلاع کی صف میں لانے کے لئے آپ کی مساعی اظہر من الشمس ہیں۔ اس علاقے کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کے لئے آپ ہی کی کوششوں سے گورنمنٹ ڈگری کالج ڈیرہ اسماعیل خان میں ایم۔اے کے متعدد پروگراموں کے کلاسز کا اجراء ہوا۔ جو بعد میں یونیورسٹی کے قیام کی بنیاد بنا۔ روزنامہ "شہباز" پشاور مورخہ 26 رستمبر 1971ء کے شمارے میں ہے۔ کہ

> 25 رستمبر 1971ء کو قائد جمعیۃ مولانا مفتی محمود کی قیادت میں ایک وفد نے وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی، سیکرٹری تعلیم اور سیکرٹری صحت صوبہ سرحد سے ملاقات کی۔ اور ضلع ڈیرہ کے تعلیمی اور صحت عامہ کے مسائل پر تبادلہ خیالات کیا۔ اور ان سے مطالبہ کیا کہ ضلع ڈیرہ میں ایم ایس سی کیمسٹری، جغرافیہ، ریاضی، ایم اے اسلامیات، تاریخ، شماریات، نیز وہاں ایل ایل بی کی کلاسیں شروع کر کے دور افتادہ اور غریب طبقہ کی ترقی کے لئے مناسب قدم اٹھایا جائے۔ نیز یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ زراعتی کالج میں بی ایس سی آنرز کی کلاسیں بھی دی جائیں اور اس سلسلے میں ڈائریکٹر تعلیمات صوبہ سرحد سے بھی ملاقات کی اس کے علاوہ ضلع ڈیرہ کی بجلی کی ناقص کارکردگی کے متعلق بھی چیف انجینئر واپڈا سے ملاقات کی۔

اسی ضمن میں مفتی صاحب نے ڈیرہ اسماعیل خان میں یونیورسٹی کے قیام کا مطالبہ بھی کیا۔ آپ کے اس مطالبہ پر مشتمل بیان روزنامہ "مشرق" پشاور، "پاکستان ٹائمز" اور ہفت روزہ "پیام نو" ڈیرہ اسماعیل خان کے 19 رمارچ 1972ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے جو کہ درج ذیل ہے۔

> ڈیرہ اسماعیل خان کے منتخب قومی نمائندہ اور ناظم اعلیٰ پاکستان جمعیۃ علماء اسلام جناب مفتی محمود نے اپنے ایک بیان میں حکومت پاکستان سے پرزور مطالبہ کیا کہ چونکہ ڈیرہ اپنے صوبے کا انتہائی پسماندہ علاقہ ہے اور یہاں کے غریب الطلباء بیرون ضلع جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے اس لئے ڈیرہ اسماعیل خان میں ایک یونیورسٹی قائم کی جائے۔

اور پھر ایک دن وہ بھی ڈیرہ کی تاریخ کا یادگار دن بنا جب ذوالفقار علی بھٹو صدر پاکستان نے ڈیرہ اسماعیل خان کے جلسہ عام میں ڈیرہ ڈویژن میں یونیورسٹی کے قیام کا اعلان کیا۔ بجائے ضلع کے ڈویژن میں یونیورسٹی کے قیام کا اعلان اگرچہ ایک سیاسی چال تھی اور ضلع ڈیرہ اور ضلع بنوں جو کہ دونوں ضلعوں کی نمائندگی جمعیۃ علماء اسلام کے پاس تھی۔ دونوں کے عوام کو یونیورسٹی کے قیام پر لڑانا مقصد تھا۔ اور وہ دونوں آپس میں لڑ بھی پڑے۔ مگر مفتی صاحب کی فراست وبصیرت اور تدبر واصابت رائے سے ان کا باہمی تنازعہ گفت وشنید کے ذریعہ ختم کر دیا گیا۔ اور پھر مفتی صاحب نے یہ فیصلہ کیا۔ کہ اب ہر حال میں یونیورسٹی کے قیام کو یقینی بنایا جائے گا۔ انہوں نے صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے ہر فورم پر اسی مسئلہ کو اٹھائے رکھا یہاں تک کہ اس کی منظوری لے کر ہی رہے۔ یہ اور بات ہے کہ جب یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا تھا۔ اس وقت آپ صوبائی وزارت سے استعفیٰ دے چکے تھے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ "گومل یونیورسٹی" کا قیام آپ ہی کا کارنامہ ہے۔

خلاصہ بحث

باب ہذا میں آپ کی سیاسی خدمات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ تجزیہ کہ آپ کو ان خدمات کی بدولت نہ صرف ملک بھر بلکہ بیرون ملک جو سیاسی مقام حاصل ہوا۔ ان کی وجہ سے معاصر سیاستدانوں نے کن الفاظ میں آپ کو خراج تحسین پیش کیا ہے؟ آپ نے کن حالات میں کن مقاصد کے تحت سیاست کی وادی میں قدم رکھا؟ اپنے اکابرین کے نقش قدم کی پیروی میں آپ کا طرز سیاست کیا رہا؟ ان مباحث کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ آپ کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ حکومت مخالف موقف کے لئے سیاسی جماعتوں میں کم از کم نکات پر اتفاق و اتحاد کی صورت پیدا کی جائے۔ اس کوشش میں وقتاً فوقتاً کس حد تک کامیاب رہے ہیں؟ نیز آپ کے معقول طرز عمل، وسعت نظری اور رواداری کی سیاست نے علماء کے وقار میں اضافہ کیا۔ آپ نے علماء میں مساجد، مدارس اور خانقاہوں میں اپنے دینی فرائض کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ سیاسی لحاظ سے بھی بیداری پیدا کی اور دین و مذہب کے ساتھ سیاست کے میدان میں ان کو قائدانہ کردار ادا کرنے کی راہ دکھائی۔ آپ نے پارلیمنٹ میں پارٹی کے قائد اور قائد حزب اختلاف کی حیثیت سے جو فعال کردار ادا کیا۔ اس کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔

حب الوطنی کا تقاضا تھا کہ پاکستان کے خلاف جو اندرونی اور بیرونی سازشیں ہو رہی ہیں ان کو بے نقاب کر کے قوم کو ان خطرات سے آگاہ کرے جو پاکستان کو کمزور کرنے کے لئے کی جا رہی تھیں۔ اور جس کی صورت میں ملک کا بڑا آبادی کا حصہ ملک سے جدا کر دیا گیا۔ آپ نے اپنی حد سے بڑھ کر ملک کے خلاف اس سازش کا مقابلہ کیا۔ بھاگ دوڑ کی اگرچہ وہ اس سازش کو ناکام بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

باب ہذا کے آخر میں ملک کو درپیش مسائل اور چیلنجز کے بارے میں آپ کی جو حکمت عملی رہی تھی اس کو کئی عنوانات کے تحت موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

حوالہ جات

(1) انور، عبید اللہ، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 379، 380

(2) محمد طیب، قاری، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 579

(3) ندوی، ابو الحسن علی، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 579

(4) خالد بن عبد العزیز، جلالۃ الملک۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 579

(5) الیمنی، سنوت النقاہ، محمد الشیخ۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 18

(6) الحرکان، محمد علی۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 18

(7) جتوئی، غلام مصطفٰے۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 588

(8) ظہور الٰہی، چوہدری۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۵۸۵

(9) اصغر خان، ائیر مارشل ریٹائرڈ۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 584

(10) ہزاروی، شیر باز خان، سردار۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 584

(11) غفور احمد، پروفیسر۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 584

(12) نصر اللہ خان، نوابزادہ۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 584

(13) عبد الولی خان۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۵۸۴

(14) قصوری، محمود علی۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 588

(15) راشدی، زاہد، مولانا۔ تذکار محمود۔ ص ۱۶۱

(16) قریشی، نور الحق، قاری۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 130، 131

(17) سعید الرحمٰن، قاری، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 174

(18) فتح محمد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 105

(19) محمد اکبر، مولانا۔ تذکار محمود۔ ص 182

(20) شمس تبریز خان۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 387

(21) مظاہری، گلزار احمد، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 160

(22) خان محمد اشرف خان۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۵۱

(23) حمزہ ایم۔ اے۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 196، 197

(24) راشدی، زاہد، مولانا۔ تذکار محمود۔ ص 167

(25) بٹالوی، محمد ریاض۔ لیڈران کرام۔ ص 36۔ ناشر خالد سیف اللہ مطبع پنجاب آرٹ پریس لاہور۔ ۱۹۷۰ء

(26) فقیر محمد، حاجی۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 163

(27) تاج محمود، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 154

(28) جانباز، مرزا۔ ماہنامہ "تبصرہ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 16۔ ج ۱۱۔ ش ۳ (جنوری ۱۹۸۱
ء)

(29) .... ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 239

(30) عمران شاہ، سید، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ج ۲۲۔ ش 48 (28/ نومبر ۱۹۸۰ء)

(31) قریشی، فاروق، محمد۔ تذکار محمود۔ ص 273، 274

(32) عبد الحفیظ بن عبد العزیز۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 214، 215

(33) عمران شاہ، سید، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ج ۲۲۔ ش 48 (28/ نومبر ۱۹۸۰ء)

(34) قریشی، فاروق، محمد۔ تذکار محمود۔ ص 273، 274

(35) .... ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 239

(36) محمد اکبر، مولانا۔ تذکار محمود۔ ص 181، 182

(37) اسفندیار، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 152

(38) .... ہفت روزہ "لولاک" فیصل آباد (۵/ دسمبر 1975ء)

(39) .... ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 194

(40) .... ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۸۰

(41) .... ہفت روزہ "لولاک" فیصل آباد (۱۵/ جون 1975ء)

(42) شیر افضل، قاری۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 331

(43) کشمیری، محمد طیب، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۲۵۲

(44) محمد یعقوب، شیخ۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 284

(45) سلیمانی، غلام اکبر، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 291

(46) سلیمانی، غلام اکبر، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 291

(47) .... ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ج ۲۲۔ ش 48 (28/ نومبر ۱۹۸۰
ء)

(48) راشدی، زاہد، مولانا۔ تذکار محمود۔ ص 167

(49) ضیاء القاسمی، مولانا۔ تذکار محمود۔ ص 178

(50) محمد یعقوب، شیخ۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۳۳۳

(51) ظہیر، احسان الٰہی، علامہ۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 140

(52) مظاہری، گلزار احمد، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 160

(53) ظہیر، احسان الٰہی، علامہ۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 140

(54) اسفندیار، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 153

(55) مظاہری، گلزار احمد، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۶۱

(56) عثمانی، محمد تقی، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 178

(57) راشدی، زاہد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 167

(58) مظاہری، گلزار احمد، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص160، 161

(59) سعید الرحمن، قاری، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 174

(60) نصر اللہ خان، نوابزادہ۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص82

(61) سعید الرحمن، قاری، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 174

(62) نور الحق، قاری، ایڈوکیٹ۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 134، 135

(63) نور الحق، قاری، ایڈوکیٹ۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 135

(64) سعید الرحمن، قاری، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص175، 176

(65) قریشی، نور الحق، قاری، ایڈوکیٹ۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص129، 130

(66) قریشی، نور الحق، قاری، ایڈوکیٹ۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص129

(67) عبد اللطیف، قاضی، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 29

(68) شمس تبریز خان۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص390

(69) ارشد، عبد الرشید، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 324

(70) محمد اکبر، مولانا۔ تذکار محمود۔ ص۱۸۱

(71) قریشی، نور الحق، قاری، ایڈوکیٹ۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص133

(72) محمد اکبر، مولانا۔ تذکار محمود۔ ص182

(73) راشدی، زاہد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص168

(74) راشدی، زاہد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص167

(75) قریشی، نور الحق، قاری، ایڈوکیٹ۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص۱۳۱

(76) حمزہ ایم۔ اے۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص197

(77) قریشی، نور الحق، قاری، ایڈوکیٹ۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص۱۳۱

(78) سلیمانی، غلام اکبر، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 291، 292

(79) صلاح الدین۔ روزنامہ "جسارت" کراچی۔ (16 / اکتوبر ۱۹۸۰ء)

(80) شمس تبریز خان۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص388

(81) اسفندیار، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص457

(82) محمد اکبر، مولانا۔ تذکار محمود۔ ص182، 183

(83) محمد اکبر، مولانا۔ تذکار محمود۔ ص182

(84) نصر اللہ خان، نوابزادہ۔ روزنامہ "وفاق" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۹

(85) قریشی، نور الحق، قاری، ایڈوکیٹ۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 133

(86) تاج محمود، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 154

(87) مظاہری، گلزار احمد، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 159، 160

(88) نور الہدیٰ، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۱۵۱

(89) سعید الرحمٰن، قاری، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 176

(90) ضیاء القاسمی، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 118

(91) قریشی، فاروق، محمد۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 60

(92) عابد، عبد الکریم۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 192

(93) قائم الدین، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 264

(94) ہاشمی، اشفاق، محمد۔ مولانا مفتی محمود۔ ص ۸

(95) سلیمانی، غلام اکبر، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص ۲۹۲

(96) شمس تبریز خان۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص 389

(97) ربانی، محمد یعقوب، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص 284

(98) محمد اکبر، مولانا۔ تذکار محمود۔ ص 182، 183

(99) کمال، احمد حسین، ڈاکٹر۔ عہد ساز قیادت۔ ص ۸۰

(100) ہاشمی، اشفاق، محمد۔ مولانا مفتی محمود۔ ص 9، 10

(101) قاسم، ظفر احمد، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 205

(102) ہاشمی، اشفاق، محمد۔ مولانا مفتی محمود (حیات و خدمات)۔ ص 10

(103) کمال، احمد حسین، ڈاکٹر۔ عہد ساز قیادت۔ ص 81

(104) کمال، احمد حسین، ڈاکٹر۔ عہد ساز قیادت۔ ص 92

(105) کمال، احمد حسین، ڈاکٹر۔ عہد ساز قیادت۔ ص 93

(106) کمال، احمد حسین، ڈاکٹر۔ عہد ساز قیادت۔ ص 93، 94

(107) کمال، احمد حسین، ڈاکٹر۔ عہد ساز قیادت۔ ص 95

(108) عبد الحکیم، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 157

(109) مفتی محمود، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص 204

(110) آسی، نعیم۔ مولانا مفتی محمود (حیات و خدمات)۔ ص 83

(111) نصر اللہ خان، نوابزادہ۔ روزنامہ "وفاق" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص ۹

(112) ہاشمی، اشفاق، محمد۔ مولانا مفتی محمود۔ ص 36، 37

(113) مفتی محمود، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص 261

(114) ہاشمی، اشفاق، محمد۔ مولانا مفتی محمود۔ ص 41

(115) تاج محمود، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 154

(116) محمود شام۔ ہفت روزہ "اخبار جہاں" کراچی۔ ج ۳۔ ش 39 (24 ستمبر 1969ء)

(117) .... ہفت روزہ "افریشیا" لاہور۔ بحوالہ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 451، 452

(118) راشدی، زاہد، مولانا۔ روزنامہ "وفاق" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 29

(119) قریشی، فاروق، محمد۔ تذکار محمود۔ ص 276، 277

(120) آسی، نعیم۔ مولانا مفتی محمود (حیات وخدمات)۔ ص 142،141

(121) ہاشمی، اکبر شاہ، محمد، مولانا۔ "مولانا مفتی محمود۔ ایک قومی رہنما"۔ ص ۱۵۱

(122) ہاشمی، اکبر شاہ، محمد، مولانا۔ "مولانا مفتی محمود۔ ایک قومی رہنما"۔ ص 152

(123) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص ۱۶۱

(124) عابد، قطب الدین۔ مفتی محمود سے ملئے۔ ص ۳۰۳

(125) قریشی، فاروق، محمد۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 65

(126) قریشی، فاروق، محمد۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 65

(127) ہاشمی، اکبر شاہ، محمد، مولانا۔ "مولانا مفتی محمود۔ ایک قومی رہنما"۔ ص 155،154

(128) ہاشمی، اکبر شاہ، محمد، مولانا۔ "مولانا مفتی محمود۔ ایک قومی رہنما"۔ ص 155

(129) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص 146

(130) قریشی، فاروق، محمد۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 65

(131) ہاشمی، اشفاق۔ مفتی محمود کا دور حکومت۔ ص 31

(132) قریشی، فاروق، محمد۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 65

(133) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص 106

(134) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص 107

(135) قریشی، فاروق، محمد۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 64

(136) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص 132

(137) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص 133،132

(138) قریشی، فاروق، محمد۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 64

(139) قریشی، فاروق، محمد۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 65

(140) عابد، قطب الدین۔ مفتی محمود سے ملئے۔ ص 303،302

(141) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص 57

(142) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص 58

(143) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص 58

(144) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص 57

(145) مفتی محمود، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 553

(146) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص 57

(147) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص 57

(148) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص 58

(149) مفتی محمود، مولانا۔ روزنامہ "مشرق" لاہور (۱۵ مارچ ۱۹۷۱ء)

(150) غلام ربانی، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 165

(151) قریشی، فاروق، محمد۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 62

(152) قریشی، فاروق، محمد۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 62،61

(153) مفتی محمود، مولانا۔ روزنامہ "مشرق" لاہور (۱۵ مارچ ۱۹۷۱ء)

(154) محمود شام۔ ہفت روزہ "اخبار جہاں" کراچی (24 ستمبر 1969ء)

(155) قریشی، فاروق، محمد۔ درویش وزیر اعلیٰ کا دور محمود۔ ص 21

(156) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص 60

(157) قریشی، فاروق، محمد۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 63

(158) قریشی، فاروق، محمد۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص 63

(159) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص 114

(160) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص130

(161) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص130

(162) قریشی، فاروق، محمد۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص63

(163) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص115

(164) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص253

(165) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص254

(166) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص164

(167) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص136

(168) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص114، 115

(169) محمد اجمل خان، قاری، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 128

(170) عابد، قطب الدین۔ مفتی محمود سے ملئے۔ ص205، 206

(171) قریشی، فاروق، محمد۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)۔ ص63

(172) سعید الرحمٰن، قاری، مولانا۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 176

(173) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص117

(174) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص165

(175) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص139

(176) مفتی محمود، مولانا۔ المجتمع (اسلامیة أسبوعیة) تصدر من جمعیة الاصلاح الاجتماعی الکویت۔ 18 جمادی الآخر 1399ھ / 15 مایو 1979م

(177) کمال، احمد حسین، ڈاکٹر۔ عہد ساز قیادت۔ ص187

(178) کمال، احمد حسین، ڈاکٹر۔ عہد ساز قیادت۔ ص178 تا 192

(179) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص108

(180) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص119

(181) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص108

(182) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص154

(183) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص154، 155

(184) مفتی محمود، مولانا۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص378

(185) شجاع آبادی، محمد اسمٰعیل، مولانا۔ خطبات محمود۔ ص155

باب پنجم

مولانا مفتی محمودؒ کے سیاسی موقف پر اعتراضات اور ان کے جوابات

سیاست ایک پُر خار وادی ہے۔ یہ کانٹوں کی سیج ہے۔ یہاں قدم قدم پر اپنے اعمال کے محاسبے کے لئے تیار رہنا پڑتا ہے۔ حکومتی کارندوں کے علاوہ جماعتی کارکن، دیگر سیاسی جماعتوں کے اراکین اور خصوصاً میڈیا کی سیاسی رہنماؤں پر کڑی نظر ہوتی ہے۔ اور ان کو ہر لحاظ سے جانچا پرکھا جاتا ہے۔ اس کے ذاتی افعال سے لیکر اس کے دوست احباب، اہل و عیال کی سرگرمیوں کو بھی اُچھالا جاتا ہے۔ اور ان سب کی کارگزاریوں کو سیاسی رہنما کے کھاتے میں ڈالا جاتا ہے۔

عیوب و نقائص سے کوئی بھی پاک نہیں۔ کمی، کمزوری، بھول چوک، خطا و نسیان کا تو ہر انسان شکار رہتا ہے۔ لیکن ایک سیاسی رہنما کو اس لحاظ سے قطعاً معاف نہیں رکھا جاتا۔ اور خاص کر وہ رہنما جو مذہبی و دینی بھی ہو پھر اس کے چال ڈھال، نشست و برخاست تک کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ اور اس کے ایک انسان سے بڑھ کر کوئی بالائی مخلوق سمجھا جاتا ہے۔ جو انسانی طبیعت سے ماوراء خیال کیا جاتا ہے۔ اس کی معمولی لغزش کو بھی ایک بڑا جرم گردانا جاتا ہے۔

ایک لحاظ سے یہ ایک اچھی روایت بھی ہے۔ اس کے اگر کچھ نقصان دہ پہلو ہیں تو اکثر مفید پہلو بھی رکھتا ہے۔

جہاں تک ہم پاکستانی سیاست پر نظر ڈالتے ہیں اور سیاستدانوں کے طرز عمل، ان کے خیالات و نظریات اور طور طریقوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کو دو طبقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (۱) ایک وہ سیاسی رہنما جو محض سیاست، انتخابات اور اقتدار کے کھیل تماشہ تک محدود ہیں۔ مذہب سے ان کا کوئی سروکار نہیں ہے۔ (۲) دوسرے وہ سیاسی رہنما ہیں جو دین و مذہب کو اعلیٰ مقاصد کے طور پر اپنا کر سیاست کو اس کا زینہ سمجھتے ہیں۔ اور ان کی تمام سرگرمیاں اسی اعلیٰ مقصد کے لئے وقف ہوتی ہیں۔

مولانا مفتی محمودؒ کا تعلق اسی دوسرے گروہ کے سیاسی رہنماؤں سے تھا۔ آپ نے دین و مذہب سے تعلق کے ساتھ ساتھ سیاست کی پُر خار وادی میں بھی قدم رکھا اور اس وقت سے یہ

تعلق قائم رکھا جب آپ اس وقت طالب علم تھے۔ یہ دراصل ان اساتذہ کا فیضانِ نظر تھا۔ جن کے سامنے آپ نے زانوائے تلمذ تہہ کئے تھے۔

اس اعتبار سے آپ کو بھی موردِ الزام ٹھہرایا جاتا رہا۔ اور آپ کے سیاسی موقف پر اعتراضات کئے جاتے رہے۔ مقالہ نگار کی حیثیت سے میری یہ کوشش ہوگی کہ آپ کے سیاسی موقف پر جو اعتراضات اُٹھائے جاتے رہے ہیں آیا اس کی کچھ حقیقت بھی تھی یا وہ غلط تھے۔ اس کی حقیقت تحقیقی نقطۂ نظر سے سامنے لاسکوں۔ یا وہ محض الزامات تھے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا۔

تحریکِ پاکستان کی مخالفت کا اعتراض

مولانا مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ پاکستان کی سیاست میں ایک فعال کردار ادا کرنے والی علماء کی جماعت "جمعیۃ علماء اسلام" ابتدائی ایام سے "پاکستان مخالف" جماعت کے الزام کی زد میں ہے۔ اور اس الزام کو بڑے شدومد کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ پاکستانی میڈیا بھی اس الزام کو بہت زیادہ اچھالتا ہے۔ اور بار بار معقول وضاحتوں اور مفتی صاحب اور ان کی جماعت کے ساٹھ سال سے زائد عرصہ پر پھیلے ہوئے پاکستان کی بقاء واستحکام اور ترقی وخوشحالی کے لئے گرانقدر خدمات سے صرفِ نظر کرتا ہے۔

حقیقت میں جن اکابرین اور اساتذۂ کرام سے آپ کو نظریاتی تعلق تھا وہ آزادی کے مجاہدین اور ملک وملت کے سچے بہی خواہ تھے۔ یہ وہ پاکیزہ جماعت تھی جو غاصب وظالم انگریزی حکمرانوں سے برسرِپیکار تھی۔ وہ تحریکِ آزادئ ہند کا ہراول دستہ تھی۔ ان کی تمام تر جدوجہد اور سعی وعمل کا مقصد انگریزی راج سے نجات اور ملک وقوم کی آزادی تھا۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر وہ ہر اس شخص، جماعت اور گروہ کو سینہ سے لگاتے جو آزادی کی تڑپ رکھتے خواہ وہ ہندو ہو

سکھ ہو یا پارسی۔ ان کے بقول یہ ملک سب کا ہے۔ اور اس کی آزادی ہی سب سے اولین نصب العین ہے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ مذہبی اختلافات اور مسلکی نزاعات ہمیں اس مقصد سے دور کرتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے متحدہ قومیت کا نعرہ لگایا۔ اس لحاظ سے وہ ہر ایسی تحریک کو جو آزادی کے حصول کے مقصد سے ان کو دور کردے غلامی کی تاریک رات کو مزید طول دینے کے مترادف سمجھتے تھے۔ اور وہ اس کے قطعاً روادار نہ تھے۔ اسی بناء پر وہ 1940ء کے قراردادِ لاہور کو مسلم لیگ کی طرف سے آزادی کی تحریک سے لوگوں کے رخ موڑنے کی کوشش سمجھتے رہے۔ اور وہ یہ سمجھتے رہے کہ اس طرح آزادی کی منزل سے جنوبی ایشیا کا یہ خطہ دور چلا جائے گا۔ اور مجاہدین آزادی کی وہ قربانیاں رائیگاں چلی جائیں گی۔ جو وہ گزشتہ دو صدیوں سے دیتے چلے آرہے ہیں۔ اور یہ ان کی مخلصانہ رائے تھی۔ اس میں کسی قسم کا مفاد ان کے پیشِ نظر نہ تھا۔ اور یہ ایک شخص یا فرد کی رائے بھی نہ تھی۔ بلکہ جنوبی ایشیا کے کونے کونے میں موجود ایک منظم جماعت، اس کے رہنماؤں اور اس کے مخلص کارکنوں کی رائے تھی۔ لیکن جب حالات تقسیمِ ملک کے لئے سازگار بن گئے اور بین الاقوامی لحاظ سے انگریز حکمرانوں کے لئے جنوبی ایشیا سے نکلنے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ رہا۔ ادھر مسلم لیگ کی قیادت میں یہ تحریک کامیابی سے ہمکنار ہونے لگی۔ تو انگریز نے آخر کار ہندوستان کو تقسیم کرنے کا فارمولا تسلیم کر لیا اور یوں 14/ اگست ۱۹۴۷ء کو یہ ملک معرضِ وجود میں آیا۔ علامہ اقبالؒ کے خواب کو تعبیر مل گئی۔ اور وہ جو ایک رائے تھی تجویز تھی۔ اب ایک حقیقت بن کر منصۂ شہود پر ظاہر ہو چکی ہے۔ اس لئے اکابرین تحریکِ آزادی کو جب کہ وہ ایک تجویز تھی۔ اس سے اختلاف کا حق تھا۔ اب جب وہ ایک حقیقت بن گئی ہے۔ اب اس کی محبت اس کی خدمت کو وہ جزوِ ایمانی سمجھتے ہیں۔ اس کی ترقی وخوشحالی اور بقاء واستحکام نہ صرف ان کی خواہش ہے بلکہ ان کی دلی آرزو بھی ہے۔ اور اب ان کی تمام سرگرمیاں اس پیارے ملک کی حفاظت کے لئے وقف ہیں۔ اور اب جب کہ اس ملک کے بانی اس ملک کے معرضِ وجود میں آنے

کے تقاضے کو پس پشت ڈال چکے ہیں۔ بلکہ جلا چکے ہیں۔ اور انہوں نے صرف ذاتی مفادات ہی کی تکمیل کو مطمح نظر سمجھ لیا ہے۔ ان اکابرین نے آگے بڑھ کر دین و مذہب اور سیاست دونوں کو ساتھ ساتھ رکھ کر ملک و قوم کی خدمت کا اہم فریضہ انجام دینا شروع کیا۔ خاص کر حضرت مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ نے ملک و ملت کی خدمت کا عظیم کام اس خلوص نیت اور انتھک جذبے سے انجام دیا کہ وہ اس وقت تمام قوم ان کی قیادت پر متفق تھی اور وہ ملت اسلامیہ کی آنکھ کا تارا تھے۔ اس سلسلے میں آپ کی وفات حسرت آیات پر روزنامہ "جنگ ـــــ" کراچی نے 15 ر اکتوبر ۱۹۸۰ء کے اداریہ میں لکھا ہے کہ

> مولانا مفتی محمود ایک بلند پایہ عالم، محقق اور متعدد اہم دینی کتابوں کے مصنف، علوم قرآنی اور حدیث و فقہ کے استاد جلیل ہونے کے علاوہ ایک کامیاب سیاستدان اور عظیم قومی رہنما بھی تھے۔ بلاشبہ تقسیم برصغیر سے پہلے ان کے سیاسی مسلک اور قیام پاکستان کے بعد ان کی بعض سیاسی وابستگیوں کی بناء پر بعض لوگوں نے ان سے سیاسی اختلاف کیا لیکن ان کے مخالفین بھی اس بارے میں ذرہ برابر شک کا اظہار نہیں کر سکتے۔ کہ قیام پاکستان کے بعد وہ پاکستان کے ساتھ اتنی ہی یا اس سے زیادہ محبت کرنے والے تھے جتنی کہ تحریک پاکستان میں حصہ لینے والی کوئی شخصیت پاکستان سے محبت کر سکتی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب مولانا مرحوم نے تحریک نظام مصطفےٰ ﷺ میں نہ صرف حصہ لیا بلکہ اس کی کامیاب قیادت کی تو وہ پوری قوم پاکستان کے ایک متفقہ لیڈر اور غیر متنازعہ شخصیت بن گئے۔ اور ان کا مقام و مرتبہ عوام کی نظروں میں بہت سے ہمعصر قائدین سے زیادہ بلند ہو گیا۔

اور کتنا عجیب اتفاق ہے کہ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پاکستان سے محبت اور اس کی بقاء و استحکام اور ترقی و خوشحالی کے لئے آپ کی شب و روز کی محنت و خدمت کو سابق صدر و وزیر اعظیم آزاد کشمیر جناب سردار عبد القیوم خان صاحب تقریباً اسی مفہوم کو یوں ادا کرتے ہیں۔

> بعض لوگ قیام پاکستان سے قبل مفتی صاحب کے کانگریس کے ساتھ تعلق کی بناء پر طرح طرح کی باتیں بھی بناتے رہے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ جن بزرگوں کی پاکستان کے متعلق سوچ پر ہمیں ذرا شک بھی ہو جائے تو ہم ان کے ساتھ بیٹھنا ہی پسند نہیں کرتے خواہ وہ کس مرتبے کے لوگ ہوں ہمارے لئے تو ایک لکیر کھنچ جاتی ہے جس سے آگے ہم جا ہی نہیں سکتے۔ مفتی صاحب کے ساتھ جتنا گہرا تعلق رہا مجھے ان کے دل میں پاکستان کی محبت، اسلام کی محبت ہم میں جو اس کے دعویدار ہیں ہمارے مقابلہ میں زیادہ ہی نظر آئی۔ ساری عمر سیاست میں گزری ہے۔ اور ایسی باتیں ہوتی ہیں جنہیں کوئی چھپا نہیں سکتا۔ مفتی صاحب کے کسی طور طریقے یا بات سے اس کا شائبہ بھی محسوس نہیں ہوا کہ پاکستان سے ان کی محبت کسی بھی پاکستانی سے کم ہے۔ یا وہ پاکستان کی آزادی و سالمیت، استحکام اور دفاع کے لئے اتنی قربانیاں دینے کے لئے تیار نہیں تھے جتنی کوئی اور شخص دینے کے لئے تیار ہو گا۔ [روزنامہ "وفاق" لاہور (مفتی محمود نمبر)]

سردار عبد القیوم خان ایک محب وطن سیاسی رہنما ہیں۔ ان سے سیاسی اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ مگر انہوں نے حضرت مفتی صاحب کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے۔ یہ بلا مبالغہ انہوں نے عین حقیقت بیان کی ہے۔ اور یہ صرف سردار صاحب ہی نے نہیں دیگر حقیقت پسند رہنماؤں نے بھی اس کا برملا اعتراف کیا ہے۔ جناب عبد الرشید ارشد صاحب نے پروفیسر مرزا محمد منور صاحب کے ایک مضمون سے اقتباس نقل کیا ہے۔ جس میں انہوں نے پاکستان کے بارے میں تحریک آزادی کے دو اہم رہنماؤں جو کہ تقسیم ملک کے خلاف تھے۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان کے بارے میں ان کے کیا خیالات ہیں کا حوالہ دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> اب لیجئے مولانا مفتی محمود اور ان کے اکابرین کے متعلق کہ جب تک پاکستان کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا اس وقت تک دیانتداری سے اس کی مخالفت کی لیکن جب بن گیا تو اس کی مخالفت کو غداری کے مترادف قرار دیا۔ یہ کبھی نہیں کہا کہ ہم نے پاکستان کی مخالفت نہیں کی تھی............. مولانا ابو الکلام آزاد اور حضرت مولانا حسین احمد

مدنیؒ نے پاکستان کے بعد پاکستان کے استحکام کے متعلق جو کچھ کہا اور جیسی دعائیں کیں اور اپنے متعلقین کو جس طرح اس فرض کی یاد دلائی کہ پاکستان کے لئے کام کرنا ہمیں دینی فریضہ ہے۔ اس کا ذکر اگر چھیڑ دیا تو مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔ صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ حضرت مدنیؒ نے تو فرمایا کہ "پاکستان کے قیام کے بعد اب اس کا حکم مسجد کا سا ہے" اور مولانا ابوالکلام آزادؒ نے فرمایا "پاکستان وجود میں آ گیا ہے تو اب اسے باقی رکھنا چاہئے اس کا بن کر بگڑ جانا سارے عالم اسلام کے لئے شکست کے برابر ہوگا۔

[یہ مختصر اقتباس پروفیسر مرزا محمد منور کے ایک طویل مضمون "بحث و نظر" "نوائے وقت" 23 مارچ سنہ 1982ء سے ماخوذ ہے]

اتنے واضح موقف کے باوجود حضرت مفتی صاحب اور ان کے اکابرین پر یہ اعتراض کرنا کہ وہ پاکستان کے مخالف ہیں یا ان کی سرگرمیاں ملک دشمنی پر مبنی ہیں کتنے افسوس کا مقام ہے کہ اتنے واضح موقف کے برعکس بعض نام نہاد مسلم لیگی اور مفادات کے شکار کالم نویسوں کا یہ طرز عمل کہ وہ اب تک مفتی صاحب اور ان کے بزرگوں کو اس معاملے میں معاف کرنے کو تیار نہیں۔ مولانا عبید اللہ صاحب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور جو خود بھی اور ان کے والد بزرگوار حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب پاکستان مسلم لیگ سے وابستہ رہے ہیں۔ جو تحریک پاکستان کے اہم رہنماؤں میں جن کا شمار ہوتا ہے۔ حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے اجلہ خلفاء میں ہیں۔ مولانا عبید اللہ صاحب لکھتے ہیں۔

مفتی صاحب علماء کے اس گروہ سے زیادہ متاثر تھے جو تحریک پاکستان کا مخالف تھا لیکن پاکستان کی محبت ان کا جزو ایمان تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ کسی کام کے کرنے سے قبل مشورہ کرنا اور اس کام کے کرنے اور نہ کرنے کے بارے میں رائے رکھنا کوئی جرم نہیں اسی طرح پاکستان کے قیام کے بارے میں برصغیر میں ایک مشاورت ہو رہی تھی اس میں بعض کی رائے یہ تھی کہ پاکستان کا بننا مسلمانوں کے لئے مفید ہوگا اور بعض یہ سمجھتے تھے کہ اس کا نہ بننا مسلمانوں کے لئے بہتر ہے لیکن جب ملک بن گیا تو وہ رائے ختم ہو گئی۔

کیونکہ وہ رائے بننے کے بارے میں تھی نہ کہ بنے ہوئے پاکستان کے بارے میں۔ اب جو لوگ ہم پر بہتان طرازی کرتے ہیں وہ بزعم خود یہ ثابت کرنے کی کوشش میں ہیں کہ ہمارے بزرگوں کی وہ رائے بنے ہوئے پاکستان کے بارے میں تھی۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ہمارے بزرگ پاکستان ہی کو مسلمانوں کا آخری قلعہ سمجھتے تھے اور یہ قلعہ بھی بحمد اللہ حضرت تھانویؒ کے فتویٰ کے مطابق بنا ہے اس لئے اس ملک کی حفاظت ہر مسلمان پر فرض ہے۔ دیانت داری کی بات یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب اسلام اور پاکستان سے والہانہ محبت رکھتے تھے۔ [قومی ڈائجسٹ لاہور (مفتی محمود نمبر) ص ۱۲۰]

اب تک کے حوالوں سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ جمعیۃ علماء ہند اور ان کے ہمنوا علماء اور دیگر بعض جماعتوں کا موقف اخلاص پر مبنی تھا۔ اور ان کی یہ مخالفانہ رائے اس وقت تک کے لئے تھی جب تک پاکستان معرض وجود میں نہیں آیا تھا لیکن جب یہ ملک معرض وجود میں آ گیا تو وہ اس ملک کی خدمت و محبت میں اس کے حامیوں سے کسی طرح کم نہیں تھے۔ اور اگر ان کی رائے مخالفانہ تھی جو اس کے وجوہات بھی تھے۔ اور ملک کی آزادی کی صورت میں ان کے پاس متبادل فارمولے بھی تھے۔ جن کا ذکر حضرت مفتی صاحب خود ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں جو روزنامہ "حریت" کراچی کے نمائندے نے حضرت مفتی صاحب سے کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے۔

مفتی صاحب اب اس مقام پر آ گئے تھے جو ان کی جماعت کا کمزور پہلو شمار ہوتا ہے یہ وہی دور ہے جس دور میں جمعیۃ پر پاکستان کی مخالفت کا الزام عائد کیا جاتا ہے مجھے یقین تھا کہ اس مرحلہ پر جب میں مولانا سے اس کا ذکر کروں گا تو وہ سختی کے ساتھ اس کی تردید کریں گے لیکن خلاف توقع مفتی صاحب کا جواب میرے اندازوں کے قطعی برعکس تھا۔ انہوں نے فرمایا!

ہم تقسیم ملک کے حامی نہیں تھے تاہم جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تقسیم ہند کی مخالفت کرنے والوں کا پاکستان بنانے میں کوئی حصہ نہیں میں سمجھتا ہوں کہ یہ بالکل درست

بات نہیں۔ اس لئے کہ پاکستان جنگ آزادی کی کامیابی کا نتیجہ تھا۔ اور ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ہم نے آزادی کی جنگ لڑ کر ایک آزاد ملک کی حیثیت سے قیام پاکستان کا راستہ ہموار کیا۔ ہماری ایک مستقل رائے تھی۔ جمعیۃ علماء ہند کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان پورا ایک رہے جبکہ اس کے تمام صوبوں کو مکمل خود مختاری حاصل رہے۔ مرکز کے پاس صرف دفاع، کرنسی اور امور خارجہ کے محکمے رہیں جبکہ بقیہ تمام امور میں سب صوبے مکمل خود مختاری کے حامل ہوں اس وقت ہندوستان کے تیرہ صوبے تھے ان میں چھ صوبوں میں مسلمان اور سات صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ ہم سمجھتے تھے کہ اس طرح پورے بنگال، پورے آسام، متحدہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان میں مسلمان حکومتیں بنیں گی اور ان صوبوں میں مسلمان کم از کم محفوظ ہوں گے۔ مرکزی حکومت سے متعلق بھی جمعیۃ علماء ہند کا ایک فارمولا تھا جس کے مطابق ہمارا مطالبہ تھا کہ مرکزی حکومت میں ہندو اور مسلمانوں کو دو بڑی اکثریتیں تسلیم کیا جائے اور ان دونوں کو 45،45 فیصد نمائندگی دی جائے۔ جبکہ بقیہ دس فیصد نمائندگی دوسری اقلیتوں کو حاصل ہو۔ اس طرح ہم سمجھتے تھے کہ ہندوؤں کی عددی اکثریت بھی قابو میں آجائے گی اور مرکز میں بھی مسلمانوں کے حقوق غصب ہونے کے راستے مسدود ہو جائیں گے۔ کانگریس نے جمعیۃ علماء ہند کے اس فارمولے کو تسلیم کرلیا اور ۱۹۴۷ء میں ہم نے حکومت پاکستان کو یہ یقین دلایا کہ پاکستان کی ترقی اور اس میں اسلامی نظام کی ترویج کے لئے ہم غیر مشروط طور پر اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ اس وقت مولانا شبیر احمد عثمانی کا واضح ارشاد تھا "ہم میں پاکستان بنانے پر اختلاف تھا جب پاکستان نہیں تھا تو پاکستان بنانے نہ بنانے کا اختلاف رائے کا اختلاف تھا۔ جب پاکستان بن گیا ہے تو ہم پاکستان کے وفادار ہیں اور مل جل کر اس کی ترقی کے لئے کوشاں ہیں۔ [روزنامہ "حریت" کراچی مورخہ 15 مئی ۱۹۷۲ء بحوالہ ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 239، 240]

آپ کے مخالفین نے اسی ضمن میں ایک بے تکا الزام یہ بھی لگایا تھا کہ انہوں نے ۱۹۴۳ء میں مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں یہ فتویٰ دیا تھا کہ مسلم لیگی لڑکی سے نکاح حرام ہے۔ اور اس سے جو اولاد پیدا ہوگی وہ ولد الزنا ہوگی۔ مفتی صاحب پر ایسے الزامات لگا کر ان لوگوں کو شرم تک نہیں آئی۔ اس الزام کا جھوٹے ہونے کے لئے اتنی ہی بات کافی ہے۔ کہ حضرت مفتی صاحب تو ۱۹۵۱ء میں بحیثیت مدرس مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں تشریف لائے ہیں۔ تو اس سے ۸ سال قبل کا الزام لگا کر اس کا جھوٹا ہونا خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ پھر مفتی صاحب کی فتویٰ کا سب سے ممتاز وصف یہ تھا کہ آپ کے فتاویٰ اعتدال پر مبنی ہوتے تھے۔ ایسے فتویٰ لگانا آپ کے مزاج ہی کے خلاف تھے۔ لیکن الزام لگانے والوں کو اس سے کیا غرض۔ وہ تو شریف لوگوں کی پگڑی اچھالنے کی ہمیشہ مذموم کوشش کرتے ہیں۔

پھر اسی ضمن میں حضرت مفتی صاحب پر ایک اور الزام لگایا گیا کہ ایک دفعہ سقوط ڈھاکہ کے بعد اپوزیشن جماعتوں کے قائدین کی چوہدری ظہور الٰہی کے گھر میں میٹنگ تھی۔ مفتی محمود نے قیام پاکستان کے حوالے سے کہا کہ "خدا کا شکر ہے ہم اس گناہ میں شامل نہیں"۔ یہ الزام میری نظر سے پہلی دفعہ روزنامہ "خبریں" اسلام آباد میں منیر احمد کے کالم "آتش فشاں" سے گزرا۔

اس الزام کے جواب کے لئے وہی کافی ہے جو ایک سوال کے جواب میں حضرت مفتی صاحب نے تفصیل کے ساتھ وہ واقعہ ذکر کر کے دیا ہے۔ ہفت روزہ "افریشیا" لاہور کے نمائندے کے اس سوال کہ

> آپ کے بارے میں یہ روایت مشہور ہو گئی ہے کہ آپ نے کسی موقع پر کہا ہے کہ خدا کا شکر ہے ہم پاکستان بنانے کے گناہ میں شریک نہیں تھے۔ یہ بات کس حد تک درست ہے؟

مفتی صاحب نے جواب دیا کہ

جو بات یہ لوگ کہتے ہوئے نہیں شرماتے میں سنتے ہوئے بھی شرماتا ہوں۔ اس بات کی حقیقت اس قدر ہے کہ محاذ کی میٹنگ میں محاذ کے بعض دوست آپس میں باتیں کرتے ہوئے مسلم لیگ کو کوس رہے تھے۔ چوہدری ظہور الٰہی بھی وہاں موجود تھے۔ بات خالصتاً مذاق میں ہو رہی تھی۔ خود مسلم لیگ کے دوست کہہ رہے تھے کہ مسلم لیگ ہماری ماں تھی لیکن یہ ماں بھی بدکار ہو گئی۔ اور اس کے گناہوں کی کوئی حد نہیں۔ اس پر میں نے ہنستے ہوئے کہا الحمد اللہ شکر ہے ہم اس گناہ میں شریک نہیں تھے۔ یہ صرف مذاق کی بات تھی اس پر ملک غلام علی اوکاڑوی نے کہا کہ ہم تو اس گناہ میں شریک تھے میں نے کہا بہر حال میں خاموش ہوں۔ آپ ہی تبصرہ فرما رہے ہیں اور مزید تبصرہ فرمادیں۔ میں تب بھی خاموش رہوں گا۔ اس پر سب حضرات ہنس پڑے۔ کسی نے اس بات کو محسوس تک نہیں کیا۔

چونکہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ اس لئے منیر احمد صاحب نے یہ الزام لگایا کہ مفتی صاحب نے یہ بات اپوزیشن جماعتوں کے اجلاس میں کی ہے۔ جبکہ ان دنوں پیپلز پارٹی کے صوبائی حکومت پنجاب کے وزیر اوقاف رانا اقبال نے الزام لگایا تھا کہ مفتی صاحب نے یہ بات گوجرانوالہ میں جلسہ عام میں کہی ہے۔ مفتی صاحب اسی "افریشیا" کے انٹرویو میں اس سلسلے میں فرمایا کہ "اس کے بعد صوبائی وزیر اوقاف دور کی یہ کوڑی لائے کہ میں نے یہ بات گوجرانوالہ کے جلسہ عام میں کہی ہے"۔ میں نے انہیں چیلنج کیا کہ اگر وہ یہ بات ثابت کر دیں تو مسجد نور میں خود ان کے حوالہ کروں گا۔ اگر وہ ثابت نہیں کر سکتے تو مسجد نور کو واگزار کر دیں۔ وہ آج تک جواب نہیں دے سکے اور میں اب تک اس بات پر قائم ہوں۔ [بحوالہ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)]

پاکستان کی تحریک کی مخالفت کے پہلے اعتراض کا تسلی بخش جواب ہے۔ اور سب اصحاب علم و دانش نے اس کو اطمینان بخش تسلیم کیا ہے۔ جبکہ آخری دونوں الزام ہیں اور بے جا اور بے تکے ہیں۔ اور ان سے حضرت مفتی صاحب کا دامن پاک ہے۔

جمہوریت کی حمایت کا اعتراض اور اس کا جواب

مولانا مفتی محمودؒ کی سیاسی موقف پر یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے۔ کہ وہ جمہوریت کے قائل تھے۔ جمہوری نظام کے لئے جدوجہد کرتے رہتے تھے۔ اور اسی طرح وہ انتخابی سیاست اور جمہوری اداروں کے قیام کے لئے آواز بلند کرتے رہتے تھے۔ اور یہ اعتراض اکثر مواقع پر بعض علماء کی طرف سے اٹھایا جاتا تھا۔

اس اعتراض کے جواب میں اتنا عرض ہے کہ آپ مغربی جمہوریت کے مروجہ نظریہ کو خالص مغربی اور غیر اسلامی نظریہ قرار دیتے تھے مگر اس کے کچھ مفید پہلو مثلاً حکومت کے پارلیمانی نظام اور بالغ رائے دہی کے حق کی وجہ سے اس کے قائل بھی تھے۔ اقتدار کی تبدیلی کے اعتبار سے اور اس لحاظ سے کہ عوام کی حکومت کے قیام و استحکام میں اس کا بڑا اور موثر کردار ہے اور اس لئے کہ اس نظام میں عوام کے بنیادی حقوق کو کافی حد تک تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ اور اس وجہ سے بھی کہ اس نظام میں عوام کے حقوق پر پابندی کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ آپ ان مفید پہلوؤں کی وجہ سے اس کو پسند کرتے تھے۔ اور آپ کے اس موقف پر جب بھی اعتراض کیا جاتا تو آپ فرماتے کہ کوئی ایسا نظام آپ تشکیل دیں جو بالغ رائے دہی سے بہتر ہو تو اس نظام کو قبول کر لیں گے۔ آپ اس کی مزید وضاحت یوں فرماتے۔

ہم محدود جمہوریت کے قائل ہیں جو علی الاطلاق جمہوریت ہے۔ جبکہ حاکمیت عوام اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق حاکمیت کا حق صرف اللہ

رب العزت کو حاصل ہے البتہ عوام کے نمائندوں کا وہ فیصلہ صحیح اور جائز ہو گا جہاں پر اللہ نے ان کو ان معاملات میں فیصلہ کرنے کا اختیار دیا ہو گا۔ لیکن جہاں عوامی نمائندوں کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فیصلوں سے متصادم ہو وہاں عوامی نمائندوں کا فیصلہ حقیقت نہیں رکھے گا۔[ہفت روزہ "اخبار جہاں" کراچی، ج،س،ش 39_24/ دسمبر ۱۹۹۶ء]

اس اعتراض کے بارے میں آپ نے "تحفظ ختم نبوت کانفرنس" لاہور منعقدہ ۲۳ جون ۱۹۷۲ء سے خطاب کے دوران تبادلہ خیال کرتے ہوئے فرمایا۔ یاد رہے کہ آپ اس وقت شمال مغربی سرحدی صوبہ کے وزیر اعلیٰ تھے۔

میں خود بھی جمہوریت کا قائل ہوں۔ اور اس ملک میں جمہوریت قائم کرنے کے لئے ہم نے خود جدوجہد بھی کی ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں لیکن ایک جمہوریت یورپ کی جمہوریت ہے اور ایک مسلمان کی جمہوریت۔ دونوں میں فرق ہے۔ ہم یورپ کی جمہوریت کو تسلیم نہیں کرتے ہم اسلام کی جمہوریت کو تسلیم کرتے ہیں۔ آئین کی بنیاد اسلامی جمہوریت ہونی چاہیے یورپ کی جمہوریت نہیں۔ یورپ کی جمہوریت کیا ہوتی ہے؟ یورپ کے لوگ کہتے ہیں کہ جمہوریت کی تعریف جو دنیا میں مشہور اور معروف ہے کہ

Democracy is the government of people by .the people, for the people

کہ عوام کی حکومت، عوام کے ذریعہ عوام کے لئے ہو......

یہ جمہوریت ہے وہاں پر حکومت عوام کی ہے۔ یورپ کی جمہوریت میں حاکم اعلیٰ عوام اور اسلام کی جمہوریت میں حاکم اعلیٰ خدا ہے۔ دونوں میں فرق ہے۔ اسلام کی جمہوریت یورپ والی نہیں ہے۔ یہاں یہ تو ہے عوام کی حکومت، اگر عوام کے نمائندے سارے اکٹھے ہو جائیں پارلیمنٹ میں بیٹھ جائیں کوئی بھی فیصلہ کر لیں وہ قانون بن جاتا ہے جیسے آپ نے دیکھا کہ پارلیمنٹ نے جو دانشوروں، تعلیم یافتہ اور قابل ترین لوگوں کی

پارلیمنٹ ہے طے کر لیا کہ اگر مرد، مرد کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے تو یہ جائز ہے۔ اور یہ بھی طے کیا کہ مرد، مرد سے شادی کر سکتا ہے۔

میرے محترم دوستو! یہ وہاں کا قانون بن چکا ہے۔ آج وہاں یہ قانون رائج ہے۔ یہ وہاں عوام کی حکومت ہے۔ عوام کے نمائندوں کا قانون وہاں نافذ ہو جاتا ہے لیکن ہمارے ہاں حاکم عوام نہیں حاکم خدا ہے بزبان ﴿الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ﴾ حکومت صرف اللہ کی ہے۔

ہمارے ہاں یہ ہے کہ Govt: of God خدا کی حکومت میں کہتا ہوں صرف پاکستان کے نہیں تمام دنیا کے عوام اور صرف 70،60 کروڑ مسلمان نہیں وہاں ارب انسان جو زمین پر بستے ہیں سب اکٹھے ہو جائیں اور سب مل کر یہ فیصلہ کر لیں کہ شراب حلال ہے تو ان کا فیصلہ غلط ہے اس لئے کہ ہمارے خدا نے فرما دیا کہ شراب حرام ہے قولہ تعالیٰ ﴿إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ عوام کا فیصلہ خدا کے حکم کے سامنے کچھ نہیں۔ خدا نے زنا کو حرام قرار دے دیا ہے۔ خدا کا فیصلہ عوام کے فیصلے سے مقدم ہے۔ ہمارے ہاں حاکم خدا ہے۔ اور یورپ کی جمہوریت میں حاکم اعلیٰ عوام ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ حاکم صرف اللہ ہے۔ اگر کوئی یہ کہہ دے کہ حاکم اللہ کے سوا عوام ہیں تو اس نے اللہ کی ذات میں شرک کیا اور اللہ کا شریک غیر اللہ کو تسلیم کر لیا۔ اسلام میں اس جمہوریت کا کوئی جواز نہیں۔

مفتی صاحب نے یورپ کی جمہوریت اور مسلمانوں کے ہاں جمہوریت کی وضاحت نہایت تفصیل کے ساتھ کی ہے۔ اور کوئی ابہام نہیں چھوڑا۔ اس کے باوجود دونوں کے درمیان فرق کو مزید واضح کرتے ہیں۔ وہ اسی تقریر میں فرماتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ حکومت صرف اللہ کی ہے یہاں خدا کے احکام موجود ہیں جو بالکل واضح اور یقینی ہیں، قرآن کریم کی آیات موجود ہیں نصوص قطعیہ موجود ہیں اور یہاں پیغمبر کی حدیث موجود ہے۔ ہم عوام کی حکومت کو خدا کی حکومت کے سامنے کچھ وقعت نہیں

دیتے۔ جیسے ہمارے ہاں جمہوریت کا مطلب اور معنی کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے زندگی کے بہت سے مسائل کے لئے احکام خود صادر فرما دیئے ہیں۔ اور بہت سے ایسے مسائل ہیں جن کے بارے میں اللہ نے ہمیں اختیار دیا ہے کہ ان مسائل کو تم لوگ کتاب وسنت کی روشنی میں طے کرلو جہاں اللہ نے ہم پر چھوڑا اور ہمیں فیصلہ کرنے کا اختیار دیا ان مسائل کو ہم اللہ کے دیئے ہوئے اختیار کے ساتھ جب طے کریں گے تو یہ عوام کا فیصلہ ہوگا اس کو ہم جمہوریت کہتے ہیں ہمارے اسلام میں خدا اور رسول کے حکم کے بعد خدا اور رسول کے دیئے ہوئے اختیار کے مطابق عوام کا فیصلہ جمہوریت ہے ہم اس کے قائل ہیں لیکن خدا اور اس کے رسول ﷺ کے مقابلے میں ہم عوام کے فیصلے کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ جمہوریت یورپ کو مبارک ہو۔ ہم اسے قبول کرنے کے لئے قطعاً تیار نہیں۔

مفتی صاحب نے اپنی اس تقریر میں اس اعتراض کا بہترین جواب دیدیا ہے جو لوگ آپ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ مفتی صاحب اور ان کی جماعت جمہوریت کی قائل ہے۔ جو ایک لادینی نظام ہے اور جو یورپ سے درآمد شدہ نظام ہے اور ایسا نظام ہے جو اسلام کی بنیادی تعلیمات کے منافی ہے مفتی صاحب نے یہاں اس کی بہترین تشریح کرکے ان کے اعتراض کی حیثیت ہی ختم کردی ہے۔ یہی وہ جمہوری نظام ہے جس کے تحت مفتی صاحب اور ان کی جماعت جمیعۃ علماء اسلام ملک میں انتخابی سیاست میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔ اور اسی نظام ہی کے تحت آپ اسمبلی کے رکن رہے اپوزیشن لیڈر منتخب ہوئے۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ کے وزیر اعلیٰ کا منصب سنبھالا ملک کی اسمبلیوں میں ایک منتخب نمائندے کی حیثیت سے فعال کردار ادا کرتے رہے۔ آئینی، قانونی مسائل کو حل کرنے کی تجویزیں دیتے رہے۔ اور عوامی فلاح وبہبود سے متعلق مسائل ومشکلات کے حل کے لئے آواز بلند کرتے رہے۔ اب بھی آپ کی جماعت آپ کے فرزند مولانا فضل الرحمن صاحب کی امارت میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں بھرپور کردار ادا کررہی

ہے۔ اس سے قبل شمال مغربی سرحدی صوبہ کی وزارت علیا آپ کی جماعت کے پاس تھی۔ جبکہ صوبہ بلوچستان کی وزارت میں آپ شریک اقتدار تھے۔ موجودہ حکومت کی وفاقی کابینہ اور بلوچستان کی صوبائی کابینہ میں آپ کی جماعت کی نمائندگی ہورہی ہے۔ اور یہ سب جمہوریت کے نظام کے تحت ہی ہورہا ہے۔

ایوب خان کے دور میں آئینی ترمیم کی حمایت کا اعتراض اور اس کا جواب

سکندر مرزا پاکستان کے گورنر جنرل تھے۔ جنرل ایوب خان بری افواج کے سربراہ تھے۔ جب ملک میں 1956ء کا آئین نافذ کیا گیا تو سکندر مرزا نے اس آئین کے فیصلے کے تحت گورنر جنرل سے صدر مملکت کا منصب سنبھالا۔ توقع یہ تھی کہ یہ نیا آئین ملک کو متحد ومضبوط رکھ سکے گا لیکن یہ آئین بھی ملک کو سنبھالا نہ دے سکا۔ سکندر مرزا جیسے طالع آزمائی وجہ سے ملک کا ہر شعبہ افراتفری کا شکار تھا۔ قدم قدم پر آئین کی دھجیاں بکھیری جارہی تھیں۔ اور آئین بنانے والوں کے ہاتھوں آئین کا مذاق اڑایا جارہا تھا کہ اس دوران جنرل ایوب خان نے اقتدار پر شب خون مارا۔ اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن کر آئین منسوخ کرکے ملک میں مارشل لاء نافذ کردیا۔ کچھ عرصہ بعد ملک کو ۱۹۶۲ء کا آئین دے کر انتخابات کرائے۔ جس سے قومی اسمبلی وجود میں آئی۔ حکومت نے اس سے آئین کی منظوری لی۔ اس آئین کی آڑ میں اس نے عورتوں کے حقوق کے نام پر ۱۹۵۶ء کے آئین میں درج اسی غرض کے لئے قائم کمیشن کی رپورٹ کو عائلی قوانین (فیملی لاز) کے نام سے نافذ کیا۔ جس میں بہت سی دفعات خلاف اسلام تھیں۔ اور جس کو حضرت مفتی صاحب نے اسمبلی کے ایوان میں ایک تفصیلی تقریر میں اہل سنت والجماعت کے چاروں فقہی مسالک (حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی) اور اہل تشیع کی کتابوں کے حوالہ جات کے ذریعہ فیملی لاز کے تمام دفعات کو خلاف اسلام ثابت کیا تھا۔ ایوب خان نے پاکستان میں پہلی دفعہ خاندانی منصوبہ

بندی اور اس کے بھاری بجٹ کی منظوری دی۔ اور اس کی تشہیر کے بڑے پیمانے پر منصوبہ بندی کی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ادارۂ تحقیقات اسلامی کے نام سے ایک ادارہ قائم کر کے اس کا سربراہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کو یورپ سے بلا کر بنایا۔ جس کے خیالات و نظریات واضح طور پر اسلام مخالف تھے۔ یہ وہ اقدامات تھے جس کی وجہ سے علماء اور خاص کر جمعیۃ علماء اسلام نے ایوب خان کی مخالفت شروع کی۔ قومی اسمبلی کے ایوان میں مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ حکومت کو زچ کرتے تو صوبائی اسمبلی میں مولانا غلام غوث ہزاروی حکومتی اقدامات کو خلاف اسلام ثابت کرتے تھے۔ تمام ملک میں دیندار طبقے نے عام جلسوں، مظاہروں، جلوسوں اور خطوط کی صورت میں ان اقدامات پر احتجاج کیا۔ لیکن حکومت کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ اس لئے صدر ایوب خان کے لئے دن بدن مخالفانہ فضا بنتی رہی۔ یہاں تک کہ حکومت نے صدارت کے الیکشن کا اعلان کر دیا۔ جو ۱۹۶۵ء کے شروع میں ہونے والے تھے۔ حزب اختلاف کی جماعتوں نے حکومت کے امیدوار صدر ایوب خان کے خلاف قائد اعظم محمد علی جناح کی بہن محترمہ فاطمہ جناح کو صدارتی امیدوار کے طور پر سامنے لانے کا فیصلہ کیا۔ جمعیۃ علماء اسلام نے اس سلسلے میں جو اجلاس طلب کیا۔ اس میں یہ فیصلہ ہوا کہ صدر ایوب کے اقدامات خلاف اسلام ہیں۔ اس لئے اس کی حمایت نہیں کی جا سکتی۔ جبکہ حزب اختلاف کی جماعتوں کی امیدوار عورت ہے۔ اور اسلامی نقطہ نظر سے وہ سربراہ مملکت نہیں بن سکتی۔ اس لئے جمعیۃ علماء اسلام نے یہ فیصلہ کیا کہ جمعیۃ تیسرا امیدوار میدان میں لائے گی۔ اگرچہ فیصلے کرنے میں تاخیر کی وجہ سے وہ تیسرا امیدوار کا فیصلہ نہ کر سکی۔ مگر یہ فیصلہ ضرور کیا کہ ان دونوں امیدواروں میں سے کسی کی حمایت نہیں کی جائے گی۔ یہی دن تھے کہ حکومت کو قومی اسمبلی کے ایوان میں ایک آئینی ترمیم کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جمعیۃ علماء اسلام کی مجلس شوریٰ کے اجلاس منعقدہ راولپنڈی میں آئینی ترامیم کے حق میں ووٹ دینے کا فیصلہ ہوا۔ اور حضرت مفتی صاحب کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ اس ترمیم کے حق میں اپنا ووٹ استعمال

کریں۔ مفتی صاحب نے اپنی جماعت کے فیصلے اور ہدایات کے مطابق حکومت کی طرف سے پیش کردہ آئینی ترمیم کے حق میں ووٹ استعمال کیا۔ چونکہ اس وقت ملک کی سیاسی فضا صدر ایوب خان کے خلاف تھی اس لئے اپوزیشن کی محاذ نے مفتی صاحب کے آئینی ترمیم کے حق میں ووٹ کے استعمال کو خوب اچھالا۔ اور اس کی وجہ سے مفتی صاحب پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی۔ اور طرح طرح کے الزامات لگائے۔ اور خاص کر جب ۱۹۷۰ء کے الیکشن ہو رہے تھے۔ اس وقت جماعت اسلامی اور اس کے خریدے ہوئے صحافیوں نے اس آئینی ترمیم کے ووٹ کے واقعہ کو خوب اچھالا اور اس ضمن میں مفتی صاحب کے دامن کو داغدار کرنے کی شعوری کوشش کی۔ اس سلسلے میں جمعیۃ علماء اسلام کے ہفت روزہ آرگن "ترجمان اسلام" نے جو تفصیل لکھی ہے وہ یہ ہے۔

> قومی اسمبلی کا اجلاس جون ۱۹۶۳ء میں راولپنڈی میں ہوا جس میں سرکاری پارٹی نے دوسرا ترمیمی بل پیش کیا۔ جمعیۃ علماء اسلام کے ذمہ دار ارکان نے حضرت مفتی صاحب کو ہدایت کی کہ وہ اس بل کی حمایت کریں........................ بہر حال
> حضرت مفتی صاحب مدظلہ نے جماعتی مشورہ کے مطابق بل کی حمایت میں ووٹ دیا۔
> دوسری ترمیم کا خلاصہ تین چیزیں ہیں۔
> (۱) صدر کا انتخاب اسمبلی کے انتخابات سے پہلے ہو۔
> (۲) صدر کی میعاد صدارت ختم ہونے کے بعد سے لے کر دوسرے صدر کے منتخب ہونے تک قومی اسمبلی کے سپیکر کو صدر بنانے کی جگہ پرانے صدر ہی ۳ ماہ تک کام سنبھالے رکھیں۔
> (۳) صدارت کا ایک امیدوار مر جائے تو دوسرا بلا مقابلہ صدر نہ بنے بلکہ دوبارہ صدارت کے امیدواروں کے کاغذات داخل کئے جائیں۔

ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور کے مدیر نے ہر ایک دفعہ کی وضاحت بھی یوں کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

پہلی ترمیم کی مخالفت بالکل بے معنی ہے اس لئے کہ اگر یہ ترمیم نہ بھی ہو پھر بھی صدر مملکت اپنا انتخاب اسمبلی سے پہلے کرا سکتے ہیں۔ دستور میں اسمبلی کا انتخاب ۸ فروری سے ۹ جون تک اور صدر کا انتخاب ۸ اپریل سے ۸ اگست تک ہو سکتا ہے۔ دوسری ترمیم کا مقصد آپ اچھی طرح سمجھ لیں کہ

(الف) پہلے دستور میں تھا کہ صدر کی میعاد ۸ اپریل کو ختم ہونے کے بعد ۸ اگست تک صدر قومی اسمبلی کا سپیکر رہے گا اس کے بعد وہ نئے منتخب صدر کو چارج دے گا۔ آپ خود غور فرمائیں یہ بحث ایوب خان کی نہیں بلکہ ملک کے لئے ایک دائمی دستور بنانے کی ہے۔ اگر ایک صدر ۵ سال ملک کو ایک ڈھب پر چلائے پھر دوسرا آکر چار ماہ کے لئے اپنے ڈھب پر چلائے اس کے بعد منتخب صدر چارج لے کر ملک اپنے ڈھب پر لائے کیا یہ ملک کی خیر خواہی ہے یا تباہی۔ اگر پرانا صدر ۵ سال تک رہ سکتا ہے تو مزید دینے سے کون سا آسمان سر پر آگرے گا۔ صدر کی غیر حاضری میں سپیکر قائم مقام صدر آگے پیچھے بھی ہو سکتا ہے مگر اس کو وزارتوں یا حکومت میں رد و بدل کا اختیار نہیں ہوتا۔ صدارت کی میعاد پوری ہونے کے بعد جب سپیکر صدر بنتا ہے اس کو گورنروں اور وزیروں کو بدلنے کا بھی پورا اختیار ہوتا ہے۔

(ب) آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ صدر کے لئے مسلمان ہونا ضروری ہے مگر سپیکر کے لئے مسلمان ہونا ضروری نہیں وہ مرزائی ہندو اور عیسائی بھی ہو سکتا ہے۔ پس اگر خدانخواستہ حالات کے تحت کوئی ایسا آدمی صدر ہو اور ملک کا مختار بن جائے تو اس صورت میں ملک کو جو خطرات پیش ہو سکتے ہیں وہ تباہ کن ہوں گے۔

(ج) تیسری ترمیم کہ صدارت کا ایک امیدوار مر جائے تو دوسرا بلا مقابلہ صدر نہ بنے بلکہ نئے سرے سے امیدوار کاغذات داخل کریں گے۔ یہ ترمیم تو انتہائی ضروری ہے اس لئے کہ ایک امیدوار کے مرنے سے نالائق امیدوار کو کیوں ناجائز فائدہ پہنچے۔ اور قوم کی رائے شماری اور استصواب رائے کے بغیر ہی وہ صدر بن جائے۔

ان حالات کے پیش نظر حضرت مفتی صاحب مدظلہ نے اپنے ووٹ کا استعمال اقتدار کی رسہ کشی جنگ سے علیحدہ ہو کر اپنے ضمیر کے مطابق کیا۔ [ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (۳ جولائی 1964ء)]

آئینی ترمیم کے حق میں ووٹ استعمال کر کے مفتی صاحبؒ نے جہاں اپنی جماعت جمعیۃ علماء اسلام کے فیصلے پر عمل کیا۔ وہاں ان کا یہ اقدام ملک و قوم کے وسیع مفادات کے تناظر میں تھا۔ جناب مولانا سعید الرحمٰن علوی لکھتے ہیں۔

مرحوم نے پہلی دفعہ اسمبلی کا ممبر بننے کے بعد ایوبی آئین کی ایک ترمیم میں جب حکومت کے حق میں اپنا ووٹ استعمال کیا تو بدقسمتی سے بعض حضرات نے اسے بڑے غلط معنی پہنائے لیکن مرحوم اختلاف برائے اختلاف کے قائل نہ تھے ان کی رائے سے اختلاف کا حق آج بھی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام ملک اور قوم کے وسیع تر مفاد میں وہ قدم اٹھایا۔ اس پر انہیں پوری طرح شرح صدر تھا انہوں نے جماعتی آرگن میں اس عنوان پر تفصیل سے لکھا۔ مختلف بار روم میں اہل دانش کے سامنے اپنا موقف واضح کیا اور بعض بار روم کی تقاریر کا میں بھی شاہد ہوں۔ کہ وکلاء حضرات نے اعتراف کیا کہ یہ بات درست ہے۔ [روزنامہ "وفاق" لاہور۔ ص 40 (مفتی محمود نمبر)]

1969ء میں جناب ریاض بٹالوی نے روزنامہ "مشرق" لاہور کے لئے مفتی صاحب کا انٹرویو کیا اس میں انہوں نے مفتی صاحب سے اس آئینی ترمیم کے حق میں ووٹ کے استعمال سے متعلق سوال کیا جس کا مفتی صاحب نے تفصیل کے ساتھ نہ صرف جواب دیا ہے بلکہ اس ترمیم کے بارے میں دلائل بھی دیئے اور اپوزیشن کے خدشات کا ذکر کر کے اس کے مقابلے میں اپنا موقف بھی واضح کیا ہے۔

سوال و جواب مندرجہ ذیل ہیں۔

سوال: کیا یہ درست ہے آپ نے اس ملک میں آمریت کو سنبھالا دینے کے لئے سابق صدر ایوب کے ہاتھ مضبوط کئے اور ایوب خان کے دوسرے صدارتی انتخابات میں ان کی

کامیابی کے لئے راہ ہموار کی؟ میرا اشارہ ۱۹۶۲ء کے دستور میں اس ترمیم کی طرف ہے جو ایوب خان کے ایماء پر کی گئی اور آپ نے اس ترمیم کے حق میں ووٹ دیا تھا۔

جواب: ۱۹۶۲ء کے دستور میں یہ دفعہ شامل تھی کہ پانچ سال کے بعد صدارتی انتخاب ہوگا اور اگر موجودہ صدر انتخابات میں حصہ لینا چاہیں تو انہیں انتخابات سے چار ماہ قبل صدارت سے مستعفی ہو کر قومی اسمبلی کے اسپیکر کو صدر کا عہدہ سونپنا ہوگا اور انتخابات کے عبوری دور میں اسپیکر ہی ملک کے اس اعلیٰ منصب پر فائز رہے گا۔ اب آئین میں ترمیم کرلی تھی کہ ایوب خان ملک کے بدستور صدر رہیں اور چار ماہ کے لئے اسپیکر کو قائم مقام صدر نامزد نہ کریں۔ اپوزیشن پارٹیوں کا موقف یہ تھا کہ ایوب خان عبوری دور میں صدر رہے تو وہ سرکاری مشینری کو استعمال کر کے ووٹروں پر اثر انداز ہوں گے۔ اور الیکشن غیر جانبدارانہ نہیں ہو سکیں گے۔ مجھے قومی اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے اس ترمیمی بل کے حق یا مخالفت میں ووٹ دینا تھا میں نے اپنی جماعت کا اجلاس طلب کیا۔ اور ذمہ دار عہدیداروں کو بل کے مندرجات پر غور کرنے کے لئے کہا جماعت نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ بل کے حق میں ووٹ دیا جائے۔ اس فیصلے کے دو بنیادی وجوہات تھیں۔ ایک مذہبی اور دوسری سیاسی۔ دستور میں صدر کی طرح اسپیکر کے لئے مسلمان ہونے کی کوئی شرط نہیں تھی اس طرح دستور کی دفعہ حذف کردینے کے تحت غیر مسلم اسپیکر عبوری طور پر پاکستان کا صدر بن سکتا تھا جو ہمارے نزدیک مذہبی اعتبار سے کسی صورت مناسب نہیں تھا۔ اس فیصلے کا سیاسی پہلو یہ تھا کہ جب ہم اسی (۸۰) ہزار بی ڈی ممبروں کے منتخب نمائندے کو ملک کا جائز صدر تسلیم نہیں کرتے تو قومی اسمبلی کے ڈیڑھ سو ممبروں کے منتخب اسپیکر کو یہ حق کیسے دے سکتے ہیں کہ وہ (عبوری دور کے آئین کے لئے سہی) کرسی صدارت پر متمکن ہو جائے اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ دستور میں کہیں شرط نہیں تھی کہ اسپیکر قائم مقام صدر ہونے کے بعد صدارتی انتخابات میں حصہ نہیں لے سکتا۔ ظاہر ہے کوئی اسپیکر جسے چار ماہ کے لئے صدر نامزد کیا گیا ہو اگر وہ صدارتی انتخاب لڑنا چاہے تو قائم مقام صدر کی حیثیت سے سرکاری

مشینری کو اپنے حق میں استعمال کر سکتا تھا۔ ان حالات میں موجودہ صدر کے لئے صدارتی الیکشن کے پیش نظر چار ماہ قبل مستعفی ہو جانا محض تکلف تھا۔ لہٰذا میں نے ترمیم کے حق میں ووٹ دے دیا۔ اگر میں نے ایسا کیا تو یقیناً کوئی گناہ نہیں کیا۔ اور میرے اس اقدام سے کہیں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ میں نے ایوب خان کی آمریت کو سنبھالا دیا تھا۔ [روزنامہ مشرق لاہور 15 / مارچ ۱۹۶۹ء]

اور جب ایک دفعہ مفتی صاحب سے سوال کیا گیا کہ کیا آپ نے صدر ایوب کے حق میں ووٹ استعمال کیا تھا۔ تو آپ کا جواب تھا کہ میں نے اپنا ووٹ صدر ایوب کے حق میں نہیں بلکہ آئین میں ترمیم کے حق میں دیا تھا۔ اس بات کو مفتی صاحب کے خلاف اتنا استعمال کیا گیا۔ کہ آئین میں ترمیم کے حق میں ووٹ کو صدر ایوب خان کی حمایت میں ووٹ استعمال کا نام دیا گیا۔ عام ملکی فضا ویسے بھی ایوب خان کے خلاف تھی۔ اس لئے اس واقعہ کو مفتی صاحب کی کردار کشی کے لئے خوب اچھالا گیا۔ جبکہ انہی دنوں کا ایک واقعہ ہے کہ جب مفتی صاحب سے صدر ایوب اور محترمہ فاطمہ جناح کے بارے میں پوچھا گیا۔ تو آپ نے فرمایا کہ "صدر ایوب میں اور کوئی خوبی نہیں سوائے اس کے کہ وہ مرد ہے اور فاطمہ جناح میں اور کوئی برائی نہیں سوائے اس کے کہ وہ عورت ہے"۔

سوشلزم کی حمایت کا الزام اور اس کا جواب

1964ء صدر ایوب کے دور کا عروج تھا۔ جس میں انہوں نے حزب اختلاف کی جماعتوں کی مشترکہ صدارتی امیدوار محترمہ فاطمہ جناح کو شکست دے کر صدارتی الیکشن جیتا تھا۔ اور پھر بی۔ ڈی ممبروں کے ذریعہ قومی و صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن کے ذریعہ اپنے حامیوں کو کامیاب کرا کر بظاہر ایک مضبوط حکومت کی بنیاد رکھی تھی مگر دوسری طرف اس کی زوال کے اسباب بھی یکے بعد دیگرے سامنے آنے شروع ہو گئے تھے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کی

وجہ سے سارے ملک میں حب الوطنی کے جذبہ کے تحت ایک اتحاد کی صورت نظر آئی تھی اور قوم ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ کا منظر پیش کرنے لگی تھی۔ ۱۷ روز کے بعد جنگ بندی ہوئی تھی مگر اس کے بعد کے حالات ایوب خان کے زوال کی نشاندہی کرنے لگے تھے۔ معاہدہ تاشقند نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔ صدر ایوب خان کی حکومت کے وزیر خارجہ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے قوم کے مزاج کو دیکھ کر وزارت سے استعفیٰ دے دیا تھا اور قوم کو یہ نعرہ دے کر اپنی طرف خوب متوجہ کیا تھا کہ میں معاہدہ تاشقند کا راز فاش کروں گا۔ قوم ایک طرف صدر ایوب کی مخالف ہو گئی تھی۔ دوسری طرف اس کے وزیر خارجہ کا استعفیٰ اور قوم کو یہ تاثر دینا کہ معاہدہ تاشقند کی صورت میں قوم کو کوئی دھوکہ دیا گیا ہے۔ اندر اندر حکومت پاکستان نے بھارت کے شرائط پر معاہدہ کر کے وطن کی عزت کو خاک میں ملایا تھا۔ اس بات نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ اور ذوالفقار علی بھٹو شہرت کی بلندی پر پہنچ گئے تھے۔ اور اس نے ان حالات سے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔ حکومت نے حالات سے مجبور ہو کر حزب اختلاف کی جماعتوں کو مذاکرات کی دعوت دی۔ مذاکرات میں ایک متفقہ موقف اختیار کرنے کے لئے حزب اختلاف کی جماعتوں کے مشورے اور اجلاس شروع ہو گئے مگر سوائے صرف دو مطالبات کے باقی پر اتفاق نہ ہو سکا اور وہ دو مطالبے ایک پارلیمانی نظام کا تھا اور دوسرا بالغ رائے دہی کا تھا اور مزید مطالبات کے بارے میں فیصلہ یہ ہوا کہ گول میز کانفرنس کی صورت میں مذاکرات میں ہر پارٹی اپنے طور پر مطالبات کرے گی۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو اور مولانا عبدالحمید خان بھاشانی نے مذاکرات کا بائیکاٹ کیا جبکہ دیگر تمام پارٹیوں نے مذاکرات میں شرکت کی۔ مولانا مفتی محمود صاحب نے مشترکہ دو مطالبات کے علاوہ دو مطالبات اور بھی سامنے رکھے ایک یہ کہ آئین میں مسلمان کی تعریف شامل کی جائے۔ تاکہ اس طرح قادیانیوں اور دیگر غیر مسلموں کا کلیدی عہدوں پر تعیناتی کا راستہ روکا جا سکے۔ دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ 31 علماء کے ۲۲ نکات کو آئین کا حصہ بنایا جائے۔ سوائے جسٹس (ر)

انعام الرحمن مرشد کے اور کسی رہنما نے مفتی صاحب کے مطالبات کی تائید نہیں کی۔ یہاں تک کہ اس میں مذہبی رہنما بھی شریک تھے۔ اور خاص کر ابوالاعلیٰ مودودی صاحب جو ۲۲ نکات مرتب کرنے والے 31 علماء میں وہ بھی شامل ہیں۔ مگر وہ بھی چپ کا روزہ رکھے رہے۔ صدر ایوب خان کے سیاسی رہنماؤں سے یہ مذاکرات ناکام ہوئے۔ جس کی بنا پر ملک کے حالات نے ابتری کی صورت اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ صدر ایوب خان نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور ملک کی باگ ڈور کو جنرل یحییٰ خان بری افواج کے سربراہ کے حوالے کر دیا۔ جنہوں نے ملک میں مارشل لاء نافذ کر کے سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی اور 90 دن کے اندر اندر بالغ رائے دہی اور پارلیمانی نظام کا اعلان کر کے عام انتخابات کا وعدہ کیا۔ کچھ عرصہ بعد سیاست سے پابندی ہٹا کر اس نے عام الیکشن کا اعلان کیا۔ تمام سیاسی جماعتوں نے الیکشن کی تیاری شروع کر دی۔ مفتی صاحب اور ان کی جماعت جمعیۃ علماء اسلام نے ملک کے دونوں مغربی اور مشرقی حصہ میں امیدوار کھڑے کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور ایک بہترین منشور تیار کر کے برسر اقتدار آنے کی صورت میں اپنے دستور العمل کا خاکہ عوام کے سامنے پیش کیا۔ جس میں قرآن و سنت کی روشنی میں عوام کے مسائل کا بہترین حل پیش کیا گیا تھا۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی جماعت کا چار نکاتی پروگرام پیش کیا جس میں ایک نکتہ یہ تھا کہ ہماری "معیشت اسلامی سوشلزم ہوگی"۔ بھٹو صاحب نے عوام کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے "روٹی، کپڑے، مکان" کا نعرہ لگایا۔ جس کی وجہ سے زندگی کے پسے ہوئے طبقات کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اور ملک میں بڑے بڑے سرمایہ داروں، جاگیرداروں، صنعتکاروں نے بھٹو صاحب کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ سرمایہ داروں کے ایجنٹ علماء نے بھی بھٹو کی مخالفت شروع کر دی۔ ان میں جماعت اسلامی سب سے آگے تھی۔ اس نے ایک طرف حکومت وقت کی ہمدردی حاصل کی۔ مشرقی پاکستان کے ضمنی الیکشن میں حصہ لے کر وہاں عبوری حکومت میں شمولیت اختیار کر لی۔ دوسری طرف بڑے بڑے سرمایہ داروں کے ایجنٹ کا کردار ادا کر کے بھٹو کی

مخالفت شروع کر دی۔ اخبارات کو خریدا۔ صحافیوں کی بولیاں لگا دیں۔ یہاں تک کہ بعض علماء کو خریدا۔ اور ملک میں ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ مفتی صاحب اور ان کی جماعت شروع دن سے ایک معتدل پروگرام کی حامی و داعی تھی۔ اور وہ ان حالات میں بھی اعتدال کی پالیسی پر گامزن رہے۔ انہوں نے اگر ایک طرف سوشلزم کی مخالفت کی تو دوسری طرف سرمایہ داری کو اس ملک کے اکثر مسائل و مشکلات کی بنیادی وجہ قرار دیا۔ غربت کی بڑھتی ہوئی شرح، مہنگائی اور اشیاء ضرورت کی قلت کی اصل وجہ وہ سرمایہ داروں کو قرار دے رہے تھے۔ ۲۲ خاندانوں کو وہ پاکستان کی غربت و افلاس کی ذمہ دار ٹھہرا رہے تھے۔ ان دنوں حضرت مفتی صاحب کی عام جلسوں سے خطاب بڑے جذباتی ہوا کرتے تھے۔ وہ غریبوں، مزدوروں کی حمایت میں آگے بڑھ کر ان کی دعائیں لیتے تھے۔ جس کی وجہ سے ملک کے پسے ہوئے طبقات یعنی مزدوروں اور کسانوں کی نگاہ میں آپ کا بڑا احترام پیدا ہوا جبکہ علماء کا ایک طبقہ وہ تھا جو سرمایہ داری نظام اور سرمایہ داروں کے تحفظ کے لئے سرگرم عمل تھا۔ جس نے مفتی صاحب اور ان کی جماعت کو مزدوروں اور کسانوں کی حمایت کی وجہ سے سوشلسٹ علماء کے نام سے مشہور کر دیا۔ اور ان دنوں ایک فتویٰ ترتیب دیا گیا جس پر 113 علماء کے دستخط تھے جس میں دیگر طبقات کے ساتھ ساتھ بالواسطہ مفتی صاحب اور ان کے دیگر ہمنوا علماء کو گمراہ قرار دیا گیا تھا۔ لیکن مفتی صاحب نے ان کو اور ان کے اس فتویٰ کو کچھ اس انداز سے چیلنج کیا کہ اس فتویٰ کے پرخچے اڑا دیئے گئے۔ اور اس کی فتویٰ کی حیثیت ہی مشکوک ہو گئی۔ دوسری طرف مفتی صاحب اور ان کی جماعت نے آگے بڑھ کر اس وقت پاکستان کی سطح پر مزدوروں کی ملک گیر لیبر پارٹی سے معاہدہ کیا اور لاکھوں مزدوروں اور کسانوں کو سوشلزم کی گود میں جانے سے بچا لیا۔ اور یہ سب حضرت مفتی صاحب کی تدبر، اصابت رائے اور عوامی مقبولیت کی وجہ سے ممکن ہو سکا۔

مفتی صاحب نے اس دور کا ذکر کرتے ہوئے بتایا۔

یحییٰ خان نے "لیگل فریم ورک آرڈر" کے تحت جنوری ۱۹۷۰ء تا دسمبر ۱۹۷۰ء کو انتخابات کا سال قرار دیا۔ جمعیت علماء اسلام نے بھی دوسری جماعتوں کی طرح اپنی انتخابی مہم شروع کی .... ہم نے اپنا ایک منشور قوم کے سامنے پیش کیا۔ ہم صحیح معنی میں اسلامی نظام لانا چاہتے تھے۔ ایسا نظام جو خلافت راشدہ کے عہد میں رائج تھا۔ ہم اسلام کو سرمایہ داری کا آلہ کار نہیں بلکہ اسے غریبوں اور مظلوموں کے تحفظ کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام سرمایہ داری کی حفاظت نہیں کرتا بلکہ غریبوں اور مظلوموں کی دستگیری کرتا ہے۔ بچپن ہی سے ہمارے ذہن کی تربیت مغربی سامراج دشمنی پر ہوئی تھی۔ اس لئے ہم خصوصاً امریکہ، برطانیہ اور دوسری مغربی طاقتوں کے خلاف سرگرم عمل تھے اس طرح انتخابات میں سرمایہ دار ہمارے خلاف رہے۔ انہوں نے بدترین استحصال کے ذریعہ غریبوں کا خون چوسا تھا۔ ان لوگوں نے ہمارے خلاف ایک مضبوط محاذ قائم کیا۔ ان کے علاوہ ان لوگوں نے جو سرمایہ داروں کے ایجنٹ تھے یا امریکی سامراج کے آلہ کار بنے ہوئے تھے انہوں نے بھی ہماری سخت مخالفت کی۔ اسلام اور سوشلزم کا تقابل اسلام اور کفر کی شکل میں آیا۔ انہوں نے نہ صرف ہمیں بلکہ ہر اس جماعت کو کافر ٹھہرایا جو اس ملک میں معاشی انصاف کا پرچم لے کر اٹھی تھی۔ بہرحال ہم نے اس فتویٰ کفر کا بھی مقابلہ کیا۔ [روزنامہ "جسارت" کراچی-15 مئی ۱۹۷۱ء]

ان حالات میں مفتی صاحب کے عظیم کردار کے بارے میں مولانا غلام ربانی صاحب یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

مفتی صاحب کی عظیم شخصیت کا نقش میرے دل پر اس وقت بیٹھا جب روٹی، کپڑے اور مکان کے نعرے لگانے والے عوام کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جا رہا تھا۔ یعنی عوام کی مشکلات، تکالیف، صعوبتوں اور مسائل سے نفرت کی جا رہی تھی۔ اور ان کو کافر قرار دیا جا رہا تھا۔ گویا بے گناہ اور غریب مسلمانوں کے مسائل کا حل ان کے کافر بنانے میں مضمر

تھے۔ تمام سرمایہ پرست مولوی اپنے اور دیگر سرمایہ داروں کے تحفظ کے لئے کفر سازی کے بھالے اور فتووں کی تلواریں سونت کر میدان میں نکل آئے تھے۔ ایسے میں ان کے مقابلہ میں دین اسلام کی ایک ہی آواز تھی اور وہ مفتی محمود کی آواز تھی۔ انہوں نے کہا کہ روٹی مانگنا کوئی جرم نہیں اور نہ ہی کپڑے مکان کا نعرہ لگانا شرعی حیثیت سے گناہ ہے۔ یوں غریب مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کمیونزم کی گود میں جانے سے بچ گئی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ مفتی صاحب کے اعمال میں اگر ان کی دوسری اسلامی خدمات شامل نہ بھی کئے جائیں تو بھی ان کے بخشش کے لئے ان کا یہی عمل کافی ہے۔ بعد میں جذبات کی فضا صاف ہونے کے بعد مفتی صاحب کی بصیرت اور سیاسی اندازوں کو پوری ملک نے خراج تحسین پیش کی۔ [مولانا غلام ربانی۔ ترجمان اسلام (مفتی محمود نمبر)]

جہاں تک آپ پر اس الزام کا تعلق ہے کہ آپ سوشلزم کے حامی ہیں۔ یا آپ کو سوشلسٹ عالم کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے تو اس کے بارے میں آپ خود اس کی وضاحت کچھ یوں فرماتے ہیں۔

> ایک مسلمان کی حیثیت سے میرا یہ عقیدہ ہے کہ میں اسلام کو ہمہ گیر اور جامع نظام زندگی سمجھتا ہوں۔ اس بات پر ایمان رکھتا ہوں کہ قرآن زندگی کے تمام شعبوں میں انسانیت کی رہنمائی کرتا ہے اور قرآن کی موجودگی میں ایک مسلمان کے لئے کسی نظریہ کسی ازم اور کسی دوسرے عقیدے کا سہارا لینے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن میں یہ ماننے کے لئے بھی تیار نہیں کہ ان دنوں اسلام اور سوشلزم کی جو بحث چھڑی ہوئی ہے وہ اسلام اور کفر کی جنگ ہے۔ میرے نزدیک یہ سیاسی اقتدار کی لڑائی ہے۔

اور جب مفتی صاحب سے یہ پوچھا گیا کہ آپ کے نزدیک اسلام اور سوشلزم میں کیا فرق ہے تو آپ نے جواب میں سوال کیا کہ "نور اور ظلمت میں کیا فرق ہوتا ہے"۔ [روزنامہ مشرق لاہور۔ 15 / مارچ 1970ء]

ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور (مفتی محمود نمبر) میں جناب عبدالکریم عابد صاحب کا مضمون بھی شامل کیا گیا ہے۔ انہوں نے حضرت مفتی صاحب کی خدمات کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ زیر نظر مسئلہ کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

> مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ سوشلزم کے سخت مخالف تھے اگرچہ بعض لوگوں نے انہیں سوشلسٹ مولانا ہونے کا طعنہ دیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ وہ ایک عرصہ تک کمیونسٹوں کے آلہ کار رہے ہیں۔ لیکن لوگ مفتی صاحب سے ذاتی واقفیت رکھتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ مولانا مفتی محمود کمیونسٹوں سے ہمیشہ سخت بیزار اور متنفر رہے ایک انٹرویو میں اسلامی سوشلزم کے متعلق مولانا نے فرمایا۔
>
> اگر کوئی شخص مارکس اور لینن کے نظریہ کو اسلامی سوشلزم سے تعبیر کرتا ہے وہ اسلامی تعلیمات کی تکذیب کرتا ہے۔
>
> اس کے باوجود مفتی صاحب کی رائے تھی کہ سوشلزم کا نام لینے والے کو کافر نہیں کہا جاسکتا۔ مولانا نے اس بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا اگر کوئی شخص اسلامی مساوات اور اسلام کے معاشی نظام کو اسلامی سوشلزم کا نام دیتا ہے تو اسے کافر قرار نہیں دیا جاسکتا البتہ ایسا شخص تعبیر کی غلطی کا شکار ہے کیونکہ اسلام تعبیرات اور اصطلاحات میں بھی خود کفیل ہے اور کسی غیر اسلامی اصطلاح کا محتاج نہیں۔

ایک تقریر میں مفتی صاحب نے اسلام اور سوشلزم پر بحث کرتے ہوئے پاکستان میں سرمایہ داری اور سرمایہ داروں کو غربت و افلاس کا ذمہ دار قرار دیا۔ آپ نے فرمایا۔

> اسلام، سوشلزم کا اس قدر مخالف نہیں ہے جس قدر سرمایہ دارانہ نظام کا مخالف ہے۔
>
> .... اس ملک میں اگر کوئی لڑائی ہے تو وہ اسلام اور سوشلزم کی نہیں بلکہ اسلام اور سرمایہ دارانہ نظام کی ہے کیونکہ گزشتہ اکیس سال کے دوران پاکستان کو سب سے زیادہ نقصان جاگیرداران اور سرمایہ دارانہ نظام سے پہنچا ہے مفتی صاحب نے کہا دیہات میں مزارعین بڑے زمینداروں کے زیر سایہ جس طرح وقت گزار رہے ہیں

ان کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مزارعین اور کاشتکار بڑے بڑے زمینداروں کے کتوں کو جو دودھ اور مکھن کھلاتے ہیں خود اس سے محروم ہیں۔ اس معاشرے میں زمیندار کے کتے کو دودھ مل جاتا ہے لیکن کاشتکار اس کے لئے ترستا ہے۔ اور زمیندار، مزارعین کے خون پسینے کی کمائی پر جس طرح عیش کرتے ہیں اس سے انسانیت کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ [ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)]

ایک مرتبہ سلہٹ (بنگلہ دیش) عیدگاہ میدان میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا "اگر ہماری کوششیں بار آور ہوئیں اور پاکستان میں اسلامی نظام کا نفاذ ہوا تو دنیا دیکھ لے گی کہ سوشلزم اور کمیونزم چین اور روس کے دروازے پر اپنی موت آپ مر جائیں گے"۔ [ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر)]

مفتی صاحب پر سوشلزم کی حمایت بھی محض الزام تھا۔ جس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ یہ محض سرمایہ دارانہ نظام کو تحفظ دینے کے لئے گھڑا گیا تھا۔ اور اس میں بھی پیش پیش کچھ علماء حضرات تھے۔ جن کا بعد میں کوئی سیاسی کردار ملک میں نہ رہا۔ جبکہ حضرت مفتی صاحب کی قیادت کو تمام سیاسی پارٹیوں نے تسلیم کیا ہے اور ان کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

ضیاء الحق کے کابینہ میں شمولیت کا اعتراض اور اس کا جواب

جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے مارچ ۱۹۷۷ء میں عام انتخابات کا اعلان کیا۔ اپوزیشن جماعتوں کا اتحاد موجود تھا۔ مگر وہ زیادہ فعال نہیں تھا۔ اسی طرح بعض سیاسی جماعتیں جو اس اتحاد سے اب تک باہر تھیں ان کی بھی خواہش تھی کہ اس اتحاد کو وسیع کر دیا جائے اور یوں نئے اتحاد کو "پاکستان قومی اتحاد" (P.N.A) کا نام دے کر تشکیل دیا گیا۔ جس کے صدر مولانا مفتی محمود صاحب، جناب پیر پگاڑا شریف و نوابزادہ نصر اللہ خان صاحب نائب صدر جبکہ جمعیۃ علماء پاکستان کے مرکزی سیکرٹری جناب رفیق احمد باجوہ کو اس اتحاد کا جنرل سیکرٹری چنا گیا۔ جس کو ایک سیاسی غلطی کی وجہ سے اپنے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ اور ان کی جگہ جماعت اسلامی کے پروفیسر غفور احمد صاحب کو جنرل سیکرٹری بنایا گیا۔ اس اتحاد نے چاروں صوبوں میں پیپلز پارٹی کے امیدواروں کے مقابلہ میں ایک مشترکہ منشور اور مشترکہ انتخابی نشان "ہل" کے ساتھ الیکشن لڑا۔ پہلے قومی اسمبلی کے الیکشن ہوئے۔ اس الیکشن میں حکومت نے دھونس، دھاندلی سے بہت سی نشستیں جیت لیں۔ وہ نشستیں بھی جس کے بارے میں عام اندازے یہ تھے کہ یہ سیٹ قومی اتحاد کی ہے۔ اس کا نتیجہ بھی دھاندلی کے ذریعہ تبدیل کر دیا گیا۔ جس کے رد عمل میں چند روز بعد ہونے والے صوبائی الیکشنز کا قومی اتحاد نے بائیکاٹ کر دیا۔ اور ملک میں ایک زبردست تحریک چلی۔ حکومت نے مزاحمت کی، جلوسوں، جلسوں مظاہروں کو روکنے کی حکمت عملی تیار کی۔ جہاں بھرپور تحریک شروع ہوئی۔ لوگوں نے رضاکارانہ گرفتاریاں دیں۔ قومی اتحاد کی قیادت کو جیلوں میں ٹھونسا گیا۔ کئی شہروں میں کئی نوجوانوں نے جام شہادت نوش کیا۔ ملک کی معیشت کا پہیہ جام کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ حکومت قومی اتحاد کے رہنماؤں کے ساتھ مذاکرات پر آمادہ ہوئی۔ مذاکرات کے شروع کرنے کے لئے قومی اتحاد نے جو شرائط رکھے تھے ان میں سیاسی کارکنوں کی رہائی کی بھی شرط تھی جس کی وجہ سے سیاسی کارکنوں کو رہا کر دیا گیا۔ مذاکرات کی ایک لمبی کہانی ہے۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے رویے اور غیر لچکدار اور غیر سنجیدہ رویے سے مذاکرات کا سلسلہ کبھی ٹوٹتا کبھی دوبارہ جوڑا جاتا۔ مذاکرات میں شریک سیاسی رہنماؤں کے بقول مذاکرات کامیابی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اور صرف ایک نکتہ حل طلب تھا کہ ۵ر جولائی ۱۹۷۷ء کی رات کو بری افواج کے سربراہ جناب محمد ضیاء الحق نے بھٹو کو اقتدار سے محروم کر کے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کو معطل کر دیا اور تمام سیاسی قیادت کو نظر بند کر دیا۔ جنرل ضیاء الحق نے 90 دن کے اندر عام انتخابات کا اعلان کر دیا۔ جس کی وجہ سے سیاسی قیادت نے اطمینان کا سانس لیا۔ مگر الیکشن کے قریب آتے ہی اس نے الیکشن کے التواء کا اعلان کر دیا۔ اور "انتخاب سے قبل احتساب" کا نعرہ لگا کر اپنے اقتدار کو طول دینے کا

منصوبہ بنایا۔ مفتی صاحب ایک جمہوری سوچ کے سیاستدان تھے۔ وہ قطعاً مارشل لاء کے حامی نہ تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ لولی لنگڑی جمہوریت مارشل لاء سے بہتر ہے۔ ایک دفعہ دوران گفتگو جب ان سے دریافت کیا گیا کہ اگر بھٹو کے ساتھ مذاکرات ناکام ہو گئے تو کیا ہوگا؟ آپ نے فرمایا مارشل لاء لگ جائے گا۔ جواب ملا یہ تو بہت ہی اچھا ہوگا چونکہ پی این اے کا مطالبہ تھا کہ از سر نو انتخابات فوج کی نگرانی میں ہوں۔ مفتی صاحب نے پورے اعتماد اور قوت کے ساتھ فرمایا مارشل لاء اب ملک کے لئے نقصان دہ ہوگا۔ میں نرم شرائط پر بھی بھٹو صاحب سے معاملہ طے کرلوں گا لیکن مارشل لاء نہیں آنے دوں گا۔ ملک کا دستور بڑی مشکل سے تیار ہوا ہے جس پر چاروں صوبوں کے لوگوں نے دستخط کئے ہیں اگر مارشل لاء لگ گیا تو ملک کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ [ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ ص 457]

آپ کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ آپ مارشل لاء کے حق میں نہیں تھے۔ اور ان کو ملک کے لئے بہت بڑا نقصان سمجھتے رہے۔ مگر ان کے نہ چاہتے ہوئے بھی ملک میں مارشل لاء نافذ کردیا گیا۔ مارشل لاء نے الیکشن کا اعلان کر کے عین موقع پر اس کو التواء میں ڈال دیا۔ ادھر جنرل ضیاء الحق نے قومی اتحاد کو عبوری حکومت میں شمولیت کی دعوت دی۔ بعض جماعتوں کی خواہش بلکہ اصرار تھا کہ حکومت میں شمولیت اختیار کی جائے۔ جبکہ مفتی صاحب کی ذاتی رائے اس کے خلاف تھی۔ قومی اتحاد میں شامل خاکسار تحریک کے سربراہ خان محمد اشرف خان ایڈووکیٹ کا بیان ہے۔ "حکومت میں شامل ہونے سے پہلے جب اتحاد کی میٹنگ میں اس مسئلے پر غور ہوتا تھا تو مولانا مفتی صاحب مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ مارشل لاء کی حکومت میں شامل ہونا جہنم میں داخل ہونے کے برابر ہے"۔

مفتی صاحب کی قطعی رائے یہ تھی کہ مارشل لاء کی حکومت میں شمولیت اختیار نہ کی جائے مگر اس میں دو جماعتیں اندرون خانہ شمولیت کا فیصلہ کر چکی تھیں۔ اب ان حالات میں مفتی

صاحب کے لئے دو راستے تھے کہ یا تو اتحاد کو بچاتے ہوئے بادل ناخواستہ حکومت میں شامل ہو جائیں اور یا اتحاد کے شیرازہ کو بکھرتا ہوا اس کو دفن کر کے اس کا فاتحہ پڑھے۔ مفتی صاحب نے اتحاد کو بچانے کو ترجیح دی۔ اور فرمایا کہ "میں اتحاد کو بچانے کی خاطر یہ کڑوی گولی نگل رہا ہوں"۔

خان محمد اشرف خان اس کی تفصیل کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مئی 1978ء میں قومی اتحاد نے فیصلہ کیا کہ مارشل لاء کی وزارتیں قبول نہیں کریں گے۔ اس پر صدر ضیاء الحق کے ساتھ مذاکرات کا سلسلہ ختم ہو گیا جون میں صدر ضیاء الحق نے ایک بیان میں اتحاد کے رہنماؤں پر بڑی شدید تنقید بھی کی یہاں تک کہا گیا کہ یہ لوگ عوام کے نمائندے نہیں ہیں یہ قیام پاکستان کے مخالفین ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس کے بعد مسلم لیگ نے اپنے طور پر حکومت میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس پر غور کرنے کے لئے غالباً قومی اتحاد کا اجلاس 19 ر جولائی 1978ء کو کراچی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں میں نے مفتی صاحب سے کہا کہ اگر مسلم لیگ والے آپ کا کہا نہیں مانتے تو آپ مسلم لیگ کو قومی اتحاد سے نکال دیں اس پر مفتی صاحب نے فرمایا بھائی! ایک جماعت نہیں دو جماعتوں کو نکالنا پڑے گا۔ جماعت اسلامی والے بھی حکومت میں جا رہے ہیں۔ بہر حال اس اجلاس میں فیصلہ یہی ہوا کہ ہمیں حکومت میں شامل نہیں ہونا چاہئے۔ [خان اشرف خان۔ ہفت روزہ "ندا" لاہور۔ 12 ر جولائی تا 18 ر جولائی 1978ء]

ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت مفتی صاحب مارشل لاء کی حکومت میں شمولیت کے حق میں نہیں تھے مگر اتحاد کو بچانا بھی ضروری تھا۔ کہ قوم کی تمام تر توقعات کا مرکز قومی اتحاد تھا۔ ادھر بعض جماعتوں کی حکومت میں شمولیت کے فیصلے نے حالات کو اور زیادہ پیچیدہ بنا دیا تھا۔ اس لئے مفتی صاحب کو بادل ناخواستہ اگرچہ شمولیت کا فیصلہ بقول ان کے کڑوی گولی نگلنا پڑی مگر اس کے لئے آپ نے حکومت میں شمولیت کے مقاصد بھی متعین کئے تھے اور شرائط بھی رکھ دیئے تھے۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور میں ہے۔

قائد جمعیت علماء اسلام حضرت مولانا مفتی محمود نے گزشتہ روز مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ گیٹ لاہور میں جمعیت کے مرکزی و صوبائی عہدیداروں کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔ قائد جمعیت نے عشائیہ کے شرکاء کو ملک کی تازہ ترین صورت حال کے بارے میں پاکستان قومی اتحاد کے نقطۂ نظر اور قومی حکومت کے سلسلے میں حکومت سے بات چیت کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ آپ نے این ڈی پی کے طرز عمل اور اس سے متعلق امور پر بھی روشنی ڈالی۔ اس موقع پر جمعیت کے مرکزی اور صوبائی عہدیداروں نے مختلف مسائل پر باہمی تبادلۂ خیالات کیا۔ عشائیہ کے بعد اخباری نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے قائد جمعیت مولانا مفتی محمود نے کہا کہ

ہم اصولی طور پر قومی حکومت میں شمولیت کو درست نہ سمجھتے ہوئے بھی ملک و قوم کے وسیع تر مفاد کے لئے اس کے لئے تیار ہیں اور ہم نے مارشل لاء حکومت کو اپنی پوزیشن سے آگاہ کرتے ہوئے بتا دیا ہے کہ اگر وہ اس صورت حال میں ضروری سمجھتے ہیں تو ہم ان کے ساتھ تعاون کے لئے تیار ہیں۔ انہوں نے واضح طور پر ایک بار پھر اس امر کا اعادہ کیا کہ قومی اتحاد کو اقتدار کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ سابق وزیر اعظم بھٹو نے ہمیں اقتدار کی پیش کش کی تھی اور مذاکرات کے دوران مجھے ڈپٹی وزیر اعظم کا عہدہ پیش کیا تھا۔ لیکن ہم نے اصول کی خاطر مسلسل اقتدار کو ٹھکرایا۔ ہمارے دل میں رتی بھر بھی اقتدار کی گنجائش نہیں ہے۔ انہوں کہا بعض افراد بلاوجہ جمہوریت کے چیمپئن بنتے ہیں ہم انتہائی مجبوری کے تحت قومی حکومت کی تجویز پر غور کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا یہ ملک ہمارا ہے ہم مارشل لاء کی حکومت سے ملک کی سالمیت و استحکام کے لئے تعاون کریں گے تاہم انہوں نے کہا کہ ہم اس اطمینان کے بغیر قومی حکومت میں شامل نہیں ہوں گے کہ ہماری شمولیت سے کوئی مفید کام ہو سکے گا۔ انہوں کہا کہ ہماری خواہش یہ ہے کہ ملک میں جلد انتخابات منعقد ہوں۔ جمہوریت بحال کی جائے اور اسلامی نظام نافذ ہو۔ [ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور ج 21۔ ش 18۔ 5/ مئی 1978ء]

اس سلسلے میں حضرت مفتی صاحب کی قومی حکومت میں شمولیت کے فیصلے کے بارے میں جماعت اسلامی کے رہنما اور پاکستان قومی اتحاد کے سیکرٹری جنرل پروفیسر غفور احمد نے لکھا ہے۔

مفتی صاحب اتحاد کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ اس کے لئے اپنی رائے کے برعکس بھی فیصلہ ماننے سے انہیں انکار نہیں ہوتا تھا۔ شخصی طور پر وہ مارشل لاء کے تحت وزارتیں قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھے مگر جب ایک جماعت نے اتحاد سے بالا بالا وزارتیں قبول کر لیں تو پھر اتحاد کو قائم رکھنے کے لئے انہوں نے بھی حالات کا از سر نو جائزہ لیا اور اتحاد کو بچا لیا۔ [ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 92]

یہی بات جناب حمزہ ایم۔ اے نے بھی لکھی ہے۔ جناب حمزہ صاحب جناب نوابزادہ نصر اللہ خان کی پارٹی عوامی لیگ کے اہم رہنما تھے۔ ضیاء الحق کے دور میں قومی حکومت میں بطور وفاقی وزیر شامل رہے۔ وہ کہتے ہیں۔

1977ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد قومی اتحاد اور حکومت کے درمیان اور حکومت میں شرکت کے سوال پر طویل مذاکرات ہوئے وہ آخری وقت تک حکومت میں شرکت کے خلاف تھے۔ جب شرائط پر حکومت میں شرکت کا فیصلہ کیا گیا وہ اس وقت بھی ذاتی طور پر اس فیصلے کے حق میں نہ تھے لیکن اکثریت کی رائے پر صادر کرنے میں تامل نہیں کیا۔ عہدہ اور مسند کے بھوکے افراد کو سخت ناپسند کرتے۔ عہدوں کے لئے تقویٰ، پرہیزگاری اور بے غرضی کو فیصلہ کن اہمیت دیتے۔ وہ فرمایا کرتے تھے ہماری سیاست دین کے تابع ہے قومی اتحاد کے مرکزی حکومت میں شرکت کے فیصلے کے بعد جب انہوں نے محسوس کیا کہ مارشل لاء انتظامیہ وعدہ ایفاء نہیں کر رہی تو انہوں نے پہلی فرصت میں حکومت کو خیرباد کہنے پر اصرار کیا۔ حمزہ ایم۔ اے۔ [ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 197]

اگرچہ مارشل لاء کے زیر سایہ قومی حکومت میں شمولیت سے متعلق آپ کی رائے مخالفانہ تھی مگر بادل ناخواستہ جب آپ نے اور آپ کی جماعت نے یہ فیصلہ کر ہی لیا۔ تو اس

شمولیت سے ان کے اغراض و اہداف کیا تھے۔ ان کی توقعات کیا تھیں۔ وہ خود اس کا بیان کرتے ہیں۔ جو انہوں نے جمعیت علماء اسلام کی مرکزی مجلس شوریٰ کے سامنے مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ گیٹ لاہور کے اجلاس میں دیا۔

> سیاسی عمل، جمہوری جدوجہد اور انتخابات ہمارا مقصد نہیں بلکہ ذریعہ ہیں جن کے ذریعہ ہم اسلام کی منزل حاصل کرنا چاہتے ہیں اس لئے ہمیں اگر اس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ مل جائے اور ہم اس راستے سے منزل تک جلدی پہنچ سکتے ہیں تو ہمیں اسے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے اور ہم نے اپنے سیاسی کیریئر کو داؤ پر لگاتے ہوئے مارشل لاء حکومت میں اس لئے شمولیت اختیار کی ہے کہ اگر اس راستے سے اسلام نافذ ہو سکتا ہے تو اس کو بھی آزمایا جائے چنانچہ ضیاء حکومت کی طرف سے حدود آرڈیننس، وفاقی شرعی عدالت اور دیگر امور کے بارے میں چند اسلامی اصلاحات کے نفاذ پر مفتی صاحب نے نہ صرف ان اقدامات کی حمایت میں لاہور میں بہت بڑے جلوس کی قیادت کی بلکہ ملک بھر میں بیسیوں اجتماعات میں لاکھوں کے مجمع کے سامنے ان اقدامات کا دفاع کیا۔ [مولانا زاہد الراشدی۔ تذکار محمود، ص 166، 167]

اس قسم کا اظہار خیال وہ ایک سوال کے جواب میں کرتے ہیں۔ جب ان سے سوال کیا گیا کہ قومی اتحاد، جمہوریت کی علمبردار ہے مگر مارشل لاء کے دوران اس کا شریک اقتدار ہونا کچھ عجیب سی بات لگتی ہے۔ تو آپ نے اس سوال کے جواب میں فرمایا۔

> وزارت میں ہماری شمولیت، جمہوریت اور اسلام کے لئے ہے آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اگر قومی اتحاد اپنے وزراء حکومت میں نہ بھیجتا تو شاید اسلامی نظام کے نفاذ کا آغاز اس قدر جلدی نہ ہوتا۔ پھر ہمارے وزیر جمہوریت کے سلسلے میں ایک قابل اعتماد ضمانت کی حیثیت رکھتے ہیں ہم ایک انتہائی نازک دور سے گزر رہے ہیں پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا اس لئے اس کی بقا و سالمیت کی ضمانت بھی اسلام کو خوش دلی سے اپنانے ہی سے مل سکتی ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ گزشتہ تیس سال کے عرصہ میں ہم اسلام کے

> قریب ہونے کی بجائے دور ہوتے چلے گئے ہیں۔ اگر اس پس منظر میں موجودہ اقدامات کا جائزہ لیا جائے تو یہ اطمینان کا باعث بنتے ہیں تاہم میں بیوروکریسی کی طرف سے قطعی مطمئن نہیں ہوں۔ بعض افسر قدم قدم پر مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ہماری بہر حال دلی آرزو یہ ہے کہ پاکستان حقیقی معنوں میں ایک اسلامی اور فلاحی مملکت بن جائے۔ [روزنامہ "سیادت" بہاولپور بحوالہ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 246]

ایک اور انٹرویو میں جو ان سے صحافی جناب مجیب الرحمٰن شامی صاحب نے لیا تھا۔ مفتی صاحب نے قومی حکومت میں شمولیت کی وجوہات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ سوال و جواب مندرجہ ذیل ہیں۔

سوال: مفتی صاحب پاکستان قومی اتحاد نے مارشل لاء کے تحت حکومت بنانے کا فیصلہ کیوں کیا؟ آپ کے "دوست" الزام لگاتے ہیں کہ یہ کرسی سے محبت کا نتیجہ ہے آپ نے عوام کے مفاد سے غداری کی ہے۔ اور اب قومی اتحاد، قومی اتحاد نہیں درباری پارٹی بن گیا ہے؟ کیا اس الزام میں کوئی صداقت موجود ہے؟

جواب: میں نے یہ بات ہمیشہ کہی ہے کہ جمہوریت کا دعویٰ رکھنے والی کوئی جماعت مارشل لاء کے تحت کسی حکومت میں شامل نہیں ہو سکتی اور آج بھی یہی کہتا ہوں۔ یہ طے شدہ مسئلہ ہے اور ایک ایسا اصول جس کی صحت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ بعض اوقات ایسی صورت پیش ہو جاتی ہے کہ معاملات کو خالصتاً کتابی نظریات کے حوالے سے نہیں عملی حقائق کی روشنی میں دیکھنا پڑتا ہے اسے ایک چھوٹی سی مثال سے سمجھئے۔ کسی کے گھر میں اجازت کے بغیر داخل ہونا قانونی، اخلاقی اور معاشرتی اقدار کے یکسر خلاف ہے۔ لیکن اگر کسی مکان میں آگ لگ جائے تو آپ پانی کی بالٹی لے کر باہر کھڑے صاحب خانہ سے اجازت مانگتے رہیں گے یا آگے بڑھ کر آگ بجھانے کے لئے سرگرم ہوں گے؟ اگر آپ آگ میں گھرے ہوئے اہل خانہ کی اجازت کے لئے پکارتے رہیں تو آپ کی آواز ان تک نہیں پہنچے گی اور وہ جل کر بھسم ہو جائیں گے کیا کوئی صحیح العقل

ایسے عالم میں پولیس نے بغیر اجازت مکان میں داخل ہونے والے پر الزام توڑ سکتا ہے اسے بد اخلاق قرار دے سکتا ہے اسے اصول شکنی کا مرتکب قرار دے سکتا ہے اس شخص کی تو تعریف ہوگی اسے شاباش ملے گی اور اس کی کاوش قابل صد مبارک تصور کی جائے گی کہ اس نے آگ بجھائی اور آگ میں گھرے ہوؤں کی جان بچائی۔

پاکستان کو بھی آج ایسے ہی حالات کا سامنا ہے مسائل کی آگ بھڑک رہی ہے مارشل لاء اور عوام کے درمیان کوئی رابطہ استوار نہیں ہو سکا جو دور کر سکے وہ کل پرزے جو بھٹو کے عہد میں قانون اور اخلاق کی دھجیاں بکھیرتے رہے وہ ابھی تک موجود ہیں اور حالات کو اور بھی آگ دکھا رہے ہیں ایسے عالم میں اہل سیاست کو لازم ہو گیا کہ وہ آگے بڑھ کر مارشل لاء کا ہاتھ بٹائیں اور انتظامی ذمہ داریوں میں اس طرح شریک ہوں کہ عوام کے مسائل کم ہوں۔ عام شکایات کی روک تھام ہو۔ اسلامی اقدار کو فروغ ہو اور منتخب حکومت کے قیام کی راہ ہموار ہو جائے۔ پاکستان قومی اتحاد نے حکومت کی ذمہ داری سنبھال کر بڑی قربانی دی ہے۔ حالات کو سنوارنے کا چیلنج قبول کیا ہے اسلامی نظام کے قیام کا راستہ کھولا ہے اور انتخابات کو درپیش خطرات کو دور کرنے کی کوشش کی ہے اتحاد بھی ذمہ داری سے فرار کی راہ اختیار کر کے تند و تیز بیانات دینے اور اپوزیشن کے منصب پر خود کو فائز کرنے کا کام بآسانی کر سکتا تھا۔ لیکن ہم نے یہ راستہ اختیار نہیں کیا۔ [مجیب الرحمن شامی۔ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 422-423]

حضرت مفتی صاحب کے اجلاسوں سے ان بیانات سے اور اخباری نمائندوں کو انٹرویوز سے قومی حکومت میں شمولیت کے وجوہات و اسباب اور یہ کہ قومی حکومت میں شمولیت کے مقاصد و اہداف کیا تھے واضح ہو جاتے ہیں۔ کہ انہوں نے اس وقت کے ملکی حالات کے پیش نظر سیاسی نقطہ نظر سے یہ ضروری سمجھا کہ وہ یہ ذمہ داری سنبھالیں۔ اگرچہ ذاتی طور پر وہ ایک جمہوری ذہن کے مالک تھے اور ان کی جماعت کی ساری جدوجہد جمہوری حقوق کی بحالی کے لئے تھی۔ مگر یہ سب کچھ آپ نے اس لئے کیا کہ اس وقت یہ حالات کا تقاضا تھا۔ پھر یہ ان کی انفرادی

رائے نہ تھی۔ ان کی اپنی جماعت کی منظوری بھی تھی۔ ساتھ ساتھ دیگر جمہوری جماعتوں اور پارٹیوں کے بھی یہی موقف تھے۔ پھر مفتی صاحب نے خود اس میں کوئی عہدہ قبول نہیں کیا بلکہ تین وزارتیں حاصل کیں۔ صوبہ سرحد سے جناب حاجی فقیر محمد خان، بلوچستان سے جناب حاجی زمان خان اچکزئی اور صوبہ سندھ سے جناب میر صحیح صادق خان کھوسو کو کابینہ میں شمولیت کی اجازت دی۔ ابتداء میں تو صدر ضیاء الحق نے کچھ اصلاحات کیں۔ کابینہ کی منظوری سے کچھ اسلامی اقدامات کئے۔ مگر بعد میں جب قومی اتحاد کے وزراء نے یہ محسوس کیا کہ وزراء با اختیار نہیں ہیں۔ اور ان کی وزارتوں میں مداخلت کی جا رہی ہے۔ اسی طرح اسلامی نظام سے متعلق بعض اصلاحات میں صدر ضیاء الحق عدم دلچسپی دکھا رہے ہیں۔ تو چند مہینوں بعد قومی اتحاد نے اپنے وزراء کو واپس بلا لیا۔ اور انہوں نے استعفیٰ دے کر حکومت سے علیحدگی اختیار کی۔

اس ساری صورت حال کے واضح ہونے کے بعد مفتی صاحب پر یہ الزام لگانا کہ اس نے حکومت میں شمولیت کر کے اپنے جمہوریت پسندی کی تردید کر دی۔ ایک غلط الزام ہے۔ اور اس کی کچھ حقیقت باقی نہیں رہتی۔

جمعیت نیپ معاہدہ پر مولانا غلام غوث ہزاروی کے اعتراضات اور جمعیۃ علماء اسلام سے ان کی علیحدگی

صدر یحییٰ خان کے دور میں 7 دسمبر 1970ء کو پاکستان میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں مشرقی پاکستان میں مکمل اکثریت شیخ مجیب الرحمن کی عوامی لیگ کو حاصل ہوئی جبکہ مغربی پاکستان میں جناب ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی اکثریت سے کامیاب ہوئی۔ بعد میں ون یونٹ کے اختتام کے بعد پنجاب و سندھ میں پیپلز پارٹی کو، جبکہ سرحد و بلوچستان میں کوئی بھی جماعت اکثریت حاصل نہ کر سکی۔ اس لحاظ سے قومی اسمبلی اور پنجاب و سندھ اسمبلی میں پیپلز

پارٹی کو اکثریت حاصل ہوئی جس کے بل بوتے پر وہاں حکومتیں بنانا ان کا آئینی و قانونی حق تھا۔ جو کہ اس نے بنادیں۔ صوبہ سرحد و بلوچستان میں حکومت بنانے کے لئے پارٹیوں کے اندر گفت و شنید اور مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا۔ جو بالآخر پیپلز پارٹی، جمعیۃ علماء اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی کے درمیان معاہدہ پر منتج ہوا۔ اس کو سہ فریقی معاہدہ کہا جانے لگا۔ مگر بعد میں معاہدہ کی ایک شق پر اختلاف کی وجہ سے پیپلز پارٹی اس سے علیحدہ ہوئی۔ جبکہ جمعیت نیپ کا معاہدہ برقرار رہا۔ یہ معاہدہ جمعیت علماء اسلام کی شرائط کی بنیاد پر ہوا تھا۔ جو کہ مندرجہ ذیل تھے۔

(أ) اشتراک کرنے والی پارٹی، مرکزی اسمبلی (قومی اسمبلی) میں آئین کے مسئلہ پر جمعیۃ علماء اسلام کا ساتھ دے گی۔

(ب) صوبائی قوانین، اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لئے علماء اور ماہرین قانون کے ایک بورڈ کی حمایت کی جائے گی۔

(ج) اسلامی تعلیمات رائج کرنے کے لئے ایک بورڈ قائم کیا جائے گا (طلبہ اور عوامی تربیت کا پروگرام اس میں داخل ہے)

(د) اسلامی قوانین کے مطابق جاگیرداری اور سرمایہ داری کے ذریعہ ہونے والے استحصال کے خاتمہ کے لئے تجاویز پیش کرنے کے لئے ایک بورڈ قائم کرنے کی حمایت کی جائے گی۔

(ہ) صوبہ میں پانی، بجلی اور جنگلات کے وسائل سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر عوامی حالت بہتر بنائی جائے گی۔

(و) ایک چھٹی شرط بھی تھی کہ کابینہ میں پالیسی جمعیۃ علماء اسلام کے ہاتھوں میں ہوگی اور اسمبلی میں پارلیمانی لیڈر، اور وزیر اعلیٰ جمعیۃ علماء اسلام کا ہوگا۔

شروع کے پانچ نکات پر نیپ اور مسلم لیگ (قیوم) کے ساتھ مذاکرات کا سلسلہ چلتا رہا۔ لیکن جب دونوں پارٹیوں نے جمعیت کے شرائط پر آمادگی ظاہر کردی۔ تو جمعیۃ نے چھٹے شرط کا

اضافہ کر دیا۔ جس کے ماننے سے مسلم لیگ (قیوم) نے معذرت کردی۔ جبکہ نیپ نے اس شرط کو بھی تسلیم کر لیا۔ اور یوں جمعیۃ نیپ کے اشتراک سے صوبہ سرحد میں وزارت سازی کا راستہ ہموار ہوا۔ اور پھر اسی قسم کے تعاون کا معاہدہ بلوچستان میں بھی جمعیت نیپ کے درمیان ہوا۔ اور وہاں بھی ان دونوں جماعتوں کے اشتراک سے حکومت بنانے کے لئے حالات سازگار بنے۔ اس طرح مرکز، پنجاب اور سندھ میں پیپلز پارٹی کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ جبکہ سرحد و بلوچستان میں جمعیۃ نیپ کی مشترک حکومتیں بنیں۔ دونوں صوبوں کے گورنر نیپ سے تھے جبکہ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ مولانا مفتی محمود صاحبؒ جبکہ صوبہ بلوچستان کے وزیر اعلیٰ نیپ کے رہنما عطاء اللہ خان مینگل منتخب ہوئے۔ صوبہ سرحد اسمبلی میں جمعیۃ علماء اسلام کے پارلیمانی لیڈر کے انتخاب کے لئے 5 / اپریل 1972ء کو پشاور میں جمعیۃ کی مجلس شوریٰ کا ایک اجلاس منعقد ہوا تھا۔ جس میں مولانا مفتی محمود کو صوبائی اسمبلی میں پارلیمانی لیڈر منتخب کیا گیا تھا۔ یہ ایک نہایت اہم اجلاس تھا۔ لیکن اس میں ہزاروی صاحبؒ نے شرکت نہیں کی تھی۔

جیسے کہ اوپر مذکور ہوا۔ شروع میں یہ ایک سہ فریقی معاہدہ تھا۔ پیپلز پارٹی بھی ایک فریق تھی۔ مگر معاہدہ کی ایک شق پر اختلاف رائے ہوا۔ ہوا یوں کہ پیپلز پارٹی کی حکومت قومی اسمبلی سے مارشل لاء کے مزید جاری رہنے کا فیصلہ لینا چاہتی تھی۔ جبکہ جمعیت و نیپ اس کے خلاف تھے۔ ان کا موقف تھا کہ اس قسم کی قرارداد کو اسمبلی کے فلور پر پیش کرنے کے ہم معاہدہ کی رو سے پابند تھے۔ مگر ہم اس امر کے پابند نہیں ہیں کہ ہم اس کے حق میں اپنا ووٹ بھی استعمال کریں۔ جبکہ پیپلز پارٹی کی رائے یہ تھی کہ معاہدہ میں شریک ہونے کی وجہ سے تمہارا ووٹ بھی حکومتی موقف کی تائید میں استعمال ہونا چاہیئے۔ آخر کار یہ معاہدہ عمل درآمد سے پہلے ہی ٹوٹ گیا۔ ابھی چند ہی دن گزرے تھے۔ کہ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے حالات کے دباؤ سے مجبور ہو کر جمعیت نیپ کے رہنماؤں کو ایک دفعہ پھر مذاکرات کی دعوت دی۔ جو کہ ایک معاہدے پر منتج ہوئے۔ اس

معاہدے کی رو سے جمعیت و نیپ مرکزی حکومت میں شامل ہونے کے پابند تھے اور نہ ہی پیپلز پارٹی کا صوبائی حکومتوں میں شمولیت کا کوئی حق ہوگا البتہ جمعیت و نیپ کو صوبوں میں حکومت سازی کا موقع ضرور دیا جائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ ½ 9 ماہ تک یہ صوبائی حکومتیں اپنا اپنا کام کرتی رہیں۔ اگرچہ مرکز کی طرف سے بار بار مداخلت کے واقعات رونما ہوئے۔ ان کے سامنے رکاوٹیں کھڑی کی گئیں (جس کا ذکر وزارت سے استعفیٰ کے ضمن میں کیا جائے گا) مگر یہ حکومتیں عوامی خواہشات کے عین مطابق عوامی مسائل کے لئے کوشاں رہیں۔ خان عبدالقیوم خان کی شروع ہی سے یہ کوشش تھی کہ ان حکومتوں کو ناکام کر دیا جائے اور خاص کر جب وہ مرکز میں وزیر داخلہ بنے۔ پھر تو ان کی تمام سرگرمیاں ان صوبائی حکومتوں کے خلاف وقف ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اسی معاہدے میں جمعیۃ علماء اسلام کے شریک رہنما مولانا غلام غوث ہزارویؒ ایم این اے نے بھی معاہدے کی مخالفت شروع کر دی۔ اور پیپلز پارٹی کی ہمنوائی میں حکومتی موقف کو صحیح قرار دیتے رہے۔ اور جماعتی موقف کو مسترد کرتے رہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ مرکزی حکومت کی طرف سے جمعیت نیپ کو بار بار مرکز میں دو تین وزارتوں کی پیشکش بھی کی جاتی رہی۔ مولانا غلام غوث ہزاروی کی خواہش تھی کہ نیپ جمعیت کو یہ پیشکش قبول کر لینی چاہئے۔ اور پیپلز پارٹی کے ساتھ اقتدار میں شریک ہونا چاہئے مگر مرکزی شوریٰ نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا تھا۔ اور وہ اس سلسلے میں اتنے آگے بڑھ گئے۔ کہ اس مذکورہ بالا فیصلوں کے علاوہ دیگر معاملات میں بھی جماعتی موقف سے ہٹ کر اپنی ذاتی رائے کو صحیح اور برحق سمجھتے رہے۔

اس دوران ایک اور جماعتی فیصلہ ہوا۔ جو مولانا ہزارویؒ کی ذاتی رائے کے خلاف تھا۔ جس سے موجودہ اختلاف سے پیدا شدہ خلیج کو اور وسعت ملی۔ اور وہ جو کہاوت ہے کہ "جلتی ہوئی آگ پر تیل ڈالنے" کا کام کیا۔ حضرت مولانا مفتی محمود جمعیۃ علماء اسلام کے مرکزی جنرل سیکرٹری تھے۔ جب ان کا بحیثیت وزیر اعلیٰ انتخاب عمل میں آیا۔ تو دونوں عہدوں پر کام کرنا، ان کی ذمہ

داریوں کو نبھانا از حد مشکل تھا۔ بلکہ جماعتی ذمہ داریوں کے لئے وقت نکالنا ہی ان کے لئے مشکل تھا۔ جمعیۃ علماء اسلام کی مرکزی مجلس شوریٰ کے فیصلے کی رو سے مفتی صاحب کو جماعتی عہدے سے استعفیٰ دینا پڑا۔ اور عبوری طور پر بحیثیت مرکزی ناظم کے مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے جمعیۃ علماء اسلام کے جنرل سیکرٹری کی ذمہ داری سنبھالی۔ 4/ ستمبر 1972ء مطابق 25/ رجب 1392ھ جمعیۃ علماء اسلام کی مرکزی مجلس عمومی کا اجلاس ملتان میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں مولانا غلام غوث ہزاروی اور مولانا عبدالحکیم (راولپنڈی والے) نے شرکت نہیں کی تھی۔ اس اجلاس نے مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس کے اس فیصلے کو منسوخ کر دیا جس کی رو سے حضرت ہزاروی صاحب جنرل سیکرٹری بنا دیئے گئے تھے۔ اور مفتی محمود کو سبکدوش کر دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ مرکزی دفتر ملتان سے لاہور منتقل کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا تھا۔ جبکہ مولانا غلام غوث ہزارویؒ کو مرکزی ناظم کے عہدہ پر برقرار رکھا گیا۔

29/ ستمبر 1972ء کو ترجمان اسلام میں مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے درج ذیل وضاحت شائع کرائی۔

میں کمزور اور بیمار بھی رہتا ہوں۔ جمعیۃ علماء اسلام نے مجھ پر بعض ذمہ داریاں ڈالی ہیں جن کی تکمیل میرے لئے مشکل ہوتی جا رہی ہے۔ مگر دوستوں کے خطوط بعض معمولی بعض غیر معمولی طویل ہوتے ہیں جن کے پڑھنے سے میں معذور ہوں۔ اس لئے سب کی خدمت میں عرض ہے کہ تمام جماعتی ڈاک اور مشورے محترم المقام حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مدظلہ کے نام بھیجا کریں چاہے پشاور کے پتہ پر چاہے دفتر جمعیۃ علماء اسلام چوک رنگ محل لاہور کے پتہ پر۔ اگر موخر الذکر پتہ پر ڈاک آئے گی تو دفتر والے وہ ڈاک حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں فوراً روانہ کر دیں گے۔ حضرت مفتی صاحب مدظلہ جمعیۃ علماء اسلام کل پاکستان جمعیۃ علماء اسلام کے جنرل سیکرٹری (ناظم عمومی) ہیں اور ان کی ذات جمعیۃ کے وقار اور حرمت کی نشانی ہے پھر وہ جو کام میرے

سپرد کریں گے یا حضرت مولانا عبید الواحد صاحب (گوجرانوالہ والے، مرکزی ناظم دوم) کے سپرد کریں گے اس کی حتی الامکان تعمیل ہوگی۔ ہم دونوں جمعیۃ علماء اسلام کل پاکستان کے ناظم ہیں۔ ڈاک کے سوا بھی جمعیۃ کے مختلف کام وہی ہم میں تقسیم کریں گے۔ [بحوالہ عہد ساز قیادت۔ ص 177، 178]

بظاہر حضرت ہزارویؒ نے ترجمان اسلام کے ذریعہ یہ اعلان شائع کرایا جس میں آپ نے جمعیۃ علماء اسلام کے مرکزی مجلس عمومی کے فیصلے کو تسلیم کیا ہے۔ مگر ان کے ساتھی، اور ان کی جماعت کے صوبہ پنجاب کے جنرل سیکرٹری مولانا ضیاء القاسمی صاحب نے اس کو مولانا ہزاروی اور مولانا مفتی محمود کے باہمی اختلافات کی ایک بنیادی وجہ قرار دیا ہے۔ اور شاید ایسا ہو۔

حضرت مفتی صاحب کا وزارت سے استعفیٰ کو مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے خوب خوب اُچھالا۔ ان کو اس بات پر اعتراض تھا۔ کہ مفتی صاحب کے وزارت علیا سے استعفیٰ کا فیصلہ ذاتی تھا۔ ان پر لازم تھا کہ کم از کم مرکزی مجلس شوریٰ کا اجلاس طلب کیا جاتا۔ اور اس میں استعفیٰ کے وجوہات پر بحث کی جاتی۔ اور اس کی روشنی میں استعفیٰ یا عدم استعفیٰ کا فیصلہ اس سے لیا جاتا اور اس پر عمل کیا جاتا۔ جبکہ مفتی صاحب نے نیپ کی خاطر وزارت سے استعفیٰ دیا ہے۔

جبکہ حقیقت حال یہ ہے۔ کہ جماعتی زندگی میں بعض صورتیں ایسی پیش آجاتی ہیں جو فوری عمل درآمد اور فوری رد عمل کی متقاضی ہوتی ہیں۔ اس میں اتنا وقت نہیں ہوتا کہ سارے ملک سے شوریٰ کے ارکان کو بلا کر ان سے فیصلہ لیا جائے کیونکہ اس وقت تک پُلوں کے نیچے کافی پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ اس وقت بھی ایسی ہی صورت حال درپیش تھی۔ لیکن مفتی صاحب کے اس فوری اقدام (وزارت علیا سے استعفیٰ) کی توثیق کے لئے اس کے چند دن بعد لاہور میں 21 ر فروری 1973ء کو جمعیۃ علماء اسلام کی مرکزی اور چاروں صوبائی مجالس شوریٰ کا ہنگامی اجلاس بلایا گیا۔ جس نے بالاتفاق مرکزی حکومت کے اقدام کو غلط اور مفتی صاحب کا حکومت صوبہ سرحد

سے استعفیٰ کو جرأت مندانہ اور صحیح قدم قرار دیا۔ اس اجلاس میں مولانا غلام غوث ہزارویؒ اور مولانا عبد الحکیم نے بھی شرکت کی۔ اس اجلاس میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے جو تقریریں کیں وہ ریکارڈ کے طور پر محفوظ ہیں۔ ذیل میں مولانا غلام غوث ہزاروی کی تقریر کا اقتباس دیا جاتا ہے وہ یہ ہے۔

آپ نے مولانا مفتی محمود کی کابینہ کے استعفیٰ کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ اس وقت نیپ سے معاہدہ توڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ نے کہا میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ مرکز نے سرحد و بلوچستان کی حکومتوں کو ناکام بنانے کی پوری کوشش کی ہے اور مشکلات پیدا کی ہیں۔ آپ نے کہا کہ ہمارا اتحاد وزارت کی خاطر نہیں اُصولوں کی خاطر ہے جب تک دوسرا فریق ان اصولوں میں ہمارے ساتھ ہے ہم اتحاد کو کس طرح ختم کر سکتے ہیں۔ [ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ یکم مارچ 1973ء۔ مدیر: مولانا غلام غوث ہزاروی]

ان حالات میں اس وقت بھی جمعیۃ علماء اسلام کے مخلص کارکن پریشانی سے دوچار تھے۔ ان کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہزاروی صاحب کا موقف کبھی کچھ کبھی کچھ ہوا کرتا تھا۔ بہت سے جماعتی فیصلے ایسے ہیں جس کی وہ وقتی طور پر تائید و توثیق کرتے اور پھر دوسرے وقت اس کی تردید و مخالفت کرتے۔ اکثر الزامات، اعتراضات انہوں نے اس وقت اُٹھائے جب جماعت سے انہوں نے علیحدگی اختیار کر لی۔ اور پھر بعد میں جماعت نے بھی ان کی علیحدگی کا فیصلہ کیا۔ ان کا اختلاف جماعتی فیصلوں سے تھا۔ جبکہ وہ اور ان کے ساتھی اس کو ہزاروی، مفتی اختلاف قرار دیتے رہے۔

قارئین کرام! راقم الحروف یہاں یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہے کہ یہ باتیں اور واقعات بیان کرتے وقت گویا دل پر پتھر رکھے ہوئے ہے۔ بزرگوں کا ادب اور ان کا احترام ہی اپنے لئے بہت بڑا سرمایہ اور ذخیرۂ آخرت سمجھتا ہے۔ راقم الحروف کبھی یہ جسارت نہ کرتا۔ اگر

اس سلسلے میں بعض مخلص ساتھیوں کا اصرار بھی ہوتا اور ان کا یہ تقاضا ہوتا کہ چونکہ حضرت مفتی صاحب اپنی حیات میں کبھی بھی ہزاروی صاحب کے الزامات اور اعتراضات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے اور نہ ہی ان کا جواب دیتے تھے۔ بلکہ آپ ہمیشہ اپنے ساتھیوں کو بھی اس سے منع فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ جب ہفت روزہ "چٹان" لاہور کے نمائندہ گلو از رضا نے ہزاروی کے اختلافات اور ان کی طرف سے سنگین الزامات کے بارے میں پوچھا تو مفتی صاحب نے جواب فرمایا۔

> میں "مولانا" کی باتوں کا کبھی جواب نہیں دیا کرتا۔ بلکہ میں اسے وقت ضائع کرنے کے برابر سمجھتا ہوں۔ میں اپنی طاقت صرف ایک محاذ پر صرف کرنا چاہتا ہوں۔ دوسرے محاذ پر اپنی طاقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ [بحوالہ ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص 44]

اس لئے جب آپ (راقم الحروف) نے حضرت مفتی صاحب کی خدمات کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اور آپ نے ان کے سیاسی موقف پر اعتراضات اور آپ پر الزامات اور ان کے جوابات کو اپنی تالیف میں شامل کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ تو ان باتوں اور واقعات کو ضرور زیر بحث لایا جائے۔ تاکہ ان تاریخی واقعات سے جماعتی کارکن کو واقفیت حاصل ہو۔ اور آئندہ کے لئے ایسے صورت حال میں فیصلہ کرنے میں ان کو رہنمائی ملے۔

جمعیۃ سے علیحدگی کے بعد مولانا ہزارویؒ نے مفتی صاحبؒ پر یہ بھی الزام لگایا۔ کہ وہ ملک دشمن ہے اور نیپ کی حمایت میں وہ ملک پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتا ہے، اور وہ پختونستان کا حامی ہے وغیرہ وغیرہ۔ عجیب بات ہے کہ دیرینہ رفاقت میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی وہ مفتی صاحبؒ کی طرف ایسی کسی الزام کی نسبت کرتے ہیں۔ لیکن جونہی جماعتی فیصلوں پر ذاتی فیصلوں کو ترجیح دینے کی وجہ سے پہلے وہ جماعت سے علیحدگی کا فیصلہ کرتے ہیں۔

مجبوراً جماعت بھی ان سے لاتعلقی کا فیصلہ کرتی ہے۔ اس کے بعد ان پر یہ منکشف ہو جاتا ہے کہ مفتی محمود وطن دشمن، ملک دشمن اور پختونستان کا حامی ہے۔ مفتی صاحب نے جیسے کہ اس سے قبل مذکور ہو چکا ہے۔ ان کے الزامات کے جواب دینے کی کبھی کوشش نہیں کی مگر جب ہزاروی صاحب کے اس الزام کے پیچھے بھٹو حکومت کے اشارے معلوم ہوئے۔ اور یہ کہ یہ سب الزامات حکومت کی پشت پناہی کی وجہ سے لگائے جارہے ہیں۔ تو مفتی صاحب نے اس الزام کا مدلل جواب دیا۔ آپ نے وزارت علیا کے دوران کراچی اور بلوچستان کا دورہ کیا اور بے شمار عام جلسوں سے خطاب فرمایا۔ 28، 29 ستمبر 1972ء کو آپ نے لائل پور (فیصل آباد) سرگودھا اور جھنگ کا دورہ کیا۔ اس دورہ میں آپ نے جو تقاریر کیں۔ ان کے اقتباسات "عہد ساز قیادت" کے حوالے سے مندرجہ ذیل ہیں۔ علیحدگی کے الزامات کے جواب میں وہ فرماتے ہیں۔

> صوبہ سرحد اور بلوچستان کے عوام کے خلاف سازشیں کی جارہی ہیں اور ان پر بھی یہی الزام لگایا جارہا ہے جو مشرقی پاکستان کے عوام کے خلاف لگایا جاتا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ صوبہ سرحد اور بلوچستان کے عوام پاکستان کی سالمیت، استحکام اور وحدت کے قائل ہیں۔ لیکن بعض اقتدار کے بھوکے چاروں صوبوں کے درمیان افتراق و انتشار پھیلانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ لیکن میں واضح الفاظ میں بتا دینا چاہتا ہوں۔ کہ ہم کسی ایسی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے اور ہم ان کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔ مفتی صاحب نے فرمایا

> کہ صوبہ پنجاب آبادی اور رقبہ کے لحاظ سے پاکستان کا بڑا صوبہ ہے۔ جس کو میں جسم کہا کرتا ہوں۔ اور باقی صوبوں کو ہاتھ اور پاؤں کہا کرتا ہوں۔ اگر جسم سے ہاتھ پاؤں علیحدہ ہو جائیں کٹ جائیں تو جسم اگرچہ بیکار سی پھر بھی وہ زندہ رہتا ہے لیکن ہاتھ جو کٹ گئے وہ کبھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہم علیحدہ ہو جائیں یا علیحدہ کئے گئے تو پنجاب جو جسم ہے وہ ناکارہ ہی سہی زندہ رہے گا لیکن ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہم پاکستان سے علیحدہ ہو کر اپنی موت پر دستخط نہیں کرنا چاہتے۔

مفتی صاحب نے فرمایا۔

کہ سرحد کے عوام پنجاب کے عوام کا احترام کرتے ہیں، پنجاب کے عوام کو بھی چاہیے کہ وہ ان کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھائیں۔ جو لوگ مشرقی پاکستان کی طرح صوبہ سرحد اور بلوچستان کو علیحدہ کرنا چاہتے ہیں پنجاب کے عوام کو چاہیے کہ وہ ان کی کوششوں کو ناکام بنادیں۔ سب مل کر نعرہ لگائیں۔ پنجابی پٹھان بھائی بھائی۔

مفتی صاحب نے خود بھی یہ نعرہ لگوایا اور لوگوں نے بھائی بھائی کہہ کر جواب دیا۔ عوام بار بار تقریر میں یہ نعرہ لگاتے رہے۔ [عہد ساز قیادت۔ ص178، 179]

14 اگست 1972ء کو "یوم آزادی پاکستان" کے سلسلے میں ریڈیو پاکستان پشاور سے مفتی صاحب کی نشری تقریر سے ایک اقتباس ملاحظہ فرماویں۔ جس سے ان کی حب الوطنی "اظہر من الشمس" کا پتہ دیتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

خدا کے فضل و کرم سے پاکستان ایک بار پھر ایک مضبوط طاقت بن کر عالمی سیاست میں اپنا کردار ادا کرنے کے لئے تیار ہے، پاکستان ہمارا ملک ہے اور ہمیں دن رات محنت کر کے اسے مضبوط سے مضبوط تر بنانا ہے۔ ملک کے چپے چپے کی زمین ہمارے لئے مقدس ہے۔ اور کسی کو بھی اجازت نہیں دیں گے کہ وہ ملک کے کسی بھی حصے کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی کوشش کرے۔ قومی اتحاد اور ملک کی سالمیت ہمارا نصب العین ہے اور ہم اس کا ہر قیمت پر تحفظ کریں گے۔ ["ترجمان اسلام" لاہور (مفتی محمود نمبر) ص528]

حضرت مفتی صاحب کی حب الوطنی کے جذبہ سے بھرپور ان بیانات اور اس سلسلے میں آپ کی جماعت جمعیۃ علماء اسلام کا موقف اور اس کی ملک و وطن کی یکجہتی، اتحاد اور وحدت و استحکام کے لئے قربانیوں کے باوجود یہ الزام لگانا کہ وہ ملک دشمن ہے۔ اور وہ ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتا ہے کتنا سنگین الزام ہے۔ لیکن جس کو مفادات کی محبت اور یا کسی کی عداوت اندھا کر دے وہ

حقائق سے بھی چشم پوشی کرتا ہے۔ لیکن اس میں جن پر الزام لگایا جاتا ہے ان کا کیا قصور ہے؟ قصور تو الزام لگانے والوں کا ہے۔ اگر کوئی اس کو قصوروار ٹھہراوے۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

چمگادڑ کو دن کو کچھ نظر نہ آنے کا الزام سورج کو تو نہیں دیا جا سکتا۔ قصور اس کا اپنا ہے سورج کا تو نہیں۔

مولانا ہزاروی کی ایک وجہ جماعت سے علیحدگی کی ایک وجہ مارچ 1973ء میں جمہوریت پسند جماعتوں کا اتحاد بھی بنا۔ جو بھٹو حکومت کے خلاف اپوزیشن جماعتوں کا اتحاد تھا۔ جس میں دیگر جماعتوں کے علاوہ نیپ اور جماعت اسلامی بھی تھی۔ جس پر مولانا غلام غوث ہزاروی صاحبؒ کو اعتراض تھا۔ اور یہ سب کچھ بھٹو صاحب اور ان کی حکومت کی حمایت میں ان کا حد سے تجاوز کی وجہ سے تھا۔ بالآخر وہ جمعیت سے کیا علیحدہ ہوئے۔ 1977ء میں انہوں نے سیاست سے بھی دست کشی اختیار کر لی۔ اور دست کشی کی ایسی کہ پھر اس کی جماعت بھی ہمیشہ کے لئے "نسیاً منسیا" ہو چکی۔

اس سلسلے میں راقم الحروف کا ایک آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا واقعہ ہے۔ راقم الحروف دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں زیر تعلیم تھا۔ یہ غالباً 1973ء کا واقعہ ہے۔ راقم الحروف، مولانا فضل الرحمن، مولانا عبد المالک شاہ اور مولانا محمود صاحب ایک ہی کمرہ کے رہائشی تھے۔ مولانا فضل الرحمن جب بھی پشاور یا اسلام آباد جاتے تھے۔ تو اکثر راقم الحروف آپ کا شریک سفر ہوتا تھا۔ اور یہ بھی حضرت مفتی صاحب کی ہدایت کے عین مطابق۔ ایک دفعہ جب ہم نے اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا تو دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے صدر المدرسین، استاذ الاساتذہ، عالم بے بدل حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب زروبی رحمۃ اللہ علیہ فاضل دیوبند نے بھی اسلام آباد جانے کی

خواہش کا اظہار فرمایا۔ ان کی خواہش تھی کہ قومی اسمبلی کے اجلاس کی کارروائی دیکھے۔ تو وہ بھی اس سفر میں ہمارے شریک رہے اور ہم نے یہ سعادت سمجھی کہ اس سفر میں اپنے استاد صاحب کی خدمت کا موقع ملے گا۔ راقم الحروف نے اس واقعہ کے ابتدائی حصے کو اپنے ایک مضمون میں جو کہ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحبؒ کے نام کی شہرت سے "صدر المدرسین" نامی کتاب میں بھی چھپی ہے۔ اس کتاب کو ان کے لائق و فائق صاحبزادے مولانا محمد ابراہیم فانی مدرس دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک نے 1990ء میں شائع کرایا ہے۔ اس مضمون میں راقم الحروف نے لکھا ہے۔

ایک دفعہ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب مرحوم نے قومی اسمبلی کی کارروائی دیکھنے کی خواہش کا تذکرہ فرمایا۔ جمعرات کے دن اسلام آباد جانے کا پروگرام طے ہوا۔ مولانا فضل الرحمن اور راقم کو شرکت سفر کا اعزاز حاصل ہوا۔ رات کا قیام حضرت مفتی صاحب کی اقامت گاہ میں تھا۔ رات دیر تک مفتی صاحب مدظلہ سے علمی بحث ومباحثہ اور افادہ واستفادہ کی محفل رہی۔ ایک عجیب سماں تھا۔ زمانے کے دو بڑے بڑے علم کے بحر بیکراں علمی بحث ومباحثہ کے ذریعہ ایک دوسرے کے ساتھ دیر تک محو گفتگو رہے۔ اور ہم ابتدائی طالب علم بحث کے بعض پہلوؤں سے لطف اندوز ہوتے رہے کافی علمی نکات ہماری ذہنی رسائی سے باہر تھے۔ لیکن ایک روحانی محفل کی کیفیت کا احساس بھرپور انداز سے ہو رہا تھا۔ جس کا احساس اب بھی اس محفل کو یاد کرکے تازہ ہو جاتا ہے۔ اور ایک فرحت بخش ماحول سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ فراہم کرتا ہے۔

صبح کو ناشتہ کے بعد حضرت مولانا عبدالحق صاحب کی اقامت گاہ پر تشریف لے گئے۔ انہی دنوں مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ کی ایک قرارداد جو سود کی حرمت اور ملک میں سودی کاروبار کی ممانعت کے سلسلے میں تھی، قومی اسمبلی میں زیر بحث تھی اور آج کا دن (اس پر بحث کا) آخری دن تھا۔ مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ اس بحث کی تیاری میں مصروف تھے۔ مولانا عبدالحلیم صاحب مرحوم کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فوراً سود کی حرمت، معاشرہ میں اس کی وجہ سے پیدا شدہ خرابیاں۔ تفریق اور افتراق کی مختلف

پہلوؤں پر تذکرہ کا آغاز کردیا۔ مولانا عبدالحلیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس بحث کا آغاز فرمایا۔ اور مسلسل گفتگو فرماتے رہے اور وہ علمی نکات بیان فرمائے۔ قرآن واحادیث کے حوالے دیئے اور واقعاتی لحاظ سے سود کی حرمت، مخالفت اور معاشرہ کے لئے اس کی بنیاد فساد پر سیر حاصل بحث فرمائی"۔ [صدر المدرسین۔ ص 193، 194]

یہ وہ دن تھا جس دن "مری مذاکرات" کے نام سے پیپلز پارٹی اور اپوزیشن کے رہنماؤں کے درمیان مذاکرات کا سلسلہ چل رہا تھا۔ مفتی صاحب، نورانی صاحب، خان عبدالولی خان، غوث بخش بزنجو، خیر بخش مری، ارباب سکندر خان خلیل اور عطاء اللہ خان مینگل اور دیگر رہنما ہمارے سامنے ہی گاڑیوں میں بیٹھ کر مذاکرات کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ اور اسی دن "سود پر پابندی" کی قرارداد اسمبلی میں زیر بحث تھی اور آج اس پر بحث کا اور یا پھر ووٹنگ کا آخری دن تھا۔ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب، مولانا فضل الرحمن اور راقم الحروف بھی وزیٹرز گیلری میں بیٹھے تھے۔ جب مولانا عبدالحق صاحب کی "سود پر پابندی" کی قرارداد کی باری آئی۔ اور مولانا عبدالحق سے جب سپیکر نے یہ پوچھا کہ آپ اس پر آخری تقریر کرنا چاہتے ہیں یا ووٹنگ چاہتے ہیں۔ تو مولانا عبدالحق صاحب نے ووٹنگ کے بارے میں رائے دی۔ (یہاں بڑے واقعات بھی اسمبلی میں ہوئے۔ پیپلز پارٹی کے ممبر قومی اسمبلی، مشہور صحافی جناب علی حسن منگی نے یہ سوال کیا کہ سود اور نفع میں کیا فرق ہے؟ اور بعض بڑے بڑے دستار اور لمبے لمبے جبوں والے، نام نہاد علماء اس کو صحیح جواب نہ دے سکے۔ جبکہ مولانا عبدالحق صاحب کو سپیکر اجازت نہیں دے رہے تھے۔ آخر کار مولوی نعمت اللہ صاحب ایم این اے کوہاٹ کو جب اسپیکر نے اجازت دی تو انہوں نے روز مرہ کی ایک نہایت سادہ مثال سے سود اور نفع کا فرق سمجھایا جس سے علی حسن منگی کی تسلی ہوئی۔ ان نام نہاد علماء دین کی اس کارکردگی پر جہاں ہمیں افسوس ہو رہا تھا۔ وہاں حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کی حالت قابل دید تھی۔ وہ بہت پیچ وتاب کی کیفیت سے گزر

رہے تھے۔ مگر اسمبلی کا ڈیکورم رکاوٹ تھا ورنہ ان کے بس میں ہوتا۔ وہ اسمبلی کے فلور پر کھڑے ہو جاتے اور جہاں وہ ان نام نہاد مولویوں کا حشر کرتے وہاں سود و نفع کا فرق بھی سمجھاتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو تفہیم کی صفت بہت وافر مقدار میں عطا فرمائی تھی)

جو نہی سپیکر نے ووٹنگ کے فیصلے کا اعلان کیا۔ مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا عبدالحکیم راولپنڈی اور مولانا عبدالحق کوئٹہ والے اسمبلی ہال سے باہر تشریف لے گئے۔ اور مولانا عبدالحق کی قرارداد کے حق میں اپنا ووٹ استعمال نہیں کیا۔ جس پر ہم سب کو بہت ہی افسوس ہوا۔ مگر کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ جماعت اسلامی کے ممبر، جمعیۃ علماء پاکستان کے ممبر یہاں تک کہ سیکولر جماعت نیپ کے اراکین اسمبلی تو مولانا عبدالحق صاحب کی قرارداد کی حمایت میں ووٹ استعمال کریں۔ اور بعض اپنے علماء حکمرانوں کی خوشنودی کی خاطر حق بات اور حق بات کی حمایت سے پہلو تہی کریں۔ اب مزید توجہ مطلوب ہے۔ اس واقعہ کے چند دن بعد دارالعلوم حقانیہ کے ایک طالب علم حافظ عبدالوارث وزیرستانی کی دعوت پر مولانا ہزاروی صاحب دارالعلوم حقانیہ تشریف لائے۔ تفصیلات تو زیادہ ہیں مگر صرف ایک بات جس کا تعلق مذکورہ بالا واقعہ سے ہے تحریر کرتا ہوں۔ صبح جب ہزاروی صاحبؒ راولپنڈی جانے کے لئے بس اڈہ کی طرف تشریف لے جانے لگے۔ تو چند طلباء کے ساتھ ساتھ راقم الحروف بھی آپ کو الوداع کہنے کے لئے ساتھ تھا۔ اڈہ پہنچ کر بس کا انتظار ہو رہا تھا۔ کہ راقم الحروف نے اسمبلی کی کاروائی اور اس میں مولانا عبدالحق صاحب کی سود پر پابندی کے حق میں ووٹ استعمال نہ کرنے کے بارے میں ان سے پوچھا۔ تو انہوں نے فرمایا۔ کہ عبدالحق کو میں نے بار بار سمجھایا ہے کہ وہ ایسی قراردادیں اسمبلی میں نہ لائیں۔ جن کے بارے میں ان کو معلوم ہے کہ پیپلز پارٹی اور اس کے ارکان اس کی مخالفت کریں گے۔ پھر وہ کیوں ایسی قراردادیں پیش کرتا ہے کبھی سود پر پابندی کے بارے میں، کبھی جوا پر پابندی، کبھی جمعہ کی تعطیل، کبھی رقص و سرود پر پابندی۔ جب اس کو معلوم ہے کہ حکمران اس

کی مخالفت کریں گے تو وہ یہ قراردادیں لا کر ان کو وہ دین کی مخالفت پر اور پختہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے میں اور میرے ساتھی ووٹنگ کے وقت اسمبلی ہال سے نکل گئے تھے۔

ببین تفاوت رہ از کجا است تا بہ کجا

جمعیۃ علماء اسلام کے اصولی مؤقف سے حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی کے انحراف نے جماعتی کارکنوں میں بہت ہی بے چینی پیدا کر دی تھی۔ اس کے ساتھ جمعیۃ کی مخالف قوتوں کی بھی خوب موقعہ ہاتھ آیا تھا۔ اور انہوں نے اپنے مضامین میں اس کو خوب ہوا دی تھی۔ جماعتی ساتھیوں کی انہی پریشانیوں اور بے چینیوں نے کئی حساس دل بزرگوں کو اس طرف مائل کیا کہ وہ درمیان میں آ کر ان مخالفتوں کو ختم کرنے کی سعی کریں۔ اور مصالحت کی ایسی صورت پیدا کی جائے کہ اکابرین کی یہ جماعت دولخت ہونے سے بچ سکے۔ دیگر بزرگوں کے علاوہ حضرت خواجہ خان محمد صاحب سجادہ نشین خانقاہ سراجیہ کندیاں نے اس سلسلے میں جو کردار ادا کیا۔ اس کے جزوی حصے کا راقم الحروف چشم دید گواہ ہے۔

حضرت خواجہ خان محمد صاحب امیر مجلس تحفظ ختم نبوت کے ساتھ ساتھ اس وقت جمعیۃ علماء اسلام کے مرکزی نائب امیر بھی تھے۔ اور اگر ایک طرف مفتی صاحبؒ کے دل میں ان کا بہت احترام تھا۔ تو دوسری طرف حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ اور مولانا عبدالحکیم ان کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے۔ اگرچہ ہزاروی صاحب، خواجہ صاحب کے پیر بھائی تھے۔ دونوں حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ کے مریدین تھے۔ حضرت مولانا عبداللہ صاحب کی انتقال کے بعد حضرت ہزاروی، حضرت خواجہ صاحب سے بیعت ہوئے تھے اور ان کی طرف سے مجاز بھی تھے۔ ان کے خلفاء میں ہزاروی صاحب کا نام بھی شامل ہے۔ حضرت خواجہ صاحب نے اس سلسلے میں حضرت مفتی صاحبؒ سے جو ملاقات کی تھی۔ اس موقعہ پر راقم الحروف اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب موجود تھے۔ اگرچہ ملاقات میں ہم شریک نہیں تھے۔ وہ ملاقات دو دیدہ تھی۔ مگر جب

حضرت خواجہ صاحب اس موقعہ پر حضرت ہزاروی صاحب سے ملنے کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ تو راقم الحروف ہمراہ تھا۔ اور وہاں ملاقات میں بھی شریک تھا۔ جب دیگر حال احوال کے بعد حضرت خواجہ صاحب نے اپنے آنے کا مقصد حضرت ہزاروی صاحب کے سامنے رکھا۔ اور ان کے سامنے مصالحت کے لئے دو صورتیں رکھیں۔ ایک تو یہ کہ جمعیۃ علماء اسلام کے مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں آپ دونوں اپنا اپنا موقف رکھ دیں پھر مجلس شوریٰ جو بھی فیصلہ کرے دونوں کو منظور ہو گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ارکان کی کمیٹی بنائی جائے اور اس کے سامنے آپ اور مفتی صاحب اپنا اپنا موقف رکھ دیں پھر کمیٹی جو فیصلہ کرے گی وہ دونوں فریق منظور کریں گے۔ حضرت خواجہ صاحبؒ کی طرف سے ان دو تجاویز کو سامنے رکھنے میں ابھی اتنا وقفہ ہی ہوا تھا کہ کوئی سوچے اور پھر جواب دے۔ حضرت ہزاروی صاحبؒ نے دونوں تجاویز کو مسترد کر دیا۔ اور انہوں نے فرمایا کہ میں مفتی محمود کے ساتھ بیٹھ کر اپنا موقف پیش کروں، یہ قطعاً نہیں ہو سکتا۔ اور حضرت ہزاروی صاحب کی یہی بات مولانا اسفندیار صاحب (کراچی) نے بھی لکھی ہے۔ وہ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (مفتی محمود نمبر) ج ۳، شمارہ نمبر 21، ربیع الثانی 1401ھ مطابق فروری 1981ء میں رقمطراز ہیں۔

> مفتی صاحب جو بات بھی فرماتے مدلل۔ اور کسی بات کو تسلیم کرتے تو وہ بھی دلائل کی بنیاد پر۔ وہ نہ اپنا حکم کسی پر ٹھونستے تھے اور نہ کسی کا حکم یا بات بغیر دلائل کے تسلیم کرتے۔ ان کے دلائل اس قدر مضبوط اور محکم ہوتے کہ بڑے سے بڑا آدمی ان دلائل کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ایک واقعہ سناتا ہوں۔ حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی اور حضرت مفتی محمود ہمارے قائدین میں سے تھے۔ ان دونوں میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ میں نے ایک بار مولانا ہزاروی سے عرض کیا کہ آپ ان اختلافات کو شوریٰ میں کیوں حل نہیں کرتے۔ مفتی صاحب تو کہہ چکے ہیں کہ شوریٰ میں بیٹھ جاؤ اور جو فیصلہ ہو وہ دونوں منظور کرلیں۔ ہزاروی صاحب نے جواب میں فرمایا کہ بھائی تم نہیں

> جانتے مفتی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے دلائل کی اتنی قوت دی ہے وہ اگر چاہیں کہ لکڑی کو سونا ثابت کریں تو اس پر بھی قادر ہیں کہ اپنے دلائل سے لکڑی کو سونا ثابت کر دیں۔ اور کوئی ان کے دلائل کو رد نہیں کر سکے گا۔ شوریٰ میں تو سراسر ان کی جیت ہے۔

مولانا اسفندیار صاحب ایک اور واقعہ بھی نقل کرتے ہیں۔ جس سے ہزاروی صاحبؒ کی نگاہ میں مفتی محمود صاحبؒ کا کیا مقام تھا۔ اور ان کے دل میں ان کی کتنی عظمت و احترام تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس قدر مخالفت کہ جمعیۃ کو دو لخت کرنے پر آمادہ ہوئے۔ نہ تو شوریٰ میں بیٹھنا گوارا کیا۔ نہ کسی کمیٹی کی تشکیل اور اس کے فیصلے کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوئے۔ نہ ان کے دلائل کے سامنے اپنے دلائل دینے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اور نہ ہی اپنے آپ کو مفتی صاحب کے دلائل کو رد کرنے کے قابل سمجھا۔ پھر کیا بات تھی؟ یہی بات آج تک مجھ سے بالاتر ہے، جمعیۃ علماء اسلام کے کارکن اور خاص کر نئی پود کے نوجوان کارکن جمعیۃ علماء اسلام کے پرانے کارکنوں سے اس بارے میں جواب سوال کرتے ہیں۔ تو وہی کہتے ہیں کہ

ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

یہی وجہ ہے کہ پھر بعض ساتھی ادھر ادھر کے الزامات لگا کر اس میں اس کا جواب ڈھونڈتے ہیں۔ کوئی ساتھی مفادات کا الزام لگاتے ہیں۔ کوئی ان کے رفقاء کرام اور احباب کے بارے میں یہ باتیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ کہ مولانا ہزاروی صاحبؒ ان کے ہاتھوں مجبور و بے بس تھے۔ شاید ہوں۔ مگر راقم الحروف کوئی ایسی جسارت نہیں کر سکتا۔ بس یہی کہہ سکتا ہے کہ ایک سازش تھی جس سے اکابرین اور علماء حق کی اس جماعت کو اس کا ہدف بنایا گیا۔

حضرت مفتی صاحب ان جماعتی اختلافات کو کبھی بھی عام مجالس میں یا اخباری نمائندوں کے سامنے موضوع بحث نہ بناتے۔ اور نہ ہی کبھی اپنی جماعت آرگن ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور کے صفحات کو اس کے لئے استعمال کیا بلکہ جب بھی اخباری نمائندے آپ سے اس بارے

میں کوئی سوال کرتے تو آپ نالتے رہتے تھے۔ لیکن دوسری طرف حضرت ہزاروی صاحب اور ان کے رفقاء نے تحریر و تقریر کا ہر وہ ذریعہ استعمال کیا جو ان کی دسترس میں تھا۔ جیسے کہ وہ اسی کے لئے وقف ہو چکے ہیں۔ صرف ایک دفعہ مفتی صاحب نے اتنے سارے الزامات و اعتراضات و اتہامات کے جواب میں اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک مضمون بعنوان "ملکی سالمیت کی خاطر میری جان بھی حاضر ہے" ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور کے ج 16، شمارہ 43 (کیم شعبان 1393ھ مطابق 31 راگست 1973ء) میں شائع کرایا تھا۔ اور یہ اس وقت کہ جب مولانا ہزاروی صاحبؒ نے مفتی صاحب پر ملک دشمنی کے الزامات لگائے تھے اور اس کی حب الوطنی کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار کیا تھا۔ مفتی صاحبؒ نے اسی مضمون میں مولانا ہزارویؒ کے ایک ایک الزام کا جواب دیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

(1) نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ معاہدہ خود مولانا ہزاروی نے کیا تھا سرحد میں مولانا ہزارویؒ نے معاہدہ کی تفصیلات طے کیں۔ اور فون پر مجھ سے مشورہ طلب کیا۔ بلوچستان میں مولانا ہزاروی اور میں نے مل کر بات چیت کی مگر معاہدہ مولانا ہزاروی نے خود اپنے قلم سے لکھا۔.................. مگر یہ حقیقت ہے کہ 21 فروری 1973ء کو جبکہ صوبوں میں مخلوط وزارتیں ختم ہو چکی تھیں مرکزی اور صوبائی مجالس شوریٰ کے مشترک اجلاس لاہور میں اس معاہدہ کو برقرار رکھنے کا فیصلہ ہوا اور خود مولانا ہزارویؒ نے اسے بحال رکھنے کی پرزور حمایت کی۔

(2) متحدہ جمہوری محاذ میں شمولیت کا فیصلہ جمعیۃ کی مرکزی مجلس شوریٰ نے 6 مارچ کے اجلاس راولپنڈی میں کیا۔ اس اجلاس میں مولانا ہزاروی موجود تھے۔ اور یہ بات بالکل واضح تھی کہ محاذ میں نیپ اور جماعت اسلامی بھی شامل ہو رہی ہے۔ اور یہ اتحاد کوئی عقیدہ یا مسلک کا اتحاد نہیں بلکہ ملک میں آمریت فسطائیت کا مقابلہ کرنے کے لئے چند اصولوں پر اشتراک عمل کا سمجھوتہ ہے اور اس سے قبل بھی اس نوعیت کے معاہدے ہوتے رہے تھے۔ 52ء میں 22 دستوری نکات کی ترتیب میں جمعیۃ علماء اسلام کے عظیم

بزرگ حضرت مولانا احمد علی صاحب شریک تھے۔ اور اس میں مودودی صاحب بھی تھے۔ 53ء میں تحریک ختم نبوت کی مجلس عمل میں مولانا ہزاروی ہی کی حیثیت سے شریک تھے اور اس میں جماعت اسلامی بھی شامل تھی۔

1968ء میں جمہوری مجلس عمل میں جماعت اسلامی شریک تھی اور مولانا ہزاروی بھی شامل تھے حتیٰ کہ جمعیۃ کے بعض ارکان (محترم مولانا قاضی مظہر حسین صاحب چکوال، مولانا قاضی عبداللطیف صاحب جہلم وغیرہ) نے اس پر اعتراض کیا تو خود مولانا ہزاروی نے ان کے اعتراض کا جواب دیا اور انہیں مطمئن کیا۔

(3) مولانا ہزاروی صاحب نے مجلس شوریٰ کے فیصلوں کی بار بار خلاف ورزی کی۔ امیر مرکزیہ کی طرف سے بار بار سرزنش کے باوجود انہوں نے روش نہ بدلی۔

(أ) 6 مارچ 1972ء کو پیپلز پارٹی، جمعیۃ اور نیپ کے درمیان سہ جماعتی معاہدہ طے پایا مگر مارشل لاء کو 14 راگست تک جاری رکھنے کے سوال پر معاہدہ کی تعبیر میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ ہم نے صدر بھٹو کو تجویز پیش کی کہ ہائیکورٹ کے دو ججوں سے اس کا فیصلہ کرایا جائے۔ مگر مولانا ہزاروی نے مجلس شوریٰ کے اجلاس سے قبل ہی اس بارے میں یکطرفہ موقف اختیار کر کے یہ بیان دیا کہ بین الاقوامی عدالت کے جج بھی اگر اس معاہدہ کی تعبیر میرے موقف کے خلاف کر دیں تو بھی 14 راگست تک مارشل لاء قائم رکھنے کے حق میں ووٹ دوں گا۔

(ب) 21 فروری 1973ء کو صوبائی و مرکزی مجلس شوریٰ کے مشترک اجلاس لاہور میں ہزارہ سے رکن صوبائی اسمبلی حق نواز خان کے بارے میں مولانا ہزاروی نے کہا۔ اس کا میں ذمہ دار ہوں۔ یہ آپ کے ساتھ رہے گا اور آپ کو چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ مگر حق نواز اس کے باوجود جمعیۃ سے غداری کر کے قیوم کی وزارت میں شامل ہو چکا ہے اور اسے مولانا ہزاروی کی مکمل پشت پناہی حاصل ہے۔ اور مولانا ہزاروی نے جمعیۃ کے خلاف جو بیان دیا ہے اس پر اس کے بھی دستخط ہیں۔

(ج) 1ر مئی 1973ء مجلس شوریٰ کے اجلاس لاہور کے بعد چار افراد کا ایک وفد مجلس شوریٰ کی طرف سے مولانا ہزاروی سے ملا۔ اور ان پر مجلس شوریٰ کے فیصلوں کی پابندی کے لئے زور دیا۔ مولانا نے وفد سے وعدہ کیا۔ کہ وہ ملک میں محاذ کی مخالفت نہیں کروں

گا۔ امیر مرکزیہ مولانا درخواستی نے مولانا ہزاروی سے تحریری وعدہ کا تقاضا کیا۔ اور جون کی ابتداء میں دفعہ دوبارہ ان سے ملے۔ انہوں نے تحریری طور پر یقین دہانی کرائی کہ وہ ہاؤس میں کاذ کے خلاف ہرگز کچھ نہیں کہوں گا مگر عملاً یہ ہوا کہ مولانا ہزاروی 24/ جون کو کوئٹہ گئے۔ وہاں رکن صوبائی اسمبلی مولوی صالح محمد سے بند کمرے میں ملاقات کر کے ان کو جمعیۃ کے موقف سے انحراف پر آمادہ کیا۔ اور اپنے ساتھ لے جا کر بگٹی صاحب سے ملاقات کرائی اور اس کے بعد مولوی صالح محمد نے وزارت کا حلف اٹھا لیا۔ اسی طرح پنجاب کے ممبران اسمبلی کو بھی مولانا ہزاروی نے ورغلایا اور 11/ اپریل کو بھٹو صاحب سے ان کی ملاقات کا اہتمام کرایا۔

(د) ایک موقع پر مجلس شوریٰ کی پابندی کے ذکر پر مولانا ہزاروی نے یہاں تک کہہ دیا کہ شوریٰ جائے جہنم میں۔ میں اس پر لعنت بھیجتا ہوں۔

(ہ) مولانا ہزاروی نے ارکان اسمبلی اور دوسرے کارکنوں کو جمعیۃ سے باغی کرنے کی پوری کوشش کی۔ جماعتی دستور کو معطل کر کے جماعت کا انتظام سنبھالنے کا اعلان کیا۔ اور اسی طرح دستور کا کھلم کھلا مذاق اڑایا۔ گویا جمعیۃ پر مارشل لاء نافذ کر کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گئے۔ امیر مرکزیہ مولانا عبید اللہ درخواستی کی طرف سے مولانا ہزاروی کے جمعیۃ کے اخراج کے اعلان کے باوجود جمعیۃ کے نام سے بیان بازی کا شغل جاری رکھا اور مرکزی قیادت پر بے بنیاد الزامات عائد کئے۔

(4) مجلس شوریٰ کے فیصلوں سے انحراف کے ساتھ ساتھ مولانا ہزاروی نے ہمارے ساتھ عدم تعاون کا طریقہ اپنائے رکھا۔

(ا) سہ جماعتی معاہدہ کے بعد اسمبلی میں خواتین کی نشستوں کے انتخاب کے موقعہ پر بھٹو اور گورنروں کے ترغیب میں آکر پیپلز پارٹی کی امیدوار کی حمایت کی۔ اور معاہدہ کی خلاف ورزی کی۔

(ب) یکم مئی 1973ء کو مفتی صاحب نے صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کے عہدے کا حلف اٹھایا۔ مگر اس تقریب میں مولانا ہزاروی نے شرکت نہیں کی۔ 5/ مئی کو جب پشاور میں "یوم تشکر" کے سلسلے میں ملک کے کونے کونے سے جماعتی کارکن اور جماعتی رہنما شریک ہوئے مگر مولانا ہزاروی نے اس میں بھی شرکت نہیں کی۔

(ج) دستور کی تدوین میں قومی اسمبلی میں انہوں نے ہماری تائید کی اور اسلامی دفعات کے حق میں ووٹ نہ دیا حتیٰ کہ سود کی حرمت کے بارے میں مولانا عبدالحق کی قرارداد کے حق میں بھی ووٹ نہ دیا۔ اور نہ کسی واک آؤٹ میں ہمارا ساتھ دیا۔

ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور کے اسی شمارے میں جمعیۃ علماء اسلام کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس منعقدہ 23/ اگست 1973ء بروز جمعرات 11 بجے دن مرکزی دفتر چوک رنگ محل لاہور جو کہ زیر صدارت نائب امیر حضرت مولانا عبید اللہ انور منعقد ہوا۔ (امیر مرکزیہ حضرت درخواستی صاحب رحیم یار خان میں سیلاب کی وجہ سے شرکت نہ کر سکے تھے) کی کارروائی شائع ہوئی ہے۔ جس میں امیر مرکزیہ کی طرف سے مولانا غلام غوث ہزارویؒ مولانا عبدالحکیم اور مولانا عبدالحق کوئٹہ کو جمعیۃ سے خارج کرنے کے فیصلہ کی توثیق کی گئی ہے۔ توثیق کی قرارداد میں کہا گیا ہے کہ جمعیۃ کے فیصلوں سے مسلسل انحراف کے باعث اخراج کا فیصلہ ناگزیر تھا۔ مجلس شوریٰ نے اعلان کیا کہ جماعتی پالیسی سے انحراف کی صورت میں آئندہ بھی کسی بڑے سے بڑے رکن کو بھی جمعیۃ سے الگ کرنے میں تامل نہیں کیا جائے گا۔

ان بیانات اور جماعتی فیصلوں پر حاشیہ آرائی کی بجائے جمعیۃ علماء اسلام کے ترجمان ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور جلد 16 ش 32، 33 (17-24/ رجب 1393ء مطابق 17-24 اگست 1973ء) کے مدیر کی طرف سے تحریر شدہ "اداریہ" کو یہاں درج کیا جاتا ہے۔

اے۔ پی۔ پی کے مطابق حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی نے ایک بیان میں یہ کہا ہے کہ انہوں نے از خود جمعیۃ علماء اسلام کا نظم و نسق سنبھال لیا ہے۔ (گویا کہ 23/ اگست کے شوریٰ کے اجلاس میں ان کے اخراج کے فیصلے سے قبل وہ جمعیۃ سے علیحدہ گروپ کی صورت میں علیحدگی اختیار کر چکے تھے۔ ان کے اخراج کا فیصلہ بعد میں ہوا ہے) اور ساتھ ہی آپ نے حضرت مفتی محمود پر یہ الزام بھی لگایا ہے کہ "مفتی صاحب نے جمعیۃ کے منشور اور مجلس شوریٰ کے فیصلوں سے انحراف کیا ہے اور جمعیۃ کے وقار اور اکابر کے مسلک کو نقصان پہنچایا ہے" مولانا ہزاروی ہمارے بزرگ ہیں اور ہمیں ان کی بزرگی اور پیرانہ سالی کا لحاظ ہے مگر چونکہ انہوں نے خود اپنے مقام اور حیثیت کا خیال نہ کرتے ہوئے جمعیۃ کی مرکزی قیادت پر حقائق کے خلاف واقعات کے برعکس اور

بے بنیاد الزامات عائد کئے ہیں۔ اس لئے ہمیں حقیقت حال کی وضاحت کی خاطر مجبوراً کچھ باتیں حیطہ تحریر میں لانا پڑ رہی ہیں۔ اس بات سے مولانا ہزاروی بھی انکار نہیں فرمائیں گے۔ کہ جمعیۃ علماء اسلام کسی فرد واحد یا بے ضابطہ گروہ کا نام نہیں جہاں ایک شخص کی مرضی چلتی ہو یا جس اشتراک عمل کا کوئی ضابطہ و دستور نہ ہو جمعیۃ علماء اسلام ایک باضابطہ سیاسی و دینی تنظیم ہے۔ جس کی شاخیں ملک کے کونے کونے میں موجود ہیں۔ اور باقاعدہ ایک دستور رکھتی ہے جس کے تحت امیر، مجلس عاملہ، مجلس شوریٰ اور مجلس عمومی اپنے اپنے دائرہ کار پالیسی، منشور اور طریق کار پر عمل درآمد کی نگرانی کرتی ہیں۔ یہ نظم و نسق سالہا سال سے چل رہا ہے۔ اور خود مولانا ہزاروی بھی اس کے اہم ترین رکن رہے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر وہ کس اصول، ضابطہ اور دستور کے تحت جماعتی دستور، امیر، مجلس عاملہ اور مجلس عمومی کو نظر انداز کر کے از خود بن بلائے مہمان کی طرح جمعیۃ کی سربراہی کے منصب پر براجمان ہونا چاہتے ہیں۔

مولانا کی جماعتی خدمات اپنے مقام پر ناقابل انکار ہیں۔ ان کی قربانیاں اور شاندار ماضی بھی مسلم ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان خدمات اور قربانیوں کے صلہ میں انہیں یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ اپنی ذاتی رائے کو پوری جماعت پر ٹھونسنے کی کوشش کریں اور جمعیۃ کے دستور اور وقار کو بھی پامال کرنے سے گریز نہ کریں۔ جمعیۃ کے نظم و نسق اور پالیسی کی ذمہ دار مجلس عمومی ہے جس کا ذکر دستور کی دفعہ 10 میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

(الف) ہر جمعیۃ کی مجلس عمومی اس جمعیۃ کی سب سے بڑی طاقت ہو گی۔ (ب) مجلس عمومی کے سامنے جملہ عہدیداروں، مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ جواب دہ ہوں گے۔ اور اس کے فیصلے سب پر حاوی ہوں گے۔

دستور کی اس واضح شق کے پیش نظر اصولی طور پر چاہئے تو یہ تھا کہ مولانا ہزاروی کو اگر جمعیۃ کی مرکزی قیادت کے کسی فیصلے سے اتفاق نہیں تھا تو وہ مجلس عمومی میں لاتے۔ وہاں اپنی بات پیش کرتے اور ارکان کو قائل کر کے اپنی رائے منواتے۔ اور اگر اس کے باوجود ان کی رائے تسلیم نہ کی جاتی تو وہ جماعتی فیصلہ کی پابندی یا جمعیۃ سے علیحدگی کے دو واضح اور منطقی راستوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتے۔ لیکن مولانا موصوف نے مجلس عمومی تو کجا مجلس شوریٰ تک کی پرواہ نہ کی۔ امیر مرکزیہ کے فیصلوں کو کوئی وقعت

نہ دی۔ اور قومی اسمبلی کے اندر اور باہر ہر سطح پر جماعتی فیصلوں کا نہ صرف کھلم کھلا مذاق اڑایا بلکہ دوسرے ارکان کو بھی جماعتی پالیسی سے انحراف کی ترغیب دی۔

جماعتوں میں اختلاف رائے اس کے فیصلوں اور پالیسیوں کا ایک حسن ہے۔ اختلاف رائے سے کسی بھی فیصلے طلب امر کے تمام اچھے برے پہلو اور اس کا حسن و بد نمائی واضح ہو جاتی ہے۔ اور پھر کسی متفقہ فیصلے تک پہنچنے میں نہایت سہولت رہتی ہے۔ لیکن اختلاف رائے کو ذاتی عزت نفس کا مسئلہ بنانا اور جماعتی فیصلوں پر اپنی ذاتی رائے کو فوقیت دینا یہ جہاں جماعت کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے وہاں اس جماعت کا وقار، رعب و دبدبہ بھی خاک میں مل جاتا ہے۔ اور پھر اس کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اس وقت کے حالات میں ان حضرات نے یہی کوشش کی۔ مگر جیسے کہ کہا جاتا ہے کہ وقت بہترین جج ہے۔ حالات نے ایسا پلٹا کھایا۔ کہ ادھر بھٹو صاحب کی حکومت گئی ادھر وہ لوگ جو جمعیۃ کو نقصان پہنچانے کے درپے تھے۔ ماضی کا قصہ بن گئے۔ پھر کسی نے ان کا نام تک نہیں لیا۔ اس وقت، وقتی حکمرانوں سے اپنے خدمات کے صلہ میں جو مفادات حاصل کئے۔ وہ یقیناً انہوں نے حاصل کئے ہوں گے۔ مگر اب جماعتی کارکنوں کو ان کے نام تک یاد نہیں۔ چہ جائیکہ ان کی قربانیوں اور خدمات کو زندہ رکھتے۔

جمعیۃ کی اس "بحرانی دور" کے تذکرے کا اختتام ایک مضمون پر کیا جاتا ہے۔ جس کا عنوان ہے۔

مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی محمود مدظلہ..... اور ان کے مخالفین

یہ مضمون ماہنامہ "تبصرہ" لاہور (مدیر جانباز مرزا) کے "مفتی محمود نمبر" ج 11 ش 3 (جنوری 1979ء) میں شائع ہوا ہے۔ اور مضمون نگار ہیں حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب۔ وہ لکھتے ہیں۔

ملک میں ایسے حضرات کم پیدا ہوا کرتے ہیں جو جامع حیثیت کے مالک ہوں۔ یہ اللہ کی دین ہے جس کو عطا فرمائیں۔

اس وقت ملک میں مفتی محمود صاحب مدظلہ ان گنے چنے اکابر دین میں سے ہیں جو کفر و الحاد اور لادینیت و سامراج کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں روشنی کی مینار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمود صاحب سے کون ناواقف ہیں صرف اندرون پاکستان میں ہی وہ معروف و قابل احترام نہیں ہیں بلکہ تمام عرب ممالک کے علماء دین نہ صرف ان کو پہچانتے ہیں بلکہ ان کی قابلیت کا لوہا مانتے ہیں۔

(1) حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مفتی اعظم ہیں۔ اور ایسے حق گو مفتی کہ اگر ان کا وجود مسعود نہ ہوتا تو آج پاکستان کے مسلمان مشینی ذبح کا جھٹکا حلال سمجھ کر کھاتے رہتے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب (کراچی) نے تو اس کے کھانے کا کراچی کے "البینات" میں لکھ ہی دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ بھلا کرے حضرت مفتی اعظم مفتی محمود کا کہ انہوں نے اس کا جواب لکھ کر فضل الرحمن (ڈاکٹر فضل الرحمن ڈائریکٹر اسلامی تحقیقاتی کونسل پاکستان) اور مولانا مفتی محمد شفیع کا راستہ روک لیا۔ ورنہ حکومت نے تو مشینیں منگا ہی لی تھیں۔

(2) حضرت مفتی صاحب، مفتی ہونے کے علاوہ محدث ہیں آپ مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے شیخ الحدیث ہیں۔ روزانہ درس بخاری شریف دیتے ہیں۔

(3) ان علمی مشاغل کے سوا آپ کو پابندی سے پنج وقتہ نماز اور جمعہ کا خطبہ بھی دینا ہوتا ہے۔

(4) پھر آپ ملک کا تبلیغی اور سیاسی دورہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ اور نہ صرف قرب و جوار بلکہ ملک کے دور دراز حصوں کو اپنے فیوض سے سیراب کرتے رہتے ہیں۔

(5) آپ کے کندھوں پر کل پاکستان جمعیۃ علماء اسلام کی نظامت کا بار گراں بھی پڑا ہوا ہے۔ اور آپ نے نہایت خوش اسلوبی سے علماء دین کی اس کشتی کو طوفانوں سے گزارتے، چٹانوں سے ٹکراتے ہوئے آگے بڑھایا بلکہ ساحل مقصود کے قریب پہنچایا ہے۔

(6) آپ کوہستان شہر اور ضلع کی سیاست پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے اور شیر ڈیرہ اسماعیل خان کی اسلامی سیاست کو بھی کامیاب بنانا ہوتا ہے۔

(7) آپ شیر دل اور دلیر خدائی سپاہی ہیں۔ میدان سیاست کے شاہسوار ہیں۔ آپ نے اپنی گزشتہ قومی اسمبلی کی ممبری کے زمانہ میں ڈیڑھ سو ممبران کے سامنے ڈیڑھ گھنٹہ وہ جامع، مانع، مدلل و فاضلانہ تقریر فرمائی جس پر تمام حاضرین عش عش کرنے لگے۔ اور ڈپٹی اسپیکر

کو آپ کی تعریف میں رطب اللسان ہونا پڑا اس طرح آپ نے اسلام کے قانون کا رعب بٹھا کر ایوبی عائلی قوانین کے پرخچے اڑا دیئے۔

(8) آپ نے قومی اسمبلی میں تمام ملکی مسائل پر سیر حاصل تبصرے فرما کر مسلمانوں کو یقین دلا دیا کہ علماء حق عمل کے ہر میدان میں سب سے آگے ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

(9) آپ نقشبندی خاندان میں دو طریقوں سے خلیفہ مجاز ہیں جس کا بہت کم لوگوں کو علم ہے۔

(10) آپ سبعہ قراءت کے ماہر قاری ہیں۔ اور قرآن پاک سے خاص مناسبت رکھتے ہیں۔

(11) ان تمام امور کے ساتھ ساتھ آپ تمام پاکستان کے وفاق المدارس العربیہ کے ناظم اعلیٰ ہیں۔ ان کے سالانہ امتحانات اور دیگر انتظامات آپ کے مرہون منت ہیں اس سلسلے میں حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری مدظلہ نیو ٹاؤن کراچی اور حضرت مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی بھی ان کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔

(12) آپ انتہائی حلیم، نرم مزاج، بلند اخلاق اور صبر و استقامت کے مجسم نمونہ خادم دین رسول ہیں۔

(13) نصرانی دنیا جو تیرہ سو سال تک اسلام سے نبرد آزما رہی آپ کے ہاں سب سے زیادہ مبغوض ہے اس نصرانی دنیا یعنی یورپ کی نمائندگی آج کل امریکی سامراج کر رہا ہے جس کے خلاف حضرت مفتی صاحب موصوف نبرد آزما ہیں اور امریکی پٹھوؤں کی نشاندہی اور یہودی نوازوں کی سرکوبی میں مصروف ہیں۔

(14) باوجودیکہ آپ کو چند خطرناک بیماریاں لاحق ہیں مگر آپ کے ان دینی مشاغل میں کمی نہیں آ رہی۔

(15) آپ نے مؤتمر عالم اسلامی منعقدہ قاہرہ میں مسلسل تین سال جا کر اسلام اور پاکستان کی بہترین نمائندگی کرتے ہوئے علم و فضل کی دھاک بٹھا دی ہے کیا اس طرح کی جامع ہستیاں روز پیدا ہوتی ہیں؟ کتنا خوش قسمت ہے وہ ملک جس میں یہ حضرات موجود ہیں اور کتنی خوش قسمت ہے جمعیۃ علماء اسلام جس کو ایسے رہنما میسر ہیں۔

مولانا ہزاروی صاحب اپنے مضمون کی تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے مفتی صاحب کے مخالفین کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں مگر تماشا دیکھیے کہ آپ کی مخالفت کرنے پر بعض لوگ اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ آپ کی مخالفت کون کون کرتا ہے۔

(1) جو امریکہ کے ایجنٹ یا سامراجی چوبے ہیں۔ یہ لوگ اکثر اپنا حق نمک ادا کرنے کے لئے حضرت مفتی صاحب کی مخالفت کرتے ہیں۔

(2) جن کو جھوٹ بولنے اور افترا کرنے میں مزا آتا ہے۔ جیسے ایک ہفت روزہ نے لکھا تھا کہ حضرت مفتی صاحب نے 1949ء میں مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں یہ فتویٰ دیا کہ مسلم لیگی لڑکی سے نکاح حرام ہے۔ اور اس سے جو اولاد ہوگی وہ حرامی ہوگی۔ حالانکہ اس وقت نہ تو مدرسہ قاسم العلوم بنا تھا اور نہ ہی حضرت مفتی صاحب ملتان تشریف لائے تھے۔ اس قسم کا فتویٰ تو کوئی ادنیٰ عالم دین بھی نہیں دے سکتا ہے۔ چہ جائیکہ حضرت مفتی صاحب موصوف جیسے محقق اور محتاط عالم دین۔ بیسوں بار اس بہتان کی تردید کی گئی مگر امریکی چوبے اس کو بار بار شائع کرتے اور تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ کتے کی دم ہیں بارہ سال لوہے کی نلی میں بند کر کر رکھو۔ جب نکالو پھر ٹیڑھی ہوگی۔

(3) آپ کی مخالفت ایسے لوگ بھی کرتے ہیں۔ جن کا نسب مجہول ہے۔ اور جن کے باپ دادوں کے عام چرچے ہوتے بلکہ اشتہار تک چھپتے ہیں کہ ان کے باپ تھے بھی یا نہیں۔

(4) آپ کی مخالفت ان عناصر کی طرف سے ہوتی ہے جو صرف دوسروں کے ٹکڑوں پر پلتے اور دوسروں کی تے چاٹتے ہیں۔

(5) آپ کی مخالفت ایسے لوگ بھی کرتے ہیں۔ جو اپنی اولاد کو لے کر بازاروں میں پھرتے اور اپنے بچوں سے ______

(6) آپ کی مخالفت وہ کمینے کرتے ہیں جو پانچ سو حنفی علماء کو کرگس اور بھیڑیئے لکھنے یا کہنے سے نہیں شرماتے۔

(7) آپ کی مخالفت وہ لوگ کرتے ہیں جو شہروں پر اپنی لڑکیوں کے لئے جہیز کی پیشکشوں کا ذکر کر کے دوسروں کو اشارۃً دعوت دیتے ہیں کہ میری لڑکیوں کے بیاہ کے لئے جہیز مہیا کرو۔

(8) آپ کی مخالفت وہ بے پیندے کے لوٹے کرتے ہیں جو ایک دن ایک پارٹی کی تعریف اور دوسرے دن اس کو گالیاں دیتے ہیں۔

(9) آپ کی مخالفت وہ جھوٹے اور بے ایمان کرتے ہیں جن کو جھوٹ بولنے میں مزہ آتا ہے مثلاً یہ کہ مفتی صاحب موصوف نے ٹیوب ویل لگائے۔ حضرت مفتی صاحب نے اتنے ہزار روپے لئے۔ اس کا جواب سوائے اس کے کیا ہے کہ فَلَعْنَتُ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ۔ ان بے غیرتوں پر پھٹکار برستی ہے۔ الخ

(10) آپ کی مخالفت وہ ابلیس صفت لوگ کرتے ہیں جو کبھی آپ کو حضرت امام ابو حنیفہؒ اور حضرت احمد بن حنبلؒ کا سچا جانشین کہتے ہیں۔

(11) آپ کی مخالفت وہ بے شرم کرتے ہیں جو دین سے جاہل ہونے کے باوجود صحابہ کرامؓ کے خلاف لکھی ہوئی مردود مودودی کی کتاب "خلافت و ملوکیت" کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔

(12) آپ کی مخالفت کرنے والے وہ لوگ ہیں جو سستی شہرت چاہتے یا آسان طریقے سے پیٹ کا جہنم بھرنا چاہتے ہیں۔

ہم ان امریکی چوہوں کو بتلانا چاہتے ہیں کہ آسمان کا تھوکا منہ پر آتا ہے حضرت مفتی صاحب موصوف کے خلاف بکواس کرنے سے ______

جمعیۃ علماء اسلام کی موٹر بفضلہ تعالیٰ آگے نکل چکی ہے۔ اب اس کے گرد و غبار کو جو تکنا صرف تکاپن ہے۔

جمعیۃ علماء اسلام کے سامنے نہ اقتدار ہے نہ جاہ طلبی۔ وہ دین اور صرف دین کی سربلندی کے لئے سرگرم عمل ہے نتائج اللہ تعالیٰ کے حوالہ کرتے ہوئے وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں بڑے بڑے اولیاء کرام اور اولیاء عظام کی سرپرستی میں مصروف عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی اعظم مولانا مفتی محمود صاحب کی عمر، صحت، اخلاص اور علمی و عملی جہاد میں مزید برکات عنایت فرماویں۔ آمین۔

حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے بارے میں جن خیالات و تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ وہ سب حق بجانب ہیں۔ اور وہ بلا مبالغہ مبنی بر حق ہیں ایسے ہی

انہوں نے حضرت مفتی صاحب کے مخالفین کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ لوگ جو حضرت ہزاروی کے مزاج سے واقف ہیں۔ وہ بھی کہیں گے کہ انہوں نے صحیح اور درست نشاندہی کی ہے۔ لیکن پھر ایک غیر جانبدار آدمی جب یہ سوچتا ہے کہ 1970ء میں مفتی صاحب کے بارے میں آپ کے خیالات و تاثرات یہ ہیں۔ اور پھر 1973ء میں وہ اس کے بالکل برعکس دکھائی دیتے ہیں۔ تو یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے۔

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

مفتی صاحب تو اپوزیشن میں رہے۔ حکومت مخالفت میں پیش پیش رہے۔ جبکہ مولانا ہزاروی صاحب حکومت وقت کے مکمل حامی رہے۔ مفادات کس نے حاصل کئے۔ موقف کس نے تبدیل کیا۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ اپنے رفقاء کو کس نے حکومت کی گود میں جانے کی ترغیب دی؟ اور اب وہ لوگ کہاں ہیں؟ کوئی ہے ان کا نام لیوا؟!

مولانا مفتی محمود کا وزارت علیا سے استعفیٰ کی وجوہات

یکم مئی 1972ء کو مولانا مفتی محمودؒ نے صوبہ سرحد کی وزارت علیا کا حلف گورنر ہاؤس پشاور میں اٹھایا تھا۔ ان سے حلف اس وقت کے صوبہ سرحد کے ہائیکورٹ کے چیف جسٹس جناب شاہنواز خان نے لیا تھا۔ یہ وزارت جمعیت اور نیپ کے درمیان ایک معاہدہ کی صورت میں عمل میں آئی تھی۔ مفتی صاحب ½9 ماہ تک صوبہ کے حکمران رہے تھے۔ 15 ر فروری 1973ء کو مسٹر بھٹو نے بلوچستان میں نیپ جمعیت کی مخلوط وزارت توڑ دی تھی اور صوبہ سرحد و بلوچستان کے گورنروں کو برطرف کر دیا تھا۔ یہ اقدام اس معاہدے کے سراسر خلاف تھا جس پر 27 ر اپریل 1972ء کو نیپ جمعیت اور بھٹو مرحوم نے دستخط کئے تھے۔ مولانا مفتی محمودؒ نے اس غیر جمہوری اقدام پر احتجاج کیا تھا اور اس کے فوراً بعد وزارت علیا سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ مسٹر بھٹو نے ان کی بہت منت سماجت کی تھی۔ طرح طرح کے لالچ دیئے تھے۔ کہ آپ تو ہمارے امام ہیں آپ سے کوئی لڑائی نہیں۔ جیسا جی چاہے حکومت کیجئے۔ کوئی بازپرس نہیں ہوگی۔ استعفیٰ کے بعد ایک

ملاقات میں مسٹر بھٹو نے آپ پر استعفیٰ واپس لینے پر زور دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ حکومت کا مزہ تو اب آپ کو آئے گا۔ آپ استعفیٰ واپس لے لیں۔ اور جو جی چاہے کریں اب تک ہم نے آپ کو حکومت کب کرنے دی ہے؟ مفتی صاحب نے جواب میں کہا تھا کہ بھٹو صاحب! آپ غلط سمجھے ہم حکومت میں مزا لینے یا جو چاہے کرنے کے لئے نہیں آئے تھے۔ میں استعفیٰ واپس لینے کو تیار ہوں۔ لیکن اس سے قبل آپ کو اپنے اقدامات واپس لینے ہوں گے۔ [مولانا زاہد الراشدی۔ مولانا مفتی محمود۔ زعماء ملت کی نظر میں۔ ص 176، 177]

جس دن مفتی صاحب نے وزارت سے استعفیٰ دیا تھا۔ اسی دن مسٹر بھٹو کی ہدایت پر اس وقت کے وزیر تعلیم جناب عبد الحفیظ پیرزادہ پشاور آئے تھے اور ان سے استعفیٰ واپس لینے کے لئے اصرار کرتے رہے تھے۔ مگر مفتی صاحب نہیں مانے تھے۔ اور وہ خالی ہاتھ واپس لوٹ گئے تھے۔

مسٹر بھٹو نے حریت کانفرنس کے صدر اور آزاد کشمیر کے سابق صدر سردار عبد القیوم خان کو بھی درمیان میں لانے کی کوشش کی تھی۔ مسٹر بھٹو نے سردار صاحب سے کہا کہ آپ مفتی صاحب کو سمجھائیں ہم نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا تو وہ ہم سے کیوں تعرض کرتے ہیں اور آرام سے حکومت کیوں نہیں کرتے؟! اسی مقصد کی خاطر مسٹر بھٹو نے حضرت خواجہ خان محمد صاحب مدظلہٗ سے ملاقات کا پروگرام بنایا تھا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ حضرت مفتی صاحب حضرت خواجہ صاحب کا دل سے عزت کرتے ہیں۔ اور جب خواجہ صاحب سے پوچھا گیا تھا تو آپ نے فرمایا تھا کہ میں مفتی صاحب سے کہوں گا کہ استعفیٰ کسی صورت میں واپس نہ لیا جائے۔ اور فرمایا۔ میرا مسٹر بھٹو کو بھی یہی جواب ہو گا۔

ان سب کے جواب میں مفتی صاحب کا ایک ہی جواب ہوا کرتا تھا۔ کہ نیپ سے ہمارا اتحاد اصولی ہے اور ہم وزارت کی خاطر اصولوں سے انحراف نہیں کر سکتے۔ بعض لوگ ہمارے اتحاد پر اعتراض کرتے ہیں کہ ہم نے ایک سیکولر جماعت سے اتحاد کر رکھا ہے۔ لیکن ہمارا موقف یہ ہے کہ ہمارے اتحاد کی بناء پانچ نکاتی منصوبہ ہے۔ اور ایک سالہ دور حکومت میں نیپ نے اس اتحادی منصوبہ کی پوری پابندی کی ہے ویسے بھی مرکزی حکومت نے بلوچستان کی عوامی حکومت

اور سرحد و بلوچستان کے گورنروں کو برطرف کرنے کا جو اقدام کیا ہے وہ غیر آئینی اور جمہوریت کے منافی ہے اس لئے ہم کسی طور بھی نیپ سے اتحاد ختم نہیں کر سکتے۔ [مفتی محمود سے ملئے۔ ص 183، 184]

مفتی صاحب کی 9 ماہ کی حکومت کیسی تھی۔ اس کا ایک عمومی جائزہ حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق سابق ایم این اے و بانی مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک نے اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون میں جو "مولانا مفتی محمود۔ رجال ملت کی نظر میں" شائع ہوا ہے۔ لکھتے ہیں۔

ان کا دور حکومت ایک درویش، بوریہ نشین، مرد قلندر اور فقیر درویش انسان کا مثالی دور حکومت ہے۔ اس پورے دور حکومت میں صوبے میں امن و امان قائم رہا۔ شراب و کباب کی محفلیں ویران ہو گئیں۔ بے حیائی کے اڈے اجڑ گئے۔ عیش و نشاط کے دروازے بند ہو گئے۔ صوبے کے وزیر اعلیٰ کی سرکاری رہائش گاہ مسجد کا درجہ اختیار کر گئی۔ اور مرد حق آگاہ کے دفتر کے ملازم اس کے ساتھ کھاتے پیتے، اٹھتے بیٹھتے، نمازیں پڑھتے اور بے تکلفانہ طور پر باتیں کرتے دیکھے گئے۔ سیاسی طور پر ان کے دور حکومت کو یہ برتری حاصل رہی کہ صوبہ میں دفعہ 144 کا نفاذ ہوا نہ انہوں نے صوبے کو پولیس اسٹیٹ بننے دیا۔ کوئی سیاسی قتل ہوا نہ کسی پر لاٹھی چارج اور گولی چلی۔ اشیاء ضرورت غائب ہوئیں نہ لوگوں کو اشیائی خریداری کے لئے سڑکوں پر لائن لگا کر کھڑا ہونے پر مجبور کیا گیا۔ مفتی محمود کا دور حکومت ہمیں فخر کے ساتھ یہ کہنے کا حق دے گیا ہے کہ مولوی حکومت چلا سکتا ہے اور اسلامی حکومت کا نمونہ بھی پیش کر سکتا ہے۔ مفتی محمود نے حکومت کے منصب کو ایک لمحہ کے لئے بھی ذاتی منفعت، کنبہ پروری، اقرباء نوازی اور شخصی پروپیگنڈا کے لئے استعمال نہیں کیا۔ انہوں نے اتنے بڑے منصب پر فائز ہونے کے باوجود بھی تنخواہ وصول نہ کی۔ اور اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کیا کہ علماء حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد خلفاء راشدین کے نقش قدم پر چل سکتے ہیں۔ [مولانا مفتی محمود۔ رجال ملت کی نظر میں۔ ص 265، 266]

پاکستان کی تاریخ میں ایک عالم دین کی سربراہی میں ایک قائم بے مثال حکومت اور ایک شاندار طرز حکمرانی کو اقتدار کی ہوس میں گرفتار قوتوں سے ہضم نہیں ہو پا رہا تھا۔ اور انہوں نے اس کے راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں اور شدید سے شدید مشکلات پیدا کرنے کی مذموم کوششیں کیں۔ حضرت مفتی صاحب نے 21 فروری 1973ء کو جمعیۃ علماء اسلام کی مرکزی اور صوبائی مجالس شوریٰ کے ہنگامی اجلاس منعقدہ لاہور میں ان مشکلات کا ذکر کیا جو مرکزی حکومت نے نیپ جمعیۃ کی صوبائی حکومت کے خلاف کی تھیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

مرکزی حکومت نے ان 9 ماہ میں صوبائی حکومت کے لئے مشکلات پیدا کرنے اور اسے ناکام بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی (1) ہمارے لئے خوراک کا مسئلہ پیدا کیا گیا۔ (2) کسان اور زمینداروں کو لڑانے کی سازش کی گئی۔ (۳) یونیورسٹی کے سوال پر بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان کے عوام کو لڑانے کی مہم چلائی گئی۔ (۴) پانی کا مسئلہ پیدا کیا گیا۔

انہوں نے فرمایا کہ صوبائی حکومت کی راہ میں جو مشکل بھی وہ پیدا کر سکتے تھے انہوں نے کیں۔ مگر ہماری حکومت نے صبر و تحمل کے ساتھ ان کا سامنا کیا۔ اور آج میں فخر کے ساتھ کہتا ہوں۔ کہ صوبہ سرحد کی حکومت کامیاب ترین حکومت ثابت ہوئی۔ [ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور۔ یکم مارچ 1973ء]

یہاں درج بالا نمبر 2 یعنی کسان اور زمینداروں کے لڑانے کی سازش کے بارے میں عرض ہے۔

کہ ہشت نگر کے وسیع علاقے، تخت بھائی وغیرہ میں مفتی صاحب کی حکومت سے قبل وہاں کسانوں اور زمینداروں کے جھگڑے چل رہے تھے۔ جس کی وجہ سے ایک دوسرے اطراف سے کئی قتل بھی ہوئے تھے۔ ان پر عدالتوں میں مقدمات بھی چل رہے تھے۔ جس کی وجہ سے وہاں وسیع و عریض رقبے خشک و بنجر تھے۔ گویا مفتی صاحب کو یہ مسئلہ ورثہ میں ملا تھا۔ اس مسئلہ کو مرکزی حکومت نے مفتی صاحب کی صوبائی حکومت کے خلاف خوب اچھالا۔ [illegible] پیپلز پارٹی کے دو راہنما جناب معراج محمد خان وفاقی وزیر بے محکمہ اور جناب طارق

عزیز (طارق عزیز شو والے) ان فساد زدہ علاقوں میں آتے۔ پیپلز پارٹی کے مقامی راہنما ان کے ہمراہ ہوتے تھے۔ اور وہ جگہ جگہ اس مسئلے کو مزید ہوا دینے کی کوششیں کرتے۔ اور اس جنگ و جدل کی آگ کو مزید بھڑکاتے۔ صوبائی حکومت نے جب فساد کو کنٹرول کرنے کے لئے وہاں کچھ گرفتاریاں کیں۔ تو فریقین کی گرفتاری کو صوبائی حکومت کے خلاف پروپیگنڈے کے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ اس سلسلے میں جب مفتی صاحب سے پوچھا گیا تو آپ نے کہا۔

ہمارے خلاف یہ پروپیگنڈا کیا جارہا ہے کہ ہم نے کسانوں کی گرفتاریاں کی ہیں۔ اور ہزاروں کسان جیلوں میں بند ہیں۔ اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ ہم نے تیرہ افراد کو جو وہاں طبقاتی جنگ کرا رہے تھے گرفتار کیا تھا۔ جیسے ان پر تبلیغ کرنے والوں نے تیرہ سو بنایا ان میں چار افراد نے تحریری طور پر یقین دہانی کرا دی کہ ہم آئندہ کسی قسم کی غیر قانونی حرکت نہیں کریں گے۔ چنانچہ انہیں اسی وقت رہا کر دیا گیا۔

آپ نے مزید کہا کہ جب میں گزشتہ دنوں ملتان کے دورہ پر آیا تو میں نے ملتان کے بہت بڑے جلسہ عام میں کہا تھا کہ میں ان تیرہ سیاسی قیدیوں کو رہا کرنے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ سندھ اور پنجاب کی حکومتیں بھی یہاں کے تمام سیاسی قیدیوں کو چھوڑ دیں۔ لیکن میں نے کافی دن انتظار کیا کہ شاید یہ حکومتیں اس طرف توجہ دیں گی۔ لیکن انہوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ تا آنکہ میں نے کراچی میں (اپنے دورہ کے دوران) باقی ماندہ قیدیوں کی رہائی کا حکم دے دیا۔ اب وہ رہا ہو چکے ہیں۔ آپ نے کہا کہ ہم نے صوبہ سرحد میں جن تیرہ افراد کو گرفتار کیا تھا۔ وہ سب غیر معروف تھے۔ اور ہم نے ان تمام قیدیوں کو "بی کلاس" میں رکھا۔ لیکن صوبہ سندھ اور پنجاب میں جن افراد کو گرفتار کیا گیا ہے وہ سب معروف ہیں ان میں کچھ سیاسی لیڈر ہیں اور کچھ اخبار نویس۔

[عہد ساز قیادت۔ ص182، 183]

جہاں تک اوپر مذکورہ 4 کا تعلق ہے۔ اس سلسلے میں تفصیل یہ ہے کہ مفتی صاحب کی صوبائی حکومت کے دور میں پیپلز پارٹی کے زیر اہتمام ڈیرہ اسماعیل خان میں جلسہ عام کا فیصلہ ہوا۔ جس سے جناب ذوالفقار علی بھٹو صدر پاکستان نے خطاب کیا۔ مفتی صاحب جناب بھٹو کے استقبال و ملاقات کے لئے ڈیرہ اسماعیل خان نہیں آئے تھے۔ جبکہ گورنر

صوبہ سرحد جناب ارباب سکندر خان خلیل تشریف لائے تھے۔ جناب بھٹو صاحب نے یہاں اپنے مزاج اور مخصوص سٹائل کے ساتھ جلسہ عام سے خطاب کیا۔ انہوں نے اپنے خطاب میں ڈیرہ اسماعیل خان ڈویژن میں یونیورسٹی کے قیام کی منظوری کا اعلان کیا۔ اس وقت ڈیرہ اسماعیل خان میں دو اضلاع، ضلع ڈیرہ اسماعیل خان اور ضلع بنوں شامل تھے۔ اور یہ دونوں اضلاع جمعیۃ علماء اسلام کے خاص گڑھ تصور کئے جاتے تھے بلکہ کوہاٹ سمیت ان اضلاع کی قومی اسمبلی میں نمائندگی جمعیۃ علماء اسلام کے پاس تھی۔

راقم الحروف، مولانا فضل الرحمٰن سمیت عصر کی نماز کے بعد حضرت مفتی صاحب کے ساتھ وزیر اعلیٰ ہاؤس پشاور میں بیٹھا تھا۔ کہ ارباب سکندر خان خلیل کا ڈیرہ اسماعیل خان سے فون آیا۔ اور انہوں نے جناب بھٹو صاحب کی تقریر کے اہم گوشے اور اہم اعلانات کے بارے میں مفتی صاحب کو آگاہ کیا۔ فون سننے کے بعد مفتی صاحب نے فوراً تجزیہ قائم کیا۔ کہ یونیورسٹی کا اعلان کر کے بھٹو صاحب نے ڈیرہ اسماعیل خان اور بنوں کے عوام کو لڑانے کی کوشش کی ہے۔ ڈیرہ کے لئے یونیورسٹی اگرچہ مفتی صاحب اور جمعیۃ علماء اسلام کا دیرینہ مطالبہ تھا۔ اور انہوں نے اس سے قبل سیاسی جلسوں میں قراردادوں تک نہیں۔ بلکہ ایک وقت ایک باوقار وفد کے ہمراہ پشاور جا کر چیف سیکرٹری، سیکرٹری ایجوکیشن، پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر تک سے ملاقاتیں کی تھیں۔ اور ان کے سامنے ڈیرہ اسماعیل خان میں یونیورسٹی کا مطالبہ رکھا تھا۔ لیکن جناب بھٹو صاحب کا یہ اعلان جمعیۃ علماء اسلام کے ان اضلاع کے عوام کو لڑا کر جمعیۃ علماء اسلام میں دراڑیں ڈالنے کی سازش کی۔ وہاں انہوں نے مفتی صاحب کی صوبائی حکومت کو بھی سخت امتحان میں ڈالنے کی مذموم کوشش کی۔ ارباب صاحب کی بات کو سن کر مفتی صاحب نے فرمایا کہ میں اب اس کو نہیں چھوڑوں گا یہ یونیورسٹی اس سے لے کر رہوں گا۔ اور پھر وہی ہوا کہ ہر میٹنگ میں وہ وفاقی کابینہ کی میٹنگ ہو۔ صدر پاکستان کے ساتھ ملاقات ہو یا کسی اور متعلقہ فورم پر ہو آپ نے اس مسئلہ کو اٹھایا۔ حتیٰ کہ مجبوراً مرکزی حکومت کو ڈیرہ اسماعیل خان میں یونیورسٹی کی منظوری کا فیصلہ کرنا پڑا۔ لیکن بھٹو صاحب کا ڈیرہ اسماعیل خان میں ڈویژن کے لئے یونیورسٹی کے اعلان سے جو ارادہ

تھا۔ جمعیۃ والی واقع ہوا۔ اس نے ڈیرہ اسماعیل خان اور بنوں کے عوام کو اس مسئلہ پر لڑانے کی کوشش کی تھی۔ وہی ہوا۔ دونوں اضلاع میں جلسوں، جلوسوں اور مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسی سال گورنمنٹ ڈگری کالج بنوں کے طلبہ یونین میں جمعیۃ طلباء اسلام کامیاب ہوئی تھی۔ جمعیۃ طلباء اسلام اور کالج سٹوڈنٹس یونین نے اسی سلسلے میں قیادت سنبھالی تھی۔ انہوں نے ٹریفک کا سارا نظام جام کر دیا تھا۔ روڈز بلاک کر دیے تھے۔ ادھر ڈیرہ اسماعیل خان کی تمام سیاسی جماعتیں بھی سرگرم تھیں۔ بڑی ردّ و کد کے بعد بنوں کی قیادت اور طلبہ یونین سے مذاکرات کے بعد اس فیصلے پر حالات پر امن ہو گئے۔ اور مظاہروں کا سلسلہ رک گیا۔ کہ یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان میں جبکہ سیکنڈری اینڈ انٹرمیڈیٹ بورڈ کا قیام بنوں میں عمل میں لایا جائے گا۔ اور یوں حضرت مفتی صاحب اپنی مدبرانہ فراست، قوت فیصلہ اور اپنے اثر و رسوخ سے اس گمبھیر مسئلہ کو حل کر کے حالات کو پر امن بنانے میں اہم کردار کیا تھا۔

ڈیرہ اسماعیل خان میں حضرت مفتی صاحب ہی کی کوششوں اور دلچسپی سے "گومل یونیورسٹی" کے نام سے یونیورسٹی قائم ہوئی۔ مگر 1974ء میں اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ جبکہ اس وقت آپ حکومت سے دستبردار ہو چکے تھے۔ اب وہ یونیورسٹی ایک تناور درخت کی صورت میں موجود ہے۔ اور اس کے ثمرات نہ صرف ڈیرہ و بنوں کے اضلاع بلکہ دور دور تک کے اضلاع کے طلباء اس کے علمی فیض سے مستفید ہو رہے ہیں۔

(5) بلوچستان کے گورنر اور وہاں صوبائی حکومت کی مرکزی حکومت کی طرف سے برطرفی کے فیصلے کی جو وجوہات بیان کی گئی تھیں۔ ان میں اسمبلی کے واقعات کو بھی ایک وجہ قرار دیا گیا تھا۔ جس کی آڑ لے کر صوبائی حکومت کو برخاست کر دیا گیا تھا۔ مفتی صاحب نے اس کے جواب میں کہا کہ

> اسمبلی میں جو کچھ ہوا۔ سندھ اور پنجاب میں اس سے زیادہ سنگین حالات پیدا ہوتے رہے ہیں۔ بالخصوص سندھ اور کراچی میں لسانی ہنگاموں کے دنوں میں کرفیو بھی لگایا گیا۔ مگر وہاں کی حکومتوں کو برطرف کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ بلوچستان اور سرحد کی حکومتوں کو روز اول ہی سے ناکام بنانے کی کوشش کی جاتی رہی۔

(6) عراقی سفارت خانے سے روسی اسلحہ برآمد ہونے کا بہانہ بنایا گیا۔ اور اسے مخالفین کو رسوا کرنے اور سرحد و بلوچستان کی حکومتی پارٹیوں کے خلاف کارروائی کرنے کا بہانہ بنایا گیا۔ اسلام آباد کے عراقی سفارت خانہ سے اسلحہ برآمد کرنے کا جو ڈرامہ رچایا گیا اس کے بارے میں مرکزی حکومت نے یہ پروپیگنڈا مہم چلائی کہ یہ اسلحہ پشاور پہنچایا جاتا۔ جہاں صوبائی حکومت نے اس کو مرکزی حکومت کے خلاف استعمال کرنا تھا۔ لیکن یہ پروپیگنڈا سراسر جھوٹ پر مبنی تھا۔ وہاں ایسے کوئی حالات نہیں تھے۔ سرحد کا سارا علاقہ نہایت پر امن تھا۔ اور پھر وہاں قبائلی علاقہ جات کے متصل ہونے کی وجہ سے اسلحہ کی کوئی کمی نہ تھی۔ پھر اسلحہ کا روس سے اسلام آباد کے عراقی سفارت خانے میں پوشیدہ رکھنے میں کیا راز تھا۔ کیا یہ اسلحہ براہ راست کابل کے راستے پشاور نہیں پہنچایا جا سکتا تھا۔ اس اسلحہ کی مرکزی حکومت نے ٹرین کے ذریعے سارے ملک میں نمائش کرائی۔ ایسی کیا ضرورت تھی؟ اور اس میں کیا حکمت و مصلحت تھی؟ سوائے اس کے کہ یہ ڈرامہ رچا کر نیپ جمعیۃ کی حکومتوں کو بدنام کر دیا جائے۔ اور ان حربوں کے ذریعہ ان کو ناکام بنا دیا جائے جس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ صوبہ بلوچستان کی حکومت کی برطرفی کے بعد جناب اکبر خان بگٹی کو وہاں کا گورنر متعین کیا جانا تھا۔ ان کو منظر عام پر لانے کے لئے ان کے لئے اسلام آباد میں ایک جلسہ عام کا اعلان کر دیا گیا۔ اور پروگرام یہ تھا کہ اسی دن عراقی سفارت خانے سے روسی اسلحہ کو برآمد کرنے کا ڈرامہ بھی رچایا جائے گا۔ لیکن اس میں ایک دن کی تاخیر ہوئی۔ اس لئے اکبر خان بگٹی کے جلسہ کو بھی ایک دن کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ فسطائی حکومتوں کے لئے ایسے ڈرامے رچانے ضروری ہوتے ہیں۔ جس کو وہ اپنی حکومتوں کے استحکام کا ذریعہ سمجھتے ہیں مگر ایسے ہتھکنڈے اور ناجائز حربے ان کے زوال کا باعث بنتے ہیں۔

(7) اس وقت ایک دو آزاد اخبارات کے علاوہ دیگر اخبارات کا تعلق "نیشنل پریس ٹرسٹ" کے ساتھ تھا۔ جو حکومتی نگرانی میں حکومتی پالیسی کے مطابق پروپیگنڈا کرتے تھے۔

حکومت نے اپنے اخبارات کو مفتی صاحب کی حکومت کے خلاف خوب استعمال کیا۔ ایک نکلو تا اخبار "شہباز" تھا جو اپنی بساط بھر صوبائی حکومت کی خبریں نشر کرتا تھا۔ لیکن اس کے قارئین کا دائرہ بہت محدود تھا۔ اس سلسلے میں صوبائی حکومت اور "نیشنل پریس ٹرسٹ" کے اخبارات کے درمیان کئی "جنگیں" لڑی گئیں۔

(8) سرحد میں مرکزی حکومت نے قومی اسمبلی کے ضمنی انتخابات کو صوبائی حکومت کو اعتماد میں لئے بغیر ملتوی کرا دیئے۔ اس طرح جمعیت نیپ حکومتوں کے ساتھ مرکز کی کشمکش کا کھلا مظاہرہ سامنے آگیا۔

(9) دیر میں خان عبد الولی خان صدر نیشنل عوامی پارٹی کے جلوس پر فائرنگ کرائی گئی۔ مولانا مفتی محمود نے صوبائی کابینہ کے مشورہ کے بعد بورڈ آف ریونیو کے میر عجم خان کو تحقیقاتی افسر مقرر کیا۔ صوبائی حکومت نے تفتیش کے لئے 45 افراد گرفتار کر لئے۔ مگر مرکزی حکومت نے خالصتاً صوبائی مسئلہ میں ٹانگ اڑانے شروع کر دی۔ اور مرکزی سطح پر ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دی تاکہ اپنے حامیوں کو بچایا جا سکے۔

(10) صوبوں میں حکومتوں کا قیام مارشل لاء کے دور میں ایک عبوری آئین کے تحت عمل میں لایا گیا تھا۔ جس کے تحت اقتدار کی ساری باگ ڈور مرکز اور خاص کر صرف صدر پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو کے ہاتھوں میں تھی۔ اس لئے بھی صوبوں کی حکومتیں بہت محدود دائروں میں کچھ کام انجام دے سکتی تھیں۔

(11) صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان کی حکومتوں کو ناکام بنانے کے لئے سب سے زیادہ کام خان عبد القیوم خان نے کیا ہے بلکہ وہ برملا کہا کرتا تھا کہ میں وزیر داخلہ بنا ہی اس لئے ہوں کہ دونوں صوبوں کی حکومتوں کو ناکام بناؤں اور ان کا خیال تھا کہ وہ ان حکومتوں کو ایک ہفتہ کے لئے ٹکنے نہیں دے گا۔ مگر ان کا خیال تو خیال ہی رہا البتہ دس گیارہ ماہ بعد وہ ضرور اپنے مشن میں کامیاب ہو گیا۔

(12) ایک جگہ مولانا ضیاء القاسمی لکھتا ہے کہ

آپ حیران ہوں گے کہ ایک طرف تو مسٹر بھٹو ہمارے حلیف تھے اور دوسری طرف ہمارے زبردست حریف تھے۔ چنانچہ وہ رات دن اسی بات پر محنت کرتے رہے کہ کسی طرح مفتی محمود کو وزارت اعلیٰ سے الگ کر دیا جائے۔ بھٹو نے مخفی طور پر سرحد انتظامیہ کو ہدایات دے رکھی تھیں کہ چھوٹے موٹے کاموں کے علاوہ مفتی محمود کے اہم منصوبے ناکام بنائے جائیں۔ اور ان کے احکامات کی تعمیل کی بجائے ان میں قانونی موشگافیاں پیدا کر کے الجھا دیئے جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ مفتی محمود نے مسٹر بھٹو اور ان کی حکومت کے خلاف صوبوں کا دورہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ [تذکار محمود۔ ص 173]

(13) حضرت مفتی محمود صاحب نے اپنے ایک انٹرویو میں جو "مفتی محمود سے ملئے" کتاب میں شائع ہوا ہے۔ جس میں وہ صوبہ سرحد بلوچستان کی صوبائی حکومتوں کے خلاف مرکز کے اقدامات پر روشنی ڈالتے ہیں وہ کہتے ہیں۔

ہو سکتا ہے اس کھیل کے پیچھے اہل ربوہ کا بھی ہاتھ ہو۔ کیونکہ ربوہ کی طاقت سازشی طاقت ہے اس کے پیچھے امریکی اور یورپی سامراج کا ہاتھ ہے۔ قادیان کے عظیم فتنہ سے ملک و قوم کو ہر وقت خبردار رہنا چاہیئے۔ اور ہم قوم کو اس فتنہ سے محفوظ رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ اور مجوزہ آئین میں ہم ترامیم کرانے کی کوشش کریں گے کہ پاکستان کی اہم اور کلیدی آسامیاں مسلمانوں کے لئے مخصوص ہوں۔ اور اس کے لئے اللہ تبارک و تعالیٰ کی وحدانیت اور سرور کائنات ﷺ کی ختم المرسلینی پر ایمان کامل رکھنا ضروری ہو۔ ہم نے تسلیم کر لیا کہ پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام ہو گا۔ اس لئے کہ جیسے کسی کیمونسٹ ملک میں غیر کیمونسٹ کو کلیدی آسامی پر مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ اور کیپٹلسٹ (Capitalist) ملک میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف عقائد اور موقف رکھنے والے کو کلیدی آسامی پر تعین نہیں کیا جا سکتا تو پاکستان میں بھی کسی غیر مسلم یا اسلام کے باغی کو کلیدی آسامیوں پر فائز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہماری اس ترمیم کو منظور نہ کیا گیا تو پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام قرار دینے کی شق بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ بہرحال جہاں تک اہل ربوہ کا تعلق ہے ان سے کوئی بھی بات بعید نہیں لیکن ہم یہ کہہ کر اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے بلکہ ہمیں متحد و منظم ہو کر کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کے منصوبے خاک میں مل جائیں۔

(14) بلوچستان اور سرحد کے گورنروں کو برطرف کرنے کے لئے الزام لگایا گیا ہے کہ وہ صدر کے نمائندہ کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دینے میں ناکام رہے ہیں۔ مفتی صاحب نے اس بارے میں بتایا کہ

یہ ایک مبہم الزام ہے اس کا کوئی تک نہیں۔ آئینی طور پر صدر کو گورنر کے تقرر و تنزل کا حق حاصل ہے اس لئے کہ ان گورنروں کا تقرر اپریل 1972ء کے ایک سہ فریقی سمجھوتے کے تحت عمل میں آیا تھا جس کے تحت صدر اپنے اس اختیار سے دستبردار ہو گئے تھے۔ اب صدر بھٹو نے یہ اقدام کر کے یک طرفہ طور پر سمجھوتے کو کالعدم کر دیا ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ صدر اس اقدام سے قبل سہ فریقی کانفرنس بلاتے اس میں بتاتے کہ صدر کے کون سے احکامات ہیں جن کی تعمیل نہیں ہوئی اور گورنروں کی غیر آئینی حرکات کون سی ہیں جو ان کو برطرف کرنے کا جواز مہیا کرتی ہیں۔ لیکن صدر نے ایسا نہیں کیا بلکہ گورنروں کو علیحدہ کئے جانے کے جو احکامات جاری ہوئے ہیں ان میں بھی تفصیلات نہیں دیں۔ صرف اس پر اکتفاء کیا کہ اس وقت تفصیلات میں جانے سے فائدہ نہیں ہوگا۔ [مفتی محمود سے ملئے۔ ص 178-179]

(15) ہفت روزہ "افریشیا" کو انٹرویو میں آپ نے بتایا ہے۔

چنانچہ سرحد و بلوچستان میں نیپ، جمعیت کی اکثریت تسلیم کرنے اور انہیں اقتدار دینے سے مسلسل گریز کیا گیا۔ لیکن جب عوامی دباؤ بڑھ گیا تو سرحد و بلوچستان میں نیپ جمعیت کو وزارت بنانے کی اجازت دی گئی۔ ان دونوں صوبوں میں جب ہماری حکومتیں قائم ہوئیں تو ہمیں پیپلز پارٹی کا تابع مہمل بننے پر مجبور کیا گیا لیکن ہم نے صاف طور پر کہہ دیا کہ یہ حکومت ہمیں بھیک میں نہیں ملی۔ بلکہ یہ ہمارا حق ہے اور ہم آزادانہ طور پر اپنا حق استعمال کریں گے۔ اس کے بعد ان حکومتوں کو ناکام بنانے کے لئے طرح طرح کے ناجائز ہتھکنڈے استعمال کئے گئے۔ تا آنکہ جب کوئی حربہ کارگر نہ ہوا تو بلوچستان کی وزارت کو توڑ دیا۔ اور میں نے احتجاجاً سرحد کی وزارت کا استعفیٰ دے دیا۔ وہ دن اور یہ دن کوئی گھڑی اور کوئی لمحہ ایسا ہے جس میں ہمارے ساتھ ظلم، زیادتی اور جبر و تشدد کو روا نہیں رکھا گیا۔ [بحوالہ "ترجمان اسلام" مفتی محمود نمبر، ص 452]

(16) روزنامہ "حریت" کراچی میں حضرت مفتی صاحب کا انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں اس کے نمائندہ نے مفتی صاحب سے یہ سوال کیا کہ

سوال: کیا آپ کے خیال میں (صوبہ سرحد) میں امن و امان بحال رکھنے کے لئے پولیس کی تعداد کافی ہے؟

جواب: "جی نہیں اسی وجہ سے کہ ہماری حکومت ایڈیشنل پولیس رکھنے کے بارے میں سوچ رہی ہے"

وہ نمائندہ لکھتا ہے کہ یکایک مفتی صاحب کا خیال پولیس والوں کی ہڑتال کی دھمکی کی طرف چلا گیا۔ کہنے لگے یہ بات بہت افسوسناک ہے کہ پولیس والے جو قانون کے رکھوالے ہوتے ہیں خود ہی قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ ہماری حکومت نے ان کی ایسوسی ایشن کو تسلیم کر لیا ہے۔ جس کے لئے آئین بھی بنایا گیا ہے اگر ایسوسی ایشن آئین کے مطابق کام کرے گی تو ٹھیک ہے لیکن آئین کی حدود سے باہر اگر کوئی مطالبہ پیش کیا گیا تو حکومت اسے ہرگز تسلیم نہیں کرے گی۔ ہم نے ایسوسی ایشن کو اس لئے منظور کیا کہ مرکزی وزراء نے ان سے وعدہ کر لیا تھا جسے بہر حال ہمیں پورا کرنا ضروری تھا۔ [بحوالہ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" مفتی محمود نمبر، ص 246]

پولیس کی ہڑتال کا واقعہ بھی مرکزی حکومت اور اس کے وزراء کی صوبائی حکومت کے خلاف ایک سازش تھی۔ پاکستان کی تاریخ میں سیکورٹی فورسز میں ہڑتال کا اس سے قبل کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا ہے۔ اور نہ ہی ان کو یونین سازی یا ایسوسی ایشن قائم کرنے کی اجازت ملی ہے۔ یہ واحد مثال ہے جو بھٹو حکومت اور اس کے وزراء کی سازش اور ملی بھگت سے ایک پرامن حکومت کے خلاف اس قسم کی ہڑتال کرائی گئی۔ پولیس نے ڈیوٹی چھوڑ دی۔ انہوں نے اپنے مطالبات کے حق میں مظاہرے کئے۔ جس کی وجہ سے صوبے میں بدامنی اور انتشار کی کیفیت پیدا ہوتی اگر مفتی صاحب کی حکومت بروقت ایسے اقدامات نہ کرتی جو اس وقت کے اعتبار سے ہنگامی طور پر ضروری ہوتے ہیں۔ ایک تو مفتی صاحب نے ایف سی، ملیشیا وغیرہ کو امن و امان، ٹریفک کی ذمہ داریاں سنبھالنے کا حکم دیا۔ اور دوسرا یہ کہ ہڑتالی پولیس ملازمین سے مذاکرات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جو بالآخر کامیابی پر منتج ہوا۔ اور صرف دو دنوں میں حکومت نے سارے حالات کو

کنٹرول میں لے لیا۔ مفتی صاحب نے اپنی فراست، معاملہ فہمی اور بروقت کارروائی سے اس مسئلہ کو حل کر دیا۔ یہ مرکزی حکومت کی صوبائی حکومت کے خلاف ایک بہت بڑی سازش تھی۔ جس کو مفتی صاحب نے بروقت اقدام سے اس کو ناکام بنا دیا۔

(17) صوبہ سرحد میں صوبائی حکومت کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ تمباکو پر ٹیکس ہے اور دوسرا بجلی کی پیدائش کے ذرائع۔ یہ دونوں ذرائع مرکزی حکومت نے اپنے کنٹرول میں رکھے ہیں۔ اور صوبے کو اپنے وسائل سے لاتعلق کر دیا گیا ہے۔

(18) مفتی صاحب کی حکومت ایک عوامی حکومت تھی۔ آپ نے اپنے دفتر اور وزیر اعلیٰ ہاؤس کے دروازے عوام کے لئے کھلے رکھے تھے۔ ان سے بروقت ملاقات ہر شخص باسانی کر سکتا تھا۔ آپ نے صوبائی حکومت کے افسروں اور ملازمین کے لئے قومی لباس کو لازمی قرار دیا تھا۔ جس کی لباس بیوروکریسی اور عوام میں بعد کی خلیج کو وسیع کرتا ہے۔ قومی لباس میں افسر ماتحت اور عام ملاقاتی ملبوس نظر آتے تھے۔ اس لئے ایک قرب اور اعتماد کی فضا ہوتی تھی۔ آپ نے دفتری زبان اردو قرار دیا تھا۔ عام دفتری خط و کتابت اردو میں ہوتی تھی۔ یہ بھی باہمی قرب کا ایک ذریعہ تھا۔ جبکہ بھٹو صاحب کو یہ بات کھٹکتی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے ایک بار اس بات کی شکایت گورنر صوبہ سرحد ارباب سکندر خان خلیل سے کی۔ وہ رقمطراز ہیں۔

> وزیر اعلیٰ ہاؤس میں ملاقاتیوں اور بھانت بھانت کے لوگوں کو دیکھ کر ایک بار بھٹو نے شکایت بھی کی کہ آپ لوگوں نے گورنر ہاؤس اور پرائم منسٹر ہاؤس کا بیڑا غرق کر دیا۔ لیکن نہ مفتی صاحب کے ملاقاتیوں میں کوئی کمی آئی اور نہ ان کے اپنے معمولات میں کوئی فرق آیا۔ [مولانا مفتی محمود زعماء ملت کی نظر میں۔ ص 21]

(19) یہ میرا راقم الحروف کا اپنا واقعہ ہے۔

ایک دن (جمعۃ المبارک) مولانا فضل الرحمٰن کی رفاقت میں وزیر اعلیٰ ہاؤس میں راقم الحروف موجود تھا۔ جمعۃ المبارک کے دن مفتی صاحب کا معمول، پشاور کی کسی مسجد میں تقریر اور خطبہ کا ہوتا تھا۔ اس جمعۃ المبارک کو انہوں نے مولانا محمد امیر بجلی گھر صاحب

کی مسجد میں جمعہ پڑھانا تھا۔ راقم الحروف نے بھی ساتھ چلنے کی اجازت طلب کی۔ جو انہوں نے دے دی۔ جب ہم وزیر اعلیٰ کی گاڑی میں بیٹھ کر کوہاٹ روڈ کی طرف چل پڑے تو راقم الحروف نے فٹ پاتھ پر چند مرد و خواتین ہیپی دیکھے۔ راقم الحروف نے مفتی صاحب کی توجہ ان کی طرف مبذول کرانی چاہی۔ یاد رہے کہ اس سال بے شمار مرد و خواتین ہیپی نے صوبہ سرحد کا رخ کیا تھا۔ وہ ہر جگہ ہوٹلوں میں، بس اڈوں پر، بازاروں میں، فٹ پاتھوں پر منڈ گشت کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ شہر کے علاوہ دیہاتوں تک جاتے تھے۔ جو کہ اس کے بعد نہیں دیکھے گئے۔ نہ معلوم یہ کون تھے؟ کہاں سے آتے تھے؟ اور کہاں غائب ہو گئے؟ راقم الحروف نے مفتی صاحب سے ان ہیپیوں کے بارے میں پوچھا کہ یہ کس غرض سے یہاں آتے ہیں۔ اسلام آباد سے سیدھے وہ یہاں کا رخ کرتے ہیں۔ لاہور، ملتان، فیصل آباد اور کراچی میں اس تعداد میں نظر نہیں آتے جتنے وہ یہاں صوبہ سرحد میں آتے ہیں۔

بتانے لگے کہ ان کی بڑی خطرناک سرگرمیاں ہیں۔ بہت سے مخرب اخلاق کارروائیوں میں ملوث پائے گئے ہیں ان کی حرکات کے بارے میں ہماری اپنی ایجنسیوں کی جو رپورٹیں ہیں وہ بہت روح فرسا اور ہوش ربا ہیں۔ راقم الحروف نے فوراً صوبائی وزیر اعلیٰ سے یہ سوال کیا۔ کہ پھر آپ کی حکومت، آپ کی فورس آپ کی ایجنسیاں ان کو روکتی کیوں نہیں؟ فرمانے لگے یہ کام اس سے بھی زیادہ حساس اور خطرناک ہے۔ مرکزی حکومت اور وزارت داخلہ، صوبائی وزارت داخلہ اور پولیس سربراہ کو باقاعدہ ان کی حفاظت کے بارے تاکیدی احکامات جاری کرتی ہے۔ اور یہ کہ ان کو کوئی تکلیف نہ پہنچائے۔ اور یہ جدھر جانا چاہتے ہیں ان کو کھلی آزادی ہے۔ اور پھر روزانہ کی بنیاد پر رپورٹس مانگی جاتی ہیں۔ راقم الحروف نے اس سلسلے میں ایک بچگانہ تجویز پیش کی۔ مگر مفتی صاحب نے ہنستے ہوئے فرمایا کہ اس کا الزام پھر بھی صوبائی حکومت پر ہی آئے گا۔ اس لئے باوجود ان کے مخرب اخلاق کرتوتوں کے ہم ان کے راستے میں رکاوٹ نہیں

بن سکتے۔ راقم الحروف نے ان کے کرتوتوں کے بارے میں استفسار کیا تو فرمانے لگے۔
یہ شہروں میں، دیہاتوں میں نوجوانوں کو برے فعل کی ترغیب دیتے ہیں۔ خود بھی منشیات استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے نوجوانوں کو بھی منشیات کے استعمال میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ راستے میں آتے جاتے مرد و خواتین ایسی حرکات و ایسے اشارات کرتے ہیں جس سے نوجوانوں کو برائی کی ترغیب ملتی ہے۔

راقم الحروف یہ سمجھتا ہے کہ یہ بھی مفتی صاحب کی حکومت کے خلاف مرکزی حکومت کی ایک سازش تھی۔ تاکہ کوئی غیرت مند مسلمان ان کے خلاف کوئی کاروائی کرے۔ یا فورس کے بارے میں ایسی کوئی شکایت ملے۔ کہ ان کے مقاصد پورے کرنے میں رکاوٹ بنتے ہیں تو مرکز کو صوبائی حکومت کے خلاف کاروائی کا کوئی جواز ہاتھ آئے۔

یہ وہ متعدد وجوہات، واقعات اور شکایات تھیں۔ جو بھٹو حکومت نے مفتی صاحب کی حکومت کو ناکام بنانے کے لئے استعمال کئے۔ اور بالآخر مفتی صاحب نے اپنی وزارت کی کرسی کو لات ماردی۔ اور علماء اور دیندار طبقہ کی لاج رکھ لی اور دنیا پر اس حقیقت کو واضح کردیا۔ کہ علماء جدید دور میں بھی پرامن اور کامیاب حکمرانی کے ساتھ دنیا کے لئے مثال قائم کرسکتے ہیں۔

آپ کا مختصر دورِ حکومت نہ صرف دینی، شرعی اور قانونی اعتبار سے ایک مثالی حکومت تھی۔ بلکہ عوامی، سماجی اور معاشرتی امن و ترقی کے اعتبار سے بھی بے نظیر تھی۔ آپ چونکہ عوام سے تھے اس لئے عوامی مسائل و مشکلات سے بخوبی واقف تھے۔ اس مختصر سی مدت میں آپ نے عوامی مسائل و مشکلات کے ازالہ میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اس لئے آپ کی حکومت سے استعفیٰ کو عوام نے رائے عامہ کا بہت بڑا نقصان سمجھا اور اسے صوبہ سرحد کی ترقی و استحکام کے خلاف سازش سے تعبیر کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس سال 4 اپریل 2019ء کو جناب ذوالفقار علی بھٹو کی برسی کے موقعہ پر روزنامہ "جنگ" راولپنڈی میں جناب بھٹو صاحب کے ایک مداح نے جو نیویارک (امریکہ) میں رہائش پذیر ہے۔ اور جس کا نام نامی حفیظ کاشمیری ہے۔ بھٹو صاحب کے اوصاف، صفات اور عوام میں ان کی مقبولیت کے واقعات لکھنے کے بعد انھوں نے ان کی چند

غلطیاں بھی تحریر کی ہیں جو بھٹو صاحب سے سرزد ہوئی تھیں جس سے بھٹو کے مخالفین اور دشمنوں کے ہاتھ مضبوط ہوئے تھے۔ جبکہ بھٹو صاحب کو سوائے بدنامی، سیاسی زوال اور جمہوریت دشمنی کے تحفے کے اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ وہ ان غلطیوں میں سب سے بڑی غلطی مفتی صاحب کی حکومت گرانے کو قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

ان تمام حقائق اور وجوہ کے باوجود بھٹو سے بہ حیثیت انسان اور سیاست دان چند غلطیاں سرزد ہوئیں۔ جن کی وجہ سے بھٹو کے مخالفین اور دشمنوں کے ہاتھ مضبوط ہوئے۔
میری ناچیز دانست کے مطابق اقتدار میں آنے کے بعد بھٹو کی سب سے بڑی سیاسی غلطی صوبہ سرحد کی مخلوط حکومت کو گرانا تھا۔ پاکستان کے نئے اور نازک جمہوری نظام پر یہ ایک ضرب کاری تھی اور بھٹو کو اس اقدام کا خمیازہ بلوچستان میں بھگتنا پڑا۔ ایک طرف بھٹو کی جمہوری ساکھ متاثر ہوئی۔ تو دوسری طرف پی پی پی اور ولی خان کی نیپ اور مفتی محمود کی بائیں بازو کی جماعتوں کے درمیان شکوک و شبہات اور اختلافات نے جنم لیا۔
(روزنامہ "جنگ" راولپنڈی 4 اپریل 2019ء)